مشاہدات
و
تاثرات
ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ
تحقیق و ترتیب
اطہر صدیقی
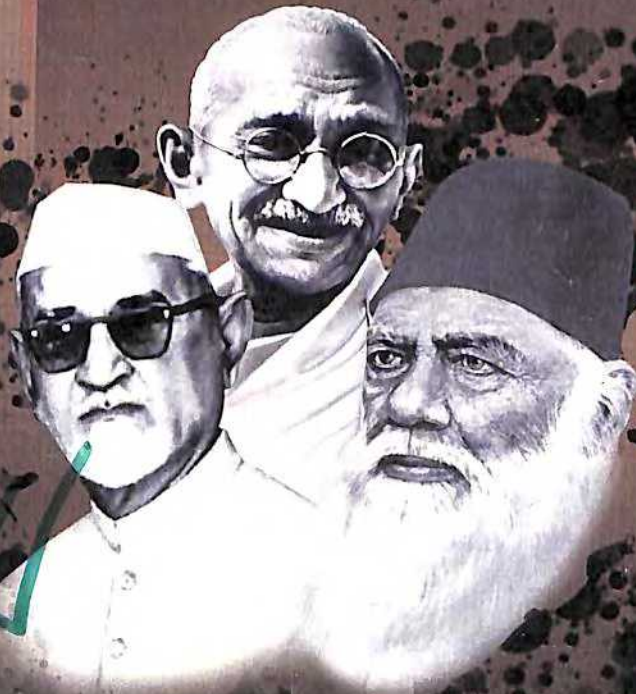
مشاہدات وتاثرات

مصنف

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ

ترتیب وتہذیب

اطہر صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

مشاہدات وتاثرات

مصنف

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ

ترتیب وتہذیب

اطہر صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی ـ 110025

قومی اردو کونسل کی پہلی اشاعت	:	2015
تعداد	:	550
قیمت	:	-/185 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1846

MUSHAHIDAAT WA TAASSURAAT
By: Dr. Sheikh Mohammad Abdullah
Edited and Revised by: Ather Siddiqi

ISBN :978-93-5160-076-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی۔110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

سرسید کے رفقا اور دیگر شخصیات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلرس

ملک کی تقسیم اور ہندوستان پاکستان کا تعین

تحریکِ تعلیمِ نسواں

متفرق مضامین

عرض مرتب

کشمیر کی ریاست سے دو نابغۂ روزگار شخصیتیں ہندوستان کے مطلع پر روشن ستاروں کی طرح جگمگائیں۔ دونوں کا نام شیخ محمد عبداللہ تھا۔ لیکن ایک ماہر تعلیم نسواں تھے اور عرف عام میں ''پاپا میاں'' کہلاتے تھے۔ دوسرے کشمیر کی سیاست کے روح رواں تھے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ لوگ پرانے لوگوں کو بھولتے جا رہے ہیں اور اکثر نام کی مماثلت کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے کنفیوز کرتے ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اپنے محسنوں کو وقت کے گزرنے کے ساتھ یاد نہیں رکھتے۔ لڑکوں کی تعلیم کے سلسلے میں سرسید نے جو کچھ بھی کیا وہ کبھی نہ بھلائی جانے والی حقیقت ہے لیکن لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں اس وقت کے اعتبار سے شیخ محمد عبداللہ (پ:1874، و:1965) نے بانی تعلیم نسواں کی حیثیت سے یکہ وتنہا جو کارنامہ انجام دیا، وہ سرسید کے کارنامے سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ راقم الحروف کی ناقص رائے میں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بات وثوق سے اس لیے کہی جا رہی ہے کہ سرسید کے ساتھ تو ان کی تحریک کے شروع ہونے کے وقت سے لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ بڑے بڑے مشہور زمانہ لوگ مثلاً محسن الملک، وقار الملک، آفتاب احمد خاں، راجہ جے کشن داس، شبلی، حالی، اور چراغ علی سرسید کے رفقائے کار تھے، ان کے پاس سرمایہ کی بھی کمی نہیں تھی۔ انگریزوں کا تعاون بھی حاصل تھا۔

ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کے والی اور سر براہوں کی اعانت بھی حاصل تھی۔اس کے برخلاف شیخ صاحب تو اکیلے ہی چلے تھے جانب منزل اور کوئی ساتھ تک نہ تھا۔ بلکہ مخالفت زیادہ تھی اور معاونت کم!وہ سب ارباب حل وعقد مثلاً نواب محسن الملک، آفتاب احمد خاں وغیرہ، جو لڑکوں کی تعلیم کے سلسلے میں بے حد گرم جوشی اور سرگرمی کے ساتھ کام کر رہے تھے وہ بھی علی گڑھ میں لڑکیوں کے اسکول کھولے جانے کے مخالف تھے۔عام مسلمان بھی لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ان مخالفتوں کے باوجود کیسے اس مرد مجاہد نے یک دستی طور پر خاص وعام مسلمانوں کی طرف سے تعلیم نسواں کی سخت مخالفتوں کے باوجود یہ معرکہ سر کر ڈالا۔

شیخ صاحب کی زیرِ نظر کتاب ''مشاہدات وتاثرات'' ایک بہت اہم تصنیف اس نقطۂ نظر سے بھی ہے کہ شیخ صاحب سترہ سال کی عمر میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔سر سید احمد خاں اس وقت حیات تھے اور اگلے دس برس انھوں نے سر سید کے سایۂ عاطفت میں گزارے۔وہ غالباً اپنے زمانے کے آخری شخص تھے جنھوں نے سر سید کو دیکھا تھا اور ان سے بالمشافہ ملاقاتوں اور تعلقات کا اپنی اس کتاب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔مزید برآں یہ کہ اس کتاب کے مطالعہ سے اس اہم بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ سر سید لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔لاہور کے اپنے خطبہ میں (جو لفظ بہ لفظ شاملِ کتاب ہے: ص 301) سر سید نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ لڑکیاں ویسی ہی تعلیم حاصل کریں جیسی ان کی نانیاں دادیاں کرتی آئی ہیں!! لیکن شیخ صاحب سر سید کی اس منطق سے بالکل متفق نہیں تھے اور وہ اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہے۔انھوں نے 1906 میں چھ بچیوں پر مشتمل باقاعدہ ایک چھوٹے سے اسکول کی بنیاد ڈال کر اپنا کام شروع کر دیا۔آج وہ ایک بڑا ادارہ ویمنس کالج کی شکل میں تقریباً پچھلے پچھتر سال سے قائم ہے۔

یہ تو تھی شیخ صاحب کی اپنے ذاتی مشن یعنی 'تحریکِ تعلیم نسواں' کے آغاز کی کہانی۔لیکن اپنے اس مشن کی تکمیل میں انھیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کس کس طرح کے لوگوں سے شیخ صاحب کا واسطہ پڑا، یا کیسے لوگوں نے ان کے کام کو سبوتاژ کرنے کوشش کی؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے، اور لوگوں کو ان کے چہرے آئینہ میں دکھلانے کے مترادف بھی ہے۔ان سب واقعات کو جو شیخ صاحب کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں پیش آئے اور جس طرح کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ

سب انھوں نے اپنی کتاب ''مشاہدات وتاثرات'' میں نہایت دل چسپ انداز میں بیان کر دیا ہے۔

یہ کتاب شیخ صاحب کی رحلت کے پانچ سال بعد اکتوبر 1969 میں شائع ہوئی تھی اور اب اس کی ایک بھی کاپی موجود نہیں ہے۔ فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن پچھلے آٹھ دس برسوں سے شیخ صاحب کے مضامین کو جو رسالہ 'خاتون' اور 'رازِ ترقی' میں شائع ہوئے تھے، یکجا کر کے اب تک چار کتابوں کی شکل میں شائع کر چکی ہے۔ یہ ایک بہت ہی مستحسن کام ہے اور جو مہر الٰہی ندیم (علیگ) اور قاسم صدیقی صاحبان کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے کہ شیخ صاحب کی یادداشتیں (مشاہدات وتاثرات) ایک بار پھر سے کتابی شکل میں قاری کو مل جائیں وہ بھی جدید کمپیوٹر کتابت اور پرنٹنگ کے ساتھ۔ آنے والی نسلوں کے لیے شیخ صاحب کی یہ تصنیف نہ صرف تحریک تعلیم نسواں کی تواریخ ہے بلکہ اس وقت کے حالات، لوگوں کے روّیوں اور تحریکِ تعلیمِ نسواں کو درپیش مشکلات اور کس طرح لڑکیوں کے اسکول اور کالج وجود میں آئے، ان کی داستان ہے۔

شیخ صاحب نے نہایت سادگی اور ایمانداری سے مختلف لوگوں کے چہروں کو بے نقاب کیا ہے اور ان سے اپنے قاری کو روشناس کرایا ہے۔ پوری کتاب میں شیخ صاحب کا انداز قطعی معروضی ہے۔ حالات جیسے جیسے رونما ہوئے، شیخ صاحب نے ویسے ویسے اپنی سادگی و پرکاری کے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے بیان کر دیے۔ اس طرح یہ ایک بے حد دلچسپ کتاب بن گئی جو نہ صرف سرسیدؒ کے آخری دس برسوں کا آنکھوں دیکھا حال، ایم اے او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ویمنس کالج بلکہ علی گڑھ تحریک کی ایک مکمل داستان ہے۔ قاری کو اس میں بہت کچھ ایسا پڑھنے کو ملے گا جو اس نے کہیں اور نہ پڑھا ہوگا۔ بہت سے واقعات کی صداقت پر سچائی کی مہر یوں ثبت ہو جاتی ہے کہ کوئی اور نہیں شیخ صاحب جیسا انسان ان کی شہادت پیش کر رہا ہے۔

کتاب کے پہلے اڈیشن کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ شیخ صاحب نے یہ کتاب ایک یا دو سال میں نہیں بلکہ دس پندرہ سال کے عرصہ میں لکھی۔ انھوں نے مضامین کی شکل میں 1948ء میں یہ کتاب لکھوانا شروع کی تھی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ پورا مسودہ اپنے منشی شاہد حسن کو املا بول کر کے لکھوایا گیا تھا۔ اس امر کی تصدیق ان کی بیٹی ممتاز جہاں، سابق پرنسپل

ڈیمنس کالج نے اپنے دیباچہ میں بھی کی ہے، جو شامل کتاب ہے۔ دوسرا ثبوت اس امر کا یہ ہے کہ بہت سے الفاظ کے ہجے اس طرح سے نہیں لکھے گئے ہیں جو جدید اردو میں مستعمل ہیں۔ کچھ اہم واقعات تاریخی ترتیب کے اعتبار سے آگے پیچھے ہو گئے ہیں یعنی chronologically غلط ہیں، مثلاً "انگریزوں کی ہندوستان میں آمد" کا ذکر "تقسیم ملک یعنی ہندوستان اور پاکستان کا تعین" کے بعد میں کیا گیا ہے۔ "گاندھی جی کا قتل" اور "میرلیس روڈ کا ذکر" کتاب میں دو مرتبہ ضابطہ تحریر میں آ گیا ہے۔ پہلی مرتبہ صفحہ 133 پر اور دوسری مرتبہ صفحہ 403 پر۔ بعض خیالات و افکار کے ذکر میں تکرار صاف دکھائی پڑتی ہے۔ شیخ صاحب نے جب اپنی یادداشتیں لکھوانا شروع کی تھیں تو اس وقت ان کی عمر تقریباً پچھتر سال رہی ہوگی اور اپنے آخری مضمون میں وہ فرماتے ہیں کہ اب ان کی عمر نوے برس کے قریب ہوگئی ہے اور وہ بچیوں سے الوداع لیتے ہیں۔ ظاہر ہے جو کتاب پندرہ سال کے طویل عرصہ میں بذریعہ املا لکھائی گئی ہو، اس میں اس قسم کے تسامحات کا داخل ہو جانا غیر متوقع نہیں ہے۔ عمر کے اس حصہ میں جب اس کتاب کا مسودہ وجود میں آیا، یادداشت بھی ساتھ چھوڑنے لگتی ہے۔ کیا لکھا دیا گیا ہے اور کیا نہیں، یہ یاد رکھنا ایک مشکل امر رہا ہوگا۔ مزید یہ کہ کتاب کے مشمولات مختصر اور طویل مضامین کا مجموعہ ہیں جس میں کچھ مضامین چند سطروں پر مشتمل ہیں تو دوسرے چند صفحات پر محیط ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کو جو یاد آتا گیا وہ لکھاتے چلے گئے۔ مکمل کتاب ایک طرح کی یاد نگاری سے زیادہ نہیں ہے۔

ان سب معروضات کی روشنی میں یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ شیخ صاحب نے اپنی کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی بھی نہیں فرمائی۔ دوسرے کتاب کی اشاعت ان کے انتقال کے پانچ سال بعد ہوئی اور شائع ہونے سے پہلے یا کتابت کے وقت پوری احتیاط کے ساتھ پروف خوانی بھی نہیں ہو سکی۔ مندرجہ بالا مثالیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ مسودہ جس حالت میں بھی تھا اسی حالت میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا۔

راقم الحروف نے ترتیب و تدوین کے وقت ان تمام باتوں کا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔

(1) تحریر کے وہ حصے جہاں تکرار نظر آتی ہے حذف کر دیے ہیں۔

(2) آج کل جدید اردو میں جو ہجے مستعمل ہیں وہ شامل کر لیے گئے ہیں۔

(3) مضامین کو چھ ابواب میں بانٹ دیا گیا ہے۔

(4) واقعات کو جہاں تک ہو سکا تاثرات اور موضوع میں تسلسلِ فکر کے اعتبار سے یکجا کر دیا گیا ہے۔

(5) اس تدوین سے کتاب کے اصل متن پر کوئی ناموافق اثر نہیں پڑتا کیونکہ کسی بھی مشاہدہ یا یادداشت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ بس یہ ضرور ہے کہ مضامین کی موجودہ منصوبہ بندی سے قاری کو کتاب کے مطالعہ میں تاریخی اور موضوعی اعتبار سے ایک تسلسل محسوس ہوگا اور وہ واقعات کی تکرار سے بھی بچ جائے گا۔

یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ شیخ صاحب نے ویمنس کالج اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے نہ صرف اپنی زندگی وقف کر دی بلکہ اپنی سب جائیداد، زیبنات، اور گھر، کوٹھی کالج کے نام لکھ دی۔ ہمیں امید ہے کہ جلد ہی ان کے وارث عبداللہ لاج کو سرسید ہاؤس کی طرح شیخ صاحب کی زندگی پر مبنی عبداللہ میوزیم اور اکیڈیمی بنوانے کا اقدام شروع کریں گے۔

میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مشکور ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت کی مکمل ذمہ داری قبول کی۔ اس کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تدوین کے سلسلے میں جناب مہر الٰہی ندیم کا مسلسل تعاون اور خاص طور سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے مشورے بے حد مفید ثابت ہوئے۔ اس کے لیے بھی میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

اس کتاب کو بیگم ممتاز جہاں حیدر (دختر شیخ محمد عبداللہ) سابق پرنسپل ویمنس کالج نے شیخ صاحب کی وفات کے پانچ سال بعد 1969ء میں فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام شائع کیا تھا۔ کتاب میں شامل دوسرا دیباچہ ان کا تحریر کردہ ہے اور یہاں شامل کر لیا گیا ہے۔

دیباچہ

میں نے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین کو اخیر نومبر 1968ء میں خط لکھا تھا کہ اگر وہ میرے والد مرحوم شیخ عبداللہ صاحب کی کتاب کا پیش لفظ لکھ دیں تو ہم سب کو بڑی خوشی ہوگی۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے منظور کر لیا تھا۔ کوتاہی میری تھی کہ اپنے کالج کے کاموں میں اس قدر منہمک رہی کہ ذاکر صاحب کے خیالات سے جو وہ پاپا کے متعلق رکھتے تھے، پاپا کے قدردانوں کو محروم رکھا۔ ذاکر صاحب کی دفعتاً موت وہ سانحہ ہے جس کا اس وقت مجھ پر بہت گہرا اثر ہے۔ اب یہ خیال بھی ہے کہ یہ ذمہ داری جو مجھ پر آ پڑی ہے اسے پورا ہی کر دینا چاہیے۔ پاپا کے انتقال کو چار سال ہو گئے اور قریب قریب تین چار سال پاپا کی زندگی میں بھی مسودہ کتابت کے بعد پڑا رہا۔ اب کام ختم ہو جانا ضروری ہے۔

پاپا مرحوم بہت عرصے سے اپنے خطوط اور مضامین کا املا بول کر لکھوانے کے عادی تھے۔ یہ پوری کتاب بھی انھوں نے شاہد حسن سے جو ان کی پیشی میں رہتے تھے، املا بول کر لکھوائی ہے۔ شاہد حسن صاف اور صحیح لکھتے ہیں اس لیے طباعت میں آسانی رہی۔ وہ کم عمری سے پاپا کے ساتھ رہے ہیں، اس لیے پاپا کو ان پر اعتماد تھا کہ وہ صحیح لکھ سکیں گے۔ شاہد حسن کا کام اس لیے قابلِ ستائش ہے۔

ڈاکٹر خلیق احمد نظامی، پروفیسر تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جو پاپا کے قدر دانوں میں سے ہیں اور اکثر ان کے پاس آیا کرتے تھے کتاب کی طباعت کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لی ہیں بلکہ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ قریب قریب سال بھر سے یہ اصرار کر رہے ہیں کہ کتاب جلد چھپ جانی چاہیے۔ میں ان کی بڑی شکر گزار ہوں۔

میں پاپا کی اولاد میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش قسمت سمجھتی ہوں کیوں کہ مجھے سب سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کا ملا اور ان کے اعلیٰ اور افضل خیالات سے مستفید ہوتی رہی۔ عورتوں کی بہتری اور بہبودی کی لگن جوان کو تھی وہ آخیر دم تک رہی، جیسا کہ ان کی اس کتاب سے، مضامین سے اور پمفلٹ سے جو وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے ظاہر ہے، بہت بچپن ہی سے تھی۔ علی گڑھ تحریک میں آنے کے بعد وہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئے۔

محترم ذاکر صاحب نے پاپا کا تعارف مصر کے کمانڈر انچیف، جنرل نجیب سے جو ہمارے کالج میں ان کے ساتھ تشریف لائے تھے یہ کہہ کر کرایا تھا کہ:

"Sheikh Sahib is the founder of women's movement in our country."

(شیخ صاحب ہندوستان کی عورتوں کی بہبودی کی تحریک کے بانی ہیں۔) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب پاپا کی خدمات کے کس قدر قدر دان تھے۔ ان کا خط جو انھوں نے میرے خط کے جواب میں لکھا تھا اس کتاب کا پیش لفظ سمجھا جائے۔

سن سینتالیس اڑتالیس کے حالات سے جس طرح ہر ذی حس شخص متاثر تھا اسی طرح پاپا مرحوم بھی تھے۔ ہندوستان، خصوصاً دہلی اور یوپی میں مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا ان پر گہرا اثر تھا جس کا انھوں نے بے دھڑک اپنی کتاب میں اظہار کیا ہے۔ میرا اور چند دوستوں کا خیال ہے کہ ابھی وقت مناسب نہیں ہے جب اپنے ملک یا دوسرے ملک کے لوگ ان کے لکھے کو ٹھنڈے دل سے پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔ جو تاثرات ان کے اس زمانے میں تھے اس کے ایک آدھ جز شائع نہیں کیے جا رہے ہیں۔

ممتاز جہاں حیدر
سیکریٹری، فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن

علی گڑھ میں آمد

تمہید

میں عرصہ سے اس فکر میں تھا کہ ایم۔اے۔او کالج اور مسلم یونیورسٹی اور اپنے عزیز وطن ہندوستان کے مختصر اور منتخب حالات جو میرے سامنے وقوع میں آئے ان کو قلم بند کروں۔ حالات بطور ایک مسلسل تاریخ کے لکھنے کے لیے بہت دشوار ہیں کیونکہ میرے پاس ایک مفصل تاریخ کے لیے واقعات جمع نہیں ہیں۔ اگر ان کو جمع کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ اخبارات و رسالوں اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کی روئدادوں میں موجود ہیں، وہ جمع کیے جا سکتے ہیں جس کے لیے کئی سال کی محنت کی ضرورت ہے۔ کوئی دوسرے صاحب ہمت کر کے مصالحہ جمع کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف اس قسم کے واقعات قلم بند کرنا چاہتا ہوں جو میرے چشم دید ہوں یا ایسے بزرگوں اور دوستوں نے مجھ سے بیان کیے ہوں جن پر مجھ کو اعتبار ہے۔ ایسے واقعات کو بھی میں بمنزلہ چشم دید واقعات ہی سمجھتا ہوں کیونکہ بیان کرنے والوں کی راست گوئی پر مجھ کو پورا اعتبار ہے۔

میں جو کچھ لکھوں گا وہ اپنے حافظہ کے اعتبار پر لکھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دے گا اور جس قدر واقعات قلم بند ہوں گے ان میں غلطی کا امکان بہت ہی کم ہوگا۔ میں ترتیب وار وہ واقعات قلم بند کروں گا جو میرے کالج میں داخل ہونے کے قریب تین سال قبل سے شروع ہوتے ہیں۔ میں ایم۔اے۔او کالج میں 14 مئی 1891 میں داخل ہوا۔ اس سے قبل

مجھ کو سرسید کی زیارت کا ایک مرتبہ موقع ملا تھا اور میں نے ان کی تصنیفات کو پڑھا تھا اور بالخصوص وہ مضامین جو ان کے تہذیب الاخلاق میں شائع ہوتے تھے پڑھے تھے۔

سرسید کی مفصل سوانح عمری ''حیات جاوید'' ہے جو جناب شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی مرحوم و مغفور کی تصنیفات میں سے ہے۔ مولانا حالی نے کچھ واقعات جو سرسید کے آخری دنوں میں وقوع میں آئے وہ انھوں نے ان کی سوانح حیات میں درج نہیں کیے کیونکہ اگر وہ درج کیے جاتے تو سرسید اور ان کے عزیز پسند نہ کرتے لیکن اب زمانہ گزرنے کے بعد اگر ان کا خلاصہ قلم بند کر دیا جائے تو ''حیات جاوید'' میں جو کمی محسوس ہو رہی تھی وہ پوری ہو جاوے گی اور وہ واقعات خاص طور سے سرسید کی ذات اور خانگی زندگی سے متعلق ہوں گے۔ ان واقعات سے ذاتی واقفیت رکھنے والے اب دنیا میں بہت کم رہ گئے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ان کا قلم بند ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ لوگوں کے بعد کوئی شخص ان کی یادداشت آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑنے کو نہیں ملے گا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو صحت اور فرصت دے تاکہ میں اس کام کو انجام تک پہنچا سکوں۔

سب سے اوّل سرسید کی زیارت

1888 کی کرسمس کی تعطیلات میں جبکہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول لاہور میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور میری عمر قریب پندرہ سال کی تھی تب میں نے سرسید کو سب سے اول دیکھا تھا۔ اس سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ لاہور میں ہوا تھا اور اپنے مخدوم استاد حکیم مولانا نورالدین مرحوم کے ہمراہ میں کانفرنس کے جلسے میں گیا تھا۔ میں نے اس سے قبل اس قسم کے جلسے نہیں دیکھے تھے۔ یوں تو لاہور ایک ایسا شہر تھا کہ اس میں آئے دن بڑے بڑے جلسے ہوا کرتے تھے۔ کبھی ہندوؤں کے، کبھی مسلمانوں کے، کبھی آریہ سماجیوں کے اور کبھی عیسائیوں کے۔ لیکن مذہبی جلسوں میں ہم طالب علموں کو شرکت کا کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ البتہ اگر کوئی بڑا آدمی باہر سے آجاتا تھا اور اس کی وجہ سے کوئی جلسہ منعقد ہوتا تھا تو اس کی تقریر سننے کے لیے میرے اسکول اور کلاس کے طالب علم جاتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ لیکن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا اور سرسید کی فصاحت و بلاغت کی تعریف ہمارے استاد

کیا کرتے تھے۔اس لیے میں کوشش کر کے مولانا نورالدین مرحوم کی وساطت سے اس جلسے میں شریک ہوا۔میرے جانے کے بعد جلسہ شروع ہوا۔سر سید جہاں بیٹھے تھے ان کے تھوڑی دور پر میری کرسی تھی۔ میں نے سر سید کو اس وقت اچھی طرح دیکھا۔ جلسہ شروع ہوا تو رپورٹ وغیرہ پڑھنے کے بعد جناب شمس العلما مولوی مولانا حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا لیکچر شروع ہوا۔ مولانا بہت فصیح البیان آدمی تھے۔ان کی تقریروں میں بہت بڑا اثر تھا۔ سننے والوں کو بہت لطف حاصل ہوتا تھا۔اپنے لیکچر کی تمہید میں انھوں نے فرمایا کہ میرے نام کے ساتھ کسی ڈگری بی۔اے یا ایم۔اے کا پن چھلہ نہیں لگا ہوا ہے۔میں جو کچھ کہوں گا وہ ایک سچی اور صاف بات ہوگی جس کو میں محسوس کر رہا ہوں۔سر سیدؒ نے ان کو کہا کہ یہ آپ نے کیا کہا کہ آپ کے نام کے ساتھ کوئی پن چھلہ نہیں آپ تو مولانا بالفضل اولانا ہیں پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ پن چھلہ نہیں لگا ہوا ہے۔اس پر حاضرین میں خوب قہقہہ پڑا۔اس کے بعد مولانا نے سر سید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ سر سید احمد خاں کو جو میں نے پہچانا ہے ان کے پہچان کی بھی خصوصیت ان میں کوئی نہیں ہے۔ان کے سر پر کوئی سرخاب کا پر تو نہیں لگا ہوا کہ ان کو دیکھتے ہی کوئی پہچان لے۔اس پر سر سید نے اپنی ترکی ٹوپی اتار دی اور اپنا صاف سپاٹ سر کو دکھا دیا کہ دیکھو کوئی سرخاب کا پر نہیں لگا ہوا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ آج کل کے زمانے کی تعلیم میں جو خصوصیت ہے وہ یہ کہ دنیا کے حالات اور واقعات سے طالب علموں کو واقفیت ضرور ہو جاتی ہے، لیکن ان کے اعلیٰ اخلاق کی تہذیب و تربیت میں کمی رہ جاتی ہے۔جس تربیت اور تہذیب پر ہمارے مذہب کی بڑی عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔مولانا نے بہت دیر تک لیکچر دیا اور حاضرین کو اول تو خوب ہنسایا اور پھر خوب رلایا۔میں نے پہلے بھی لیکچراروں کی گفتگو کے دوران میں حاضرین کو ہنستے ہوئے اور قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔یہ رونے کا منظر میری عمر میں پہلا ہی تجربہ تھا کہ مرد اس طور پر دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔

ایک صاحب جن کا نام قاضی سراج الدین تھا جو ایک اخبار موسومہ چودھویں صدی کے ایڈیٹر بھی تھے وہ بہت دیر تک اور سب سے زیادہ روئے۔یہ جلسہ کوئی دو ڈھائی گھنٹہ تک رہا اور مجھے سر سیدؒ کو دیکھنے کا جو شوق تھا وہ بہت اچھی طرح پورا ہو گیا۔سر سیدؒ بڑے مشہور و معروف آدمی

تھے۔ دہلی کے رہنے والے ایک ہمارے استاد تھے جو ہم کو اردو پڑھاتے تھے وہ ہمیشہ سرسید کا ذکر کرتے تھے اس لیے ہم لوگوں کو ان کے دیکھنے کا شوق تھا۔ جلسہ کے بعد میں لوٹ کر اپنے بورڈنگ ہاؤس چلا آیا اور پھر میں جلسے میں نہیں گیا البتہ بعض اپنے کلاس کے مسلمان لڑکوں سے سنا کہ محرم علی صاحب چشتی نے جو سرسید کے سخت مخالف تھے کوئی خط سرسید کو لکھا تھا جس میں ممدوح کی بہت توہین کی تھی اور ان کی ذات پر رکیک حملے کیے تھے۔ سرسید نے وہ خط لاہور کے معززین کے سامنے پیش کیا کہ محرم علی خاں چشتی کہ جو اخبار کے ایڈیٹر بھی ہیں، مجھ کو ایسا بدتمیزی کا خط لکھا ہے۔ چنانچہ وہاں جتنے لوگ موجود تھے انھوں نے کہہ دیا کہ محرم علی خاں کا اخبار نہ کوئی خریدے گا اور نہ کوئی پڑھے گا۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر اندر محرم علی خاں کا اخبار بند ہوگیا۔ اس کے بعد اپنی تعلیم میں مشغول رہا اور ساتویں کلاس کے امتحان کے بعد تین سال کے اندر میٹرک کا امتحان دے دیا اور اس میں پاس ہوگیا۔ 1891 کے شروع میں میرا نتیجہ نکل آیا اور اس کے بعد میں کالج میں داخلے کے لیے علی گڑھ چلا آیا۔

ایم۔اے۔او کالج میں میرا داخلہ

14 مئی 1891 میں ایم۔اے۔او کالج کی فرسٹ ایئر کلاس میں میرا داخلہ ہوگیا۔ لاہور سے علی گڑھ تک کا سفر بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ کچھ نئی نئی شکلیں، کچھ عجیب وغریب طریقے مشاہدے میں آئے اور قریب بارہ بجے رات کے میں علی گڑھ پہنچ گیا۔ جب میں علی گڑھ اسٹیشن پر پہنچا تو آواز سنی کہ علی گڑھ کا اسٹیشن آگیا۔ میں فوراً درجہ سے اترا اور سامنے خالی پلیٹ فارم دیکھ کر وہیں پر اپنا سامان رکھ دیا اور دیوار کے سہارے سے بچھونا بچھا کر سو گیا اور صبح تک برابر سوتا رہا۔ ان دنوں یا تو آدمی کم تھے یا لوگ سفر کم کرتے تھے اس لیے آج کل کی سی بھیڑ بھاڑ اسٹیشن پر نہیں تھی۔ ورنہ ایسے بڑے اسٹیشن پر سونے کا موقع کہاں ملتا ہے۔

صبح کو اٹھ کر میں نے قلی کے سر پر سامان رکھ کر کہا کہ ایم۔اے۔او کالج لے چل۔ ان دنوں تانگے نہیں ہوتے تھے بلکہ گھوڑا گاڑیاں ہوتی تھیں جو ریلوں کی آمد کے وقت اسٹیشن پر آجاتی تھیں۔ اس لیے مجھے کوئی سواری نہیں ملی۔ قلی جو میرے ساتھ تھا وہ مجھ سے بھی زیادہ ناواقف نکلا۔ وہ مجھے اول تو گورنمنٹ ہائی اسکول میں لے گیا۔ وہاں سے اس کو کسی نے کالج کا پتہ بتایا تو وہ

مجھے سائنٹفک سوسائٹی کے مکان میں لے گیا۔ وہاں پر کوئی صاحب نے اس کوٹو کا کہ تم ان کو کہاں لیے لیے پھرتے ہو اشارہ کر کے بتایا کہ ایم۔اے۔او کالج اُدھر ہے۔اس کے بعد قلی مجھ کو کالج کے وکٹوریہ گیٹ پر لے کر پہنچا۔ وہاں پر مجھ کو بھائی جی ظفر علی ملے۔ یہ بھائی جی ظفر علی بھی فرسٹ ایئر کلاس میں داخل ہونے کو آئے تھے۔ میں نے ان سے حافظ دل احمد صاحب کا نام دریافت کیا جو لاہور میں پڑھا کرتے تھے اور مجھ سے واقفیت تھی۔ مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے آ کر تھرڈ ائیر کلاس میں داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ بھائی جی ظفر علی نے کسی سے ان کے کمرے کا پتہ دریافت کر کے مجھے ان کے پاس پہنچا دیا۔ وہاں پر اور دو تین دوست جن سے واقفیت تھی ملے اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی غیر ماحول میں نہیں ہوں بلکہ اپنے ہی لوگوں میں ہوں۔ دوسرے روز میں فرسٹ ائیر کلاس میں داخل ہو گیا۔ سر ٹامس آرنلڈ نے مجھ کو داخل کیا اور سر تھیوڈور ماریسن سے جو قائم مقام پرنسپل تھے تعارف کرایا۔

مجھے اس بارک میں کمرہ ملا جس کو کچی بارک کہتے ہیں۔ میرے کمرے کے آس پاس بہت ممتاز طالب علم رہتے تھے جیسے خواجہ غلام الثقلین مرحوم، خان بہادر ڈاکٹر حبیب اللہ خاں صاحب، خان بہادر مولوی نذیر احمد صاحب ریٹائرڈ جج کشمیر، مولانا ظفر علی خاں صاحب وغیر وغیرہ۔ دوسرے یا تیسرے دن میں کچھ معززین کے خطوط جو لاہور سے اپنے ساتھ سر سید علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا تھا وہ لے کر کوٹھی پر گیا اور مولانا حکیم نور الدین صاحب کا ایک پیغام تھا ان کی خدمت میں پہنچایا۔ سر سید علیہ الرحمۃ نے نہایت شفقت اور مہربانی سے فرمایا کبھی کبھی ہم سے آ کر مل جایا کرو۔ اس کے بعد میں بورڈنگ ہاؤس میں سب طالب علموں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگا۔ میری زندگی کے وہ دن جو بورڈنگ ہاؤس میں گزرے بہت ہی پر لطف اور بے فکری کے دور تھے۔ سر سید کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتا تھا اور جتنی مرتبہ حاضری کا شرف حاصل کیا اتنی ہی مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسی بات حاصل کی کہ جس کا اثر میری زندگی پر بہت اچھا پڑا۔ اور اب تک میں انھیں کے فیض کا اپنی طبیعت کو مطیع پاتا ہوں۔

سر سید کے پاس بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی۔ ہندوؤں میں راجہ جے کشن داس آنجہانی جو کہ سر جگدیش پرشاد صاحب کے دادا تھے

ان کو کبھی کبھی سرسید کے پاس دیکھا کرتا تھا۔ وہ مراد آباد کے رئیس تھے لیکن سرسید کی محبت کی وجہ سے مہینہ دو مہینہ میں سرسید سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ وہ ٹھہرتے بھی سرسید کے پاس تھے اور کھانے کا انتظام ان کا مجھ کو معلوم نہیں کہاں ہوتا تھا لیکن ایک برہمن رسوئیا ان کے ہمراہ آیا کرتا تھا۔ راجہ صاحب آنجہانی ہندو قوم کی ترقی اور تہذیب کے متعلق مایوسی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہندو ذات پات کی قیود کے شکنجہ میں ایسے کسے ہوئے ہیں کہ ان کو تہذیب اور ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ایک موقع پر راجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر ہندو قوم اپنی رسوم اور ذات پات کی زنجیروں میں ایسے ہی جکڑی رہی جیسی کہ اب ہے تو ہزار سال میں بھی وہ ایک مہذب قوم نہیں بن سکے گی۔ سرسید نے فرمایا کہ یہ ضرور ہے کہ ہندوؤں میں ذات پات اور رسموں کی پابندیاں کمزور ہو رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ بہت جلد ہندو قوم کو ان سے نجات مل جائے اور وہ ترقی کی راہ پر پڑ جائیں۔ مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے بھی بدتر ہے۔ وہ یوں تو اپنے کو ایک قوم کہتے ہیں لیکن علما نے ان میں اس درجہ اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے کا جانی دشمن ہو گیا ہے۔ پہلے ہی مسلمانوں میں بہت سے فرقے تھے لیکن ان میں اضافہ پر اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک مولوی دوسرے کا دشمن ہے اور اپنے مریدوں کو دوسرے کے مریدوں کا دشمن بنانے میں ان کی تمام کوشش صرف ہوتی ہے۔ ترقی اور تہذیب کو وہ اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی حالت ترقی کے میدان میں ہندوؤں سے بدرجہا بری ہے۔ ممکن ہے کہ موجودہ زمانہ کی تعلیم مولویوں کے پنجہ سے اس قوم کو نجات دلا دے اور مسلمان بھی ترقی کی راہ پر پڑ جائیں اور آخر کو یہ دونوں قومیں ترقی اور تہذیب میں یورپ کی قوموں کا مقابلہ کرنے لگیں۔

میں نے ایف۔ اے کے دونوں کلاسوں میں دو سال تک پڑھا۔ میرے استادوں میں سر تھیوڈور ماریسن، سر ٹامس آرنلڈ، بابو جادو چندر چکرورتی، شمس العلما مولانا شبلی اور شمس العلما مولانا عباس حسین صاحب تھے۔ یہ سب لوگ صاحب تصنیف گزرے ہیں۔ سر ٹامس آرنلڈ نے ''پریچنگ آف اسلام'' جیسی شہرۂ آفاق کتاب لکھی۔ شمس العلماء مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ کے لٹریچر میں اس قدر زبردست اضافہ کیا کہ اور کسی ہندوستانی مصنف نے اس قدر اضافہ نہیں کیا ہے۔ مولانا مرحوم مغفور کی سیرت اور الفاروق اور المامون حالات متعلق کتب خانہ اسکندریہ

بہت مقبول تصنیفات ہیں۔ بابو جادو چندر چکرورتی نے اسکولوں کے نصاب کے لیے ریاضی میں دو ایسی اچھی کتابیں لکھیں کہ کل ہندوستان کے اسکولوں میں ان کا رواج ہو گیا اور ان کتابوں سے چکرورتی صاحب کو اتنا منافع ملا کہ جب وہ ملازمت سے علاحدہ ہوئے تو ان کے پاس پانچ لاکھ روپیہ نقد تھا۔ مولانا عباس حسین کی کوئی خاص تصنیف تو مجھے یاد نہیں لیکن وہ بڑے عالم تھے اور مذہبی اختلافات مٹانے میں وہ ہمیشہ سرسید کی مدد کرتے رہے۔ ہمارے زمانے کے اساتذہ میں ایک مولانا خلیل احمد صاحب بھی تھے جو عربی کے عالم تھے اور ان کی تعلیم سے بہت سے لوگ خواہ وہ کالج کے طالب علم ہوں نہ ہوں بہرور ہوتے تھے۔ مولانا عباس حسین مرحوم ضلع جگت بولنے کے بہت عادی تھے۔ ایک مرتبہ مولانا شبلی کے پاس آئے تو مولانا کیلا کھا رہے تھے۔ انھوں نے مولانا عباس حسین کے سامنے بھی پیش کیا کہ آپ بھی کھایئے۔ مولانا عباس حسین صاحب نے جواب دیا اکیلے ہی کھایئے۔ ایک مرتبہ محرم کی تعطیل کے متعلق جو کالج میں ہوتی تھی گفتگو شروع ہوئی کہ کتنے دن کی تعطیل ملنی ضروری ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ کبھی بارہ روز کی ہوتی تھی اس کے بعد دس روز کی ملنے لگی پھر گھٹتے گھٹتے سات روز کی رہ گئی اب سات روز میں بھی شش و پنج ہے۔

مولانا عباس حسین جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تھے تو طالب علم پہلے ہی سے ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ یہ خوب ضلع بولیں گے اور خوب ہنسائیں گے۔ ایک وقت میں کچھ دنوں کے لیے مولانا باغات کے نگراں ہو گئے۔ صبح کے وقت کلاس میں آئے اور کہا کہ ہم تو باغی ہو گئے، اور پھر ایک روز فرمایا کہ مالی کی خوب گوشمالی کرتا ہوں۔ لیکن مالی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس قسم کی ضلع بازی سے ان کو خود بھی بہت لطف حاصل ہوتا تھا اور ان کے شاگرد بھی ہمیشہ بہت محظوظ ہوتے تھے۔ مولانا عباس حسین صاحب مذہب کے شیعہ اثنا عشری تھے۔ وہ غیر مسلموں کے ہاتھ کی چیز ہرگز نہیں کھاتے تھے۔ وضو اور طہارت کا ہمیشہ بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن میں نے ان کے دل میں کسی غیر مذہب کو کوئی نقصان پہنچانے کا خیال نہیں پایا۔

ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ صبح کے وقت سب سے اوّل کالج کا وقت شروع ہونے سے قبل سب جماعتوں کے طالب علم اسٹریچی ہال میں یا اور کسی بڑے ہال میں جمع ہو جاتے تھے اور وہاں مولانا شبلی صاحب خوش الحانی کے ساتھ قرآن پاک کے کسی رکوع کے تلاوت فرماتے تھے اور

ترجمہ کر کے ہم سب لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ اتنے میں گھنٹی ہو جاتی تھی اور ہم سب لوگ اپنی اپنی کلاس میں چلے جاتے تھے۔ یہ زمانہ بہ لحاظ اپنی عمر کے اور بہ لحاظ بہت سے خوشگوار مشاغل کے ایسا اچھا گزرا کہ اس کی ایک ایک بات اس وقت تک یاد ہے۔ کالج سے اس قدر انسیت پیدا ہو گئی تھی کہ کسی کو اپنے ماں باپ کے گھر سے بھی اتنی محبت نہ ہوتی ہوگی۔ ایک مرتبہ ایک انگریز کلکٹر نے اس زمانے میں جبکہ میں وکالت کرتا تھا مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے کالج کے متعلق کیا کرنا چاہتے ہو اور کیا ایسی بات تمھارے دل میں ہے جس سے تم کو کالج کی زندگی کے متعلق خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں پھر طالب علم بن کر اپنے بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں جا کر رہوں۔ اس پر انگریز نے قہقہہ لگایا کہ بالکل یہی خیالات میرے بھی ہیں کہ میں کیمبرج میں جا کر پھر طالب علم کی سی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس زمانے کی طالب علموں کو اپنے کالج سے کس درجہ محبت ہو جایا کرتی تھی۔

مجھے امید ہے کہ اس کے بعد کے طالب علموں کو اپنے کالج سے ویسی ہی محبت ہو جاتی ہوگی۔ لیکن اب یونیورسٹی کی زندگی ہماری زندگی سے بہت مختلف ہے۔ ہم تعداد میں کم تھے اس لیے کالج کی زندگی گھر کی زندگی کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ اب چار پانچ ہزار طالب علم ہیں۔ بجائے ایک دو ہوسٹل کے پندرہ بیس ہوسٹل ہیں۔ اس لیے ایسے گہرے تعلقات طالب علموں کے نہ آپس میں پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ادارے کے در و دیوار سے اس قسم کا انس ہو سکتا ہے جیسا کہ پہلے تھا۔

زمانۂ طالب علمی کے ہمارے مشاغل

ہم لوگوں کی زندگی میں ڈرل جسمانی ورزشیں، کرکٹ، فٹ بال، رائڈنگ اسکول اور بہت سے بڑے بڑے مشاغل تھے۔ ان کے علاوہ یونین اور چھوٹی چھوٹی سوسائٹیاں، مثل ڈیوٹی سوسائٹی کے ہمارے دن رات کے مشاغل کے لیے بہت مشاغل تھے۔ یونین کلب اور ڈیوٹی سوسائٹی میرے آنے سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ لیکن رائڈنگ اسکول میرے آنے کے دو سال بعد سر تھیوڈر ماریسن نے قائم کیا۔

سب سے پہلے جنھوں نے گھوڑے کی سواری سیکھنا شروع کی ان میں میں اور میرے ہم کلاس ڈاکٹر ضیاء الدین، مرحوم مولانا ظفر علی خاں و نیاز محمد خاں اور غلام محی الدین خاں تھے اور

ہماری کلاس کے پانچ آدمیوں کے علاوہ ڈاکٹر ناظر یار جنگ کو بہت شوق تھا اور اسی وجہ سے انھوں نے رائڈنگ اسکول قائم کیا تھا جو اب تک قائم ہے۔ درمیان میں اس کو بہت ترقی ہوئی تھی اور اب بھی وہ اچھی حالت میں ہے۔ سر تھیوڈر ماریسن فٹ بال کھیلنے میں بہت بڑے مشاق تھے اور ان کی وجہ سے فٹ بال کلب کو بھی بہت ترقی ہوئی۔ کرکٹ میں ہم لوگوں کا کچھ حصہ نہیں تھا اور نہ ہماری کلاس کا کوئی طالب علم فرسٹ الیون میں کبھی لیا گیا۔ کرکٹ پر مولانا شوکت علی مرحوم کی پارٹی حاوی تھی۔ مولانا مرحوم کے زمانے میں کرکٹ کو بہت فروغ ہوا تھا۔ وہ ایک ایسے آدمی تھے جو اپنی علاحدہ ایک پارٹی رکھتے تھے اور اس پارٹی کے آدمیوں سے ان کے بڑے گہرے تعلقات رہتے تھے۔ وہ کرکٹ کے کیپٹن بھی ہو گئے تھے اور ان کے زمانے میں علی حسین صاحب اور احسان الحق صاحب وغیرہ چند طالب علم اس کھیل میں بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ ایک وقت میں علی گڑھ کرکٹ ٹیم کی بہت دھاک تھی۔ جب ہماری کرکٹ الیون دوسرے مقامات پر کھیلنے کے لیے جاتی تھی، تو دور دور کے آدمی کھیل دیکھنے آجایا کرتے تھے۔ مسٹر بیک پرنسپل کو ہماری کریکٹ الیون سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اور بعض وقت اس کے ممبروں کی فروگذاشتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے تھے اور اگر کسی سے سخت لغزش ہو جائے تو معاف بھی کر دیتے تھے۔ ان دنوں پرنس رنجیت سنگھ جو بعد میں جام نگر کے مہاراجہ ہوئے انگلستان میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے اور انھوں نے اس کھیل میں ید طولیٰ (یعنی بڑی کامیابی) حاصل کیا تھا اور انگریز ان کے کرکٹ کے اس قدر مداح تھے کہ بعض شاعروں نے انگریزی میں ان کے قصیدے لکھے تھے۔ ان مہاراجہ صاحب کو رنجی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور اب بھی ان کے نام سے بعض انعامات کرکٹ کھیلنے والوں کو دیے جاتے ہیں۔ مسٹر بیک نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں کہا کہ انگلستان میں اس وقت دو ہندوستانی الگ الگ کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو دادا بھائی نوروجی جو ہندوستان کے سیاسی معاملات میں انگریز قوم پر اثر ڈال رہے ہیں۔ اور دوسرے رنجیت سنگھ جی ہیں جو کرکٹ کے میدان میں برٹش پبلک کو ہندوستان کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ہندوستان کا ایک ایک فرد ناموری حاصل کرنے کے قابل ہے۔ ان دونوں میں سے برٹش قوم پر رنجیت سنگھ کا زیادہ اثر ہے۔ یہ زمانہ جب انھوں نے تقریر فرمائی تھی ہماری علی گڑھ کرکٹ کا عروج کا زمانہ تھا۔

کرکٹ کے علاوہ فٹ بال ٹیم بھی بہت کامیابی کے ساتھ نام پیدا کر رہی تھی۔ فٹ بال کھیلنے کے لیے دوسری یونیورسٹیوں اور دوسرے کالجوں سے طالب علم آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رڑکی سے انگریز اور اینگلو انڈین لڑکے فٹ بال کھیلنے آئے انھوں نے یہاں پر آ کر فٹ بال کے میدان میں بہت شد و مد سے اپنا کھیل دکھایا اور کئی ہزار تماشائیوں کو بہت لطف آیا۔ لیکن ہمارے طلبا نے ان کو ہرا دیا۔ جب ہمارے طلبا ان کو دھکے دے کر گرا دیتے تھے تو مسلمان بیرے اور خانساماں جوان کے ساتھ رڑکی سے آئے تھے ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہو جاتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ ان فرعون فرنگیوں کو جو لوگ دھکے دے کر گراتے ہیں وہ ضرور ان سے زبردست ہیں۔ ہم تو رڑکی میں سمجھا کرتے تھے ان کے مقابلہ کا دنیا میں کوئی نہیں ہے لیکن آج ہم کو خوشی ہوئی کہ ہمارے مسلمان بھائی اس قابل ہیں کہ ان لوگوں کے غرور کو توڑیں یہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ ہم پیٹ کی خاطر ان کی نوکری کرتے ہیں لیکن یہ ہندوستانیوں کی بہت ہی بے قدری کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ گورا فوج کی ٹیم سے ہمارے طالب علموں کا علی گڑھ میں مقابلہ ہوا۔ ایک طالب علم کی ٹھوکر سے ایک گورے کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ کر چورا چورا ہوگئی۔ یہاں سے گورے اس کو اٹھا لے گئے اور کیمپ میں جا کر اس کی ٹانگ کٹی اور سنا کہ بعد میں اس کا انتقال بھی ہوگیا۔ ہماری ٹیم کی جو کچھ بھی تنظیم اور قوت تھی وہ سر تھیوڈور ماریسن کے ساتھ تھی۔ ان کے بعد طالب علم اب تک فٹ بال کھیلتے ہیں۔ لیکن ہماری ٹیم کی ویسی شہرت نہیں ہوئی جیسی کہ سر تھیوڈ ور ماریسن کے سامنے تھی۔

یونیورسٹی کلبوں میں سڈنس یونین کلب طالب علموں کے لیے بہت بڑی دلچسپی کا کلب تھا۔ اس میں ہفتہ وار بحث و مباحثہ اور تقریریں ہوتی تھیں۔ اور سال میں جس شخص کی تقریریں اور بحثیں سب سے زیادہ پسندیدہ ہوتی تھیں اس کو ایک میڈل ملا کرتا تھا۔ جس کو کیمبرج اسپیکنگ پرائز کہتے تھے۔ سب سے اول پرائز صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کو ملا تھا۔ صاحبزادہ صاحب بیرسٹری کے لیے ولایت چلے گئے تھے۔ وہ قریب قریب 1894 کے وہاں سے واپس آئے۔ اس دوران میں اور طالب علموں کو یہ میڈل ملتا رہا اور سب کے نام یونین کلب کی دیواروں اور تختوں پر

لکھے ہوئے ہیں۔1896 کا میڈل اس خاکسار کو ملا تھا۔

اب تک سالانہ میڈل برابر ملے چلے جاتے ہیں۔ طالب علم اس میڈل کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں اور اس میڈل کا حاصل کرنا ایک امتیاز اور فخر کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اس یونین کلب کی وجہ سے طالب علموں میں اختلاف بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے عہدہ داروں میں سب سے بڑا عہدہ وائس پریذیڈنٹ کا ہوتا تھا۔ کالج پرنسپل پہلے زمانے میں اور اب کچھ دن پہلے تک وائس چانسلر پریذیڈنٹ ہوتا تھا اور طالب علموں میں سے ایک وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کا انتخاب بڑے معرکہ کا ہوتا تھا۔ دو پارٹیاں ہو جاتی تھیں اور اپنے اپنے امیدوار کے لیے اس قسم کی کوشش کرتے تھے جیسے کہ کونسلوں کے چناؤ کے لیے لوگ کرتے ہیں۔ انتخاب کے دن سے تین چار دن پہلے سے طالب علم دن اور رات اسی مشغلہ میں لگے رہتے ہیں اور اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی بہبودی اور سیاست اور یونیورسٹی کی ترقی اور تنزلی ان کے اس چناؤ اور کامیابی پر مبنی ہے۔ اب سے کچھ قبل اس انتخاب نے ایک بدنما شکل پیدا کرلی ہے کہ جب ایک پارٹی کا امیدوار ہار جاتا ہے تو دوسری پارٹی ہارنے والے کا جنازہ نکالتی ہے۔ یہ نہایت ہی مذموم طریقہ ہے اور مجھے تعجب ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر یا بعد کے وائس چانسلر نے اس کو بند نہیں کیا۔ انتخاب خوشی کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ ماتمی رسوم ادا کرنے کے لیے۔ یونیورسٹی کے طلباء خود جب اس برائی کی مضرت محسوس کریں گے تو وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔

1946 میں اس یونین کے انتخاب کی وجہ سے یونیورسٹی میں سخت خلفشار اور ہنگامہ پیدا ہوا۔ طالب علموں نے وائس چانسلر کی وجہ سے جو دونوں پارٹیوں میں سے ایک کے حق میں مفید تھا یونیورسٹی میں اسٹرائک کر دیا اور کئی روز تک طالب علم اپنی کلاسوں میں نہیں آئے۔ شاید وائس چانسلر نے اپنے نزدیک واجبی حکم صادر کیا ہوگا۔ لیکن طالب علموں نے اس کو ایک پارٹی کی جانب داری پر محمول کیا اور ترک موالات پر آمادہ ہوگئے۔ بہر حال کام میں کچھ نہ کچھ خرابیاں ہوئی ہیں۔ گذشتہ طلبا نے یہ کلب ایک مفید ادارہ بنا دیا تھا اور یونیورسٹی کے طلبا کے لیے بطور وراثت کے چھوڑا ہے۔

ہمارے زمانے میں سرٹامس آرنلڈ اور شمس العلماء مولانا شبلی نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام اخوان الصفا تھا۔ اس انجمن کے ماہانہ جلسے ہوتے تھے اور ان میں علمی مضامین پڑھے جاتے تھے۔ اس انجمن کے ممبروں کی تعداد بہت قلیل تھی لیکن اپنے کام کی اہمیت کے لیے یہ بہت ہی مفید جماعت تھی۔ ممبروں کو تاریخی اور علمی تحقیقات کا موقع ملتا تھا۔ بڑی محنت اور کاوش سے وہ پرانی کتابوں کا مطالعہ کر کے مفید واقفیت حاصل کرتے تھے اور اپنے مضامین سے بہت ہی کارآمد علمی واقفیت کا ذخیرہ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ انجمن بہت دنوں تک قائم نہ رہی اور اس کے بند ہو جانے کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ اس زمانے میں اس قسم کی علمی تحقیقات عام طور پر دلچسپی کا باعث نہیں رہی تھی۔ یورپ میں بھی ہزاروں تعلیم یافتہ اشخاص میں ایک آدھ ہی عالم ایسا نکل آتا ہے جو علمی اور تاریخی تحقیقات میں دلچسپی رکھتا ہو اور علمی معلومات کے مہیا کرنے میں اپنا وقت دیتا ہو۔

ہمارے کالج میں ٹینس کلب کچھ اچھی حالت میں نہیں تھا۔ جمناسٹک کی ورزشوں کے لیے کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اور نہ تیراکی کا تالاب تھا۔ ڈرل ضرور ہوتی تھی۔ لیکن ڈرل کے لیے کوئی کلب نہیں تھا۔ اس زمانہ میں یو۔ ٹی۔ سی کا بھی شعبہ نہیں تھا۔ غرض یہ کہ ہمارے زمانے میں جس قدر بورڈنگ کی زندگی تھی اس کی حالت ابتدائی منظروں سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی زندگی میں بہت دلچسپی کے سامان پیدا ہو گئے جو اس وقت بھی قائم ہیں۔ لیکن ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس زمانے کے طلبا میں جو خصوصیت اور انسیت کے تعلقات کالج سے و نیز آپس میں پیدا ہو جاتے تھے، اس قسم کے تعلقات طالب علموں کی افراط کی وجہ سے اب دیکھنے میں نہیں آتے۔

میری مضمون نگاری کی ابتدا

سرسید کی خدمت میں مجھ کو سب سے زیادہ حاضری کا موقع ملا کرتا تھا کیونکہ میں نے سرسید کی تصنیفات اور مضامین کا بہ کثرت مطالعہ کیا تھا اور مجھے مرحوم سے ایک دلی عقیدت ہو گئی تھی۔ سرسید بھی مجھ پر بہت مہربانی کرتے تھے اور کبھی کبھی کھانے پر بھی بلا لیا کرتے تھے۔ سرسید نے مجھ کو اخبارات میں مضامین لکھنے سکھائے اور اس کی ابتداء اس طور پر ہوئی کہ ایک شخص ایرانی

الفسل جن کا نام درردی تھا اور جو درردی اصفہانی کے نام سے مشہور تھے وہ کانگریس کے بہت گرویدہ
تھے اور سرسید کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کے مضامین فارسی میں ہوتے تھے اور میں
ان کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ ایک مرتبہ سرسید نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو اس مضمون کو پڑھو اور غور کرو کہ تم
اس کا کچھ جواب دے سکتے ہو یا نہیں۔ میں نے مضمون پڑھا اور عرض کیا کہ جو کچھ ارشاد ہو میں
لکھ دونگا۔ میں نوٹس لیے لیتا ہوں۔ موصوف نے مجھے چند باتیں بتائیں اور کہا کہ ان پر خاص
زور دینا۔ میں نے ان کو نوٹ کرلیا اور جا کر ایک مضمون لکھا اور تیسرے یا چوتھے روز جا کر پیش
کیا۔ اس میں بہت سی غلطیاں تھیں۔ مرحوم نے خود اپنے قلم سے درست کیں۔ میں نے وہ
مضمون صاف کر کے اخبار میں بھیج دیا۔ جب وہ مضمون شائع ہوا تو درردی اصفہانی صاحب نے
جواب الجواب لکھا اور کیونکہ وہ مجھ کو نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں، اس لیے انھوں نے تمہید
میں لکھا ''کہ مسٹر عبداللہ نمی دانم کہ ماسٹر ہستی یا متعلم ہستی یا'' اور اس کے بعد سرسید کی پولیٹیکل
پالیسی پر خوب حملے کیے۔ سرسیّد ان کو پڑھ کر خوب ہنسے اور فرمایا کہ ان کا جواب بہت کمزور ہے
اس وقت کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ جب مضمون لکھے گا اس وقت جواب دینا
لیکن نہ معلوم درردی صاحب پر کیا اثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے سرسیدؒ کے خلاف کوئی مضمون
نہیں لکھا۔ یہ میرا پہلا مضمون تھا اس کے بعد میں خود ہی اخبارات میں مضمون لکھنے لگا۔ سرسید
میرے مضامین پڑھ کر بعض وقت خوشنودی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی موضوع پر سرسید نے ایک مضمون لکھا اور مجھے ان کی رائے سے سخت
اختلاف تھا۔ میں نے اپنے نام سے تو موصوف کے مضمون کا جواب نہیں دیا بلکہ ایک گمنام خط ان
کے مضمون کے جواب میں لکھ دیا۔ اس کے بعد سرسید نے اخبار میں لکھا کہ کسی دوست نے میرے
مضمون کا جواب لکھا ہے لیکن اس کی وجہ معلوم نہیں ہوئی کہ انھوں نے اپنا نام کیوں نہیں لکھا۔ ہم کو
اس مضمون میں راستی اور معقولیت معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنے دل میں بہت خوش ہوا کہ میرے
مضمون کی بہت قدر ہوئی اور اگر سرسید سے جا کر اقرار کرلوں گا کہ وہ خط میں نے لکھا تھا تو وہ مجھ
سے خوش ہوں گے۔ چنانچہ میں نے جا کر عرض کیا کہ وہ مضمون میں نے لکھا تھا اپنا نام میں نے اس
لیے نہیں لکھا کہ یہ بات میری گستاخی سمجھی جائے گی کہ میں حضور والا کے مضامین سے اختلاف کرتا

ہوں ۔فرمایا کہ اچھا تم نے یہ گم نام خط لکھا تھا یہ سخت بداخلاقی میں شامل ہے کہ گم نام خط لکھے جائیں ۔ابھی اسی وقت تہیہ کرو کہ آئندہ گم نام مضامین نہیں لکھو گے۔ میں نے توبہ کرلی اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی گم نام مضمون نہیں لکھوں گا اور میں نے آج تک اس عہد کی پاس داری کی ہے اور کبھی گم نام مضامین اخبارات میں نہیں بھیجے۔

سرسید کا معمول زندگی

سرسید صبح چار بجے اٹھ جاتے تھے اوران کے پلنگ کے پاس جو میز رکھی رہتی تھی اس پر ایک موم بتی جلا کر رکھ دیتے تھے اوراس کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے یا مضامین لکھا کرتے تھے۔جاڑوں میں دو گھنٹہ اس شغل میں صرف کرتے تھے۔اس کے بعد اٹھ کر غسل خانہ جایا کرتے تھے اور ضروریات سے فراغت پانے کے بعد چائے نوش فرماتے تھے اور پھر ایک بڑی میز کے پاس بیٹھ جاتے تھے جہاں گدے لگے ہوئے تھے۔اس پر بیٹھ کر تصنیف کا کام شروع کر دیتے تھے۔اسی دوران میں ڈاک آجایا کرتی تھی تو سب کام چھوڑ کر ڈاک کی طرف توجہ کرتے تھے اور انگریزی خواں بابو کو گورنمنٹ یا افسران گورنمنٹ کے نام خطوط لکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔اور گورنمنٹ کے پاس انگریزی میں جو خطوط بھیجے جاتے تھے وہ کسی انگریز پروفیسر کو اور بالخصوص مسٹر بیک پرنسپل کالج کو ضرور دکھائے جاتے تھے اور بعض خط و کتابت جو بہت اہم ہوتی تھی اس کا مسودہ مسٹر بیک سے ہی بنواتے تھے۔روپیہ جو آتا تھا تو بابو شیام بہاری لال سکریٹری کی معرفت بینک آف بنگال شاخ آگرہ میں جمع کروانے کو بھجواتے تھے۔بینک آف بنگال تو ختم ہو گیا اور اس کی جگہ امپیریل بینک آف انڈیا کو اسٹیٹ بینک آف انڈیا کر دیا ہے۔

انگریزی داں اور دو کایستھ ملازم تھے جو معمولی انگریزی کا کام کیا کرتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کی فیس وصول کرنے کا انتظام اچھا نہیں تھا۔بورڈنگ ہاؤس کی فیس سرسید کے ہاتھ میں نہیں آتی تھی اور نہ اس زمانے میں کوئی ٹریزرر مقرر تھا۔بورڈنگ ہاؤس کی فیس سعید احمد ساکن کاندھلہ، ضلع مظفر نگر وصول کرتے تھے۔وہ مولویوں کے خاندان کے لوگ مولوی اکبر وغیرہ سرسید کے دوستوں میں سے تھے۔اس لیے منشی سعید احمد ایک معتبر آدمی سمجھے جاتے تھے اور بورڈنگ ہاؤس کا کل روپیہ ان ہی کے ہاتھ میں آتا تھا۔طالب علموں کا حساب وہی کرتے تھے۔

میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ نہ وہ لائق تھے اور نہ وہ معتبر تھے۔ان کے زمانہ میں حسابات میں بہت گڑ بڑ رہتی تھی۔ان کے پاس کوئی باقاعدہ حساب کا رجسٹر یا کھاتہ نہیں تھا۔سادہ کاغذوں کی ایک جلد بنا رکھی تھی اور جب کوئی طالب علم روپیہ لے کر آتا تھا تو جہاں کہیں خالی جگہ یا خالی صفحہ ملا اس پر لکھ دیا اور یاد نہ رہا تو پھر دوبارہ مانگا۔جب کہا گیا کہ آپ نے لے لیا تھا اور درج بھی کر لیا تھا تو وہ اپنی کتاب کھول کر ڈھونڈھنے بیٹھ جاتے تھے اور بعض وقت دو دو گھنٹہ صرف کر کے ایک اندراج کہیں ملتا تھا۔رسید کسی کو نہیں دیتے تھے۔بعض طالب علم شکایت کرتے رہ جاتے تھے کہ ہم نے تو روپیہ دے دیا اور منشی سعید احمد نے نہ اس کا اندراج کہیں کیا اور نہ وہ اب تسلیم کرتے ہیں کہ روپیہ ہم نے لیا ہے۔لیکن ایسے واقعات کم ہوتے تھے۔زیادہ تر اندراج ڈھونڈھنے سے مل جاتے تھے اور بعض طالب علم منشی سعید احمد پر تہمت بھی لگایا کرتے تھے کہ منشی سعید احمد روپیہ لے لیتا ہے اور کھا جاتا ہے۔میرے خیال میں طالب علموں کو اس بات کی جرأت اس سے ہوتی تھی کہ منشی سعید احمد کا حساب ٹھیک نہیں تھا اس لیے ان کو موقع مل جاتا تھا کہ وہ منشی سعید احمد پر الزام لگائیں۔

بابو شیام بہاری لال کے تغلّب کا واقعہ

سرسید کے پاس علاوہ بابو شیام بہاری لال کے جنھوں نے بہت بڑا تغلب کیا دو اور کایستھ کلرکی کا کام کرتے تھے۔بابو شیام بہاری لال نے ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ سرسید کے جعلی دستخط بنا بنا کر بینک سے وصول کیے۔شیام بہاری لال نے سرسید کے دستخط کی نقل کرنے میں اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ خود سرسیدؒ کو بعض وقت دھوکا ہوتا تھا کہ آیا یہ میرے اصلی دستخط ہیں یا کسی نے نقل کی ہے۔بابو شیام بہاری لال علی گڑھ کے رہنے والے تھے اور بڑے مزاج اور عیاش آدمی تھے۔سرسیدؒ پر یہ رعب جما رکھا تھا کہ وہ گھر کے بڑے رئیس ہیں کیونکہ ان کے بعض رشتہ داروں کے پاس زمینداریاں تھیں اور مکانات تھے۔بابو شیام بہاری لال انگریزی میں چیک لکھ کر سرسید کے دستخط کرا کے بینک میں پیش کرتے تھے اور روپیہ وصول کرتے تھے جو کالج کے خرچ میں آتا تھا لیکن علاوہ معمولی ماہانہ خرچ کے وہ جعلی چیک بنا بنا کر بھی روپیہ وصول کرتے تھے۔

سرسید نے کالج کے کچھ روپے سے گورنمنٹ کے پرومیسری نوٹ خرید کر بنک میں امانت رکھ دیے تھے اور بنک ہی ان کا سود وصول کرتا تھا۔شیام بہاری لال نے امانت کا روپیہ جو

نقدی کی صورت میں بینک میں تھا وہ وصول کیا اور علاوہ اس کے کالج کے کیپٹل فنڈ کے پرومیسری نوٹ جو بنک کی سپردگی میں تھے ان کے بارے میں یہ کارروائی کی کہ ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جلسے کی کارروائی جعلی بنا کر اس میں بینک کو لکھوایا کہ کیپٹل فنڈ کی ضمانت پر کالج کی ضرورتوں کے لیے روپیہ دیا جائے۔ چنانچہ اس طریقہ سے نقدی کے پرومیسری نوٹوں کی کفالت پر بہت سارو پیہ بینک سے نکال لیا اور یہ کل روپیہ اس نے عیاشی میں صرف کیا۔ سرسیدؒ کو آخر تک مطلق خبر نہ ہوئی کہ ان کا معتمد سکریٹری یہ جعل کھیل رہا ہے۔ چنانچہ 1893 میں شیام بہاری لال پر فالج گرا۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس شخص نے فالج گرنے سے قبل کالج کا روپیہ خرد برد کرلیا۔ اس کی تحقیقات ہونی چاہیے۔ سرسید کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو ان کو یقین نہیں آیا اور اپنی فٹن میں بیٹھ کر شیام بہاری لال کے مکان پر پہنچے اور اس کو تسلی دی کہ تم بیمار ہو تم کو یہ سن کر صدمہ ہوگا کہ لوگ کہتے ہیں تم نے کالج کا روپیہ غبن کیا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آیا اور میں تم کو یقین دلانے آیا ہوں کہ جب تک تم تندرست نہ ہو جاؤ کوئی تحقیقات نہیں ہوگی۔ مجھے تم پر اب بھی ایسا ہی اعتماد ہے جیسا کہ پہلے تھا۔

شیام بہاری لال نے رو رو کر اور گڑگڑا کر سرسید کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سرکار کا نمک خوار ہوں مجھ پر اگر سرکار کا اعتماد ہے تو مجھے امید ہے کہ میری کوئی خطا ثابت نہ ہوگی اور سرکار کا اعتماد بدستور قائم رہے گا۔ سرسیدؒ واپس چلے آئے لیکن لوگوں نے کہا کہ تحقیقات کیجیے یا نہ کیجیے لیکن دیکھیے تو سہی کہ کیا حال ہے۔ اس روز نامچے، ڈاک بہی، چیک بک کے مثنے نکلوا کر دیکھے گئے تو شیام بہاری لال کی بد دیانتیوں کا راز پورے طور پر کھل گیا۔ بینک سے خط و کتابت کر کے حالات دریافت کرنے پر یقین ہو گیا کہ واقعی شیام لال نے بہت سارو پیہ غبن کرلیا ہے۔ سرسید مجبور ہوئے تو خود کچہری میں جا کر جوائنٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں شیام بہاری لال کے خلاف استغاثہ دائر کیا۔ شیام بہاری لال گرفتار ہو کر عدالت میں آئے۔ بیمار تھے لیکن ہوش و حواس بالکل درست تھے۔ حوالات میں دیدیے گئے۔ مقدمہ کی چند پیشیاں بھی ہوئیں۔ سرسیدؒ کے اظہار بھی قلم بند ہوئے۔ مسٹر بیک پرنسپل کالج بطور ماہرِ فنِ تحریر سرسیدؒ کے دستخط شناخت کرنے کے لیے پیش ہوئے۔ انھوں نے جعلی اور اصلی دستخطوں کے شناخت کرنے میں بہت سا وقت دیا چونکہ جعلی دستخطوں اور اصلی دستخطوں میں تمیز کرنا نہایت دشوار معلوم ہوتا تھا۔ لیکن آخر جعلی چیز جعلی ہوتی ہے۔

مسٹر بیک نے جعلی دستخطوں کے چیک الگ الگ کر کے دکھائے۔ ابھی مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ شیام بہاری لال کا حوالات ہی میں انتقال ہو گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس نے کچھ کھا لیا ہے۔ بعض سر سیدؒ کے مخالفین نے یہاں تک گل افشانیاں کیں اور کہنا شروع کیا کہ شیام بہاری لال کا تو نام بدنام ہے، سر سیدؒ نے خود روپیہ وصول کر لیا ہے اور شیام بہاری لال کا نام لگا دیا ہے۔ ایسے لوگ صرف دو تین ہی تھے۔ باقی لوگوں نے ان کے بیان کو کچھ وقعت نہیں دی اور ان کو جھوٹا سمجھا۔ سر سید نے خود خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی زندگی میں شیام بہاری لال کے غبن کا راز کھل گیا ورنہ ان کے بعد ان کے مخالفین ان ہی پر الزام لگاتے کہ انھوں نے ہی روپیہ خُرد بُرد کر لیا ہے۔ سر سید مرحوم کو اس تغلّب کا بہت رنج تھا۔ اور اس وقت لوگوں کو خیال یہ تھا کہ اس صدمہ نے ان کی زندگی میں بہت کمی کر دی اور اگر یہ نہ ہوتا تو دو چار سال تک اور زندہ رہتے۔

شیام بہاری لال کے مذکورہ بالا واقعہ کے بعد کالج کے حسابات کا مسٹر بیک پرنسپل اور ٹرسٹیوں نے علاحدہ انتظام کر دیا۔ مسٹر بیک خزانچی قرار پائے۔ حسابات ڈبل اینٹری کے طریق پر رکھنے کا انتظام ہوا۔ ایک بنگالی بابو جو گورنمنٹ کے حسابات کے محکمہ میں ملازم رہ چکے تھے اور اب پینشن یافتہ تھے، ان کو ملازم رکھا گیا۔ سید عبدالباقی صاحب جو ہائی اسکول میں ماسٹر تھے ان کو بنگالی بابو کی ماتحتی میں واسطے ترتیب حساب کے رکھ دیا گیا اور خدا کا شکر ہے اس کے بعد سے کالج اور یونیورسٹی کے روپے میں ایک پیسے کا تغلّب اور تصرّف نہیں ہوا۔ ٹرسٹیوں نے ٹھوکر کھا کر حسابات کے معاملہ کو صحیح راستے پر ڈال دیا اور اس وقت تک اسی راستے اور اسی انتظام سے حسابات اور روپیہ کی حفاظت کا کام چل رہا ہے۔

سر سید کی روز مرّہ کی معمول زندگی پر جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں اس میں شیام بہاری لال کے تغلّب کا واقعہ بطور جملہ معترضہ کے آ گیا اور آگے بھی بہت سے واقعات ایسے آئیں گے جو سلسلے سے ہٹے ہوئے معلوم ہوں گے لیکن ان کا تعلق سر سید کی زندگی کے واقعات ہی سے ہو گا۔

سر سید کے احباب

سر سید کے دن کے کھانے میں اکثر ان کے احباب شریک ہو جاتے تھے جیسے محسن الملک، خان بہادر سید زین العابدین خاں وغیرہ۔ ان کے یہاں مہمان داری بھی رہتی تھی۔ پنجاب یا حیدر

آباد سے جولوگ سرسیدؒ سے ملنے آتے تھے وہ ان ہی کے مکان پر ٹھہرتے تھے۔ان کے یہاں کھانا کسی بھی اہتمام سے تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک شخص کو دوسو روپیہ ماہوار پر ٹھیکہ دے رکھا تھا کہ وہ ان کا اور مہمانوں کا کھانا مہیا کرے۔ یہ ٹھیکہ کا طریقہ اس وقت تک رہا جب تک کہ سید محمود الہ آباد سے ججی چھوڑ کر علی گڑھ نہیں آئے۔تب سید محمود بیگم بہت منتظم خاتون تھیں۔انھیں کسی ٹھیکیدار سے کھانا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔سرسید کی ذاتی آمدنی تو بہت قلیل تھی۔ان کو چار سو روپیہ تو پنشن ملتی تھی اور دوسو روپیہ غدر 1857 کی خیر خواہی میں انعام کے ملتے تھے۔وہ چار سو روپیہ تو اپنے خرچ کے لیے رکھ لیتے تھے اور دوسو روپیہ ماہانہ اپنے مرحوم بیٹے حامد کی بیوہ کو دیتے تھے۔سید محمود نے ججی ہی کے زمانے میں ایک کوٹھی کے خریدنے سے قبل سرسیدؒ جیل خانہ کے قریب اس مکان میں رہتے تھے جس کو اب سمیع منزل کہتے ہیں اور جس کے مالک مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم تھے۔اس کوٹھی کے خریدنے کے بعد سرسیدؒ اس کوٹھی میں آگئے جو انگلش ہاؤس کہلاتی ہے۔سرسیدؒ کی نسبت لوگوں سے یہ بھی سنا کہ اگر مہینہ کے آخر میں اپنی قلیل رقم میں سے کچھ بچ جاتا تھا تو وہ کالج کے فنڈ میں دے دیتے تھے۔مجھ کو اس کا ذاتی طور سے علم نہیں ہے۔

سرسید دن کا کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتے تھے اور پھر تصنیف و تالیف کی میز پر بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت شمس العلما مولانا شبلی اور مولوی وحید الدین سلیم اور چند دیگر بزرگوں کو بھی سرسید کی تصنیف کی میز کے گرد بیٹھا میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا۔سرسید اکثر مسائل پر اپنے احباب سے جو اس وقت موجود ہوتے تھے بعض وقت بحث بھی کیا کرتے تھے اور ان کی رائے بھی طلب کرتے تھے۔ایک موقع پر وہ لکھتے لکھتے قلم چھوڑ کر بیٹھ گئے اور مسلمانوں کی تجارت کے متعلق کچھ واقعات بیان کرنے شروع کیے۔فرمایا کہ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں نے جو کچھ حاصل کیا تجارت سے حاصل کیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تجارت پیشہ تھے اور ان کے صحابہ میں اکثر تجارت پیشہ تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ میں پہنچے تو سب مہاجرین کی مالی حالت نہایت ہی زبوں تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں انصار مدینہ کو کفالت کی ترغیب دی تھی اور مدینہ کے مسلمانوں نے خوشی سے مہاجرین کی امداد کی اور بعد میں مہاجرین اپنے پرانے تجارتی تجربے کے باعث تجارت کرنے لگے اور بہت خوش حال

ہو گئے اور پھر ان کو انصار کی مدد کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ بعض بعض مہاجرین صحابہ دولت مندوں میں شمار ہونے لگے پھر یہ بھی فرمایا کہ ہندوستان، ملایا، جاوا، اور برما ولنکا اور چین کے ملکوں میں ابتدا میں مسلمان تجارت ہی کے سلسلے میں پہنچے تھے اور اکثر نے ان ممالک میں جا کر تجارت کی منڈیاں ایسی گرم کیں کہ ہر جگہ ان کی دولت مندی اور تجارت کی ایسی دھاک ہو گئی جیسی کہ آج کل انگریزوں اور فرانسیسی لوگوں کی دھاک ہے۔

سرسید نے فرمایا کہ اب مسلمان اس وقت ہندوستان میں تجارت تو کرتے ہیں لیکن بے قاعدہ، زمانہ کے ساتھ نہیں چل رہے ہیں۔ اب زمانہ چاہتا ہے کہ سب مل کر سرمایہ جمع کریں اور اونچے درجے کی تجارت کریں جیسی کہ یورپ کے لوگ کرتے ہیں۔ مدینہ منورہ اور مکہ شریف کے عرب قریب قریب اسی طریقہ کی تجارت کرتے تھے جیسی کہ اس وقت یورپ کر رہا ہے۔ عرب کی تجارت بجز اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ شام اور مصر وغیرہ سے غلّہ لاتے تھے اور اس کے عوض میں عرب کے ریگستانوں میں جو چیزیں پیدا ہوتی تھیں وہ وہاں جا کر بیچ آتے تھے۔ گو یہ محدود اور چھوٹی تجارت تھی لیکن وہ اس کو بھی انتظام سے کرتے تھے۔ سب لوگ مل کر سرمایہ ایک جگہ جمع کر کے مصر اور شام کو قافلے بھیجتے تھے اور وہاں سے جو غلّہ آتا تھا اس کو سب حصہ رسدی سے تقسیم کر لیتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان کسی دوسرے سے شراکت میں کام کرنا نہیں چاہتے اور اگر اتفاق سے دو آدمیوں میں شرکت ہو بھی جائے تو شرکا میں سے ہر ایک کے دل میں ابتدا ہی سے یہ خیال رہتا ہے کہ کسی طریقہ سے میں اس شراکت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاؤں۔

اس موقع پر موصوف نے دو مولوی صاحبان کا ذکر کیا کہ انھوں نے سرمایہ جمع کر کے صحیح بخاری شریف چھپوانے کا انتظام کیا اور شرط یہ قرار پائی کہ جس قدر صرف ہوگا وہ آدھا آدھا اور کتاب کی بکری سے جو روپیہ آئے گا اس میں سے خرچ منہا کرنے کے بعد جو بچے گا وہ بھی آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ ان دونوں صاحبان میں ایک بہت سیدھے سادھے مولوی تھے، اور دوسرے صاحب چلتے ہوئے تھے جو اس کام میں سکریٹری مقرر ہوئے جب کتاب کی طباعت شروع ہوئی تو ان چلتے ہوئے مولوی صاحب نے جو سکریٹری بھی تھے اپنے ملنے والے لوگوں کو خطوط لکھے کہ ہم کتاب چھپوا رہے ہیں جو صاحب خریدنا چاہیں وہ اپنا نام درج کرا دیں کہ جب

کتاب چھپ کر تیار ہو تو پہلے خریداری میں ان کا حق رہے۔ اس طور پر ان کی کوشش سے بہت سے خریداروں کی فرمائشیں آ گئیں اور سیدھے سادے مولوی صاحب کو خبر بھی نہ ہونے دی کہ فرمائشیں منگوائی گئی ہیں۔ جب کتاب چھپ کر تیار ہو گئی تو چلتے ہوئے مولوی صاحب نے اکھاڑ پچھاڑ لگانی شروع کی اور آخر کو دونوں شرکا میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ چالاک مولوی صاحب نے دوسرے مولوی صاحب سے کہہ دیا کہ حضرت یہ دیکھیے کتاب چھپ کر تیار ہو گئی ہے اور یہ سب جلدیں آپ کے سامنے موجود ہیں کتابیں بانٹ لیجیے۔ آپ اپنی بیچ ڈالیے اور میں اپنی بیچ لوں گا۔ سیدھے سادے مولوی صاحب نے سمجھا کہ آدھے کا میں شریک ہوں آدھی کتابیں مجھے مل رہی ہیں۔ انھوں نے آدھی کتابیں تقسیم کر کے لے لیں۔ چلتے ہوئے مولوی صاحب نے ان خریداروں کے نام جن کی فرمائشیں آ چکی تھیں دوسرے ہی روز وی۔ پی کے ذریعہ کتابیں بھیجنی شروع کیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے حصہ کی سب کتابیں بیچ کر روپیہ حاصل کر لیا۔ دوسرے مولوی صاحب کتابیں لیے بیٹھے رہے کہ جب کوئی فرمائش آئے تو ہم کتابیں بھیجیں۔

سر سید نے فقط ایک ہی واقعہ کا ذکر کیا تھا کہ دو مسلمان عالموں میں شرکت ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا مگر مجھ کو اپنی وکالت کے زمانے میں جو تجربہ ہوا اور جو جو واقعات میرے سامنے آئے وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ میں بیسیوں واقعات اس ایک واقعہ کے اوپر اضافہ کر سکتا ہوں۔ مسلمانوں کی ایمان داری اور زمانۂ حال کی تجارتی قابلیت سے مجھ کو سخت مایوسیاں ہوئیں لیکن سر سیدؒ نے دو علماء کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس پر یہ مثل صادق آتی ہے۔ 'چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی' میں نے اپنے تجربہ میں بھی یہی دیکھا کہ جہاں کہیں علما کے معاملات کچہری میں آئے ان سے مخاصمین کا نامۂ اعمال بہت سیاہ اور گندہ پایا۔ دوسروں کو وعظ کرنا تو بہت آسان ہے کہ ایمان داری سے کام کرو لیکن واعظین کو اکثر ان اصولوں کا پابند نہیں دیکھا کہ جن کا وہ اپنے وعظوں میں ذکر کرتے ہیں۔

سر سید نے فرمایا کہ جو لوگ تجارت میں اور معاملات میں ایمان داری کا وعظ کیا کرتے ہیں ان کی جب یہ حالت ہے تو دوسروں کی کیا حالت ہوگی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم کو تجارتی معاملات میں علما کی تقلید ہرگز نہیں کرنی چاہیے اور زمانہ کی روش کو دیکھتے ہوئے ہم کو وہ طریقہ اختیار کرنے چاہییں جو اہل یورپ نے اختیار کر رکھے ہیں۔ اہل یورپ کوئی فرشتے تو نہیں ہیں

ان میں بھی بد دیانتی کی مثالیں بہت ملیں گی لیکن جو باتیں مسلمان بھائیوں کو سوجھتی ہیں وہ ان کے فرشتوں کو بھی نہیں سوجھتی ہوں گی۔ مسلمان جب تک ایمانداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام کے معاملات دیانت داری کی تقلید نہیں کریں گے اور اس تقلید کے ساتھ تجارت کے ان طریقوں کو اختیار نہیں کریں گے جو اہل یورپ کے صدیوں کے تجربے کے بعد مفید اور کار آمد معلوم ہوئے ہیں اس وقت تک وہ تجارت میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اور موقعوں پر بھی سر سید نے مسلمانوں کی تجارت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ مسلمانوں کو تجارت کرنا چاہیے۔

میں تجارت کے بارے میں جو کچھ رائے رکھتا ہوں اس کو کسی موقع پر الگ بطور اپنی رائے کے ان ہی اوراق میں زیادہ واضح طور پر لکھوں گا۔

سر سید کی طبیعت میں اس قسم کا مذاق بھی تھا جو ہمارے ملک کے پرانے رؤسا کی محفلوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس زمانے میں اکثر لوگوں میں پایا جاتا تھا۔ سر سید کی محفل میں روزانہ حاضر باش جو لوگ دکھائی دیتے تھے ان میں بجنور کے ایک صاحب محمد سعید خاں نامی بھی تھے جن کو عمارات کی نگرانی کے لیے ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ سر سیدؒ ہی کی وجہ سے بجنور سے آ کر علی گڑھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ کچی بارک کے ایک کونے میں جو مکان بنے ہوئے تھے ان میں سے ایک مکان میں سر سید نے ان کو رہنے کے لیے جگہ دے دی تھی۔ وہ صاحب واقعی اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ولی کہلانے کے قابل تھے۔ ان کو لوگ بہت چھیڑا کرتے تھے، اکثر وہ خاموش رہتے تھے لیکن کبھی کبھی چڑ بھی جاتے تھے۔ ان کو عمارت کی نگرانی کرنے کی وجہ سے لوگ گڑ کپتان کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایک موقع پر سر سید کی محفل میں کسی نے کہا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت پٹھانوں کے ہاتھ سے ہوئی تھی۔ اس الزام کو گڑ کپتان صاحب برداشت نہیں کر سکے اور بڑے زور زور سے کہنا شروع کیا کہ پٹھانوں پر سخت بہتان ہے اور الزام ہے۔ پٹھانوں نے ہرگز امام حسین علیہ السلام کو شہید نہیں کیا۔ نواب محسن الملک مرحوم بھی اس وقت موجود تھے۔ انھوں نے بھی درمیان میں لقمے دینے شروع کیے کہ یہ بات تو کتابوں میں لکھی گئی ہوگی اس سے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ گڑ کپتان صاحب نے ایسی کتاب لکھنے والے کو مغلظات سنائیں۔ وہ چڑتے جاتے تھے اور لوگ قہقہے لگائے جاتے تھے۔ گڑ کپتان صاحب نے سر سید سے مخاطب ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر کہا

کہ سرکار یہ بھی کوئی بات ہے کہ جھوٹے الزام پٹھانوں پر لگائے جاتے ہیں اور سرکار کے دربار میں لوگ پٹھان قوم کو بدنام کر رہے ہیں۔ نواب محسن الملک مرحوم نے کہا کہ اس واقعہ کی تحقیقات ہونی چاہیے کہ کیا واقعی امام حسین علیہ السلام کو پٹھانوں نے شہید کیا یا نہیں کیا۔ کسی صاحب نے کہا کہ تحقیقاتی کمیٹی میں کوئی پٹھان نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات کو سن کر گڑ کپتان صاحب اور بھی برہم ہوئے اور کہا کہ پٹھانوں کو مار ڈالو۔ تم تو چاہتے ہو کہ اس قوم کا نام مٹ جائے۔ نواب محسن الملک مرحوم اس پر بہت ہنسے اور گڑ کپتان صاحب کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے کہا کہ مجھے بھی اس واقعہ کے سچا ہونے میں شبہ ہے۔ بھلا پٹھان کہاں اور کربلائے معلیٰ کہاں۔ اس پر گڑ کپتان صاحب خوش ہو گئے اور کہا جزاک اللہ آپ نے ایمان کی بات کہی ہے۔

ایک مرتبہ چودھری خوشی محمد صاحب جو ہمارے کالج کے طالب علم تھے اور مجھ سے دو سال سینیر تھے، وہ میری موجودگی میں سرسید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چودھری خوشی محمد صاحب گو کچھ بڑے جسیم آدمی تو نہیں تھے لیکن چھریرے بدن کے طویل القامت آدمی تھے۔ قریب قریب چھ فٹ کے ان کا قد تھا اور برخلاف اس کی سرسید کے ایک نجی ملازم الٰہی نامی کوئی ساڑھے چار فیٹ کے آدمی تھے۔ سرسید نے الٰہی ملازم کو آواز دی اور چودھری خوشی محمد سے کہا کہ اس غریب پر رحم کرو اور ایک ٹکڑا اپنے قد کا اس کو بخش دو تا کہ یہ بھی آدمیوں میں شمار ہونے لگے۔ جتنے لوگ وہاں بیٹھے تھے سب نے کہا کہ چودھری صاحب اگر ایسا کریں تو ایک انصاف کی بات ہوگی۔

ایک روز شام کے وقت میں حاضر ہوا تو الٰہی ملازم کو بلایا اور کہا کہ وہ فوٹو لاؤ جو آج آیا ہے۔ الٰہی جب وہ فوٹو لایا تو سرسید کا چھوٹا سا فوٹو دو گرہ کا تھا اور اس پر گز بھر کی داڑھی تھی۔ میں نے کہا لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ کہا کہ ہاں تم بھی لاحول پڑھتے ہو۔ میں نے اس فوٹو کے اوپر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا شیطان الرجیم۔ یہ فوٹو کسی شریر مولوی نے تیار کرا کر سرسید کے پاس بھیجا تھا اور سرسید نے اس کو رکھ لیا تھا جو آتا تھا اس کو دکھاتے تھے۔

خان بہادر سید زین العابدین خاں سے بہت زیادہ خلوص اور یگانگت کے تعلقات تھے۔ خان بہادر موصوف مچھلی شہر کے رہنے والے تھے اور سب ججی کے عہدہ سے پینشن پائی تھی، پینشن کے بعد وہ اپنے وطن میں مقیم نہیں ہوئے بلکہ سرسید کی دوستی کی وجہ سے علی گڑھ میں مقیم

ہوئے اور کالج کی ایک کوٹھی جو تار والے بنگلے کے نام سے اب مشہور ہے سر سید نے کرایہ پر ان کو دے دی تھی، جو سر سید کی کوٹھی سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ وہ اکثر اوقات سر سید کے دربار میں دکھائی دیتے تھے جن وکلا نے کبھی سید زین العابدین خاں صاحب کی عدالت میں وکالت کی تھی وہ ان کی دیانت داری کے بہت مداح تھے۔ وہ بہت بڑے محبت کے آدمی تھے۔ سر سیدؒ کا ان سے مذاق رہتا تھا۔

سر سید کا تعمیری شوق

سر سید روز سہ پہر کے بعد اور مغرب کی نماز کے قبل اپنی فٹن میں بیٹھ کر کالج میں پہنچ جاتے تھے۔ کالج میں ان دنوں اسٹریچی ہال کی عمارت بتدریج تیار ہو رہی تھی۔ اگر روپیہ ہوتا تھا تو مدد لگ جاتی تھی ورنہ کام بند ہو جاتا تھا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ معماروں کے پاس جا کر مونڈھے پر بیٹھ جاتے تھے اور ان کو ہدایت کرتے تھے کہ اینٹوں کے ردّے تم غلط لگا رہے ہو۔ اس طور پر لگاؤ۔ ایک روز بہت سے ردّے اکھڑ وا دیے کہ ان کو دوبارہ چنو۔

مولانا حالی ایک مرتبہ علی گڑھ آئے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ سر سید تو معماری کے کام کے بھی ماہر معلوم ہوتے ہیں اور اس واقعہ کا کہ انھوں نے اینٹوں کے ردّے اکھڑ وا دیے میں نے ذکر کیا۔ مولانا حالی مرحوم نے فرمایا کہ میں 1865 سے سر سید کی تعمیری قابلیت سے واقف ہوں۔ 1865 میں سر سید علی گڑھ میں سب جج تھے اور اس زمانے میں سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت تعمیر کرا رہے تھے۔ ان کا ہر روز کا معمول تھا کہ کچہری سے آنے کے بعد کھانا کھا کر اور چھتری لے کر عمارت کی جگہ پہنچ جاتے تھے اور گھنٹوں تعمیر کی نگرانی کرتے تھے اور معماروں کو ہدایت کرتے تھے۔ سر سید کو اچھی عمارت سے بہت شوق تھا چنانچہ تمام ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں وہ واحد شخص تھے جنھوں نے غدر 1857 سے پہلے پرانی دہلی کی عمارات کے حالات قلم بند کیے تھے اور اکثر پرانی عمارتوں کی در و دیوار کے فوٹو بھی لیے تھے اور اس کتاب کا نام "آثار الصنادید" رکھا تھا۔ اس کتاب کی بعد میں بہت قدر ہوئی اور وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر بھی بنائے گئے اور ان کو ڈاکٹر کا خطاب بھی ملا۔

اس کتاب کی ترتیب اور تصنیف کا حال وہ خود بیان فرمایا کرتے تھے کہ پرانی عمارات کی اوپر کی منزل کے کتبے کو دیکھنے اور ان کی نقل کرنے کے لیے میں چھینکوں میں بیٹھ کر اوپر پہنچتا

تھا اور وہاں پر کتبوں کی نقل کرتا تھا۔ قطب صاحب کے لاٹ کے کتبوں کی نقل کرنے میں ان کو بہت دشواری پیش آئی لیکن بعض کتبوں کی نقل خود کی اور بعض کی دوسروں سے کرائی ۔ یہ آثار الصنا دید ایسی کتاب ہے کہ آثار قدیمہ کے عالموں کو اس کی وجہ سے بعد میں مفصل حالات کے ترتیب دینے میں بہت مدد ملی تھی۔

مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد

سرسید نے جب علی گڑھ کالج میں مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو دہلی کی جامع مسجد کے چاروں طرف کی لمبائی اور چوڑائی ڈوریوں سے ناپ لی۔ پھر اس کے بعد ڈوری کو چوہرا کر لیا یعنی دہلی کی جامع مسجد کے نمونہ پر ایک چہارم اسکیل اور وسعت پر کالج کی مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ سرسید کے زمانے کی جس قدر عمارتیں کالج میں ہیں گو تعداد میں کم ہیں لیکن نہایت مضبوط اور اچھی ہیں۔ چونے کے لیے کنکر منگوا کر اسے پانی کے حوض میں ڈلوا دیتے تھے اور اس کے بعد جب مٹی چھوٹ جاتی تھی تو نکلوا کر بھٹی میں چونا پھکواتے تھے۔ اینٹیں جب تک کم از کم ایک دن کے لیے حوض میں بھیگنے کے لیے پڑی نہ رہتیں ان کو چنائی کے کام میں نہیں لاتے تھے۔

سرسید کے کالج کے پروفیسروں سے تعلقات

سرسید کے زمانے میں اسٹاف میں انگریز ہوتے تھے یا مولوی صاحبان۔ ہندوستان کے انگریزی خواں یا تو ملتے نہ ہوں گے یا اتنے قابل نہ ہوتے ہوں گے کہ ان کو بچوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیا جائے۔ اس لیے کالج کا کلاسوں کو پڑھانے کے لیے انگریز پروفیسر رکھے جاتے تھے۔ اگر ایک نوکری چھوڑ دیتا تھا تو ولایت کے اخباروں میں اشتہار دے کر دوسرے کو نوکر رکھ لیتے تھے۔ ریاضی کی تعلیم کے لیے البتہ کسی ہندو کو ملازم رکھتے تھے۔ مسلمان ریاضی داں اس زمانے میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتے تھے۔ جب کالج جاری ہوا تھا تو کسی ہندو کو ریاضی کی تعلیم کے لیے عارضی طور پر مقرر کیا۔ لیکن جب سرسید خود کلکتہ گئے تو بابو جادو چند صاحب چکرورتی کو جو ضلع باریسال بنگال کے رہنے والے تھے اپنے یہاں ریاضی کی تعلیم کے لیے بلا لائے ۔ بابو جادو چند چکرورتی وہی پروفیسر تھے جنھوں نے علی گڑھ کے زمانہ ملازمت میں سب اسکولوں کی تعلیم کے لیے ایک تو ارتھمیٹک لکھی جو تمام ہندوستان کے صوبہ جات میں مقبول ہوئی اور جس کی بدولت انھوں نے پانچ

لاکھ روپیہ کمایا اور ایک کتاب الجبرے پر لکھی جس کی اشاعت بہت کافی ہوئی لیکن ارتھمیٹک کے برابر نہیں ہوئی۔ بابو جادو چند چکرورتی کے ارتھمیٹک کے ایک حصے کا ترجمہ اردو میں خانصاحب میر ولایت حسین نے کیا تھا لیکن بابو جادو چند چکرورتی نے چار ہزار روپیہ دے کر اس کا حق تالیف خرید لیا۔ سید محمود مرحوم مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملامت کیا کرتے تھے کہ تم نے اپنی تصنیف و تالیف سے کبھی ایک پیسہ بھی نہ کمایا لیکن بابو جادو چند چکرورتی صاحب نے لاکھوں روپیہ کما لیا۔

انگریز پروفیسروں سے سرسیدؒ کا محبت اور یگانگت کا برتاؤ تھا اور وہ بھی سرسیدؒ کے گرویدہ تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ سر تھیوڈور ماریسن کو اپنے قریب اور سامنے بیٹھا کر اپنے ہاتھ سے مٹھائی ان کے منہ میں دیتے جاتے تھے۔ مسٹر بیک تو ان کی تعریف میں ہر وقت رطب اللسان رہتے تھے۔

مسٹر ٹامس آرنلڈ ایک بڑے عالم اور محقق آدمی تھے۔ سر تھیوڈور ماریسن نے بھی کتابیں تصنیف کی تھیں لیکن سر ٹامس آرنلڈ نے ''پریچنگ آف اسلام'' ایک ایسی کتاب تصنیف کی کہ تمام دنیا میں اس کی شہرت ہوگئی اور اس وقت تک ایک بڑی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اور دوسرے مصنف اکثر اپنی تصنیفوں میں اس کے حوالے دیتے ہیں۔

مولانا شبلی کا ذکر

ہمارے مسلمان اسٹاف میں تین بڑے عالم تھے اور تینوں اپنے اپنے فن میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ ان میں ایک تو مولوی خلیل احمد صاحب تھے جو عربی زبان کے بڑے عالم تھے اور جو طالب علم پرائیویٹ طور پر عربی میں ایم۔اے کا امتحان دینا چاہتے تھے وہ ان سے مدد لیا کرتے تھے اور عام طور پر مشہور تھا کہ ان کی تعلیم سے جس کو فیض پہنچ گیا وہ عربی کے امتحان میں کبھی ناکامیاب نہیں رہتا۔ لیکن مولوی صاحب موصوف نے کوئی کتاب میرے علم میں تصنیف نہیں کی۔ دوسرے مولانا عباس حسین صاحب اثناءعشری شیعہ مذہب کے تھے وہ بھی بڑے عالم تھے لیکن انھوں نے بھی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ تیسرے مولانا شبلی صاحب تھے جنھوں نے متعدد کتابیں اردو زبان میں بڑی تحقیقات اور انتظام سے لکھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی کتاب سیرت ہے یعنی حیات آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم ''بانی مذہب اسلام'' کی سیرت پر جو انھوں نے کتاب لکھی وہ علی گڑھ

سے جانے کے بعد لکھی۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے وہ فقط دو جلد لکھنے پائے تھے کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے اس تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا اور صحابۂ کرام اور خلفائے راشدین کے حالات بھی لکھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ کل مجموعہ کئی جلدوں میں ختم ہوا اور یہ مجموعہ مسلمانوں میں بہت ہی مقبول عام ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے اور بھی اچھی اچھی کتابیں لکھیں لیکن وہ سب عرب کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے واقعات کے متعلق چھوٹے چھوٹے مضامین ہمیشہ لکھتے رہے تھے۔ الفاروق ان کی کتاب بہت مستند ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کی تصنیفات دیکھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی گڑھ نے بھی سرسید علیہ الرحمۃ کے بعد ایک ایسا مصنف پیدا کیا تھا جن کا شمار مصنفین کے گروہ میں صف اوّل میں رکھنے کے قابل ہے۔

مولانا شبلی مرحوم مغفور میں قابلیت تو بہت تھی لیکن ان کی قابلیت میں روح پھونکنے والے سرسید احمد خاں مرحوم تھے۔ مولانا مرحوم سرسید کی کوٹھی کے قریب ایک چھوٹی سی بنگلیا میں رہا کرتے تھے اور اکثر میں نے ان کو سرسید کی محفل میں حاضر پایا۔ ایک مرتبہ میری موجودگی میں انھوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں قرآن شریف کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے فرمایا کہ ہمیں پوربی اردو میں کسی ترجمے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی وقت سید راس مسعود جن کی عمر سات آٹھ سال کی تھی وہ کھل کھلا کر ہنستے ہوئے باہر سے آئے اور کہا کہ ''ہم باہر کھیل رہے تھے اور درخت کے پیچھے چھپ گئے اماں سمجھیں ہم کھو گئے خوب چاروں طرف ڈھونڈیا پڑی ہم درخت کی آڑ سے نکل آئے تو اماں خوش ہو گئیں۔'' مولانا شبلی مرحوم نے کہا کہ مسعود ہم کو بھی اردو سکھا دو۔ راس مسعود نے پوچھا کہ آپ اردو نہیں بولتے تو کیا بولتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم تو پوربی اردو بولتے ہیں راس مسعود ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔

مولانا شبلی مرحوم نے ترکی کا سفر بھی کیا تھا۔ وہ یہاں سے نہر سوئز تک سر تھامس آرنلڈ کے ہم سفر رہے۔ سر تھامس آرنلڈ انگلستان جا رہے تھے اور جہاز میں ان کے ہم سفر ہونے کے خیال سے مولانا نے بھی ٹرکی جانے کا قصد کر لیا۔ مولانا نے واپس آنے کے بعد فرمایا کہ ایک روز سخت طوفان آیا تو جہاز ڈگمگانے لگا اور اہل جہاز پریشان دکھائی دینے لگے۔ میں آرنلڈ صاحب کے

پاس گیا کہ دیکھوں ان کی کیا حالت ہے۔ میں ان کے حجرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے اوران کے چہرے سے کسی قسم کا کوئی ہراس یا پریشانی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کہا کہ جہاز تو خطرے کی حالت میں ہے آپ کو ذرہ برابر بھی خیال نہیں اور آپ برابر کام کیے جاتے ہیں۔ جہاز میں سب لوگ سخت پریشان ہیں۔ آرنلڈ صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب کیا کسی پریشانی سے طوفان بند ہو جائے گا۔ اگر جہاز کو ڈوبنا ہی ہے تو کیا وہ ڈوبنے سے بچ جائے گا۔ اگر جہاز بچ گیا تو میرا یہ وقت پریشانی میں بیکار جاتا اور اگر اس کے مقدر میں ڈوبنا ہی ہے تو میں بھی ڈوب جاؤنگا۔ اور جو لوگ پریشان ہو رہے ہیں وہ بھی ڈوب جائیں گے۔ مولانا شبلی نے اس واقعہ کا ذکر ہم لوگوں سے کئی مرتبہ کیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جن کو سخت خطرے کے وقت بھی پریشانی نہ ہو۔ مولانا شبلی نے جہاز کے جس کمرے میں سفر کیا اس میں ان کو نیچے کی سیٹ ملی تھی اور ان کے اوپر جو سیٹ تھی وہ ایک انگریز کی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب وہ انگریز بد بخت اوپر سے اتر تا تھا تو مجھے ایک ٹھوکر لگا جاتا تھا۔ لیکن میں خاموش رہا اور برداشت کرتا رہا۔ اور جب میں ٹرکی میں پہنچا تو میں نے ایک انگریز کو دیکھا کہ وہ بھی ویسا ہی مظلوم صورت ہے جیسے کہ ہندوستان میں ہم لوگ ہیں میرے قریب سے گزرا میں نے قصداً بڑھ کر اس کو ایک دھکا دیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر خاموش ہو رہا۔ میں نے دل میں سمجھا کہ اس کے بھائی نے جو جہاز میں مجھے ٹھکرایا تھا یہ اس کا بدلہ ہے۔

مولانا شبلی جب ٹرکی سے واپس تشریف لائے تو سر سیدؒ ٹرسٹیوں اور ممبران اسٹاف اور طلبا نے ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ ہم طالب علموں نے ان کو ایک بڑا ڈنر دیا جس میں علاوہ اسٹاف کے علی گڑھ کے سب سر برآوردہ اشخاص کو مدعو کیا۔ مولانا نے فارسی میں ایک نظم پڑھی جس کا مقطع ''ہمانست کہ بود'' تھا یعنی جب میں آیا تو ہر چیز جیسی تھی ویسی ہی دیکھی۔ مولانا شبلی سر سید کی زندگی میں ملازمت سے علاحدگی چاہتے تھے لیکن مسٹر بیک نے سر سیدؒ سے کہا کہ مولانا موصوف ایک قابل مصنف آدمی ہیں۔ ایسے آدمیوں کا کالج میں رہنا بہت ضروری ہے آپ ان سے کہیے کہ یہ کالج سے علاحدگی نہ اختیار کریں۔ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے علاحدہ ہو کر تصنیف و تالیف کا کام کروں گا۔ ہمیں موقع دینا چاہیے کہ یہ تصنیف کا کام بھی کریں اور کالج

سے بھی تعلقات قائم رہیں۔ سر سیدؒ نے فرمایا کہ مجھے منظور ہے اور میں ان سے کہوں گا چنانچہ یہ تجویز ہوا کہ مولانا شبلی چھ ماہ کالج میں کام کیا کریں اور باقی چھ ماہ ان کو پوری تنخواہ پر رخصت مل جایا کرے۔ یہ مجھ کو یاد نہیں رہا کہ مولانا شبلی نے اس تجویز کو منظور کیا یا نہیں، یہ یاد ہے کہ سر سید کے انتقال سے کچھ پہلے یا کچھ بعد میں مولانا نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کالج کے اسٹاف میں کالج کے طلبا میں سے سب سے پہلے ڈاکٹر ضیاءالدین کو سر سید نے ریاضی کی تعلیم کے لیے ملازم رکھا تھا۔ غالباً 1896 میں ملازم ہوئے تھے اور چند سال کام کیا لیکن پھر وہ الٰہ آباد اور کلکتہ چلے گئے اور وہاں سے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے لندن چلے گئے اور وہاں سے ڈگری حاصل کر کے علی گڑھ واپس آ گئے اور 1947 یعنی اکیاون سال تک وہ مختلف عہدوں پر ملازم رہے۔ ان کا تعلق جس حیثیت سے کالج اور مسلم یونیورسٹی سے رہا ہے اس کا ذکر علاحدہ ان کے سوانح کے متعلق لکھا جائے گا۔ سر سیدؒ کے بعد سے اولڈ بوائز کالج کی ملازمت میں داخل ہونا شروع ہوئے اور 1947 میں نوے یا پچانوے فی صدی ممبران اسٹاف کالج یا یونیورسٹی کے تعلیم یافتوں میں سے ہیں۔

سر سید کا مذہب

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں شمس العلما ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی نے ایک لیکچر دیا اور اس میں مولانا موصوف نے ایک نظم پڑھی جس کے اوّل کے چند اشعار مجھے یاد ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

پھر آخر ہوا سال خورشید خاور	کہ ہو چکنے پر آیا ماہ دسمبر
لگا روز آہستہ آہستہ بڑھنے	بند ھا ہے ترقی تنزل کا چکر
ہم اپنی ان آنکھوں سے دیکھا کیے ہیں	ہلالوں کو بنتے ہوئے بدر انور
ہوئے ہیں بہت دانۂ بے حقیقت	بزور طبیعت درخت تناور
مسلمانوں پر صادق آئے تو جانیں	کہ یہ بھی ہے اک رسم دنیا مقرر

اس نظم میں ایک شعر تھا جو مسلمانوں کی طرف خطاب کر کے سر سید کے مذہب کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ وہ شعر یہ تھا:

پڑے کیا ہو سید کے مذہب کے پیچھے　　　سنو جی وہ کافر سہی بلکہ اکفر

پھر آگے چل کر مولویوں کا اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہ اس نیچری سید نے اسلام کی بالکل بیخ کنی کر دی ہے فرمایا:

وہ اس باغ کو کیسے کاٹے اجاڑے　　　کہ جو باغ ہے اس کا میراث مادر

ان اشاروں سے پتہ چلتا ہے کہ علماء کو اور ان کے مریدوں کو سرسید کے مذہب پر بہت سے اعتراضات تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید کافر ہو گئے ہیں اور ان کے خیالات کا اثر مسلمانوں پر اچھا نہیں پڑ رہا۔ علماء نے عام مسلمانوں کو سرسید کی ہر بات سے متنفر کر دیا تھا اور ان کی تعلیمی کوششوں کی بھی ان کی مذہبی خیالات کی وجہ سے مخالفت کرنا شروع کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ نیچری کے منہ سے نکلی ہوئی بات ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ مذکورہ بالا نظم میں مولانا نذیر احمد نے مسلمانوں کی اس غلط روش کی طرف ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ۔

کوئی بات ہو اس میں دیں گے اڑنگے　　　کوئی بات ہو اس میں مذہب کی پچڑ

شروع شروع میں جب سرسید نے تہذیب الاخلاق میں مسلمانوں کو صحیح اور سچے اسلام کی تلقین کرنی شروع کی اور لکھنا شروع کیا کہ جو مذہب ہمارے مولوی ہم کو سکھا رہے ہیں وہ قرآن کا مذہب نہیں ہے نام تو قرآن کا لیا جاتا ہے لیکن واعظین قرآن پاک کی تعلیم سے بہت ہٹ کر مسلمانوں کو دینی مسائل بتاتے ہیں تو ان کی تقریروں اور ان کے مضامین کو دیکھ کر مولوی صاحبان چراغ پا ہو گئے اور انھوں نے سرسیّد پر کفر کے فتوے جاری کرنے شروع کیے۔ بدایوں کے کوئی مولوی صاحب تھے جنھوں نے اپنے جوش میں یہاں تک تکلیف گوارا کی کہ حج کے ارادے سے مکہ شریف پہنچے لیکن ان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے علما سے سرسید کے خلاف کفر کے فتوؤں پر مہریں لگوا کر لائیں۔ ہندوستان کے علما مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے علما کی مہروں کو مثل آیات قرآنی اور احادیث کے سمجھتے تھے اور اکثر یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ جب کسی پر کفر کا فتویٰ لگانا ہوتا تھا وہ مکہ شریف اور مدینہ منورہ کے عالموں کی مہریں اس فتاویٰ پر لگوا کر منگواتے تھے اور لوگوں کو یقین دلاتے تھے کہ وہ شخص پکا کافر ہو گیا جبکہ عرب کے علما کی مہریں ان کے فتوے پر لگ گئیں اور یہ فتاویٰ عجیب طریقوں سے حاصل کیے جاتے

تھے،ان کے شروع میں یہ الفاظ ضرور ہوتے تھے۔

فتویٰ

کیا فرماتے ہیں علم دین مبین اس شخص کے بارے میں جو دینی احکام کا منکر ہو،فرشتوں کے وجود کا قائل نہ ہو نماز اور روزے کا پابند نہ ہو قرآن کی آیات کی تاویلیں یورپ کے سائنس کے مطابق کرتا ہو،انگریزوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا پیتا ہو،عربی تعلیم کا مخالف ہو اور انگریزی تعلیم کا حامی ہو وغیرہ وغیرہ۔اس سوال کا جواب بھی خود لکھ کر اپنی اور اپنے دوستوں کی مہریں لگواتے تھے اور دور دور کے عالموں اور مولویوں سے مہریں لگوا کر منگواتے تھے اور فتویٰ صرف یہ ہوتا تھا۔

نقل فتویٰ

حسب منشا قرآن پاک واحادیث شریف وروایات دینی بالاتفاق ایسا شخص کافر مطلق ہے اور اس کے ساتھ کھانا حرام ہے اور اس کی بیوی کو طلاق ہو جاتی ہے۔اس فتوے پر جتنی زیادہ مہریں ہوئی تھیں اس شخص کا کفر پکا ہو جاتا ہے۔جن کے خلاف فتویٰ دیا جاتا تھا۔

سرسید کے خلاف جو کہ فتویٰ تیار کیا گیا تھا اس پر کہا جاتا تھا کہ سات سو علما کی مہریں لگی تھیں۔ہمارے علما کے فتاووں میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے جا الزامات کسی پر لگاتے ہیں تو الزام کے ثبوت میں کوئی سند پیش نہیں کرتے اور نہ اس شخص کی کوئی تحریر یا تقریر کا کوئی خلاصہ تحریر کرتے ہیں جس کے خلاف وہ فتویٰ دیتے ہیں۔ایک شخص عداوت سے تعصب سے یا غلط فہمی سے کسی کے خلاف فتویٰ تیار کرنا شروع کرتا ہے تو دوسرے صاحبوں کو جو اس کے فتوے پر مہریں لگاتے ہیں لازم ہے کہ وہ کوئی سند بھی طلب کیا کریں اور فقط فتویٰ تیار کرنے والے کے الفاظ ہی پر آنکھیں بند کر کے مہریں لگانا شروع نہ کیا کریں۔مہریں لگانے والوں کو یہ تو دیکھنا چاہیے کہ فتوے کے تیار کرنے والے کی اصلی غرض کیا تھی اور اس کی چھان بین وتحقیقات ہونی چاہیے کہ واقعات جو بیان کیے گئے ہیں وہ کس شخص کے متعلق ہیں۔آیا اس کی تحریروں اور تقریروں سے اس کا کفر ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔فتوے تیار کرنے والے مولوی صاحب مہریں لگانے والوں کو اس شخص کا نام اور پتہ بھی نہیں بتاتے جس کے خلاف فتویٰ تیار کرتے ہیں۔کبھی کبھی کسی فتوے میں نام ظاہر کر دیتے ہیں

ورنہ اندھیری کوٹھری میں لٹھ چلوایا کرتے ہیں اور جب فتویٰ تیار ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ فلاں شخص پر چسپاں ہوتا ہے۔اس کا نام اور پتہ معلوم ہونے پر بھی وہ لوگ جنھوں نے فتوے پر مہر لگائی ہے کسی قسم کی کوئی تحقیق وتفتیش نہیں کرتے کہ آیا فتویٰ جن وجوہات سے لگایا گیا وہ سچ تھے یا نہیں۔ علماء کے فتوؤں کی حقیقت اس زمانے کے فہمیدہ اشخاص نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں اور تقریروں میں مسلمانوں کے سامنے پیش کی ہے۔سرسید اور نواب محسن الملک مرحوم سید مہدی علی نے اس مسئلہ پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔مولانا حالی مرحوم نے اپنی مسدس کے ایک بند میں اس فتاویٰ بازی کی مسموم عادت پر نہایت فصاحت سے حسب ذیل اشعار لکھے ہیں:

سدا اہل تحقیق سے دل میں بل ہے حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
فتاووں پہ بالکل مدار عمل ہے ہر ایک رائے قرآن کا نعم البدل ہے
کتاب اور سنت ہے نام باقی
خدا اور نبی سے نہیں کام باقی

جہاں مختلف ہوں روایات باہم کبھی ہوں نہ سیدھی روایت سے خوش ہم
جسے عقل رکھے نہ ہرگز مسلم اسے روایت سے سمجھیں مقدم
سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں
سمجھ پر ہماری یہ پتھر پڑے ہیں

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

آگے چل کر مولانا حالی مرحوم مغفور فرماتے ہیں۔

ہمیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی
مخالف کی ریس اس میں کرنی بری ہے نشاں غیرت دیں حق کا یہی ہے
نہ ٹھیک اس کی ہرگز کوئی بات سمجھو
وہ دن کو کہے دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہ راست پر اس کا پاؤ تو تم سیدھے رستے سے کترا کے جاؤ
پڑیں اس میں جو نقص وہ اٹھاؤ لگیں جس قدر ٹھوکریں اس میں کھاؤ
جو نکلے جہاز اس کا بچ کے بھنور سے
تو تم ڈال دو ناؤ اندر بھنور کے

اگر مسخ ہو جائے صورت تمھاری بہائم میں مل جائے سیرت تمھاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمھاری سراسر بگڑ جائے حالت تمھاری
تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی
ہے اک جلوۂ نور ایمان یہ بھی

نہ اوضاع میں تم سے نسبت کسی کو نہ اخلاق میں تم پہ سبقت کسی کو
نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو نہ پیدا یہ پوشش یہ زینت کسی کو
تمھیں فضل ہر علم پر ملا ہے
تمھاری جہالت میں بھی ایک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بُری تم رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم
حمایت میں ہو جب کہ اسلام کی تم تو ہو ہر بدی اور گناہ سے بری تم
بدی سے نہیں مومنوں کو مضرت
تمھارے گناہ اور اوروں کی طاعت

مخالف کا اگر اپنے نام لیجے تو ذکر اس کا ذلت سے خواری سے کیجیے
کبھی بھول کر طرح اس میں نہ دیجے قیامت کو دیکھو گے اس کے نتیجے

گناہوں سے ہوتے ہو گویا مبرا
مخالف پر کرتے ہو جب تم تبرا

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت مقلد کرے نا مقلد پہ لعنت

رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دین خدا پہ ہنسے سارا عالم

مولانا حالی کی کتاب مسدس حالی بار بار مسلمانوں کو پڑھنی چاہیے۔اس کتاب میں علاوہ اعلیٰ سے اعلیٰ مطالب کے زبان کی فصاحت بھی قابل تقلید ہے۔

اس احقر نے بھی کافر گر علما کے متعلق ایک چھوٹے سے رسالے میں جو''کافر اور کافر گر'' کے نام سے موسوم ہے تفصیل سے بحث کی ہے۔چونکہ وہ رسالہ آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا ہے اور جہاں تک معلوم ہوا ہے اب علما بھی سمجھنے لگے ہیں کہ یہ کافر گری کی عادت چھوڑنے کی ضرورت ہے۔اس رسالے کا ترجمہ گجراتی میں نواب جہانگیر خاں صاحب والی مانگرول نے کر دیا تھا اور اردو میں اپنے پاس سے خرچ کر کے دو ہزار جلدیں چھپوا کر ممبئی گجرات اور کاٹھیاوار کے علاقے میں تقسیم کرائیں۔جہاں کہیں علما کا پتہ چلا کہ وہ کافر گری کی قبیح عادت میں مبتلا ہیں ان کے پاس رسالہ کی متعدد جلدیں بھیج دیں اور عربی مدارس میں بڑی بڑی تعداد میں یہ رسالہ بھیجا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحبان نے انصاف پسندی اور معقولیت سے کام لیا ہے کہ اس کا جواب نہیں لکھا۔

عربی مدارس

سر سید کی مخالفت جو علما نے کی وہ زیادہ تر نفسیات پر مبنی تھی جب سر سید نے جدید علوم پر زور دینے کی کوشش کی لیکن ان کی کوشش کارگر نہیں ہوئی۔عربی میں ہمیشہ سے علما تعلیم کیا کرتے تھے۔لیکن ہندوستان میں بڑے مدارس کی شکل میں کوئی ادارہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں بالخصوص مغلیہ سلطنت کے زمانے میں تاریخ میں نہیں ملتا جس زمانے میں سر سید نے انگریزی تعلیم کی تحریک شروع کی تو عربی کی تعلیم میں بڑے مدارس کا آغاز ہوا۔چنانچہ صوبہ متحدہ میں ایک

بڑاادارہ عربی تعلیم کا جناب مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم ومغفور نے دیوبند میں جاری کیا جو اس وقت ترقی کرتے کرتے ایک عربی یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچ گیا ہے۔

سہارنپور کے ضلع میں اور بھی چند برگزیدہ علما نے مدارس جاری کیے اور لکھنؤ میں علما فرنگی محل کے زیر اہتمام ایک مدرسہ جاری ہوا، اسی طور پر اور چند مقامات پر عربی کے مدارس جاری ہوئے۔ ان عربی مدارس کے بعض منتظمین اور طلبا کو یہ بات یقینی ناگوار گزری ہوگی کہ قدیم طرز کی عربی تعلیم جس میں پرانے زمانے کے علوم اور دینیات کی تعلیم ہوتی تھی ان کے مقابلے میں یہ جدید تحریک ان کو کمزور کرنے کے لیے شروع کی گئی ہے اور یہ مخالفت ان کی جدید مخالفت نہیں تھی۔ اس قسم کی مخالفتیں ہمیشہ ہوتی رہی ہیں۔ جب کسی قوم میں تعلیم کا کوئی سلسلہ شروع ہوتا ہے اس میں ترقی ہو جاتی ہے اور جن لوگوں کا اس سلسلے کے اداروں سے تعلق ہوتا ہے ان کے ذاتی اغراض بھی اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب بھی اور جہاں بھی ایک سلسلہ ترقی کرتے کرتے اس حالت کو پہنچ جائے کہ اساتذہ و منتظمین اس کو ہر طریقہ سے اپنی ملکیت سمجھنے لگیں اور ان کی روزی کا دارومدار بھی اسی پر ہو وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتے اور نہ کریں گے کہ کوئی دوسرا سلسلہ ایسا جاری کیا جائے کہ جس سے ان کے ادارے کی ضرورت عوام میں کم ہو جائے اور ان کے ذرائع معاش جو ان کے اداروں سے متعلق تھے وہ مسدود ہو جائیں۔

جدید تعلیم کی تحریک

سرسید نے اس جدید تحریک کے جاری کرنے میں جس خلوص اور بے غرضی کا ثبوت دیا اس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ سرسید کے سامنے اس وقت فقط مسلمانوں کی قوم کی خستہ حالی تھی اور کوئی چیز ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ نہیں سکتی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کی قوم پر ایک سخت انقلاب کی حالت طاری ہوگئی تھی اور قریب سات سو سال تک انھوں نے ملک کے اندر حکومت کی تھی۔ دولت، عزت، حوصلہ اور خوش حالی جو صدیوں سے مسلمانوں کو اس ملک میں برتری بخش رہی تھی وہ اب اپنی آنکھوں کے سامنے فنا ہوئی جاتی تھی۔ سرسید جیسا ہمدرد اور حساس مسلمان چاروں طرف جو نگاہ دوڑا کر دیکھ رہا تھا کہ اس حالت سے نجات پانے کے لیے اور آنے والے مصائب کو روکنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ بادشاہت اور ثروت کے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کی

قومی حیثیت اور وقار قائم رہیں۔ سرسید نے دیکھا کہ کسی سابق طریقۂ ترقی کی طرف توجہ کرنا اور ملک میں اس کو پھر قائم کرنے کی کوشش کرنا قطعی بے سود ہوگا۔ تاریخ ان کو مشورہ دے رہی تھی کہ دنیا کی کوئی قوم جو قومی عروج کھو بیٹھتی ہے وہ پھر ان حالات کو واپس نہیں لاسکتی جن پر اس کا عروج مبنی تھا۔ اس کو کوئی جدید طریقہ اپنی قومی وقعت اور خوش حالی کا اختیار کرنا پڑے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی حکومت پھر بحال کرنے کا خیال ایسے دور اندیش انسان کی دل میں نہیں آسکتا تھا جیسا کہ سرسیدؒ کا دماغ تھا۔ یورپ کی صنعت وحرفت اور تجارت کسی طرح سے وہ اس زمانے میں مسلمانوں میں پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستان میں جو قوم اتنے زمانے تک مسلمانوں کے زیر حکومت رہی تھی وہ اب حالات کے بدلنے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش کا عنصر جدید تعلیم تھی۔ جدید تعلیم سے یہ مطلب نہیں کہ انگریزی زبان کی تعلیم بلکہ جدید علوم کی تعلیم تھی جو یورپ میں کچھ زمانے سے جاری ہوگئی تھی لیکن ایشیا کی قومیں اس سے نابلد تھیں لیکن ہندو قوم میں اس وقت بہت دور اندیش آدمی پیدا ہوگئے تھے۔ انھوں نے بخوبی سمجھ لیا کہ ہم بھی اس وقت کوئی حکومت تو قائم نہیں کر سکتے لیکن علوم وفنون اور تجارت کے حاصل کرنے میں ہم کو یورپ کی تقلید کرنی چاہیے اور اس کے لیے جدید تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ 1857 کے غدر میں مغلیہ سلطنت کا قطعی خاتمہ ہوگیا۔ اس سے قبل بھی گو عملاً تو خاتمہ ہی تھا لیکن سرکاری کاغذات میں اور اشتہارات وغیرہ میں ''ملک بادشاہ اور حکم کمپنی بہادر کا'' لکھا جاتا تھا۔ 1857 میں آکر حکم اور ملک دونوں آپس میں مل گئے یعنی ملک بھی کمپنی بہادر کا ہوگیا اور حکم بھی کمپنی بہادر کا ہوگیا اور بادشاہ کا نام قطعاً مٹ گیا۔ مسلمان ممکن ہے کہ 1857 سے قبل اپنے دل میں امید رکھتے ہوں کہ ہماری بادشاہت پھر بحال ہو جائے گی لیکن 1857 میں آکر اس امید موہوم کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ہماری ہم وطنی قوم نے 1857 سے بہت قبل اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا اور یقین کرلیا تھا کہ مسلمانوں کی بادشاہت اور حکومت دونوں انگریزوں کے ہاتھ میں آئیں گی چنانچہ 1857 کے غدر میں ایسا ہی ہوا۔

غدر 1857 سے قبل کمپنی مسلمانوں کو نوکریاں بھی دیتی اور بڑی بڑی ملازمتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں رہتی تھیں۔ انتظامی معاملات میں تو انگریزوں کے ملازم ہی ملک کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے لیکن انگریز بڑے ہوشیار تھے۔ وہ کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے مسلمانوں کو یہ

شکایت پیدا ہو جائے کہ ہم کو اپنے ملک میں تمام اختیارات سے بے حق کر رہے ہیں۔ سر سید خود بھی کمپنی کے ملازم تھے اور چاروں طرف کے حالات کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق اپنی رائے اچھی طرح قائم کر چکے تھے کہ مسلمان تو اب کبھی بادشاہ ہونے کے نہیں اور ہندوؤں کے پاس حکومت آنے کی نہیں اس لیے حکومت اور اختیار ہر چیز انگریزوں کے ہاتھ میں آئے گی اور مسلمان نہ کچھ کر سکیں گے اور نہ ان کو اطمینان و خوش حالی کی زندگی نصیب ہوگی۔

حالات مذکورہ بالا میں سر سید نے یہی دیکھا کہ دور اندیشی کا تقاضا صرف یہ ہے جس طور پر ہمارے ہم وطن ہندوؤں نے انگریزی زبان کے ذریعہ جدید تعلیم کا حاصل کرنا اپنی ضرورتوں کے لیے اختیار کر لیا ہے اسی طور پر اگر مسلمان بھی انگریزی زبان کے ذریعہ سے جدید تعلیم کا حاصل کرنا اختیار نہ کریں گے تو پھر ان کی حالت وہی ہوگی ''از ین سو رانده و از ان سو در مانده'' (یعنی یہاں سے تو دھکے دے کر نکال دیے گئے لیکن وہاں سے ادھر آنا نصیب نہ ہوا) اس خیال کو اپنے سامنے رکھ کر انھوں نے جدید تعلیم کی طرف توجہ کی۔ جدید تعلیم سے یہ مطلب نہیں تھا کہ انگریزی زبان ہی کو لازمی طور پر پڑھا جائے بلکہ جس زبان میں بھی ہو سکے جدید علوم کی تعلیم مسلمانوں کی حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ سب سے پہلے سر سید نے علی گڑھ میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تا کہ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں سے علوم کی کتابوں کے اردو میں ترجمے کر کے مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا ایک ذخیرہ تیار کیا جائے۔ لیکن یہ طریقہ زیادہ کارگر ہوتا دکھائی نہ دیا۔ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ مسٹر بیک پرنسپل ایم۔اے او کالج اور دوسرے انگریزوں نے سر سید کو آمادہ کیا کہ انگریزی زبان میں جدید تعلیم دے کر قوم کو انگریزوں کا مطیع بنانے کے لیے تیار کریں انھوں نے سر سید پر بھی ایک بہتان باندھا ہے اور خود اپنی جہالت و ناواقفیت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ جس وقت سر سید نے جدید تعلیم کی طرف توجہ کی تھی اس وقت مسٹر بیک یا کسی دوسرے انگریزوں کا نام بھی نہیں تھا جو ان پر اثر ڈالتے۔ جدید علوم کی تعلیم کا خیال خود سر سیدؒ کو حالات کے دیکھنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔

غدر 1857 میں سر سید انگریزوں کے ملازم تھے اور ججی کے عہدے پر مامور تھے لیکن وہ ملک کی اور قوم کی حالت سے غافل نہیں تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ''رسالہ بغاوت ہند'' لکھا اور انگریزوں کو صاف صاف بتایا کہ 1857 کا غدر تمھاری غلط پالیسی کی وجہ سے ظہور میں آیا۔ تم

نے ہندوستان کے لوگوں کو کبھی موقع نہیں دیا کہ وہ ملک کے انتظام کے بارے میں تم کو مشورہ دیں یا اہل ملک کی بہتری و بہبودی کے رستوں کی طرف تم کو توجہ دلائیں۔ اہل ملک کو تمھارے ملازمین کی زیادتیوں کی وجہ سے تکلیفیں پہنچیں اور تم نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اس لیے غدر ہوا۔ اس کا ہونا ایک لفظ میں ختم کیا جا سکتا ہے کہ "تنگ آمد بجنگ آمد" لیکن سرسید یہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ یہ رسالہ لکھنا اور اس قسم کی بحثیں کرنا کارگر نہ ہوگا۔ جب تک اہل ملک جدید تعلیم حاصل کر کے انگریزوں کو یہ نہ دکھا دیں کہ ہم کسی بات میں تم سے کم نہیں ہیں۔ ہم اپنے ملک کے حقوق چاہتے ہیں اور اپنے ملک کے انتظام میں پورا دخل دینا چاہتے ہیں۔

1857 میں تو غدر ہوا اور 1857 سے لے کر 1870 تک سرسید ملازمت میں بھی رہے اور کتابیں بھی لکھتے رہے اور کمپنی کے معزز و سربرآوردہ لوگوں سے جیسے لیفٹیننٹ گورنر یا وائسرائے سے آشتی کے طریقہ سے ملک کی آئندہ بہبودی کے لیے تبادلۂ خیالات بھی کرتے رہے اور اس بات کی بھی کوشش کرتے رہے کہ کوئی مدرسہ جاری کیا جاوے اور انگریزوں کے حکام کو جو ہندوستان میں کام کرتے تھے راغب بھی کرتے رہے کہ مسلمانوں کو تعلیم دینا ضروری ہے اور اس کے لیے گورنمنٹ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ 1874 میں ان کا یہ منصوبہ پکا ہو گیا اور علی گڑھ میں انگریزی کا ایک مدرسہ قائم کیا۔

سرسید اور اسلام کی خدمت

سرسید نے اسلام کی خدمت کی ہے اس کا خلاصہ مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے "حیات جاوید" مطبوعہ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کے حصہ دوم کے صفحہ 307 پر مذہبی خدمات کے عنوان کے ذیل میں درج کیا ہے اس لیے یہاں پر اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

سرسید اعتقاد کے لحاظ سے پکے مسلمان تھے۔ خدا کی وحدانیت اور الوہیت اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے دل سے قائل تھے۔ چنانچہ اس فضیلت کا اندازہ کرنے کے لیے سرسید کے "خطبات احمدیہ" کو پڑھنا ضروری ہے۔ خطبات احمدیہ حیات جاوید کے صفحہ 310 میں دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پادریوں کے اعتراضات کے جو وقتاً فوقتاً سرسید نے جواب میں دیے ہیں ان میں سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا جیسا بے نظیر جواب سرسید نے دیا

ہے اس کا اس زمانے سے لے کر آج تک کسی نے جواب نہیں دیا۔ سید امیر علی صاحب نے ''اسپرٹ آف اسلام'' میں بہت سے اسلامی مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور قوم اسلام پر بڑا احسان کیا ہے لیکن سرسید کی نگاہ جس حد تک واقعات کی گہرائی کو پہنچی تھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہمارے علما نے یہ نہیں دیکھا کہ سرسید اسلام کی کیا خدمت کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک جو شخص انگریزی تعلیم کی حمایت کرتا ہو غیر مذاہب کے لوگوں سے آشتی اور رواداری کی تلقین کرتا ہو وہ اسلام کی کوئی خدمت کر ہی نہیں سکتا۔ ہمارے علما لکیر کے فقیر ہیں کہ جو کچھ ان کے استاد نے ان کو سبق پڑھا دیا اس سے ایک قدم بھی ادھر ادھر ہٹنے کو کفر سمجھتے ہیں اور ظاہری صورت پر فدا ہیں۔ اگر کسی کے داڑھی نہیں ہے تو وہ کافر، اگر پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہے تو وہ کافر، اگر ان کے طرز کی کوئی نماز نہیں پڑھتا ہے تو وہ کافر اور انہیں وجوہات سے حنفی مسلمان وہابیوں کو کافر کہتے ہیں اور وہابی مسلمان حنفیوں کو اور شیعوں کی طرف سے تو صاف جواب ہے کہ ہم کسی سنّی کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے، کفر کے فتوے کی کیا ضرورت ہے۔ نماز کے روحانی اثرات کا مولوی صاحبان کو کچھ خیال نہیں بلکہ ان کے ظاہرہ طرز اور رسمی باتوں کی پابندی جو شخص کرے وہ مسلمان ہے باقی سب کافر ہیں۔

سرسید کو میں نے نماز پڑھتے دیکھا۔ روزے کے متعلق میں شہادت نہیں دے سکتا کیونکہ جس وقت میں کالج میں داخل ہوا اور میں نے سرسید کو دیکھا اس وقت ان کی عمر کم و بیش پچھتر سال کی تھی۔ ہم لوگ سالانہ یوم النبی مناتے تھے۔ سرسید اور دیگر اکابر قوم کو جو علی گڑھ میں موجود ہوتے تھے مدعو کیا کرتے تھے۔ سرسید کو متعدد مرتبہ محفل میں موجود پایا۔ سرسید کے دل میں قوم کا اس قدر درد تھا کہ اگر جلسوں میں کوئی مقرر موثر طریقے سے قوم کی موجودہ حالت بیان کرتا تھا تو سرسید کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ چند مرتبہ یہ بھی دیکھا کہ خود تقریر کرتے کرتے اور قوم کی حالت پر بیان کرتے وقت دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور سفید ریش مبارک پر سے آنسو ٹپک ٹپک کر ان کی کالی اچکن پر گرنے شروع ہو گئے۔ مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے جب مسدّس لکھی اور قوم کی حالت کا نہایت پر درد اشعار میں نقشہ کھینچا تو سب سے زیادہ اثر سرسید کے دل پر ہوا اور انھوں نے حسب ذیل خط میں مولانا حالی کی اعلیٰ قومی ہمدردی اور قابلیت کا اعتراف کیا۔

نقل خط

جناب مخدوم مکرم من ۔عنایت نامہ جات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ،جھوٹ اور تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ نازشعراو شاعری ہے بالکل مبرّا ہے کیونکر ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔متعدد بند اس میں ایسے ہیں کہ بے چشم نم پڑھے ہی نہیں جاسکتے۔حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں پہنچتی ہے۔نثر بھی نہایت عمدہ و نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اور پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جائے تو صرف انھی الفاظ میں ہے جس میں میری طرف اشارہ ہے۔بے شک میں اس کا محرّک ہوا۔اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیالایا ہے تو میں کہوں گا کہ حالی کی مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں۔آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیالاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمایے۔یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یافروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں۔آپ کے اس خیال کا مخالف ہوں کہ مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرائی جاوے۔میں دل سے شکر کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ان پر حاوی ہوں اور رنڈیاں مجلسوں میں تبلے سارنگی پر گاویں قوال درگاہوں میں گاویں۔حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی ۔میرا دل تو چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں نچواؤں مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔میں اس کل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔میرے

ان استفسار کا جواب جن پر نشان دیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو۔

والسلام

شملہ پارک ہوٹل

آپکا احسان مند تابعدار

10 /جون 1897

سید احمد

سر سید کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے کل کارناموں سے اور کاموں سے زیادہ اہم ان کو مسدس حالی کی نظم معلوم ہوئی۔ سر سید کی تمام تحریروں اور تقریروں میں اس قدر قوم کی ہمدردی کا احساس بھرا ہوا تھا کہ ہر لفظ پڑھنے اور سننے والوں کے دل پر نقش ہو جاتا تھا اور اس قول کی پوری تصدیق ہو جاتی تھی کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دوسرے کے دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ سر سید اپنی تقریروں اور تحریروں میں استدلال اور برہان کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے کہ جتنی انسانی اور قومی ہمدردی کے پہلو کو اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے دل ہی ایسا پایا تھا کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے قومی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ ان کے کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہت ابتدا سے ان کے دل میں رفاہ عام اور فلاح و بہبودئ قوم کے کاموں سے گہری دلچسپی تھی۔

اگر سر سید کو مجبوریاں پیش نہ آجاتیں اور واقعات زمانہ ان کے رستہ میں مانع وحائل نہ ہوتے تو وہ مثل دنیا کے بڑے ریفارمروں کے دوسرے سب کام چھوڑ کر اصلاح و بہبودئ قوم کے میدان میں اپنی شخصیت کا جھنڈا گاڑ دیتے اور دنیا کے بڑے بڑے ریفارمروں کی طرح کروڑوں آدمیوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے اور ایک بڑی جماعت ان کے قول وفعل کو اپنے لیے قابل تسلیم و تقلید جان کر اس رستہ پر پڑ جاتی جو رستہ وہ ان کے سامنے پیش کرتے لیکن گزشتہ زمانے میں اکثر بڑے بڑے ریفارمر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی حیثیت سے دنیا میں آئے اور اصلاح کی یا کسی پیغمبر کے مقلد کی حیثیت سے اس پیغمبر کی امت کی اصلاح کی لیکن سر سید کو ہزارہا سال کی تاریخ نے یہ بتایا تھا کہ مذہب اور دنیا میں کوئی تفریق نہیں ہو سکتی بلکہ مسلمانوں کے لیے مذہب اور دنیا ایک ہی ہے اور جس کی تعلیم و تلقین ہو سکتی حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو کی ہے۔ قرآن پاک انسانوں کے دین اور دنیا کی بہبودی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا اور بعض دوسرے مذاہب کی طرح کہیں بھی یہ تلقین نہیں کی تھی کہ دنیا کو چھوڑ دو اور فقط مذہب کے

پیچھے پڑ جاؤ گو ہمارے علما نے ایک مقولہ ایجاد کر رکھا ہے اور وہ اپنے وعظوں میں اس مقولے کو دہراتے ہیں جن سے دنیا اور دنیاوی زندگی سے نفرت کا پہلو نکلتا ہے لیکن قرآن پاک سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور وہ مقولہ حسب ذیل ہے:

الدنیا جی فتن و طالب ھا کلاب

یعنی دنیا ایک مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں لیکن قرآن پاک نے مسلمانوں کو سکھایا کہ وہ دعا مانگیں:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار

اب اس دعا میں جو ہر مسلمان پنج وقتہ نماز کے بعد دہراتا ہے دنیا کی مذمت نہیں نکلتی بلکہ پہلے دنیا بعد کو آخرت ہے۔ مہاتما بدھ نے دنیا کو محض مذہب کے رستے پر لگایا اور دنیا سے نفرت دلائی اور خود بادشاہت چھوڑ کر ایک درویش بے نوا کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں بسیرا لیا اور کبھی کسی قسم کا ذاتی لالچ ان کے خیال میں بھی نہیں آیا۔ آخر تک وہ سخت ریاضتیں کرتے رہے کہ دنیا فقط ناپائیدار ہی نہیں بلکہ پر عذاب ہے اور خود زندگی ہی کل تکالیف کا مجموعہ ہے۔ اپنا وقت دنیا کے کاموں میں مت لگاؤ بلکہ بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرو۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک وقت میں کل ہندوستان میں ماسوا چند مقامات کے سب لوگ بدھ مذہب کے پیرو ہو گئے اور ان میں سے نصف آبادی بھکشو یا بھیک مانگنے والی ہو گئی اور بہ کثرت مرد اور عورتیں راہب اور راہبیاں بن گئے۔ اس دنیا سے بیزاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ بدھ مذہب کے پیرو سخت کمزور اور بے کار ہو گئے اور دن رات بدھ مہاتما کے بتوں کی پوجا کرنے میں صرف کرتے تھے اور بدھ مہاتما کے بتائے ہوئے اصولوں کے ماتحت اپنی زندگی گزارتے اور مصائب زندگی پر دن رات غور کرتے رہتے تھے۔ ان کی دنیا سے بیزاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اپنی جان کی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ جب برہمنوں نے یہ دیکھا کہ بدھوں کی آبادی بالکل بے کار ہو گئی اور اس میں مدافعت کی قوت مفقود ہو گئی ہے تو انھوں نے راجپوتوں کو بدھوں کا قلع قمع کرنے کے لیے تیار کیا۔

راجپوتوں کے ایک فرقہ اگنی کل نے ایک بڑی تنظیم کر کے تین چار سو سال کے اندر لگاتار مذہبی جہاد کر کے بدھوں کی آبادی کو ہندوستان سے نیست و نابود کر دیا۔ یہاں تک کہ بدھ

مت کے پرانے پیروؤں میں سے ایک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ مثال تمام دنیا سے الگ کر کے فقط مذہب کی تلقین کرنا اور دنیا کو پر مضرت اور مکروہ ثابت کرنا ایک غلط اصول ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم بھی ابتدا میں بدھ مذہب کے اصولوں سے ملتی جلتی تھی۔ بدھ مہاتما شاید خدا کی ہستی کے قائل نہیں تھے۔ وہ صرف روح کو مانتے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ روح اس دنیا میں کبھی آئے بھی نہیں تا کہ اس کو یہاں کی دردناک زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور نہ ہونا پڑے۔ برخلاف اس کے حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل تھے اور اللہ تعالیٰ کی روحانی بادشاہت کی طرف مخلوق کو لانے کا وعظ فرماتے تھے مگر دنیا سے جن لوگوں کو نفرت دلاتے تھے ان کے نزدیک دنیا نہایت مکروہ اور تمام معاصیات کی کان تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں نکلنا آسان ہے لیکن دنیا دار کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ وہ خود درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور جہاں کہیں جاتے تھے اگر کسی نے کھانے کو کچھ دے دیا تو کھالیا ورنہ بھوکے سو رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی عسرت اور مصیبت میں گزاری۔ ان کے حواری بھی نہایت افلاس اور تنگی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن چند صدیوں کے بعد جب یہ مذہب اٹلی اور یورپ میں پہنچا تو جن لوگوں نے عیسائیت کا مذہب قبول کیا انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم دنیا سے بیزاری کے متعلق چھوڑ دی اور دولت کا کمانا قومی ترقی کے لیے لازمی قرار دے دیا۔ زبان سے وہ بھی نفرت دلاتے تھے لیکن عملاً وہ دولت کے پیدا کرنے کے لیے دن رات جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ دنیا سے بیزاری کی تعلیم جو حضرت مسیح نے دی تھی وہ کارگر نہیں ہوئی کیونکہ وہ فطرت انسانی کے مطابق نہیں تھی۔

اسلام نے دین و دنیا دونوں کی بہتری اور بہبودی کی تلقین کی اور یہ بتایا کہ کسی مسلمان کو دنیا سے بیزار نہیں ہونا چاہیے اور نہ راہب اور راہبی بننا چاہیے اور فرمایا کہ ''**لا رھبانیۃ فی الاسلام**'' یہ زبردست حکم قرآن پاک میں صادر ہوا اور اس کے بعد وہ لوگ جو اسلام پر ایمان لائے انھوں نے بانیٔ مذہب کی حیات اور موجودگی میں ہی تجارت اور کاروبار دنیا کی طرف توجہ کرنی شروع کی اور مسلمان پانچوں وقت نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہی دعا مانگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دنیا بھی اچھی کر دے اور ہمارا دین بھی یعنی ''**ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ**

حسنة و قنا عذاب النار ''اس آیت شریف سے ظاہر ہے کہ دنیا کو آخرت سے پہلے رکھا گیا ہے اور دنیا کو تقدیم دی گئی ہے کیونکہ اگر دنیا اچھی نہیں تو آخرت اچھی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے لفظ میں دونوں باتیں شامل ہیں۔

سب سے اوّل ضرورت معاش کی ہے جس سے انسان زندہ رہتا ہے اور عبادت کر سکتا ہے اور دوسروں کی مدد کر سکتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہ کر اچھے اعمال کرتا ہو تو اس کے دین اور دنیا دونوں اچھے ہو جائیں گے۔ اگر معاش کی طرف سے وہ پریشان رہے گا تو عبادت بھی ٹھیک سے نہیں کر سکے گا۔

''پراگندہ روزی پراگندہ دل'' بس دین اور دنیا دونوں ترازو کے دو پلڑوں پر تل کر برابر اتریں تو سمجھو کہ انسان کے دین اور دنیا دونوں اچھے ہو گئے اور اگر اس میں سے ایک بھی ہلکا رہے گا تو سمجھو کہ انسان کی زندگی کی تکمیل میں فرق ہے وہ کامل اور اچھا انسان نہیں بن سکے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا اور دین دونوں کے اچھا ہونے کے لیے دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ دنیا کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مزرع آخرت ہے یعنی آخرت میں پھل کاٹنے کے لیے دنیا میں بیج بونا لازمی ہے اور آخرت کی زندگی کو بھی حیات کے لفظ سے یاد کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی دونوں اچھی ہو جائیں۔ پس اسلام کی تعلیم دین اور دنیا دونوں کے لیے نہایت مکمل ہے۔ جب آخرت کو بھی لفظ حیات سے تعبیر کیا ہے تو اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک خدا کے ماننے والے انسان کے لیے دین اور دنیا دونوں میں حیات ہی حیات ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کر کے فقط دین کی فکر میں پڑ جانا اس بے سود فعل کے برابر ہے کہ کوئی ایک پہیہ سے گاڑی چلانا چاہے جو کبھی نہیں چل سکے گی۔ اسلام کی تعلیم تو نہایت پاکیزہ اور مکمل اور مفید تھی اگر مسلمان اس کی پیروی کیے جاتے تو آج ان کی وہ پست حالت نہ ہوتی جو ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

کسی وقت میں بعض علمائے دین وفقرا کے خیالات میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور ان میں سے بعضوں نے دنیا کے مکروہات کے تلخ تجربوں کی وجہ سے دنیا کے خلاف وعظ کرنا شروع کیا اور کسی بزرگ کا یہ قول کہ دنیا مردار ہے اور اس کا کھانے والا کتا ہے اپنے خطبوں میں شامل کر لیا اور

کمزور دل کے غیر مستعد سننے والوں پر اس قسم کے وعظوں کا برا اثر ہوا اور روزی پیدا کرنے کے کاموں میں تساہل کرنے لگے اور رفتہ رفتہ دنیا سے بیزاری ظاہر کرنے لگے اور ہزاروں لاکھوں انسان بجائے اپنے ہاتھ سے روزی پیدا کرنے کے دوسروں کے سامنے اپنے پیٹ کے خاطر ہاتھ پھیلانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت ہندوستان سے لے کر تمام مغربی ممالک اسلامیہ میں مسلمان بھیک منگوں کی بہت افراط ہے اور لاکھوں آدمی بھیک کے ٹکڑے پر اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جاتا ہے تو اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک اپنے ہی ملک میں ہے۔ کیونکہ گلی کوچوں سے صبح وشام بھیک مانگنے والوں کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ ایران کی حد سے ادھر نکلتے ہی یہ آواز کان میں پڑتی ہے کہ ''مردیم از سہ روز نخوردیم'' اور تمام ایران میں اسی قسم کی آوازیں سننے میں آتی ہیں۔ بعض مسلمان جو حج کو جاتے ہیں تو اپنے ساتھ جوزادراہ لے جاتے ہیں اس میں سے کچھ خرچ نہیں کرتے بلکہ تمام راستے بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے ہیں۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ صوبہ بنگال کے زائرین اپنی زندگی کا بُرا نمونہ دکھاتے ہیں۔ یہ لوگ خدا و رسول پاک کے مقرر کیے ہوئے قاعدوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ حاجی کا دُم چھلا لگانے کی خاطر رسول پاک کی تعلیم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حج کے لیے حکم ہے کہ جب تک تمھارے پاس کافی زادراہ نہ ہو اس وقت تک تم حج کو ہرگز نہ جاؤ اور علاوہ اس کے اگر اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں کے لیے اپنی غیر حاضری کے زمانہ میں روزی کا ذریعہ نہ چھوڑ سکو تو بھی حج کے لیے جانا تم پر فرض نہیں ہے۔ لیکن اکثر لوگ حاجی بننے کے شوق میں ان مقدس ہدایات کی کچھ پرواہ نہیں کرتے ہیں۔

ایک عرب صاحب نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا کہ ہندی حاجی جدّہ میں جس قدر اپنے کو ذلیل کرتے ہیں کسی دوسرے ملک کے افراد اتنا اپنے کو ذلیل نہیں کرتے اور شہر کو اپنے بول و براز سے گندہ کرنے کا بھی انھی کو ملزم قرار دیا جاتا ہے۔ اب اگر دین اور دنیا دونوں کا پاس ہوتا تو مسلمان اس قسم کے مکروہ مظاہرات مخلوق کے سامنے پیش نہیں کرتے۔ خواہ کسی کے پاس پیسہ ہو یا نہ ہو بھیک مانگنے کی امید میں حج کو چل دیتے ہیں اور اگر حج کر کے واپس آگئے تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے فریضہ حج ادا کر دیا لیکن ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ اس قسم کا حج ان کی روحانی

زندگی کو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ بزرگان دین نے بھی مسلمانوں کو ہمیشہ سمجھایا کہ تم دین اور دنیا کے معنی اچھی طرح سمجھو اور دنیا کی مخالفت مت کرو اور اس اصول کو سمجھو کہ دین کیا ہے اور دنیا کیا ہے۔ چنانچہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں بہت خوبی کے ساتھ اس دین اور دنیا کے مسئلے کی صراحت کر دی ہے اور فرمایا ہے:

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　نی کماش او نقرۂ فرزند و زن

(ترجمہ: دنیا کیا ہے خدا سے غافل ہونا ہے یعنی دنیا خدا سے غافل ہونے کا نام ہے اور یہ دنیا نہیں ہے کہ دولت پیدا کرو، شادیاں کرو اور بچے پیدا کرو)

قرآن پاک اور اسلام کے اصولوں کی خلاف ورزی دنیا میں اہل اسلام کے لیے نہایت پُرمضرت ثابت ہوئی۔ یہ ایک تعجب کی بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے دنیا کی مذمت کی مگر ان کی امت نے دنیا کو مضبوطی سے پکڑا۔ برخلاف اس کے اسلام نے انسان کی زندگی گاڑی کے دو پہیوں پر قائم کی یعنی دین اور دنیا کے دو پہیے گاڑی میں لگا دیے مگر اہل امت نے ایک پہیہ بالکل بے کار کر دیا جس سے گاڑی کی رفتار میں سخت خلل آ گیا اور بقول شاعر:

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　　نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

دنیا سے بیزاری کی وجہ سے دینی معاملات میں سستی آ گئی اور احکام قرآنی کی تکمیل دشوار ہو گئی۔ انسان اگر قوانین قدرت کے کسی قاعدے کی بھی خلاف ورزی کرے گا تو اس کی زندگی کا نظام کمزور اور بے کار ہو جائے گا۔ اپنی روزی پیدا کرنا مقتضائے قوانین قدرت ہے۔ روزی پیدا کرنے میں غفلت کرنا انسان کی زندگی کو بے کار کر دیتا ہے۔

ہمارے علما کو خود تو اچھی طرح کھانے پینے کو مل جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مولویوں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں جائے۔ وہ مولوی صاحبان جو دنیا کو مردار بتاتے ہیں وہ اس مردار دنیا کو جن طریقوں سے حاصل کرتے ہیں وہ طریقے ان کی انسانیت کو بھی ذلیل کر دیتے ہیں۔ مفت خوری انسان کو ذلیل کر دیتی ہے۔ دنیا اگر مردار ہو تو واعظین بھی اس مردار کی طمع میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ وہ جس طور پر دنیا کو حاصل کرتے ہیں اس سے انسانی شرافت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

سرسید نے ان ہی وجوہات سے مسلمانوں کو خود اپنے ہاتھ سے روزی پیدا کرنے کی تاکید کی اور تجارت کی طرف بھی مسلمانوں کو متوجہ کرتے رہے اور زمانے کے مقتضا کی وجہ سے ان کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی اور اس زمانے میں جب کہ انھوں نے اصلاح کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا روزی کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ ملازمت تھا اور ملازمت بغیر اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کیے نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی تحریک قوم کے سامنے پیش کی جس کی وجہ سے کاہل الوجود مفت خورے مسلمانوں نے ان کو کافر بنا دیا۔ منجملہ اور الزامات کے ان پر یہ الزام بھی لگایا کہ یہ شخص مادیات کے پیچھے پڑا ہے اور قرآن کی تعلیم اور بزرگوں کے اقوال کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہ شخص بجائے پیغمبروں اور بزرگوں کی تقلید کرنے کے یورپ کے اور ہندوستان کے کفار سرمایہ داروں کی تقلید کرنا چاہتا ہے۔ سرسید کو اس بات کا بہت رنج رہا کہ ان کی قوم نے ان کو نہیں سمجھا اور ان کو بلا وجہ سرمایہ داری کا دلدادہ سمجھتے رہے۔ وہ خود سرمایہ دار نہیں تھے اور نہ ان کو سرمایہ داری کا شوق تھا بلکہ اکثر فرمایا کرتے تھے ''الفقر فخری'' یعنی مجھ کو اپنی فقیری پر فخر ہے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی روزی خود جائز طریقہ سے کمائیں اور اپنے بیوی بچوں کی پرورش کریں اور خوش رہیں اور قوم کی اعانت کریں۔ یہاں پر میں ایک بہت بڑے مسلمان یعنی غازی مصطفےٰ کمال پاشا مرحوم و مغفور کا قول نقل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ انھوں نے بھی سرمایہ داری کے متعلق سرسید کے قول کی تصدیق کی ہے۔ اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ''ہماری قوم سرمایہ دار نہیں ہے، ہم لوگ زراعت پیشہ ہیں اور دست کاری اور محنت سے اپنی روزی کماتے ہیں، اور جو کماتے ہیں وہ اپنی اور قوم کی ضرورتوں پر صرف کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں'' یہ بات فیصلہ طلب ہے کہ آیا افراط سے دولت حاصل کرنا اور جوڑ جوڑ کر اس کو رکھنا انسان کی مسرت کی نعمت عطا کر سکتا ہے یا ضرورت کے لیے کما کر اس کو خرچ کرنا خوشی کا باعث ہو سکتا ہے۔ مذکورہ بالا قول سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ سرسید نے صحیح معنوں میں اسلام کی خدمت انجام دی۔ ایک طرف تو وہ اسلام کے مکذبین اور معترضین کے جوابات دیتے رہے، جس کے لیے انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب کا جواب اور خطبات احمدیہ اور بیسوں مضامین آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑے اور

دوسری طرف مسلمانوں کو معاش پیدا کرنے کی تاکید کی اور توہمات کی زندگی سے جس میں وہ صدیوں سے پھنس رہے تھے نجات دلانے کی فکر کی اور اس کے لیے جد و جہد کی۔ یہ ہم قطعی نہیں سمجھ سکتے کہ باوجود ان جملہ وجوہات کے ہمارے علما نے ان کو اسلام کا دشمن کیسے گردانا اور ان کے خلاف کفر کے فتوے کیسے دیے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مدبّر اور سپہ سالار، مصنف اور شاعر اور صاحبِ کشف و کرامات فقرا پیدا ہوتے رہے لیکن سرسید نے جو کام کیا وہ کسی سے نہ ہوا۔

سرسید کی سوانح عمری

سرسید کی زندگی کے حالات کافی طور پر قلم بند نہیں ہوئے۔ ان کی ایک سوانح عمری موسومہ ''لائف آف سرسید'' انگریزی زبان میں ایک انگریز میجر جنرل جی۔ ایف۔ آئی گرہم نے لکھی تھی لیکن وہ بہت ہی مختصر اور نا قابل اطمینان تھی لیکن سب سے بڑی اور مفصل اور واضح سوانح عمری جناب شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی مرحوم مغفور مصنف ''مسدس حالی'' نے موسومہ ''حیات جاوید'' لکھی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی کی تصنیف ہمارے اردو لٹریچر میں ایک بہت بڑے پائے کی تصنیف ہے لیکن اکثر واقعات جو مولانا حالی نے لکھے ہیں وہ سماعی شہادت کے اوپر مبنی ہیں۔ یا تو کالج اور ایجوکیشن کانفرنس سے اخذ کیے گئے ہیں یا سرسیدؒ کے احباب کے منقولات پر استدلال کیا گیا ہے۔ اگر مولانا حالی سرسید کی صحبت میں شروع سے ہمیشہ رہتے تو سرسید کی سوانح عمری کا حق مکمل طور پر ادا کرتے۔ ان سے بہتر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی سوانح عمری میں وہ حصے جو ان کے چشم دید واقعات سے متعلق نہیں یا جو باتیں انھوں نے خود سرسید سے سنیں ان کی کیفیت کچھ دوسری ہے تاہم مولانا حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمری حیات جاوید سے بہتر کوئی کتاب ملنی دشوار ہے۔ راقم الحروف جو کچھ لکھ رہا ہے وہ سرسید مرحوم کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ طالب علمی کے زمانے میں جو کچھ وقت ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ملا اور جو باتیں ان کی زبان مبارک سے نکلیں اور کانوں سے سنیں ان کو قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ان کو سوانح عمری نہیں کہہ سکتے ہیں۔ سرسید کی سوانح عمری ان کے کاموں میں مضمر ہے۔ جو اثرات مسلمانوں کی قوم کی حالت پر ان کی اصلاحی کوشش سے

اسی طور پر نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی اور ان کے بھائی مولوی سید علی وڈاکٹر سید حسن سرسید کے بڑے معتقدین اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ پنجاب کے نواب محمد حیات خاں اور ڈپٹی برکت علی خاں اور باغبان پورہ لاہور کے رؤسا، بالخصوص مسٹر شاہ دین اور سر محمد شفیع ان کے بڑے دوستوں میں سے تھے۔ صوبہ متحدہ میں خاصی تعداد مسلمانوں کی ان سے خلوص وعقیدت رکھتی تھی اور مراد آباد کے بڑے رئیس راجہ جے کشن داس صاحب بھی سرسید کے بہت بڑے دوستوں میں سے تھے۔ علی گڑھ شہر کے مسلمانوں میں دو گروہ تھے ایک حنفی اور دوسرا وہابی۔ یہ دونوں گروہ زیادہ تر مذہبی اختلافات کی وجہ سے سرسید سے دور ہی دور رہتے تھے لیکن علی گڑھ اور بلند شہر کے زمین دار اور رؤسا طبقہ میں سرسید کی بہت عزت اور قدر تھی۔ نواب لطف علی خاں مرحوم لال خانی اور نواب فیاض علی خاں صاحب ونواب فیض علی خان صاحب رؤسا پہاسو اور عبدالشکور خاں صاحب و عنایت اللہ خانصاحب شروانی رؤسا بھیکم پور سرسید کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ اس زمانے میں سرسید نے کالج کے ٹرسٹیوں کی جماعت کی تشکیل کی تو ضلع کے اکثر رؤسا کو انھوں نے ٹرسٹی بنایا علی گڑھ شہر سے دس بارہ میل کے فاصلے پر جلالی ایک قصبہ ہے جو سادات اہل شیعہ کی بستی ہے، وہاں پر اچھے اچھے باثروت خوش اخلاق زمیندار رہتے تھے۔ ان میں عاشق علی خاں صاحب بھی ایک بزرگ تھے جن کے پاس اپنی زمین داری تو بہت کم تھی لیکن وہ اپنے دو زمین دار بھتیجوں کے ولی تھے اور ان کی ریاست کے منیجر تھے۔ سرسید نے ان کو بھی کالج کا ٹرسٹی بنایا۔ وہ بہت ہی چھوٹے قد کے مخنی آدمی تھے اور ظاہری وجاہت سے عاری تھے۔ ایک مرتبہ کوئی لفٹنٹ گورنر کالج میں آیا تو سب ٹرسٹیوں کی جماعت پرا باندھ کر ان کے سامنے ہاتھ ملانے کو کھڑی ہوگئی۔ مہمان نے سب سے ہاتھ ملایا لیکن میر عاشق علی رہ گیے۔ میر صاحب نے آگے بڑھ کر کہا کہ حضور میں بھی ٹرسٹی ہوں۔ تب لفٹینٹ گورنر نے ان سے بھی ہاتھ ملایا۔

فرشتوں پر سرسید کا اعتقاد

پنجاب کے بعض سنی مسلمان سرسیدؒ کے مذہباً بھی معتقد تھے۔ سرسید کا مذہب دوسرے مسلمانوں سے کچھ مختلف نہیں تھا لیکن مذہب کی بہت سی رسمی باتیں زمانے کی ترقی کے لحاظ سے لوگوں کے حالات کے مطابق معلوم نہیں ہوتی تھیں اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ نوجوان ان

پڑے وہ کام ہنوز اپنے پورے فروغ کو بھی نہیں پہنچے۔امید ہے کہ ہماری قوم میں ایسے مصنف پیدا ہو جائیں گے جو سر سیدؒ کے کاموں سے ان کی سوانح حیات اخذ کر کے آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دیں گے۔

تہذیب الاخلاق

سر سید نے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے کالج کے قیام کی تحریک کے ساتھ ساتھ جاری کیا تھا۔اس کا مقصد بہت ہی گہرا تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی میں جو کمزوری پیدا ہوگئی ہے اس کی اصلاح کی جائے۔انسان کی تہذیب و اخلاق کا مضمون بہت وسیع ہے اور اس میں ہر قسم کی تہذیب شامل ہے۔یعنی مذہبی تہذیب،روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی تہذیب،کھانے پینے کی اشیا کو ایک حد کے اندر محدود کرنے کی تہذیب، بیاہ شادیوں مرنے جینے کے مراسم کی تہذیب،مجالس میں گفتگو کرنے کی تہذیب،حفظ مراتب کی تہذیب وغیرہ وغیرہ۔یہ تو ظاہری اخلاق و تہذیب کی مثالیں دی گئی ہیں لیکن اعلیٰ تہذیب روحانی زندگی کی تہذیب ہے۔وہ بہت مشکل امر ہے اور نبیوں اور بڑے بڑے مصلحان نے اسی تہذیب کو دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی۔سب سے زیادہ بین طور پر اس تہذیب کے وعظ قرآن پاک میں ملتے ہیں۔اگر کسی شخص کی زندگی میں اس روحانی تہذیب کا شائبہ بھی پیدا ہو جائے تو سمجھو کہ اس نے دین اور دنیا کی فلاح حاصل کر لی۔روحانی تہذیب بڑی دشوار چیز ہے۔صرف پیغمبروں اور بڑے بڑے بزرگوں کو یہ نعمت ملتی رہی ہے اور باقی دنیا گو اس سے کلیتاً محروم تو نہیں رہی لیکن اس کو اس سے بہت کم نفع حاصل ہوا۔ہمارے واعظین نے اخلاق کی بہت سی قسمیں کر دی ہیں۔وہ اپنے وعظوں میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت پر گفتگو کرتے وقت اس کو اسلامی اخلاق اور تہذیب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔گویا اسلامی تہذیب انسانی تہذیب سے مختلف ہے۔یہ بالکل غلط خیال ہے۔اخلاق کا مفہوم عام ہے۔سچ بولنا،ایمان داری سے معاملات کرنا،اپنے وعدوں کو پورا کرنا۔بددیانتی سے باز رہنا۔اپنے قول و فعل سے کسی انسان کو ضرر نہ پہنچانا۔دوسرے انسانوں کے حقوق کا لحاظ رکھنا۔اپنے ماں باپ،بیوی بچوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی پاسداری کرنا۔یہ کل باتیں انسانی اخلاق میں شامل ہیں۔اسلامی اخلاق ان سے کوئی جداگانہ اخلاق نہیں ہے۔بزرگان دین کے افعال و اقوال تب ہی

اچھے اخلاق سے مطابقت کر سکتے ہیں اگر ان کے افعال واقوال مذکورہ بالا صراحت کے مطابق ہوں۔ اگر کسی بزرگ کے افعال واقوال اس معیار سے گرے ہوئے ہوں گے جس کی اوپر تفصیل دی گئی ہے تو ان کے اخلاق بھی خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں اور مسلمانوں کی نگاہ میں تقدس و بزرگی کا درجہ رکھتے ہوں، ان کو ہم با اخلاق انسان نہیں کہیں گے اور نہ ہی اسلامی اخلاق کے مطابق ہوں گے۔ پس سب سے اول ہم کو انسانی اخلاق کی تہذیب سیکھنی چاہیے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بزرگان دین کے اخلاق عموماً اچھے ہی اخلاق تھے اور ہم کو ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ لیکن اگر کسی دوسرے مذہب کے انسان کے اخلاق حسنہ ہوں تو ہم کو اس کی پیروی سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

سر سید مصلح تھے اور عام انسانوں کے اخلاق کی درستی انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا۔ پس سر سید نے جو جو کوششیں اور جد و جہد مسلمانوں کے اخلاق پر اچھا اثر ڈالنے کی کیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ گزشتہ اور موجودہ زمانے کے دیگر اقوام کے اچھے انسانوں کے اچھے نمونے ہم کو پس پشت ڈال دینے چاہئیں اور فقط گزشتہ مسلمانوں کے اچھے نمونے جب تک ہمارے سامنے نہ آئیں دوسرے نمونوں کی طرف ہمیں توجہ نہیں کرنی چاہیے۔

سر سید نے جب تہذیب الاخلاق جاری کیا اور مسلمانوں کی موجودہ طرز طریقۂ زندگی پر نکتہ چینی کی تو مولوی صاحبان نے یہ سمجھا کہ یہ اسلام کا دشمن ہے اور ان کے خلاف مضامین لکھنے شروع کیے۔ تہذیب الاخلاق نے اس زمانے میں مسلمانوں کو اپنا پرانا طرز زندگی بدلنے کا مشورہ دیا کہ تمھارا رہنا سہنا، بود و باش، میل جول کا جو طریقہ ہے وہ نہ تو حفظان صحت کے مطابق ہے اور نہ اچھے خیالات و محسوسات پر مبنی ہے۔ اس لیے اس طرز کو بدلو۔ گھروں، دستر خوانوں، باورچی خانوں کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرو اور اپنا لباس شریعت کے احکام کے مطابق اُجلا رکھو اور دوسروں کی دل آزاری سے باز رہو اور اپنے قول اور عہد کی پابندی کرو۔ لیکن پرانے قسم کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ مغربی تہذیب کے اثر سے کہہ رہے ہیں۔ ہم مسلمانوں کا طور طریقہ جو کچھ بھی ہے وہ شرع کے مطابق ہے اور ہمارے بزرگ اس کے پابند رہے ہیں۔ ہم کو اسے چھوڑ کر نئی نئی باتیں اپنی معاشرت میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ تہذیب الاخلاق بہت تھوڑے دنوں تک چلا۔ اس زمانے کے بڑے

بڑے اہل قلم جیسے نواب محسن الملک مرحوم، مولوی چراغ علی مرحوم، مولوی اقبال علی وغیرہ نے اس کے کامیاب بنانے میں بہت کچھ کوشش کی لیکن اس پر بھی وہ کچھ عرصہ مفید کام کرنے کے بعد ختم ہو گیا۔ پھر ایک مرتبہ اپنے انتقال سے چند سال قبل سر سید نے تہذیب الاخلاق کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ سال ڈیڑھ سال تک جاری رہ کر پھر ختم ہو گیا۔

سر سید کے حواری

سر سید کے دوستوں کا دائرہ بہت محدود تھا اور جتنے بھی ان کے احباب ان سے اُنس و محبت رکھتے تھے وہ بڑے خلوص سے سر سید کی اصلاحی تحریکوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کے حواریوں میں مسلمان بھی تھے ہندو بھی تھے اور انگریز بھی شامل تھے۔ کیونکہ سر سید نے کوئی آشرم یا تکیہ یا مسافر خانہ نہیں بنایا تھا جہاں پر ان کے مداح مسلمان دور دراز مقامات سے آ کر ان کے پاس بہت دنوں تک مقیم رہ کر ان کے اصلاحی کاموں میں حصہ لیں اس لیے بہت کم لوگ ان کے اردگرد دکھائی دیتے تھے بعض لوگ ان کی دانش مندی نیک خصالی کی شہرت سن کر آتے تھے اور کہیں دوسری جگہ قیام کرتے تھے اور ان سے چند مرتبہ ملاقات کر کے چلے جاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے والے لوگوں میں مولانا حالی اور مولوی ممتاز علی صاحب ایڈیٹر ''تہذیب نسواں'' کو متعدد مرتبہ ان کے دربار میں حاضر دیکھا۔ ان کے ملنے والوں میں پنجاب حیدر آباد اور دیسی ریاستوں میں رہنے والے بہت سے مسلمان اکثر ان سے ملنے آتے تھے۔ حیدر آباد سے بعض لوگوں کو جب ریاست رخصت کر دیتی تھی کہ جاؤ اب ہم کو تمھارے کام کی ضرورت نہیں ہے تو ان میں سے بعض ممتاز لوگ بجائے اپنے وطن جانے کے علی گڑھ میں آ کر قیام کیا کرتے تھے۔ نواب محسن الملک مرحوم تو مستقل علی گڑھ ہی میں حیدر آباد سے آنے کے بعد رہنے لگے۔ نواب فتح نواز جنگ نے کچھ عرصے کے لیے حیدر آباد سے آ کر علی گڑھ ہی میں قیام کیا۔ اس طرح دو تین اور صاحبان علی گڑھ ہی میں عارضی طور پر مقیم ہوئے۔ جب متعدد اصحاب حیدر آباد سے آنے کے بعد علی گڑھ میں مقیم ہوئے تو اخبار اودھ پنچ نے لکھا کہ علی گڑھ کیا ہے۔ یہ تو تکیہ مردوداں ہے یعنی جو شخص کسی جگہ سے نکال دیا جاتا ہے وہ علی گڑھ میں آ کر پناہ لیتا ہے۔

سر سید کے مخلص دوستوں میں خلیفہ محمد حسین اور خلیفہ محمد حسن وزرائے ریاست پٹیالہ تھے۔

اسی طور پر نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی اوران کے بھائی مولوی سید علی وڈاکٹر سید حسن سرسید کے بڑے معتقدین اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ پنجاب کے نواب محمد حیات خاں اور ڈپٹی برکت علی خاں اور باغبان پورہ لاہور کے رؤسا، بالخصوص مسٹر شاہ دین اور سر محمد شفیع ان کے بڑے دوستوں میں سے تھے۔صوبہ متحدہ میں خاصی تعداد مسلمانوں کی ان سے خلوص وعقیدت رکھتی تھی اور مراد آباد کے بڑے رئیس راجہ جے کشن داس صاحب بھی سرسید کے بہت بڑے دوستوں میں سے تھے۔علی گڑھ شہر کے مسلمانوں میں دوگروہ تھےایک حنفی اور دوسرا وہابی۔ یہ دونوں گروہ زیادہ تر مذہبی اختلافات کی وجہ سے سرسید سے دور ہی دور رہتے تھےلیکن علی گڑھ اور بلند شہر کے زمین دار اور رؤسا طبقہ میں سرسید کی بہت عزت اور قدر تھی۔نواب لطف علی خاں مرحوم لال خانی اورنواب فیاض علی خاں صاحب ونواب فیض علی خان صاحب رؤسا پہاسو اور عبدالشکور خاں صاحب و عنایت اللہ خانصاحب شروانی رؤسا بھیکم پور سرسید کے خاص دوستوں میں سے تھے۔اس زمانے میں سرسید نے کالج کے ٹرسٹیوں کی جماعت کی تشکیل کی توضلع کے اکثر رؤسا کوانھوں نے ٹرسٹی بنایا ۔علی گڑھ شہر سے دس بارہ میل کے فاصلے پر جلالی ایک قصبہ ہے جوسادات اہل شیعہ کی بستی ہے، وہاں پر اچھے اچھے باثروت خوش اخلاق زمیندار رہتے تھے۔ان میں عاشق علی خاں صاحب بھی ایک بزرگ تھے جن کے پاس اپنی زمین داری تو بہت کم تھی لیکن وہ اپنے دوز مین دار بھتیجوں کے ولی تھے اور ان کی ریاست کے منیجر تھے۔سرسید نے ان کو بھی کالج کا ٹرسٹی بنایا۔ وہ بہت ہی چھوٹے قد کے منحنی آدمی تھے اور ظاہری وجاہت سے عاری تھے۔ایک مرتبہ کوئی لفٹنٹ گورنر کالج میں آیا تو سب ٹرسٹیوں کی جماعت پرا باندھ کر ان کے سامنے ہاتھ ملانے کوکھڑی ہوگئی۔ مہمان نے سب سے ہاتھ ملایا لیکن میر عاشق علی رہ گیے۔میر صاحب نے آگے بڑھ کر کہا کہ حضور میں بھی ٹرسٹی ہوں۔تب لفٹیننٹ گورنر نے ان سے بھی ہاتھ ملایا۔

فرشتوں پر سرسید کا اعتقاد

پنجاب کے بعض سنی مسلمان سرسیدؒ کے مذہبا بھی معتقد تھے۔سرسید کا مذہب دوسرے مسلمانوں سے کچھ مختلف نہیں تھا لیکن مذہب کی بہت سی رسمی باتیں زمانے کی ترقی کے لحاظ سے لوگوں کے حالات کے مطابق معلوم نہیں ہوتی تھیں اوراس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ نوجوان ان

رسمی باتوں سے کبیدہ خاطر معلوم ہوتے تھے۔لیکن سرسید نے بعض رسمی اور اعتقادی باتوں کو دلائل سے معقولیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ مثلاً فرشتوں پر مسلمانوں کا جو اعتقاد ہے موجودہ زمانے کے مسلمان اس اعتقاد کی بے قدری کرنے لگے تھے مگران کے وجود پر ایمان لانا ضروری تھا کیونکہ ان پر ایمان لانا از روئے تعلیم اسلام ضروری ہے اس لیے سرسید کو بھی فرشتوں کے وجود سے انکار نہیں ہوسکتا تھا۔لیکن مسلمانوں نے محض فرشتوں کے وجود پر ہی ایمان لانے تک اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی شکل وصورت اور دیگر اوصاف پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دے دیا جن کا قرآن پاک کی تعلیم میں کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔محض فرشتہ مان کر اس پر ایمان لانا تو ایک دوسری بات ہے لیکن فرشتے کو ایک پرندے کی شکل میں آسمان سے اُڑ کر زمین تک پہنچانا ایک دوسرا ہی معاملہ ہے۔اسلام نے کہیں یہ نہیں کہا کہ فرشتے چیل کوؤں کی طرح اڑتے ہوئے آسمان سے نیچے اترتے ہیں اور زمین پر آکر اپنے فرائض حسب ارشاد خدا وحدہ لاشریک انجام دے کر پھر واپس چلے جاتے ہیں۔قرآن پاک نے فرشتوں کی ظاہری شکل وہیئت کے بارے میں ہم کو کوئی تعلیم نہیں دی ہے۔علماء کا جو کچھ دل چاہے وہ تجویز کریں کہ فرشتوں کی ایسی شکل وصورت ہوتی ہے اور اس طور پر آسمان سے اترتے ہیں۔لیکن علماء کے خیالات ہمارے لیے اور امت محمدی کے لیے کوئی حجت نہیں ہیں۔سرسید بالکل آزاد تھے کہ وہ فرشتوں کی شکل وصورت سے انکار کر دیں۔فقط فرشتوں کے وجود کا اعتقاد ان پر لازمی تھا اور وہ اس کے قائل تھے اور علماء کے خیالات کی پابندی وہ اپنے اوپر لازمی نہیں سمجھتے تھے اس لیے بعض قدیم خیال کے علما ومقتدر اصحاب کی رائے کے مطابق انھوں نے فرشتوں کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا کہ فرشتے ان قوتوں کا نام ہے جو حسب ارشاد اللہ تعالی انسان کی رہنمائی کرتے ہیں اور یہی قوتیں تھیں جن کے ذریعہ سے پیغمبروں کے دل میں خدا کے احکام کا القا ہوتا تھا اور اسی القاء کو لفظ الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ خیال ہر ایک شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتا ہے۔یہ نہایت دقیق اور باریک خیال ہے اس کے ماننے سے نہ فرشتوں کے وجود سے انکار لازم آتا ہے اور نہ فقط الہام کی اصلیت سے کوئی انحراف لازم آتا ہے لیکن ہمارے اس زمانے کے اکثر علما کی سمجھ سے یہ خیال بالاتر تھا۔کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ فرشتہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوبدو باتیں کیا کرتا تھا اور اسی طور پر ان کو پیغام پہنچایا کرتا تھا جیسے کہ ایک درمیانی انسان ایک آدمی کا

پیغام دوسرے تک پہنچاتا ہے۔اس لیے انھوں نے سر سیدؒ پر یہ الزام لگایا کہ یہ فرشتوں کے وجود کا بھی منکر ہے اور الہام سے بھی انکار کرتا ہے اور ان ہی وجوہات سے علما نے سر سید کو کافر گردانا اور ان کے خلاف کفر کے فتوے جاری کیے۔

سر سید بہت سی باتوں کو جو نوجوانوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں دلائل سے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے، لیکن ہمارے علما مذہب کے معاملے میں دلائل اور برہان کو دخل دینے کے ہمیشہ مخالف رہے اور ہمیشہ اس بات کے قائل رہے کہ ''نقل راچہ عقل''یعنی جو چیز قدیم زمانے سے نقل ہوتی چلی آتی ہے اس میں عقل و دلائل کو دخل نہیں دینا چاہیے۔سر سید کی ان ہی کوششوں کی وجہ سے ان کو علاوہ کافر گرداننے کے نیچری بھی گردانا گیا۔نیچری کے معنی مولوی صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہے اگر کوئی شخص دلائل سے اس میں تبدیلی کرلے یا اس کی تردید کرنے کی کوشش کرے وہ صحیح راستے سے گمراہ ہوجاتا ہے اور خدائی راستے سے ہٹ کر نیچر کے گمراہ کن رستے پر پڑجاتا ہے۔مولوی صاحبان نے اس لفظ نیچر کو عجیب عجیب معنی پہنائے اور سر سید کے متعلق نہایت گندے خیالات مسلمانوں میں پھیلائے جن کا اثر یہ ہوا کہ جاہل مسلمان سر سید کے مذہبی خیالات سے برگشتہ تو ہو ہی گئے لیکن ان کے معاشرتی و اقتصادی و اخلاقی اور تعلیمی اصولوں سے بھی منحرف اور برگشتہ ہوگئے اور سر سید کے ذاتی مخالف بن گئے۔ میں اس امر کی تصدیق کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ سر سید اعتقاداً نہایت راسخ الخیال مسلمان تھے اور ان پر کفر و الحاد اور نیچریت کے فتوے جو علما نے لگائے وہ علما کی تاریک خیالی اور جہالت پر مبنی تھے۔وہ مذہب کے کل ارکان کے معتقد تھے اور میں نے ان کو نمازیں پڑھتے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ان کا اسلام قرآن اور حدیث پر مبنی تھا۔علما کے فتوؤں کے وہ قائل نہیں تھے۔مولانا حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں مولویوں کے فتوؤں کے بارے میں جو بند لکھے ہیں پڑھنے کے قابل ہیں جو درج ذیل ہیں:

سدا اہل تحقیق سے دل میں بل ہے　　حدیثوں پہ چلنے میں دیں کا خلل ہے
فتاووں پہ بالکل مدار عمل ہے　　ہر اک رائے قرآں کا نعم البدل ہے
کتاب اور سنت کا ہے نام باقی
خدا اور نبی سے نہیں کام باقی

جہاں مختلف ہوں روایات باہم کبھی ہوں نہ سیدھی روایت سے خوش ہم
جسے عقل رکھے نہ ہرگز مسلم اسے ہر روایت سے سمجھیں مقدم
سب اس میں گرفتار چھوٹے بڑے ہیں
سمجھ پہ ہماری یہ پتھر پڑے ہیں
کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں
وہ یاں اک عجب بھیس میں جلوہ گر ہے چھپا جس کے پردے میں اس کا ضرر ہے
بھرا زہر جس جام میں سر بسر ہے وہ آب بقا ہم کو آتا نظر ہے
تعصب کو اک جزو دیں سمجھے ہیں ہم
جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ اہل اسلام کی خدمت اور ان میں روشن خیالی پھیلانا ہے۔ ہماری مذہبی تعلیم کا اصلی اصول یہی ہے کہ اپنے اعتقادات کی پختگی اور مضبوطی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی بھی خدمت کرو۔ تم کو بہشت کی نعمت نصیب ہوگی۔ میری رائے میں سرسید با

بہمہ وجوہ اپنے اعتقاد اور اپنے اعمال کی رو سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخ روئی کے ساتھ حاضر ہونے کے مستحق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی بہشت بریں میں اعلیٰ روحانی مدارج عطا فرمائے گا۔

سر سید کی اولاد

سر سید کے دو بیٹے تھے۔ایک کا نام سید حامد تھا اور دوسرے کا نام سید محمود تھا۔جب سر سر سید کی عمر پینتالیس سال کی ہوئی تو ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ایک مرتبہ انھوں نے خود ہی اس کا ذکر فرمایا تھا۔سر سید کے دونوں بیٹوں میں سے سید حامد بڑے تھے اور سید محمود چھوٹے تھے۔سید حامد پولیس میں ملازم تھے اور میری علی گڑھ کی طالب علمی کی ابتدا میں وہ حیات تھے اور پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔سید محمود نے ولایت میں جا کر تعلیم حاصل کی تھی۔وہاں سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔اپنے فن میں یعنی قانون دانی میں اپنے زمانے کے لوگوں میں نہایت ممتاز تھے۔اوّل ڈسٹرکٹ ججی کی ملازمت کی اور پھر ہائی کورٹ الہ آباد کے جج ہو گئے۔ہائی کورٹ کی ججی نو دس سال کی اور پھر سر جان ایج چیف جسٹس ہائی کورٹ سے اختلاف کی وجہ سے ججی سے استعفا دے دیا۔

میرے علی گڑھ میں آنے کے قریب تین سال بعد وہ علی گڑھ آ گئے اور سر سید کے ساتھ رہنے لگے اور کانفرنس و کالج کے کاموں میں سر سید کا بھی ہاتھ بٹانے لگے۔جب میں نے اوّل ہی اوّل ان کو دیکھا اس وقت ان کی جسمانی حالت جس کا اثر ان کے دماغ پر بھی تھا قابل اطمینان نہیں رہی تھی۔رفتہ رفتہ حالت خراب ہوتی گئی یہاں تک کہ سر سید میں اور ان میں نقیض شروع ہو گیا۔اختلاف کی وجہ سر سید کی ایمان داری اور سید محمود کی دماغی خرابی تھی۔سید محمود یہ چاہتے تھے کہ کالج کا کل مالی انتظام ان کے سپرد کر دیا جائے اور کالج کی آمدنی و خرچ کی ذمہ داری ان پر چھوڑ دی جائے۔سر سید اس پر کسی طرح بھی رضامند نہیں ہوتے تھے۔یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سید محمود کا اس معاملے میں اختلاف جنون کی حد تک پہنچ گیا اور 1897 کے آخیر اور 1898 کے شروع میں سر سید میں اور سید محمود میں اس قدر زبردست تنازعہ اور اختلاف پیدا ہوا کہ سید محمود نے سر سید سے یہ کہہ دیا کہ کوٹھی جس میں آپ رہتے ہیں یہ میری ہے آپ اپنے رہنے کا انتظام کسی دوسری جگہ کر لیجیے۔

میں 1897 میں ایم۔اے۔او کالج کے احاطے میں ایک بنگلیا میں رہتا تھا جو یونین کلب کے کچھ فاصلے پر واقع تھی۔یونین کلب سے بہت قریب ایک اور بنگلیا بھی تھی جس میں اعلیٰ

جماعتوں کے کچھ طلباء رہتے تھے۔ایک روز جب کام ختم ہونے کے بعد میں اپنے مکان پر آیا تو ملازم سے معلوم ہوا کہ سرسید اپنا کچھ سامان لے کر اس بنگلیا میں آگئے ہیں جو یونین کلب کے قریب واقع تھی۔میں نے باہر نکل کر دیکھا کہ سرسید بنگلیا کے برآمدے میں تشریف رکھتے ہیں اور سید راس مسعود سامنے کے میدان میں کھیل رہے ہیں۔میں چائے پینے کے بعد فوراً سرسید کی خدمت میں حاضر ہوا اور سرسید کی کرسیاں وسامان وغیرہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور حیرت کی وجہ یہ بھی تھی کہ ناصر خاں جو عمارت کا کام کیا کرتے تھے وہ بنگلیا کے چاروں طرف مزدوروں سے صفائی کرا رہے تھے اور سرسید کا کچھ سامان مزدور سر پر اٹھائے لا رہے تھے۔میں سمجھ گیا کہ آج سرسید سے اور سید محمود سے کوئی ایسا جھگڑا پیش آیا ہے جو سرسید کی برداشت سے باہر ہوگا۔ اس وجہ سے وہ اپنی مسکونہ کوٹھی چھوڑ کر یہاں آگئے ہیں۔میں نے سرسید سے کچھ نہیں پوچھا بلکہ کھڑا دیکھتا رہا۔سرسید نے مسکرا کر فرمایا کہ حیرت اور پریشانی کی کیا بات ہے۔تم اب بورڈنگ ہاؤس چھوڑنے کو آمادہ بیٹھے ہو۔چند ماہ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤ گے۔میں نے سمجھا کہ میں بورڈنگ میں آ کر تمھارے بجائے کسی مکان پر قبضہ کرلوں اور بورڈر بن جاؤں۔مجھے رنج تو انتہا درجہ کا ہوا لیکن میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا اور ناصر خاں کو میں نے بنگلیا کے ایک طرف کچھ کوڑا پڑا ہوا تھا اس کے اٹھانے کی ہدایت کی اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد مزید حالات دریافت کرنے کے لیے وہاں سے چلا آیا۔

حالات جو مجھے معلوم ہوئے وہ یہ تھے کہ سید محمود جو ایک عرصے سے اس بات پر مصر تھے کہ کالج کی آمدنی اور خرچ کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی جائے اور سرسید اس کام میں دخل نہ دیں۔اس کی نوبت آخر یہاں تک پہنچی کہ سید محمود نے سرسید سے نہایت سختی سے کہا کہ میری کوٹھی چھوڑ دیجیے اور کسی دوسری جگہ اپنا ٹھکانہ کیجیے۔یہ بات سن کر سرسید نے ناصر خاں کو حکم دیا کہ میرا اور راس مسعود کا ضروری سامان پلنگ وغیرہ اس بنگلیا میں پہنچا دو جو یونین کلب کے قریب واقع ہے اور راس مسعود کو اپنے ہمراہ لے کر فٹن میں بیٹھ کر اسی وقت کالج کے احاطے میں چلے آئے۔ شام ہونے سے پہلے ٹرسٹیوں میں سے چند معززین سرسید سے آ کر ملے جن میں مرزا عابد علی بیگ نواب محمد اسماعیل خاں شروانی اور سید محمد احمد برادرزادہ سرسید کے نام مجھ کو یاد ہیں۔ان لوگوں نے

اسی وقت سے سید محمود اور سرسید میں صلح وصفائی کی گفتگو شروع کر دی۔ لیکن دونوں میں سے ایک بھی اپنی بات سے نہیں ہٹتا تھا۔ سرسید کسی طور پر سید محمود کے ہاتھ میں کالج کا مالی انتظام دینا نہیں چاہتے تھے اور سید محمود سخت مصر تھے کہ کالج کی آمدنی اور خرچ کا کام مجھ پر چھوڑ کر سرسید الگ ہو جائیں۔ سرسید اس بنگلیا میں فقط چند روز رہے اور پھر ٹرسٹیوں کے درمیان میں پڑنے سے سنا کہ سید محمود نے اپنی ضد چھوڑ دی کہ کالج کا روپیہ ان کے سپرد کیا جائے اور سرسید نے بھی احباب کے کہنے سے اپنی سکونت کی کوٹھی میں واپس جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس لیے سید راس مسعود کو اپنے ہمراہ لے کر اسی طور پر واپس چلے گئے جیسے کہ آئے تھے۔

سرسید سے مولوی سمیع اللہ خاں کا اختلاف

متذکرہ بالا واقعات کا کسی دوسری جگہ ذکر دیکھنے میں نہیں آیا۔ مولانا حالی نے حیات جاوید میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ سرسیدؒ کی زندگی میں واقعات کے تذکرے میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید اور سید محمود اور سید راس مسعود کی زندگی میں انھوں نے اس واقعہ کی تفصیل بعد کی نسلوں کے لیے چھوڑنا مناسب نہ سمجھی ہوگی۔ لیکن مجھ کو اس واقعہ کا قلم بند کرنا نہایت مناسب معلوم ہوا۔ جو لوگ سرسید کی زندگی کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے یہ واقعہ نہایت اہم ہے۔ حیات جاوید اور دیگر تحریروں سے یہ بات سب کو معلوم ہے اور ہو جاوے گی کہ ان اختلافات سے قریب بارہ سال قبل جب سرسید نے کالج کے ٹرسٹیوں کی جماعت قائم کی اور اس میں اپنے کو لائف آنریری سکریٹری اور سید محمود کو جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا اور یہ بھی شرط کی کہ ان کے بعد سید محمود ان کی بجائے لائف آنریری سکریٹری ہوں گے تو اس قانون اور ان شرائط کی ایک فریق نے سخت مخالفت کی اور جس فریق کے سرغنہ جناب مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سی ایم جی تھے۔ ان کو سرسید سے تو اتنی مخالفت نہیں تھی لیکن سید محمود اور ان میں عرصے سے ناخوشگوار تعلقات چلے آتے تھے اس وجہ سے وہ نہیں چاہتے تھے کہ سید محمود جوائنٹ سکریٹری ہوں اور سرسید کے بعد بلا کسی انتخاب کے وہ سرسید کی جگہ سکریٹری بن جائیں۔ دوسرا اہم اختلاف اس بات کا تھا کہ مولوی سمیع اللہ خاں مسلمانوں میں اس قسم کی معاشرت پیدا کرنے کے حامی نہیں تھے جس قسم کی معاشرت سرسید مسلمانوں کو سکھانا چاہتے

تھے۔ مخالف پارٹی کے لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز پرنسپل اور پروفیسر کالج میں اس قدر دخیل ہو جائیں کہ مسلمان بچوں کو نہ صرف انگریزی علم بلکہ انگریزی معاشرت بھی سکھائیں۔

آخر کو دونوں فریقوں میں سخت تناتنی ہوگئی اور سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک نہایت سخت مضمون لکھا اور مولوی سمیع اللہ خاں اور ان کے دوستوں کو چیلنج دیا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم سچے ہو تو آؤ کسی ایسے ملک میں چلیں جہاں ڈویل کے لیے قانونی ممانعت نہیں ہے۔ وہاں چل کر اور آپس میں لڑ کر اپنے اختلافات کا فیصلہ کر لیں۔ (DUEL) انگریزی زبان میں دو آدمیوں کی باہمی کشتی یا جنگ کو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں سب ملکوں میں ڈویل کی اجازت تھی۔ لیکن بعد میں انگریز کے ملک میں اس کی ممانعت ہوگئی لیکن فرانس میں بدستور جاری رہی۔ سرسید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فرانس میں چل کر ہم ایک دوسرے سے لڑ کر اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ آیا تم سچے ہو یا ہم، یعنی دونوں میں سے لڑ کر جو مارا جائے گا وہ جھوٹا ثابت ہوگا اور جو بچ رہے گا وہ سچا مانا جائے گا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ادھر تو سرسید کے دل میں سید محمود کی قابلیت کی اس قدر وقعت تھی کہ وہ ان کے لیے اپنے ایک دوست یعنی مولوی سمیع اللہ خاں سے لڑنے کو تیار ہو گئے اور راقم اپنی واقفیت سے یہ جانتا ہے کہ سرسید فقط سید محمود کے لیے اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے سے لڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے تھے بلکہ سید محمود کی اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے وہ ان کو اپنے بعد سیکریٹری بنانے کے حامی تھے۔ جب سرسید نے مولوی سمیع اللہ خاں کے خلاف مذکورہ بالا مضمون لکھا تھا اس وقت سید محمود کی حالت نہایت قابل اطمینان تھی اور سرسیدؒ جانتے تھے کہ ایم۔اے۔او کالج جن مقاصد اور اصولوں کو سامنے رکھ کر قائم کیا گیا ہے ان مقاصد کی کامیابی سید محمود ہی جیسے کسی منتظم کے ہاتھ سے ہو سکتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں اور ان کے ہم خیال لوگ ان مقاصد کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔

مولوی سمیع اللہ خاں اور سرسید کے اصولوں میں فرق تھا۔ مولوی سمیع اللہ خاں نے خود عربی مدارس میں تعلیم پائی تھی۔ وہ طالب علموں کی وہی حالت قائم رکھنا چاہتے تھے جو ہمارے قدیم مدارس کے طالب علموں کی ہوتی تھی اور ہے کہ معمولی حجروں میں رہنا اور قرب و جوار کے کھاتے پیتے مسلمانوں کے گھروں سے کسی طالب علم کی ایک وقت کی یا دونوں وقت کی روٹی کا مقرر ہونا اسی کو طالب علم کی زندگی کے لیے کافی سمجھتے تھے اور اب تک عربی مدارس کے طلبا کی قریب قریب

یہی حالت ہے۔ پرانی تعلیم کے طلبا کی زندگی کے متعلق روایات بھی اس قسم کی چلی آتی ہیں کہ طالب علموں کو ایسے طور پر رہنا چاہیے کہ ان پر زیادہ صرف نہ ہو کیونکہ فارغ التعلیم ہونے کے بعد ان کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازمت ملنا یقینی بات نہیں ہے۔ اس لیے ان کو شروع ہی سے اپنا طرز زندگی ایسا رکھنا چاہیے کہ اس کو نباہ کر سکیں۔ برخلاف اس کے جدید ہائے انگریزی تعلیم میں زیادہ تر تعلیم کے بعد اچھی تنخواہ پر ہر شخص کو ملازمت کے ملنے کی امیدیں ہوتی تھیں اس لیے طلبا کو شروع ہی سے ایسی حالت میں رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ فارغ التعلیم ہونے کے بعد وہ اپنی حیثیت کو ایک اچھے پیمانے پر رکھ سکیں تا کہ لوگوں کے دل میں ان کی تذلیل نہ ہو۔

سرسید اوکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کو دیکھ کر آئے تھے اور وہاں کے طلبا کی زندگی اور معاشرت کا معیار ان کو پسند تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ طالب علموں کو تعلیم کے زمانے میں بہ لحاظ ان کے خورد ونوش اور پوشش اور بود وباش کی اچھی حالت میں رکھنا ضروری ہے تا کہ جب وہ اچھے عہدوں پر پہنچیں تو پبلک کے دل میں ان کی حالت کو دیکھ کر ان کی طرف سے کسی قسم کا کوئی تنفر پیدا نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص شروع سے مبتذل حالت میں رہے گا وہ کبھی کسی کے دل میں اپنی ظاہری عزت ووقعت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے سرسید چاہتے تھے کہ طالب علموں کو اچھے مکانوں میں رکھا جائے، اچھا لباس پہنایا جائے اور اچھا کھانا کھلایا جائے تا کہ وہ مکتبوں کے طالب علموں کی طرح مفلوک الحال معلوم نہ ہوں۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر کرنا ضروری تھا کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب اور سرسید میں جو اختلاف تھا اس کے وجوہات کیا تھے۔ سرسید اور سید محمود کے مابین جو اختلافات پیدا ہو گیے تھے وہ سید محمود کی کمزوریٔ دماغ کی وجہ سے ہوا تھا جو اس علت کی وجہ سے ان کو لاحق ہوگئی تھی جس علت کی ممانعت مذہب میں آئی ہے اور جو لوگ اس علت کو اپنے گلے لگا لیتے ہیں ان کو دنیا میں آخر کار سخت پریشانی اور نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ سید محمود کو شراب پینے کی عادت ججی کے زمانے میں پڑ گئی تھی۔ اب جوں جوں ان کی عمر بڑھتی گئی اس عادت میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ چنانچہ جب میں نے ان کو دیکھا ہے تو اس وقت ان کی دماغی حالت میں کمزوری آ گئی تھی۔ اب ان کا یہ اصرار کہ کالج کا روپیہ میرے ہاتھ میں آئے یہ بھی ان کے دماغی ضعف کا باعث تھا۔ سرسیدؒ اپنی آنکھ کے

سامنے دیکھتے تھے کہ چھ سو روپیہ ماہوار جو پنشن کا سید محمود کا مقرر تھا وہ ان کے ہاتھ میں آتے ہی ختم ہو جاتا ہے اور روپے کی ہر وقت ضرورت اور پریشانی رہتی ہے پھر ان حالات کے دیکھنے کے بعد سر سید اگر ایک معمولی آدمی ہوتے تو وہ اپنے بیٹے سے اس روپے کے معاملے میں اس قدر سخت اختلاف پیدا نہ کرتے لیکن ان کی شخصیت اور ایمانداری اور اصولوں کی پختگی ایسی نہیں تھی کہ وہ اس قسم کی کمزوری دکھاتے کہ سید محمود کے کہنے سے کالج کا روپیہ ان کو سونپ دیتے۔

سر سید اور سید محمود کا اختلاف کا واقعہ سر سید کی سوانح کا ایک لازمی جزو معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے ان کے اخلاق کی برتری اور ان کے اصولوں کی عظمت کا سکہ دل پر بیٹھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس محمود کے لیے ان کے اور ان کے دوستوں کے درمیان ایک وقت میں سخت اختلافات ہو گئے تھے، اس محمود کی حالت میں جب تغیر پیدا ہوا تو سر سیدؒ نے اس کی خواہش کا مطلق کچھ لحاظ نہیں کیا۔ سر سید کا سید محمود کی کوٹھی سے نکل کر کالج کے احاطے میں چند روز کے لیے چلے آنا سر سید اور سید محمود کے درمیان انتہائی کشیدگی کا ثبوت تھا اور سر سید کے واپس چلے جانے کے بعد سے قیاس ہوتا تھا کہ وہ کشیدگی رفع ہو گئی لیکن فی الواقع وہ کشیدگی رفع نہیں ہوئی تھی۔ اب ہم سر سید کے درمیانی حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد اس موضوع کی طرف پھر توجہ کریں گے اور سر سید کی زندگی کے آخری دنوں کے مناظر ناظرین کے سامنے پیش کریں گے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

گوسر سید نے 1872 سے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کی کوشش شروع کردی تھی اوراس دوران میں علی گڑھ میں ہائی اسکول اورکالج بھی کھل گئے تھے لیکن ان کی کوشش اور سلسلۂ جنبانی کا دائرہ بہت محدود تھا۔کہیں کسی نے بلایا تو اپنے مقاصد بیان کردیے۔مستقل طور پرکوئی ادارہ بطور منتظمہ جماعت کے تعلیم کی تحریک کو پھیلانے کے لیے قائم نہیں ہوا تھا۔اس کے علاوہ عجیب بات یہ تھی کہ مسلمانوں کی قوم میں کسی مقام پربھی کوئی جماعت پولیٹکل وسوشل اور تعلیمی معاملات میں قوم کوان مقاصد کی طرف توجہ دلانے کے لیے کہیں قائم نہیں ہوئی تھی۔ممکن ہے کہ مذہبی مقاصد کوتقویت دینے کے لیے کہیں کوئی انجمن وغیرہ کبھی قائم ہوئی ہو۔لیکن دیگر مقاصد کے لیے کوئی جماعت نہیں تھی۔مسلمان تو درکنار جہاں تک راقم کی واقفیت ہے ہندوؤں کی کثیر التعداد قوم جوتعلیم میں بہت آگے بڑھ گئی تھی اس میں بھی کوئی پولٹیکل جماعت 1885 سے قبل قائم نہیں ہوئی تھی۔1886 میں سب سے اول انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی اوراس جماعت کی تنظیم کی پیروی منجملہ اورلوگوں کے سرسریندرناتھ بنرجی آنجہانی نے بھی کی تھی۔ڈاکٹر سرسریندرناتھ بنرجی نے ہندوستان کے مختلف صوبوں اورشہروں کا دورہ کیااوروہ علی گڑھ میں بھی آئے۔علی گڑھ کی ہندو جماعت نے سرسید سے کہا کہ آپ اس جگہ کیونکہ سب سے بڑے لیڈر ہیں اورکانگریس کی تحریک

ایک جدید تحریک ہے، آپ ڈاکٹر سر سریندر ناتھ بنرجی کی آمد کے سلسلہ میں ایک جلسے کا اہتمام فرمائیے اور کیونکہ کوئی دوسرا مقام اس کے لیے موزوں معلوم نہیں ہوتا اس لیے سائنٹیفک سوسائٹی کے ہال میں اس جلسے کے انعقاد کا انتظام کیجیے۔ سر سید نے اس کو منظور کرلیا اور سائنٹیفک سوسائٹی کے ہال میں جلسے کا اہتمام کیا اور بہت سے لوگوں کو مدعو کیا۔ اس جلسے میں ہمارے انگریز پروفیسر بھی شریک ہوئے۔ یہ جلسہ سر سید کی صدارت میں منعقد ہوا۔

ڈاکٹر سر سریندر ناتھ بنرجی نے اس جلسے میں کانگریس کی تائید میں ایک تقریر کی اور بعض حصے اس تقریر کے بہت ہی پر اشتعال اور گرم الفاظ میں بیان کیے۔ چنانچہ انگریز پروفیسروں کی طرف اشارے کر کے کہا کہ یہ سفید گدھ جو ہندوستانیوں کا گوشت کھا رہے ہیں اور کھانے کو بیٹھے ہیں ان کو یہاں سے نکالنا مقصود ہے اور ہندوستان کے وسیع ملک کی سیاست وحکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آنا ضروری ہے۔ کیونکہ کسی غیر ملک کی قوم کو دور دراز مقام سے آ کر ہم پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ غالباً انھوں نے نظام حکومت کے متعلق بھی کچھ بیان کیا کہ کس طور پر ہم اپنی پارلیمنٹ بنائیں گے اور کس طرح ہم اپنے وزراء کو ہندوستان کی سیاست میں سیاہ وسفید کے اختیارات دیں گے (یہ کل واقعات جو سر سریندر ناتھ بنرجی کے متعلق لکھے گئے ہیں 1886ء کی کانگریس تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ان صاحبوں سے سنے جو اس جلسے میں شریک تھے کیونکہ اس وقت میں کالج میں داخل نہیں ہوا تھا)

سر سید نے جب سر سریندر ناتھ بنرجی کی تقریر سنی تو ان کے دل میں ایک خدشہ پیدا ہوا کہ اس قسم کی حکومت کا مسلمانوں کی قوم پر کیا اثر پڑیگا۔ یہ لوگ ابھی سے خشمگیں نگاہوں سے انگریزوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جب ان کو سیاسی اختیارات حاصل ہوجائیں گے تو پھر یہ ملک کی اقلیتوں کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ اس مسئلے پر وہ غور فرماتے رہے اور کانگریس کی جماعت قائم ہوگئی اور اس کی شاخیں بھی بڑے بڑے مقامات پر قائم ہوگئیں اور اپنے سالانہ جلسوں میں وہ ہندوستان کی آزادی پر ریزولیوشن بھی پاس کرنے لگے اور بڑی بڑی اشتعال انگیز اور سخت تقریریں کرنے لگے۔ مسلمان عام طور پر ابھی کانگریس میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ بعض بڑے بڑے مسلمان کلکتہ بمبئی وغیرہ میں اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے اور چاروں طرف سے مسلمانوں

نے سر سید سے یہ تقاضا کرنا شروع کیا کہ آپ اس مسئلہ میں ہماری رہنمائی کیجیے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ سمجھ دار مسلمانوں کے دل میں وہی خدشات پیدا ہو گئے تھے جو سر سید کے دل میں تھے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام

سر سید ابھی تک خاموش تھے لیکن 1887 میں سر سید کو مجبوری سے مہر سکوت توڑنی پڑی اور انھوں نے ارادہ کر لیا کہ اب مسلمانوں کو بھی ایک جماعت بنام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرنی چاہیے تا کہ سال میں ایک مرتبہ کسی ایک مقام پر جمع ہو کر سب کو تبادلۂ خیالات کا موقع ملے۔ چنانچہ کانگریس کے قائم ہونے کے قریب ایک سال بعد انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک جماعت قائم کی اور اس کے پہلے سالانہ جلسے میں کانگریس کے اصولوں کی مخالفت فرمائی اور کہا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک نہیں ہونا چاہیے، اگر وہ شریک ہوں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ ہمارے ہم وطن جمہوری حکومت کی کوئی قابلیت نہیں رکھتے نہ انھوں نے کبھی اس قسم کی حکومت کی ہے اور نہ ان میں جنگی اوصاف باقی رہے ہیں۔ یہ ملک میں امن قائم نہیں رکھ سکیں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر کثرت رائے سے حکومت کے سب معاملات طے ہوں گے تو حکومت میں مسلمانوں کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوگا۔

سر سید علیہ الرحمۃ نے جو خیالات اس وقت قائم کیے تھے ان کی صداقت بعد میں اچھی طرح سے ہو گئی اور 1947 میں تقسیم ملک کے بعد ملک کے دونوں حصوں میں جو قتل و غارت اور خونریزی کا بازار گرم ہوا اس سے ہر شخص واقف ہے۔ 1947 کے واقعات کی مکمل تاریخ مورخ لکھیں گے جو بعد کو ناظرین کے سامنے آئے گی لیکن سر سید کی پولیٹکل دور اندیشی اور دور بینی کی تصدیق بعد میں ہو گئی۔

میرے دل میں طالب علمی ہی کے زمانے سے ایک خلجان پیدا ہو گیا تھا کہ آیا سر سید جیسا آدمی ظاہر داری سے انگریزوں کے خوش کرنے کے لیے کانگریس کی مخالفت کرتا ہے یا کانگریس سے ان کی مخالفت ایمان داری اور دور اندیشی پر مبنی ہے۔ اور اگر وہ انگریزوں کے خوش کرنے کے لیے کانگریس کی مخالفت کرتے ہوں تو ان کی اس عظمت میں جو مسلمانوں کے دل میں ہے بہت فرق آ جانا چاہیے۔ پھر وہ کسی بڑے اصول کی پابندی کی وجہ سے ایک بڑے ریفارمر

نہیں سمجھے جا سکتے ۔ میں نے سر سید کے انتقال سے قریب ڈیڑھ سال قبل اپنے اس خدشہ کو سر سید کے سامنے پیش کیا اور اپنا اطمینان کر لیا کہ سر سید کی نسبت لوگوں کے خیالات نہایت غلط ہیں ۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سچائی سے کہتے ہیں نہ کہ انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے ۔ میں ایک روز خاص اسی غرض کے لیے سر سید کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اپنا خدشہ جو ان کی نسبت پیدا ہو گیا ہے اس کی صفائی کر لوں ۔ جب میں حاضر ہوا تو وہاں اور بھی آدمی بیٹھے تھے ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے عرض کیا کہ میں آج ایک خاص معاملے میں علاحدگی میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ چنانچہ سر سید نے ان صاحبان سے جو وہاں بیٹھے تھے کہا کہ آپ لوگ تھوڑی دیر کے لیے دوسرے کمرے میں بیٹھ جایئے تا کہ علاحدگی میں ان کی (یعنی میری) بات سن لوں ۔

چنانچہ جب دوسرے سب صاحب تشریف لے گیے تو پھر میں نے صفائی سے یہ عرض کیا کہ آپ تو کانگریس کے مخالف ہیں اور میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ یہ مخالفت سچے وجوہات پر مبنی ہو گی لیکن لوگ یہ کہتے ہیں کہ سر سید انگریزوں کے کہنے سے اور ان کو خوش کرنے کے لیے کانگریس کی مخالفت کر رہے ہیں ۔ میں آج یہ ارادہ کر کے آیا ہوں کہ میں آپ سے اس بات کی صفائی کر لوں کہ اس معاملے میں اصلیت کیا ہے تا کہ آپ کے بعد دوسروں کی طرح میرے دل میں بھی شبہات باقی نہ رہ جائیں کہ آپ کی ملکی پالیسی آپ کے دلی خیالات کا عکس نہیں تھا بلکہ حکومت موجودہ کے خوش کرنے کو آپ کانگریس کی مخالفت کر رہے تھے ۔ سر سید میرا بیان سن کر بہت ہی خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں خود چاہتا تھا کہ لوگ میرے پاس آئیں اور میں ان کے سامنے کانگریس کے متعلق اپنے دلی خیالات کا اظہار کروں ۔ کیا ہی اچھا ہوا کہ تم نے خود یہ معاملہ چھیڑا اور مجھ سے میری سچی رائے دریافت کی اور اب میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں اور تم سے یہ خواہش کرتا ہوں کہ جو کچھ میں تم سے کہوں میرے بعد مسلمانوں کے سامنے تم اس کو پیش کر دینا ۔ کانگریس کے متعلق جو کچھ میرے خیالات ہیں وہ سچائی اور ایمان داری کے ساتھ ہیں ۔ میں اہل ملک کی آزادی اور حکومت خود اختیاری کا مخالف نہیں ہوں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی رفتہ رفتہ انگریزوں کی حکومت سے نجات پا جائیں لیکن میں ہندوستان میں اس قسم کی حکومت خود اختیاری کا حامی اور قائل نہیں ہوں جیسی حکومتیں مغربی یورپ کے ممالک

انگلستان اور فرانس میں قائم ہیں۔

یورپ کے ان ممالک میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے لوگ ایک مذہب ایک رنگت، ایک لباس، ایک تہذیب، ایک زبان کے مالک ہیں اور ایک ہی نسل سے ہیں ان میں اور اختلافات ہوں تو ہوں لیکن اس قسم کے اختلافات نہیں ہیں جو اختلافات ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہیں۔ ہندوؤں کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو بتوں کو پوجتے ہیں اور مسلمان ان بتوں کو توڑنا کار ثواب سمجھتے ہیں۔ ہندو گائے کی پوجا کرتے ہیں اور مسلمان اسی گائے کو ذبح کر کے کھا جاتے ہیں۔ ہندو مسلمان آپس میں بیاہ شادی نہیں کرتے۔ ان دونوں قوموں کا کھانا پینا بھی الگ ہے۔ ان دونوں قوموں کے خیالات اور طرز زندگی میں بنیادی اختلافات ہیں اور ان میں کسی قسم کا قومی اور ملکی اتحاد نہیں ہے۔ ایسی حالت میں انگلستان اور فرانس کے نمونے پر کسی حکومت کا قائم ہونا ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے اور ہندو مسلمانوں میں سخت اختلاف ہیں مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوگا۔ میں ہندوستان کی آزادی اور خود مختار حکومت کا مخالف نہیں ہوں بلکہ میں اس طرز کی حکومت کا مخالف ہوں جو کانگریس کا مطمح نظر ہے۔ کانگریس یہ چاہتی ہے کہ ملک کے باشندے بلا کسی قید و روک ٹوک کے اپنے قائم مقاموں کا ایک گروہ منتخب کریں۔ اس قسم کی کثرت رائے کی حکومت لامحالہ کل اقتدار و اختیار ہندوؤں کے ہاتھ میں پہنچا دے گی۔ مسلمان اقلیت میں ہیں وہ کسی معاملے میں بھی خواہ سراسر ان کے حقوق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اکثریت کی رائے کو روک نہیں سکیں گے۔ اور ہندوستان میں اکثریت کی حکومت بجائے جمہوری حکومت کے مسلمانوں کے لیے ایک استبدادی حکومت ہو جائے گی۔ ایسی جمہوری حکومت میں اور شخصی حکومت میں مسلمانوں کے لیے کوئی تفاوت نہیں رہے گی۔

میں سرسید کے اس فرمان کو نہیں بھولا ہوں۔ میں نے آفتاب احمد خاں مرحوم اور دیگر احباب کے سامنے سرسید کی یہ رائے پیش کر دی تھی اور ان کے انتقال کے بعد سالانہ جلسوں میں بھی اس رائے کا اظہار کرتا رہا۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم نے شاید خود بھی کبھی سرسید سے کانگریس کے معاملے میں گفتگو کی تھی۔ وہ سرسید کی صداقت اور خلوص کے بالکل قائل تھے۔ لیکن مولانا طفیل احمد مرحوم کو سرسید کے زمانے میں پولیٹکل معاملات میں دخل نہیں دیا کرتے تھے

لیکن بعد میں وہ سرسید کی پولیٹکل رائے کے بہت مخالف رہےاور مولانا طفیل احمد مرحوم نے بعد میں اپنی کتاب موسومہ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں سرسید کی صداقت پر سخت حملے کیےاور لکھا کہ انگریزوں کے بہکانے سے اور ان کو خوش کرنے کے لیے سرسید نے کانگریس کی مخالفت کی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم بھی سرسید کی رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن اپنی زندگی میں اپنی تصنیفات میں کبھی سرسید کی صداقت پر حملہ نہیں کیا لیکن ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ''حیات شبلی'' میں سرسید کے مذہبی و پولیٹکل اور دیگر خیالات پر بہت کچھ نکتہ چینیاں کی ہیں۔ میں اپنی ذاتی واقفیت سے مولوی صاحب موصوف کی نکتہ چینیوں کی تصدیق نہیں کرسکتا بلکہ ان نکتہ چینیوں کو مولوی صاحب کی ناواقفیت پر محمول سمجھتا ہوں۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تھی تو ایجوکیشنل کانفرنس یعنی تعلیمی کانفرنس، لیکن سرسید نے اس سے ایک بہت بڑا پولیٹکل کام لیا کہ کانگریس کی پولیٹکل پالیسی سے مسلمانوں کو آگاہ کردیا اور سرسیدؒ کی تقریر جو انھوں نے کانفرنس کے موقع پر 1878 میں کی اور جو چھپ چکی ہے۔ اس نے ہندوستان کی آئندہ پولیٹکل رفتار کے بارے میں مسلمانوں کو بیدار کردیا۔ اگر سرسید ٹھیک موقع پر مسلمانوں کو بیدار نہ کرتے تو ان کی کوئی بھی پولیٹکل پالیسی نہ ہوتی۔ زیادہ تر لوگ پولیٹکل خیالات سے لاپرواہی کرتے اور کچھ لوگ کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ ہو جاتے لیکن ان کی آواز میں کوئی اثر کسی کو محسوس نہ ہوتا کیونکہ وہ ایک خالص اور مضبوط ارادے سے کانگریس کی کامیابی کی تحریک میں نہ شریک ہوتے اور نہ ان کو شریک کیا جاتا۔ وہ مثل شودروں کے جو ہندو تو کہلاتے ہیں لیکن ہندوؤں کی سوسائٹی میں نہایت ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طور پر کانگریس کے ممبر بننے سے ان کا درجہ شودروں سے کچھ اونچا نہ ہوتا۔ ہندوؤں کا قومی نظام تمام دنیا کی قوموں سے نرالا ہے۔ ان کے مذہبی قوانین کی رو سے کسی شخص کا بھارت ورش میں پیدا ہونا اور اونچی تین ذاتوں میں پیدا نہ ہونا کسی کو بھارت ورشی نہیں بنا سکتا۔ بلکہ پیدائش جو شخص جس ذات میں پیدا ہوگا وہی اس کی قوم ہے۔ برہمن کے گھر جو پیدا ہوگا اس کی قوم بھی برہمن ہی ہے اور اسی طور پر چھتری یا ویش کے گھر پیدا ہوگا تو اس کی قوم بھی چھتری اور ویش ہی ہوگی۔

ہندوؤں میں تین اونچی ذاتیں ہیں یعنی برہمن، چھتری اور ویش، ان تینوں ذاتوں

میں سے جو شخص نہ ہو اس کو ہندو مقصوں نے آریہ ورت اور بھارت ورش میں رہنے کا حق نہیں دیا اور نہ اس کو یہاں کی زمین میں کوئی حق دیا ہے۔ ہندوؤں میں ایک قوم خاص خدا کی منتخب کردہ قوم ہے جس کے لیے خدا نے سب چیزیں پیدا کیں۔ جو برہمن کہلاتے ہیں وہ بہت ہی پاک ہیں اور ان کو پیدائشی حقوق دوسرے تمام ہندوؤں کی نسبت بہت زیادہ اور مخصوص ملے ہیں۔ محنت مشقت کرنا ان کا حصہ نہیں ہے صرف تعلیم اور تعلم اور دوسروں کو مذہبی رسومات میں مدد دینا یہی ان کا کار منصبی ہے اور ان کا درجہ اتنا بڑھا دیا ہے کہ بڑے ہندو رشی یا مقنن منوجی نے فرمایا ہے کہ برہمن کی خدمت کرنا اور عزت کرنا ہر دوسری قوم کے لوگوں کا فرض ہے۔ وہ یہاں تک فرماتے ہیں کہ اگر برہمن کی عمر دس سال کی ہو اور راجہ کی عمر سو سال کی ہو تو سو سال کی عمر کا راجہ اس دس سال کے برہمن کو مثل اپنے باپ کے سمجھے۔ منوجی نے عام ملکی قوانین وضع کیے بلکہ مختلف ذاتوں کے لیے الگ الگ قوانین وضع کیے۔ برہمنوں کے لیے الگ اور چھتریوں کے لیے الگ اور ویشوں کے لیے الگ اور شودروں کے لیے الگ اور تعزیری قانون میں بھی ان چاروں ذاتوں کے لیے اکثر سزائیں بھی الگ الگ تجویز کی ہیں۔ سب سے بڑا کارنامہ یہ کیا ہے کہ ہندوستان کا یہ علاقہ جو اب انڈین یونین میں آ گیا ہے اور جس کی حدود شمال میں ہماچل (ہمالیہ) جنوب میں بندھیا چل، مشرق اور مغرب میں سمندر، یہ کل علاقہ برہمن چھتریوں اور ویشوں کو دیا ہے اور شودروں کے لیے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس علاقے میں شودروں کو زمین کا کوئی حصہ نہیں دیا جاتا، وہ اپنی محنت مزدوری سے جس طرح چاہیں اپنا پیٹ بھریں اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ حدود مذکورہ بالا سے جو لوگ باہر رہتے ہیں وہ ملچھ ہیں، ان کو اس ملک میں نہ آنے دیا جائے۔ یہ سب باتیں ''منوسمرتی'' میں ملتی ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں میں جمہوریت کا رجحان طبع موجود ہے تو مجھ کو حیرت ہوتی ہے کیونکہ ان کا عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہندوؤں کی سیاست اور سوسائٹی کی ہر چیز ذات پات کی تفریق پر مبنی ہے۔ ان کی ذاتوں میں سے کسی ذات کے تعلقات دوسری ذاتوں سے جمہوریت کے نہیں ہیں۔ میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ کل افراد ہندو سوسائٹی کے دلوں پر منوسمرتی کے اصول اس وقت تک حاوی اور غالب ہیں۔ ہندوؤں کی تینوں ذاتوں میں باہم کسی قسم کا رابطہ و اتحاد یا واسطہ ابھی

تک قائم نہیں ہوا ہے۔

ہندو قوم کا کسی جمہوری سلطنت کا قائم کرنا دشوار ہے کیونکہ جمہوریت کی روح تو قومی اور افرادی مساوات میں مضمر ہے لیکن ہندوؤں میں تو نہایت صفائی کے ساتھ غیر مساوات کی تعلیم بھی ہوئی ہے اور اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ ایک برہمن پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر جمہوریت کی تعریف میں فصاحت اور بلاغت کا دریا بہا دے گا لیکن پنڈال سے باہر نکل کر وہ کبھی اس بات کو گوارہ نہیں کرے گا کہ ایک بھنگی یا ایک ہابوڑہ یا ایک سانسیا یا ایک چمار ایک کنجڑ سے ہاتھ ملائے یا اس کے ہاتھ سے لے کر پانی پی لے۔ یہ جمہوریت کا خیال جس کو کانگریس نے اپنا بنیادی اصول قائم کر رکھا ہے یہ خیال قطعی بے اصل ہے۔ حقیقت میں کانگریس نے یہ خیال انگریزوں سے اور یورپ کی دوسری قوموں سے مستعار لیا ہے۔ کانگریس کے لیڈروں کا جمہوریت کے اصولوں کی تلقین کرنا مطلق کسی اصلیت پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جیسے انگلستان اور فرانس جمہوری حکومتوں کی وجہ سے دنیا میں بہت بڑی متمول اور طاقتور قومیں بن گئیں اسی طور پر ہم بھی جمہوریت کی مدد سے ایک بڑی متمول قوم بن جائیں گے، لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ انگلستان، فرانس اور ہندوستان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انگریزی میں مثل ہے کہ فلاں شخص دوسروں سے مستعار پر لے کر اُڑ رہا ہے لیکن اگر اس کے وہ مصنوعی پر جھڑ جائیں تو وہ سرنگوں زمین پر گر پڑے گا۔ ہماری کانگریس بھی یاد رکھے کہ ان مستعار پروں پر اڑنے کا ثبوت ہمارے ملک نے پہلے دے دیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ سرسید نے مسلمانوں کے کان کھول دیے کہ ہندوستان میں انگلستان اور فرانس کی طرح کسی جمہوری حکومت کا قائم ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے اور اگر مسلمان اس تحریک میں شامل ہوں گے تو ان کی حالت شودروں کی حالت سے بھی بدتر ہوگی۔ شودروں کو تو صرف یہ سزا ملی تھی کہ ملکی دولت اور زمین اور تجارت وغیرہ کی شرکت سے ان کو محروم کر دیا گیا تھا۔ لیکن مسلمان جوان حدود کے اندر باہر سے آ کر آباد ہو گئے ہیں جو حدود منوجی نے ہندوؤں کے لیے مخصوص کر دیے تھے وہ اس ملک میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک قوم کی حیثیت سے منوسمرتی کے قانون کی رو سے رہ بھی نہیں سکتے۔

پس سرسید کی پولیٹکل تعلیم جو انھوں نے مسلمانوں کو دی وہ اپنی جگہ مضبوطی سے قائم

ہے اور اس وقت تک قائم رہے گی جب تک فرقہ پرست ہندو قدیم خیالات اور اعتقادات میں تبدیلی پیدا کر کے اپنے میں وہی قومی خصوصیات پیدا نہ کرلیں جو ایک جمہوریت کی کامیابی کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔ جب تک فرقہ پرست ہندوؤں میں جمہوریت کی یہ خصوصیات پیدا نہ ہو جائیں اس وقت تک مسلمانوں کو عزت سے ایک شہری کی زندگی اس ملک میں بسر کرنا دشوار ہوگی کیونکہ مسلمان اگر اکثریت کی مخالفت کریں گے تو وہ غدار اور ملک وقوم کے دشمن سمجھے جائیں گے۔ اب جب تک کہ فرقہ پرست ہندوؤں میں جمہوریت کے خیالات پیدا نہ ہو جائیں اس وقت تک مسلمانوں کو بجز اس بات کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی حفاظت خوداختیاری کے لیے جدوجہد کرتے رہیں۔

ہمیں اپنے فرقہ پرست ہندو ہم وطنوں کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی جو پولیٹکل جلسوں کے پلیٹ فارم سے ملک کے سامنے پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر مسلمان اختلاف نہ کریں تو ہمارے ملک میں بھی ایک بڑی طاقتور جمہوری سلطنت قائم ہو جائے گی۔ ان کی غرض اس بیان سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اپنی قومی عزت و وقار اور اپنی بہبودی کے مصالح پر غور کرنا اور ان سب باتوں سے تائب اور دست بردار ہو کر اکثریت کی ہر بات آمنا وصدقنا کہہ کر مان لیں تو ہندوستان میں ایک طاقتور جمہوری سلطنت قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اکثریت کے لیڈروں اور واعظین کی جمہوریت کا مطلب نہیں سمجھتے۔ جمہوریت ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ ملک کے سب لوگ باہمی تبادلۂ خیالات سے اور مشوروں سے جو بات طے کریں اور اس پر اتفاق یا کثرت رائے ہو جائے تا کہ اس کو جمہور کی رائے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ملک کی آبادی کا ایک کثیر حصہ دوسرے قلیل حصہ سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اپنی زبان بند رکھو اور ہماری کسی بات میں تم دخل اندازی نہ دو اور اگر ہماری رائے سے اختلاف کرو گے تو اس کو جمہوریت کی مخالفت پر محمول کریں گے، تو صاف ظاہر ہے کہ ایسی اکثریت کی رائے جمہور کی رائے نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اقلیت کی رائے کا مطلق کچھ لحاظ نہ کیا جائے، اس کو اپنے مشوروں میں بھی نہ شریک کیا جائے اور ہر بات میں اس کی زبان پر اور قلم پر پابندی لگادی جائے تو ایسی یک طرفہ رائے یا قرارداد کو کوئی شخص جمہور کی رائے نہیں کہہ سکتا۔ میں نہایت غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مذہبی اکثریت کے اکثر لیڈر جمہوریت سے یہ مطلب سمجھتے

ہیں کہ مذہبی اکثریت کی جو رائے اور پالیسی ہو وہی جمہوریت ہے اور مسلمانوں کی جماعتیں اپنی بہبودی کے متعلق اگر کوئی رائے ظاہر کریں تو وہ جمہوریت کی مخالفت رائے متصور ہوگی اور اس کا دوسرا نام فرقہ پرستی ہے۔ میرے خیال میں مذہبی اکثریت کے لیڈروں میں اکثر خواہ وہ بڑے سے بڑا لیڈر ہو یا چھوٹے سے چھوٹا لیڈر ہو، اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور یہی غلط فہمی بطور رکاوٹ کے ہمارے نظام سیاست میں حائل ہے کہ جس کی وجہ سے ہندوستان کبھی بھی ایک جمہوری ملک نہیں بن سکے گا۔ مذہبی اکثریت سے مراد یہ ہے کہ ہندوا کثریت یا مسلمان اکثریت ہمارے ملک کی ایک خاص حالت جو انگلستان اور فرانس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ انگلستان اور فرانس کے طرز کی جمہوری سلطنت ہم اپنے یہاں قائم کریں تو اس میں ہماری غلطی ہوگی اور ہم کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ ہم کو بہت غور کے بعد اپنے ملک میں ایک ایسے طرز کی جمہوری سلطنت قائم کرنی چاہیے جو حالات کے موافق ہو اور ملک کے عام طبائع اس کو قبول کرسکیں۔ اب یہ سوال کہ ہمارے ملک کی حالت کے مطابق جو حکومت قائم ہو اس کے نظام کس طریقے سے ترتیب دیا جائے۔ اس کی نسبت میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فرقہ پرست گروہ کی زبان بند کی جائے کہ وہ ملک میں اختلاف اور خلفشار پیدا نہ کرسکیں۔ اختلاف تو ہوتے ہیں لیکن فرقہ پرست ہندو جس طور پر اختلاف کرتے ہیں وہ دیگر ممالک کے جمہوری اصولوں کے خلاف ہیں۔ یہاں پر ہم کو صرف یہ دکھانا منظور تھا کہ سرسید کی رائے نہایت صائب تھی کہ انگلستان اور فرانس جیسی جمہوری حکومت ہندوستان میں قائم نہیں ہوسکتی اور اس رائے کی تائید اور تصدیق واقعات کر رہے ہیں۔

سرسید کی تعلیمی تحریک کا مقصد

سرسید نے جب یہ دیکھا کہ اس ملک میں عام تعلیم کے اداروں سے مسلمانوں کو کوئی نفع نہیں پہنچ رہا ہے، انگریزی کالجوں اور اسکولوں میں لکھوکھا بچے تعلیم پاتے ہیں لیکن مسلمان کی تعداد ہر سو بچوں میں پانچ بھی نہیں ہے تو انھوں نے اس کمی کی وجوہات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ مسلمان ابھی تک سب پرانے خیالات کے جکڑ بند میں پھنسے ہوئے ہیں اور دوسرے مذہب کے بچوں کے ساتھ مشترکہ تعلیم میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔ ایسی حالت میں جب تک مدارس اور کالجوں کا ایک حصہ مخصوص طور پر ان کی تعلیم کے لیے قائم نہیں ہوگا وہ ترقی نہیں کرسکیں گے۔ ادھر ہمارے مولوی

صاحبان برابر اپنے فتوے جاری کیے جاتے تھے کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے اور بچوں کے والدین اگر انگریزی پڑھائیں گے تو ان پر سخت عذاب ہوگا کہ انھوں نے اپنے دین اور مذہب کے رستے سے ہٹا کر گمراہی اور معصیت کے رستے پر لگا دیا۔ سرسید نے اپنے اصولوں کے موافق مسلمانوں کو جداگانہ مدارس اور کالجوں کے قائم کرنے کی ترغیب دی۔ اس ترغیب میں ایک فائدہ اور ایک نقصان بھی تھا۔ فائدہ تو یہ تھا کہ مسلمان جب عام انگریزی مدارس میں تعلیم پاتے ہی نہیں تو ان کے لیے جداگانہ مدارس کا قائم کرنا ضروری ہے جس میں انگریزی اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ مذہب کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ بچوں کو اسکولوں میں آنے کی ترغیب ہو۔ لیکن نقص اس میں یہ تھا کہ وہ عام تعلیم کے مدارس سے علاحدگی کی وجہ سے اپنے ملک کے ماحول سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے تھے۔ ہندو تعلیم میں بہت آگے بڑھ گئے تھے اور مسلمان بہت ہی پیچھے رہ گئے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کا جداگانہ مدارس میں تعلیم پانا ترقی یافتہ گروہ سے ان کو بالکل الگ کر دینا تھا جس کا اثر مسلمانوں کے اوپر اچھا نہیں پڑا۔ ہندوستان کی تعلیم کے اوپر ملک کے روپے میں سے کثیر رقم خرچ ہوتی تھی۔ اس کثیر خرچ میں مسلمانوں کا بہت ہی قلیل حصہ تھا۔ خود ان کے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ وہ گورنمنٹ کے برابر یونیورسٹیاں اور کالج قائم کر کے اپنے بچوں کو تعلیم دے سکیں۔ جداگانہ تعلیم کے اداروں کی تحریک ایک سخت مجبوری پر مبنی تھی۔ اس سے مسلمانوں کو بہت ہی کم نفع پہنچنے کی امید تھی تاہم سرسید نے یہ مناسب سمجھا کہ جداگانہ مدارس قائم کر کے مسلمانوں کو تعلیم دی جائے تاکہ نہ ہونے سے کچھ تو ہو جائے گا۔

ہم ہندو قوم کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی قوم میں مولوی صاحبان جیسا کوئی گروہ ترقی کے راستہ میں حائل ہونے والا نہیں تھا اور اسی وجہ سے اس سرخرو قوم نے انگریزی یا جدید تعلیم میں بہت ترقی حاصل کر لی اور اپنے گروہ میں بہ کثرت عالم، فاضل، مصنف، مورخ، سائنسداں اور ہیئت داں پیدا کر لیے جن کی وجہ سے اس گروہ میں مخصوص طور پر بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ سرسیدؒ کی کوشش کا بہت بڑا نتیجہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ تھا جو بعد میں ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے درجے کو پہنچا۔ لیکن مسلمانوں کی تعداد ہندوستان میں قریب دس کروڑ کے تھی اس لیے صرف ایک کالج یا ایک یونیورسٹی سے ان کی تعلیمی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ سرسید نے محمڈن

ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعے سے جدید اور انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلانی شروع کی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ایک وقت میں تمام ہندوستان پر حاوی ہوگئی تھی۔ صوبہ یو۔ پی و پنجاب اور دہلی میں کئی کئی مرتبہ اس کے سالانہ اجلاس ہوئے اور ان کے علاوہ کولکتا میں ڈھاکہ میں ممبئی و گجرات میں مدراس میں کراچی میں لاہور میں پونا میں ریاست خیر پور سندھ میں سورت میں غرض یہ کہ ہر ہر صوبے میں کہیں ایک مرتبہ کہیں ایک سے زیادہ مرتبہ اس کانفرنس کے اجلاس ہوئے اور اس کے لیے مسلمانوں میں بہت کچھ قومیت کا جذبہ پیدا کیا اور اپنی طرف کھینچا۔ سرسید اپنی زندگی میں صوبہ یو۔ پی اور پنجاب سے باہر نہیں گئے لیکن ان کے بعد نواب محسن الملک مرحوم ان کے جانشین نے اس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ایک بہت بڑا ادارہ بنا دیا اور ہز ہائی نس سر آغا خاں مرحوم، علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ مغفورہ والئی بھوپال اور دیگر بڑے بڑے اکابر قوم کو مختلف مقامات پر مدعو کر کے کانفرنس کی صدارت کی کرسی پر بٹھایا اور قوم کے دلوں میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی ہستی کا احساس پیدا کرایا۔

نواب محسن الملک مرحوم ایک بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ کانفرنس میں ان کی تقریر سننے کے لیے ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے تھے اور جس مقام پر جلسے ہوتے تھے وہاں کی آب و ہوا میں مسلمانوں کی خاص ہستی کا احساس ہندو اور مسلمان کے دلوں میں پیدا ہو جاتا تھا۔ سرسید کے زمانے میں کانفرنس کے سب سے بڑے ہیرو یعنی سب سے اچھی تقریر کرنے والے شمس العلما مولانا مولوی ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی تھے۔ میں نے دس بیس کانفرنسوں میں شرکت کی اور ہر کانفرنس میں مولوی نذیر احمد صاحب کی تقریروں اور فصاحت و بلاغت کا ڈنکا بجا گیا۔ مولانا نذیر احمد صاحب کے علاوہ اعلیٰ مقرر ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے اور بہت بڑے ظریف تھے۔ ان کی کتابیں توبۃ النصوح وغیرہ اس وقت تک مسلمانوں کے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے بہت روپیہ کمایا۔ قرآن پاک کا پہلے صرف ایک ترجمہ تھا یعنی جناب مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ تھا اور وہ ترجمہ نہایت ہی ابتدائی اور سادہ اردو زبان میں کیا گیا تھا۔ اور شاہ صاحب نے اس میں کہیں کہیں ہندی الفاظ اور پنجابی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ جرمانہ یا تاوان جو اردو میں بولا جاتا ہے پنجابی میں اس کو چٹی کے الفاظ

سے ادا کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے محض لفظی ترجمہ کیا ہے اور اکثر مقام پر اردو داں نہیں سمجھ سکتے کہ اس کا کیا مطلب ہے تاہم جس وقت مولانا نذیر احمد صاحب نے قرآن پاک کے ترجمے کے لیے قلم اٹھایا اس وقت شاہ صاحب موصوف کے ترجمے کے علاوہ کوئی ترجمہ میدان میں مشہور نہیں تھا۔ مولانا نذیر احمد صاحب نے شاہ صاحب کے ترجمے کے زمانے سے کوئی ساٹھ ستر سال بعد میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمے کے وقت اردو زبان کو بہت فروغ اور ترقی ہو گئی تھی۔ اس لیے ان کا ترجمہ اردو داں مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا اور جناب مولانا نے اس سے لاکھوں روپے کمائے۔

مولانا نذیر احمد صاحب اکثر اپنی تقریریں نظم سے شروع کیا کرتے تھے۔ ایک کانفرنس کے موقع پر انھوں نے اپنی تقریر کے شروع میں وہ نظم پڑھی تھی جس کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

پھر آخر ہوا سال خورشید خاور　　　کہ ہو چکنے پر آیا ماہ دسمبر

اس قسم کی بہت سی نظمیں کانفرنس کی تقریروں میں موجود ہیں اور ممکن ہے کہ بعض رپورٹوں میں موجود نہ بھی ہوں کیونکہ مولانا مرحوم اکثر اپنی تقریریں مع نظموں کے جداگانہ رسالوں کی شکل میں طبع کرا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ روپیہ کمانے کا مولانا کو بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ مولانا آپ کو روپیہ کی بہت ہوس معلوم ہوتی ہے آپ روپیہ کمائے جاتے ہیں لیکن آپ کی نیت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ فرمایا کہ کسی کا زبردستی تو نہیں لیتا ہوں۔ تصنیف سے میں روپیہ کماتا ہوں تصنیف میری زندگی کا شغل ہے اور روپیہ کمانے میں مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ شراب پیتے ہیں یا عیاشی کرتے ہیں ان سے آپ کبھی نہیں کہتے کہ شراب پینے سے آپ کو سیری نہیں ہوتی۔ جتنی آپ پیتے ہیں اتنی ہی خواہش بڑھتی ہے۔ اب میرے روپیہ کمانے کے اوپر آپ کا خیال کیوں مبذول ہوا۔ ایک مرتبہ شاہ جہاں پور میں کانفرنس میں جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ شہر کے در و دیوار پر بڑے بڑے اشتہارات مولوی صاحبان نے چسپاں کرا رکھے تھے اور ان میں کانفرنس کی شرکت سے مسلمانوں کو منع کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ شیطانی کام میں شرکت بہت بڑا گناہ ہے اور کسی مسلمان کو اس میں شریک نہیں ہونا چاہیے اور اپنے اشتہار میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو

شخص اس کانفرنس کے جلسے میں شریک ہوگا اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔

اس اشتہار کا معاملہ شام کے وقت سر سید کے جلسے میں پیش ہوا۔ شاہ جہاں پور کے بہت سے مسلمان جن کا مولویوں سے اتفاق نہیں تھا وہ بھی وہاں موجود تھے۔ سر سید نے اس اشتہار کے مطالب کو سن کر بہت افسوس کیا اور فرمایا کہ یا تو دنیا میں مولوی زندہ رہیں گے یا قوم زندہ رہے گی۔ مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ مولوی صاحبان کی جہالت کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے فضل سے قوم فقط زندہ ہی نہیں رہے گی، بلکہ بہت سرسبز ہوگی اور ترقی کرے گی۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ ان کی ظرافت جوش میں آئی اور فرمایا کہ صاحبو محترمات سے کہہ دینا کہ اگر مولویوں کے اس فتوے کی وجہ سے کسی پر طلاق بھی پڑ جائے اور اپنے شوہر کی مفارقت بھی ہو جائے تو ان کو پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے یہاں چار چار شادیوں کی اجازت ہے اور شادی کرنا سنت ہے اور طلاق کے بعد شادی ہونے میں کوئی دقت نہیں ہے۔ اس لیے ان کو تو کوئی اچھے سے اچھا شوہر مل جائے گا۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ اس سال کے جلسے میں ہماری جماعت کے طالب علموں نے جو اس وقت تھرڈ ایئر میں پڑھتے تھے ایک درخواست سر سید کے سامنے پیش کی اور لکھا کہ شیام بہاری لال کے تغلب کی وجہ سے جو پریشانی ہے اس میں ہم کالج کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں کہ جب ہم روپیہ کمانے لگیں گے تو اس میں سے ہر ایک اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کالج کی امداد کرے گا۔ اس درخواست پر پندرہ بیس طالب علموں کے دستخط تھے۔

سر سید نے اس موقع پر نہایت ہی مختصر سی تقریر فرمائی اور فرمایا کہ اے میرے عزیزو، مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے کالج کی مالی امداد کا وعدہ کیا۔ روپیہ تو فی الواقع وہی دے سکتا ہے جس کا دل ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس روپیہ ہو اور دل نہ ہو تو وہ مدد نہیں کر سکے گا۔ اس لیے مجھے اس کے لیے دعا کرنے کی ضرورت ہے کہ خدا آپ لوگوں کو روپیہ بھی دے اور دل بھی دے تب آپ کالج کی مدد کر سکیں گے۔

میں اوپر ذکر کر آیا ہوں کہ کانفرنس کے اجلاس یو۔ پی اور پنجاب کے صوبوں کے باہر بھی ہوا کرتے تھے۔ ایک جلسے میں جو کولکتا میں ہوا تھا سید امیر علی صاحب صدر تھے۔ مولانا نذیر

احمد صاحب نے اس میں لیکچر دیا اور لوگوں کی داڑھی منڈانے کے اوپر کچھ چوٹیں کیں اور اس میں اپنی معمولی ظرافت سے بڑھ کر بھی باتیں کہہ گئے۔ سید امیر علی صاحب بگڑ گئے اور تھوڑی دیر کے لیے بےلطفی رہی۔ جب تک سرسید حیات رہے وہ ہر کانفرنس کے جلسے میں بحیثیت سکریٹری کے شرکت فرمایا کرتے تھے۔ میری علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے سے کچھ قبل کانفرنس کا جلسہ دہلی میں ہوا اور عین دوران جلسے میں سرسید کو خبر ملی کہ ان کی بہن کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر کی وجہ سے انھوں نے کام میں کچھ بھی تبدیلی یا کمی بیشی نہیں کی، کام برابر جاری رہا اور جب جلسہ ختم ہو گیا تو اپنی بہن کے گھر ماتم کرنے کو گئے۔

کانفرنس کے اجلاسوں کی رپورٹیں ایک بہت ہی مفید لٹریچر کے طور پر قومی و علمی ذخیرہ متصور ہونا چاہیے گو بدقسمتی سے اب اس وقت کانفرنس ہی مردہ ہو گئی ہے۔ اس میں زندگی کی کوئی بات باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن اس کا گذشتہ زمانہ بہت ہی شاندار رہا ہے۔ نواب محسن الملک مرحوم کی فصاحت و بلاغت نے اس کو چار چاند لگا دیے تھے اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تدبیر و کوشش کی وجہ سے اس ادارے کو بہت بڑا عروج حاصل ہوا۔ صاحب زادہ صاحب مرحوم نے علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ و مغفورہ سے ایک بڑا عطیہ حاصل کر کے کانفرنس کا دفتر موسومہ سلطان جہاں منزل تعمیر کرائی جو اب تک موجود ہے اور وہیں کانفرنس کا دفتر ہے۔ کانفرنس کے لیے صاحب زادہ صاحب نے ریاستوں سے بالخصوص ریاست حیدرآباد اور ریاست بھوپال سے عطیہ حاصل کر کے کانفرنس کی مستقل آمدنی ایک ہزار روپے مہینہ سے زیادہ کر لی تھی۔ علاوہ بریں انھوں نے تعلیم کے لیے بڑا لٹریچر بھی جمع کر لیا تھا۔ کچھ کتابیں تو ہندوستان سے جمع کیں اور کچھ وہ انگلستان سے لائے تھے لیکن اب اس وقت یہ سب چیزیں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے کارنامۂ نشانی کے طور پر قائم ہیں۔ موجودہ منتظمین مجبوریوں کی وجہ سے کانفرنس کی پرانی حالت کو قائم رکھنے میں قاصر رہے ہیں۔ ان کی حالت اب تو وہی ہے جو خانقاہوں کے مجاوروں کی ہوتی ہے کہ کسی بزرگ کے مزار کی اینٹ پتھر اور سنگ مرمر کے ڈھیروں کے پاس بیٹھے لوگوں کو یاد دلایا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کا یہ مزار ہے اور ان کی اولاد میں فلاں فلاں صاحب اثر یا صاحب کرامت ہو گزرے ہیں اور یہ کل جگہ انھیں بزرگوں کی یاد دلانے کے لیے قائم ہے۔ مجھ کو نہایت

سخت افسوس ہے کہ میں نے اس مفید ادارے کو جو صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی انتھک کوششوں سے قائم ہوا تھا اس کو تنزل کی حالت میں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ جن صاحبوں کے ذمہ اس ادارے کا کام کیا گیا تھا ان کی قابلیت میں تو کچھ شبہ نہیں تھا لیکن مستعدی سے وہ عملی کام نہیں کر سکے اور ان کو اپنے زمانے کے لوگوں سے مدد بھی نہیں ملی۔ اس لیے خود کانفرنس کی حالت میں بہت ابتری پیدا ہو گئی۔ قوم کا کانفرنس میں جو شغف پیدا ہو گیا تھا اس کا محسن الملک اور آفتاب احمد خاں کے بعد عشر عشیر بھی باقی نہ رہا۔ کانفرنس اب بھی نام کو زندہ ہے لیکن یہ فقرہ اس پر اچھے طریقے سے چسپاں ہوتا ہے کہ ''زندہ در گور'' علاوہ بریں اب اس کانفرنس کی اس قسم کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے جس ضرورت کو سامنے رکھ کر یہ قائم کی گئی تھی۔ وہ ضرورت بہت دن ہوئے پوری ہو چکی تھی اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس احساس سے فائدہ اٹھانے کے لیے کسی ادارے کو مسلمانوں کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ اگر کانفرنس چاہتی تو اس کام کو وہ خود کر سکتی تھی مگر اس سے نہیں ہو سکا۔ اب کانفرنس اگر کسی مستعد آدمی کے ہاتھ میں دیدی جائے جو کام بھی کر سکے اور جس کے خیالات میں قوم کو آگے بڑھانے کی رغبت اور صلاحیت بھی ہو تو یہ ادارہ مسلمانوں کی قومی تعلیم کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

اب موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے سب سے زیادہ ضرورت صنعت و حرفت کی تعلیم کی ہے تا کہ بہ کثرت مسلمان نوجوان اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جائیں یا بہ الفاظ دیگر قوم میں بہت سے لوگ اپنی روزی کمانے کے لیے اپنا سرمایہ اور اپنی کوشش میں اشتراک عمل کر لیں۔ جیسے کہ اسٹالن نے روس میں اور اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹرکی میں آبادی کے بہت بڑے حصے کو کسب معاش کے لیے تعلیم دی تھی۔ ہندوستان میں بھی اس طرز کی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا سے کسی نے کہا کہ دنیا کی دولت مند قوموں کا مقابلہ کرنا ترکی قوم کے لیے بہت مشکل ہوگا۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے جواب دیا کہ ''میں اپنی قوم میں لکھ پتی اور کروڑ پتی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری قوم میں محنتی کاشت کار اور صنعت و حرفت کے جاننے والے کافی ہیں جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ ہم اسی کو اپنے لیے بہت بڑی دولت سمجھتے ہیں۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ہم کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو از سرنو زندہ

کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ واقعات مارچ 1948 میں لکھ رہا ہوں۔ اس سے قریب بیس بائیس سال قبل سے کانفرنس سکتے کی حالت میں ہے اور اب رفتہ رفتہ سابق حالت پر اس کو لانا ایک مردے کو زندہ کرنا ہے۔ لیکن اس کی پرانی روایات کو مدنظر رکھ کر اگر سرسید، نواب محسن الملک مرحوم اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کے زمانے کی کانفرنس از سر نو قائم کی جائے تو وہ ایک بہت ہی بڑا اور مفید ہی بڑا اور مفید ادارہ ثابت ہوگی کیونکہ ایسے ادارے کی سخت ضرورت ہے

سرسید کی زندگی کے آخری دن

میں نے اوپر ذکر کیا تھا کہ 1897 میں سرسید اور سید محمود میں کالج کی مالی حالت کے متعلق ایک سخت نزاع پیدا ہوا۔ سرسید مالی انتظام سید محمود کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتے تھے اور سید محمود جن کی دماغی حالت دگرگوں ہو چکی تھی وہ یہ چاہتے تھے کہ کل روپیہ ان کے ہاتھ میں آئے اور جس طور پر میں چاہوں خرچ کروں۔ یہ کہنا خلاف واقعہ اور انصاف کے خلاف ہوگا کہ باوجود اپنی حالت کی پستی کے سید محمود کی نیت میں کبھی یہ آیا ہوگا کہ میں کالج کا روپیہ اپنے ہاتھ میں لے کر جس طرح چاہوں اپنی ذات پر خرچ کروں اور خرد برد کر دوں۔ میں اس الزام سے ان کو بالکل بری کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں سرسید کی دور اندیشی، ایمان داری اور بے لوث زندگی سے اس بات کو قطعی بعید سمجھتا ہوں کہ وہ سید محمود کی اس زمانے کی حالت کے لحاظ سے ٹرسٹ کا روپیہ سید محمود کے سپرد کر دیتے۔

گو احباب کے کہنے کی وجہ سے سرسید بورڈنگ ہاؤس سے پھر لوٹ کر سید محمود کی کوٹھی میں چلے گئے تھے جیسا کہ اس سے قبل بیان ہوا ہے لیکن دونوں میں جو باہمی نزاع تھا وہ بدستور قائم رہا اور دن رات کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا شبلی مرحوم نے بیان فرمایا کہ سید محمود نے غصے میں آ کر ایک گھونسا اس کرسی پر مارا جہاں سرسیدؒ بیٹھے تھے اور زبان سے کہا کہ پیر فانی اب تک بھی تمھاری حرص حکومت کرنے کی اور روپیہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی باقی رہ گئی ہے۔ میں نے اس واقعہ کی کچھ تحقیقات نہیں کی تھی کیونکہ مولانا شبلی مرحوم نے یہ واقعہ اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا، لیکن اگر یہ واقعہ صحیح ہو تو اس میں سید محمود کی نہایت بے جا حرکت تھی۔ لیکن اس زمانے میں

سخت افسوس ہے کہ میں نے اس مفید ادارے کو جو صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی انتھک کوششوں سے قائم ہوا تھا اس کو تنزل کی حالت میں اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ جن صاحبوں کے ذمہ اس ادارے کا کام کیا گیا تھا ان کی قابلیت میں تو کچھ شبہ نہیں تھا لیکن مستعدی سے وہ عملی کام نہیں کر سکے اور ان کو اپنے زمانے کے لوگوں سے مدد بھی نہیں ملی۔ اس لیے خود کانفرنس کی حالت میں بہت ابتری پیدا ہو گئی۔ قوم کا کانفرنس میں جو شغف پیدا ہو گیا تھا اس کا محسن الملک اور آفتاب احمد خاں کے بعد عشر عشیر بھی باقی نہ رہا۔ کانفرنس اب بھی نام کو زندہ ہے لیکن یہ فقرہ اس پر اچھے طریقے سے چسپاں ہوتا ہے کہ "زندہ درگور" علاوہ بریں اب اس کانفرنس کی اس قسم کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے جس ضرورت کو سامنے رکھ کر یہ قائم کی گئی تھی۔ وہ ضرورت بہت دن ہوئے پوری ہو چکی تھی اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس احساس سے فائدہ اٹھانے کے لیے کسی ادارے کو مسلمانوں کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ اگر کانفرنس چاہتی تو اس کام کو وہ خود کر سکتی تھی مگر اس سے نہیں ہو سکا۔ اب کانفرنس اگر کسی مستعد آدمی کے ہاتھ میں دیدی جائے جو کام بھی کر سکے اور جس کے خیالات میں قوم کو آگے بڑھانے کی رغبت اور صلاحیت بھی ہو تو یہ ادارہ مسلمانوں کی قومی تعلیم کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

اب موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے سب سے زیادہ ضرورت صنعت و حرفت کی تعلیم کی ہے تاکہ بہ کثرت مسلمان نوجوان اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جائیں یا بہ الفاظ دیگر قوم میں بہت سے لوگ اپنی روزی کمانے کے لیے اپنا سرمایہ اور اپنی کوشش میں اشتراک عمل کر لیں۔ جیسے کہ اسٹالن نے روس میں اور اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی میں آبادی کے بہت بڑے حصے کو کسب معاش کے لیے تعلیم دی تھی۔ ہندوستان میں بھی اس طرز کی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا سے کسی نے کہا کہ دنیا کی دولت مند قوموں کا مقابلہ کرنا ترکی قوم کے لیے بہت مشکل ہوگا۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے جواب دیا کہ ہمیں اپنی قوم میں لکھ پتی اور کروڑ پتی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری قوم میں محنتی کاشت کار اور صنعت و حرفت کے جاننے والے کافی ہیں جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ ہم اسی کو اپنے لیے بہت بڑی دولت سمجھتے ہیں۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ہم کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو از سر نو زندہ

کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ واقعات مارچ 1948 میں لکھ رہا ہوں۔ اس سے قریب بیس بائیس سال قبل سے کانفرنس سکتے کی حالت میں ہے اور اب رفتہ رفتہ سابق حالت پر اس کو لانا ایک مردے کو زندہ کرنا ہے۔ لیکن اس کی پرانی روایات کو مدنظر رکھ کر اگر سرسید، نواب محسن الملک مرحوم اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کے زمانے کی کانفرنس از سر نو قائم کی جائے تو وہ ایک بہت ہی بڑا اور مفید ہی بڑا اور مفید ادارہ ثابت ہوگی کیونکہ ایسے ادارے کی سخت ضرورت ہے

سرسید کی زندگی کے آخری دن

میں نے اوپر ذکر کیا تھا کہ 1897 میں سرسید اور سید محمود میں کالج کی مالی حالت کے متعلق ایک سخت نزاع پیدا ہوا۔ سرسید مالی انتظام سید محمود کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتے تھے اور سید محمود جن کی دماغی حالت دگرگوں ہو چکی تھی وہ یہ چاہتے تھے کہ کل روپیہ ان کے ہاتھ میں آئے اور جس طور پر میں چاہوں خرچ کروں۔ یہ کہنا خلاف واقعہ اور انصاف کے خلاف ہوگا کہ باوجود اپنی حالت کی پستی کے سید محمود کی نیت میں کبھی یہ آیا ہوگا کہ میں کالج کا روپیہ اپنے ہاتھ میں لے کر جس طرح چاہوں اپنی ذات پر خرچ کروں اور خرد برد کردوں۔ میں اس الزام سے ان کو بالکل بری کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں سرسید کی دور اندیشی، ایمان داری اور بے لوث زندگی سے اس بات کو قطعی بعید سمجھتا ہوں کہ وہ سید محمود کی اس زمانے کی حالت کے لحاظ سے ٹرسٹ کا روپیہ سید محمود کے سپرد کردیتے۔

گو احباب کے کہنے کی وجہ سے سرسید بورڈنگ ہاؤس سے پھر لوٹ کر سید محمود کی کوٹھی میں چلے گئے تھے جیسا کہ اس سے قبل بیان ہوا ہے لیکن دونوں میں جو باہمی نزاع تھا وہ بدستور قائم رہا اور دن رات کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا شبلی مرحوم نے بیان فرمایا کہ سید محمود نے غصے میں آکر ایک گھونسا اس کرسی پر مارا جہاں سرسیدؒ بیٹھے تھے اور زبان سے کہا کہ پیر فانی اب تک بھی تمھاری حرص حکومت کرنے کی اور روپیہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی باقی رہ گئی ہے۔ میں نے اس واقعہ کی کچھ تحقیقات نہیں کی تھی کیونکہ مولانا شبلی مرحوم نے یہ واقعہ اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا لیکن اگر یہ واقعہ صحیح ہو تو اس میں سید محمود کی نہایت بے جا حرکت تھی۔ لیکن اس زمانے میں

سید محمود کی وہ حالت تھی کہ ہم اس واقعہ کو بعید از قیاس بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں سید محمود اور سر سید میں بے لطفی حد کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن سر سیدؒ کے دل میں جو قوم کا درد تھا اس کی آگ باوجود اپنی نجی زندگی کی بے لطفی کے کسی طرح کم نہیں ہوئی تھی۔

اسی زمانے میں پنڈت مدن موہن مالویہ اور بہت سے ہندو لیڈروں نے سر اینٹونی مکڈانلڈ لفٹنٹ گورنر یو۔ پی کے سامنے ایک عرض داشت پیش کی کہ اس صوبے میں اردو کی جگہ ہندی جاری کی جائے۔ لفٹنٹ گورنر نے اس کے جواب میں ممبران ڈیپوٹیشن کو اس معاملے میں اپنی توجہ کی امید دلائی۔ ان دنوں سر سید کی طبیعت بہت مضمحل ہوگئی تھی۔ تاہم اس درخواست اور لفٹنٹ گورنر کے جواب پر وہ بے چین ہوگئے اور ایک دن صبح کے وقت مجھے بلایا اور فرمایا کہ دیکھو اس وقت کے لفٹنٹ گورنر کا رجحان پہلے ہی سے ہندی کے موافق اور اردو کے خلاف تھا۔ مدن موہن مالویہ وغیرہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی ہے کہ ہندی کو رواج دیا جائے۔ ہم عمر بھر تک اس معاملے میں ہندی کے طرف داروں کے خلاف لڑتے رہیں گے۔ اب ہمارا وقت لڑنے کا نہیں رہا۔ اب دوسرے لوگوں کو اس میں کچھ کرنا چاہیے اور تم اگر کچھ کر سکتے ہو تو ہندی کے ڈیپوٹیشن کی درخواست کی تردید کرنی چاہیے۔ میں نے کہا تمام ملک مسلمانوں سے بھرا پڑا ہے، کوئی تو آواز اٹھائے گا۔ آپ اس علالت کی حالت میں اس معاملے میں پریشان ہو رہے ہیں؟ فرمایا کہ مجھے امید ہوتی کہ دوسری جگہ کے مسلمان کچھ کرنے کو کھڑے ہو جائیں گے تو مجھے پریشانی نہ ہوتی۔ لیکن دیکھ لینا کہ مسلمانوں میں ایک شخص بھی کھڑا نہیں ہوگا کہ وہ ہماری قوم کی آواز لفٹنٹ گورنر تک پہنچائے۔ میں اس گفتگو کے بعد وہاں سے چلا آیا اور میں نے واقعات جمع کرنے شروع کیے اور سر تھیوڈور ماریسن اپنے پروفیسر سے کہا کہ آپ اخبار پانیر میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی عرض داشت کی تردید لکھ دیجیے۔ واقعات جو بھی بہم پہنچیں گے میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ چنانچہ پروفیسر صاحب موصوف نے ایک طویل خط لکھا جو اخبار پانیر (پرانے پانیر) میں شائع ہوا۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پانیر کی جلدوں میں یہ خط 1897 کے آخر یا 1898 کے شروع میں ملے گا مگر ملے گا ضرور۔ جب خط اخبار پانیر میں شائع ہوگیا تو میں نے پرچہ لے جا کر سر سید کو دکھایا۔ انھوں نے فرمایا کہ ٹھیک لکھا ہے۔

آخری خدمت

اب سرسید کی حالت روز بروز گرتی گئی۔ ان کی اسی علالت اور ضعف اور اندرونی تکلیفات کے زمانے میں کسی پادری نے "امہات المومنین" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر بہت سخت حملے کیے۔ سرسید نے چارپائی پر پڑے پڑے اس رسالے کا جواب لکھوانا شروع کیا اور ابھی آدھا بھی ختم نہ کر چکے تھے کہ ان کی تکلیف اور ضعف نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی، اس لیے سرسید کا وہ جواب ادھورا رہ گیا اور سرسید کے انتقال کے بعد وہ ادھورا جواب اخباروں میں چھپا تھا۔ غالباً انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ملے گا اور دیگر رسالوں میں بھی وہ چھپا اور سرسید کی آخری خدمت کے نام سے اس کو نامزد کیا گیا۔

سرسید کی وفات

سرسید جنوری 1898 سے کم وبیش ہر روز کچھ نہ کچھ تکلیف محسوس کرنے لگے تھے۔ عمر کافی ہوگئی تھی۔ تفکرات بہت تھے۔ سید محمود کی مخالفت اور دن رات کی کل کل کا ان کے دل پر بہت گہرا اثر تھا جو ان کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کے پاس بیٹھنے والوں میں اس قسم کی باتیں بھی اپنے طور پر سنیں کہ اب سورج افق کے قریب پہنچ چکا ہے۔ سرسید بھی کبھی کبھی فرماتے تھے کہ طبعی عمر ہو چکی ہے اب بقائے زیست کی امید بہت کم ہے۔ ان دنوں غذا میں بہت کمی ہوگئی تھی یہ سب کچھ تھا لیکن کالج کی ڈاک روزانہ دیکھنے کا معمول بدستور قائم تھا۔ سرکاری خط وکتابت کے متعلق وہی پابندیاں قائم تھیں جو پہلے تھیں۔ لوگ آتے جاتے تھے۔ ان کی بات چیت بھی ہو جاتی تھی اور موقع موقع سے طبعی ظرافت کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی تھی۔

جنوری اور فروری کا مہینہ اس طور پر ختم ہوا اور مارچ کے مہینے سے سرسید کے چہرے پر بہت زیادہ تفکر کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھ کو ٹھیک یاد نہیں رہا کہ فروری یا مارچ میں سرسید کو پھر سخت مجبوری پیش آگئی اور ان کو سید محمود کی کوٹھی دوبارہ چھوڑنی پڑی اور وہ نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں، رئیس دتاولی کی کوٹھی میں جو بی بی والی کوٹھی کے نام سے مشہور تھی اس میں چلے گئے۔ یہ کوٹھی منزل پیلیس کے جنوب مغرب کی جانب کوئی سو یا سوا سو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ اب محمد جان خانصاحب رئیس دادوں نے اس کے قریب میں ایک بڑی کوٹھی تعمیر کی ہے جس کا

نام بیت الاکرم ہے اور پان والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ مارچ کے آخری ہفتے میں راقم اپنے نجی ضرورتوں سے دہلی گیا اور وہاں پر سامان خریدنے میں چند روز لگ گئے۔ 27/مارچ 1898 کو دہلی سے واپس آیا تو ریلوے اسٹیشن علی گڑھ پر یہ خبر سنی کہ سرسید کا ابھی ابھی انتقال ہو گیا ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ یہ خبر بہت تازہ اسٹیشن پر پہنچی تھی کیونکہ زنانہ ویٹنگ روم کی آیا یہ خبر سن کر ویٹنگ روم کے باہر نکلی اور مردانہ ویٹنگ روم کے بیرے سے کہا کہ باپ رے باپ سنا ہے کہ بڑے سرسید صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب کیا ان کا سر کٹے گا اور کٹ کر لندن جائے گا۔ بیرے نے کہا کہ سید محمود صاحب نے کہہ دیا ہے کہ ہم سر نہیں کٹنے دیں گے اور نہ لندن جانے دیں گے۔ ان دونوں میں یہ گفتگو اس شہرت کی وجہ سے پیدا ہوئی کہ جو ہندوستان کے مسلمانوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی کہ لندن کے کچھ ڈاکٹروں نے سرسید کے سر کے لیے ایک بہت بڑی رقم دینی منظور کر لی ہے کہ جب سرسید کا انتقال ہو تو ان کا سر کاٹ کر ہم کو دیا جائے تا کہ ہم دیکھیں کہ ان کے دماغ میں وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے وہ اتنے بڑے عقل مند ہیں۔ گو یہ شہرت سراسر غلط تھی لیکن چھوٹے طبقہ کے لوگوں میں یہ سچ مانی جاتی تھی کہ ان کا سر کٹ کر لندن جائے گا۔ اسی وجہ سے آیا اور بیرے میں مذکورہ بالا گفتگو ہوئی۔

میں اسٹیشن سے اپنے مکان پر آیا اور وہاں سے اس کوٹھی کی تلاش میں گیا جس کا نام بھی پہلے نہیں سنا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی دو تین کمروں کی کوٹھی تھی۔ اس میں جانے آنے کا نہ کوئی کام تھا اور نہ اس کی شناخت کا کوئی موقع تھا۔ بہر حال رات کے گیارہ بجے میں اس کوٹھی میں پہنچا اور حالات دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ تین چار روز سے سرسیدؒ کو جاڑے سے بخار آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کا علاج تھا اور پیشاب سلائی کے ذریعہ نکالا جاتا تھا کیونکہ پیشاب بار بار بند ہو جاتا تھا۔ آخر کو بہت زور کا جاڑا چڑھا اور غفلت ہو گئی اور اسی میں انتقال ہو گیا۔ اس موقع پر میں نے سرسید کے بیٹے سید محمود یا ان کے بھتیجے سید محمد احمد یا کسی اور عزیز کو نہیں دیکھا۔ ملازم تھے اور جہاں تک مجھے خیال ہے نواب محمد حاجی اسمٰعیل خاں اور مولوی وحید الدین سلیم بھی تھے۔ یہ معلوم ہوا کہ دوسرے روز صبح کے وقت جنازہ اٹھے گا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کہاں پر دفن ہونا تجویز ہوا ہے۔ میں قریب بارہ بجے لوٹ کر مکان پر آ گیا اور رات کو سو گیا صبح اٹھ کر پھر موقع پر گیا۔ وہاں جا کر ایک عجیب بات

معلوم ہوئی کہ سر سیدؒ کی تجہیز و تکفین کے لیے روپیہ بھی نہیں ہے۔

شہزادہ آفتاب احمد خاں اس روز علی گڑھ میں نہیں تھے۔ ان کا ملازم ولی محمد وہاں اس وقت تھا۔ وہ میرے سامنے نواب محسن الملک مرحوم کے پاس گیا اور وہاں سے لوٹ کر کہا کہ دیکھیے کسی نے کفن دفن کے لیے روپیہ بھی نہیں دیا۔ میں نواب صاحب سے یہ پچاس روپیہ مانگ کر لایا ہوں۔ حالانکہ اس وقت سید محمد احمد ان کے بھتیجے بھی وہاں موجود تھے۔ وہیں پر یہ معلوم ہوا کہ سید محمود رات کے دو بجے کالج کی مسجد میں منشی ناصر خاں کو ساتھ لے کر گئے اور وہاں پر مسجد کے شمال مشرق کی جانب ملحقہ آراضی پر قبر کھدوانی شروع کر دی۔ اتنے میں مسٹر بیک وہاں پر آئے اور کہا اسٹیشن کے انگریز جنازے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اس لیے چار بجے شام کا وقت جنازہ اٹھنے کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اتنے میں خواجہ محمد یوسف مرحوم و نواب محمد اسماعیل خاں صاحب اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب وہاں تشریف لائے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو اعتراض تھا کہ مسٹر بیک صاحب جنازہ اٹھانے کا وقت مقرر کرنے والے کون ہیں جب ان کے وارث موجود ہیں تو دوسروں کو کیا حق ہے کہ وقت مقرر کرے۔

یہ اعتراض اعتراض ہی کی حد تک رہا۔ اس پر کوئی مزید گفتگو نہیں ہوئی اور نہ عمل ہوا۔ قریب گیارہ بجے دن کے سر سید کو غسل میت دیا گیا۔ خواجہ محمد یوسف صاحب نے اپنے ہاتھ سے غسل دیا۔ خواجہ صاحب بہت روئے اور سر سید کے ورثا کی شکایت کے کچھ لفظ بھی زبان پر لائے۔ غسل ہونے کے بعد اس کوٹھی کے بیچ کے کمرے میں جنازہ رکھا گیا۔ غسل صحن میں دیا گیا تھا۔ یہ کل مقامات جہاں پر ان کا انتقال ہوا اور جہاں پر ان کو غسل دیا گیا اور جہاں غسل کے بعد ان کا جنازہ رکھا گیا میری نگاہ میں ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے میرے سوا اب کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے جو ان حالات اور واقعات سے واقفیت رکھتا ہو۔ قریب ایک بجے کے ضیاء اللہ خاں مرحوم اور میں اور ایک اور دوست جن کا نام اس وقت یاد نہیں رہا سید محمود کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ چار بجے جنازہ اٹھے گا آپ کو جنازہ میں ضرور شریک ہونا چاہیے۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ سر سید کی بیماری کے زمانے میں یا انتقال کے وقت یا انتقال کے بعد اس وقت تک جب تک کہ ہم لوگ سید محمود کے پاس گئے وہ اس کوٹھی میں جہاں سر سید کا انتقال ہوا نہیں آئے۔ سید محمود نے ہم لوگوں کو دیکھ کر سر پر

ہاتھ رکھ کر زور زور سے آہیں بھرنا شروع کیں اور کہنا شروع کیا کہ ہائے میرے باپ کا انتقال ہوگیا۔ میرے گھر میں تو بوریا بھی نہیں کہ مہمانوں کو بٹھاؤں۔ جب وہ ذرا خاموش ہوئے تو ہم نے کہا آپ کا آنا ضروری ہے، آپ بھول نہ جائیے گا اور بہتر تو یہ ہے کہ آپ جنازے کے ساتھ چلیے۔ اس کا صرف یہ جواب دیا کہ ہاں میں آؤں گا۔ ہم وہاں سے لوٹ کر آئے تو جنازے کے اٹھنے کا وقت ہوگیا تھا۔ کالج کے طالب علم، ممبران اسٹاف، انگریز اور ہندوستانی حکام اور بعض رؤسا، جو علی گڑھ میں رہتے تھے وہ جنازے کے ساتھ گئے اور شہر کے لوگ بھی خاصی تعداد میں رستے میں شریک ہوتے گئے۔ مسجد کے قریب پہنچ کر یہ بات طے پائی کہ جنازے کی نماز کرکٹ لان میں پڑھی جائے چنانچہ جنازہ کرکٹ لان میں رکھا گیا۔ اتنے میں سید محمود بھی عربی جبہ پہنے ہوئے آموجود ہوئے۔

جنازے کی نماز مولوی عبداللہ انصاری مرحوم ڈین کالج نے پڑھائی۔ سید محمود بھی ایک صف میں کھڑے ہوگئے۔ بیک صاحب اور ماریسن صاحب بھی صفوں میں کھڑے ہوگئے۔ نماز کے بعد جنازہ قبر کے پاس لایا گیا۔ قبر میں اتارتے وقت ہم طالب علموں کی آنکھوں میں آنسو جاری تو تھے ہی لیکن بیک صاحب اور ماریسن صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ قبر میں دفن کرنے اور مٹی دینے کے بعد نواب محسن الملک مرحوم صحن کے نیچے میدان میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور سرسید کے ورثا کو خوب کھری کھری سنائیں کہ جس شخص کی بدولت ان لوگوں کو دنیا میں عزت و ثروت حاصل ہوئی، ان میں سے کسی کی جیب سے پچاس روپے بھی نہیں نکلے جس سے ان کی تجہیز و تکفین ہوتی۔ میں سرسید کا دوست ضرور تھا لیکن وارث نہیں تھا۔ یہ وارثوں کا فرض تھا کہ وہ روپیہ صرف کرتے لیکن انھوں نے نہیں کیا۔

یہ سرسید کی آخری زندگی، ان کی بیماری، ان کی تکلیف، ان کی وفات ان کے دفن کفن کی تجویز کی سرگزشت جو مجھ کو یاد تھی وہ سپرد قلم کردی ہے۔ سرسید کی پیدائش 1817 کی تھی اور 1898 میں ان کا انتقال ہوا، اس لیے ان کی عمر 81 سال ہوئی۔

انھوں نے اپنی زندگی میں بہت بڑے بڑے انقلابات دیکھے ہوں گے۔ ان کی ذات سے مسلمانوں کی قوم کو جو فائدہ پہنچا وہ ہندوستان کے کسی دوسرے مسلمان کی ذات سے نہیں پہنچا۔

انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں قومی احساس پیدا کیا، ان کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیا، ان کو گورنمنٹ میں ملازمت کے صیغوں میں داخل کرانے کے لیے بہت جد و جہد کی، اردو زبان کی حفاظت کے لیے عمر بھر سینہ سپر رہے۔ غدر 1857 میں سخت مصیبتیں جھیلیں۔ اس زمانے میں جب کہ ہزاروں مسلمان روزانہ پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے اور زبان سے بات نکالنا موت کو اپنے منہ سے اپنے پاس بلانا تھا، اس وقت انھوں نے کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی اور مسلمانوں کو انگریزوں کے غیض و غضب سے بچانے کے لیے اپنی جان کی بھی کچھ پرواہ نہ کی اور اس کتاب کے لکھنے پر بہت سے انگریز سخت برہم ہوئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ اس شخص کو پھانسی ہونی چاہیے۔ ایسے وقت میں ایک لفٹنٹ گورنر نے جوان کو انگریزوں کا دشمن نہیں سمجھتا تھا، ان کی جان بچائی۔

سر سید کی وفات کے ساتھ ہمارے ہندوستان کی قومی تاریخ کا ایک باب ختم ہوا اور انھوں نے جو کچھ کام اپنی زندگی میں کیے ان کے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اور بھی اس سے زیادہ ظہور میں آنے والے ہیں جن کو آئندہ نسلیں دیکھیں گی۔

اگر سر سید کسی ایسے ملک میں پیدا ہوئے ہوتے جہاں پر ایک قوم، ایک تہذیب، ایک مذہب ہوتا اور وہ اس قوم کے افراد میں سے ایک فرد ہوتے تو وہ اس فہرست میں شامل کیے جانے کے قابل تھے جو یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے پولیٹکل اور قومی ریفارمر کی فہرست ہے۔ لیکن سر سید جس ملک میں پیدا ہوئے وہ مختلف مذاہب اور مختلف اقوام کا ملک تھا جن کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے سخت عداوت، کینہ اور تعصب اور صدیوں سے اپنے اثرات پیدا کر رہے تھے۔ گو ظاہرہ انگریزوں کی زبردست سیاست کی وجہ سے وہ آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اور اس میں شعلے پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن غور کرنے والے اور سمجھ دار آدمیوں کے خیال میں اور قیاس میں انگریزوں کے بعد اس سلگتی ہوئی آگ کا نہایت خوفناک طریقوں سے مشتعل ہونا لازمی تھا۔

اب ہم جملہ دیگر حالات سے قطع نظر فقط ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو جھگڑے ہوئے اور سر سید کے انتقال کے قریب پچاس سال بعد وقوع میں آئے ان حالات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو سر سید کے ذہن میں تھے۔ جب انھوں نے مسلمانوں کے اصلاح کی تنظیم شروع کی تھی اور جن کا مظاہرہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا اس کی تفصیل کی طرف ناظرین کی توجہ دلاتے ہیں۔

سرسید کے انتقال کے بعد کے واقعات

سرسید کا انتقال 28/مارچ 1898 میں ہوا۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اس تاریخ میں علی گڑھ میں نہیں تھے۔ چند روز کے بعد وہ واپس آئے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو سخت صدمہ ہوا ہے۔ ہمارے ہندو ہم وطن اپنے عزیزوں کی وفات پر اپنا سر اور داڑھی منڈوا دیتے ہیں۔ اور یہ کسی کی موت کے ماتم کی بڑی نشانی ہے۔ ہمارے مرحوم دوست صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم نے الٹا عمل کیا کہ داڑھی منڈوانا بند کردی۔ یہ ماتم کی نشانی کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی لیکن اس خاص وقت کے لیے اور غالباً مہینہ دو مہینہ کے لیے تو ضرور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم نے اپنی داڑھی بڑھائی تھی اس کے بعد چند دنوں کے اندر علاوہ دیگر ماتمی جلسوں کے ایک انتظامی جلسہ ہوا۔ جس میں وہ ٹرسٹی صاحبان جو علی گڑھ میں موجود تھے اور ممبران اسٹاف بالخصوص انگریز اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ مسٹر بیک آنجہانی پرنسپل کالج اس جلسے کے محرک اور روح رواں تھے۔ سرسید کی زندگی میں سال دو سال پہلے سے وہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں دس لاکھ روپیہ جمع کر کے ایم۔ اے۔ او کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ جلسہ مذکورہ بالا میں انھوں نے اپنی تجویز پیش کی کہ سرسید کی یادگار اس سے بہتر نہیں ہوسکتی کہ ایم۔ اے۔ او کالج کو یونیورسٹی بنادیا جائے۔ سب حاضرین نے اس تجویز کو منظور کیا اور ایک کمیٹی سرسیدؒ میموریل فنڈ کے نام سے قائم ہوئی جس کے سکریٹری یا پریسیڈنٹ یا تو نواب اسمٰعیل خاں مقرر ہوئے یا نواب محسن الملک۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد یہ ہوا کہ نواب محسن الملک تو پریسیڈنٹ ہوئے، آفتاب احمد خاں صاحب سکریٹری، ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب مرحوم اور راقم الحروف جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، لیکن کام سوائے میرے اور نواب محسن الملک کے کسی نے نہیں کیا۔

سال چھ مہینے کے بعد آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے سکریٹری شپ کا عہدہ چھوڑ دیا اور میں آنریری سکریٹری مقرر ہوا۔ اس کے بعد سے میں بدستور آنریری سکریٹری رہا اور 1911 تک کام کیا۔ گو آفتاب احمد خاں صاحب سکریٹری نہیں رہے تھے لیکن وہ اس تحریک میں جس قدر دلچسپی لیتے تھے اس قدر کسی دوسرے آدمی نے نہیں لی۔ نواب محسن الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور میں اس تحریک کو چلانے والے تھے۔ نواب محسن الملک اپنی

حیات میں 1907 تک برابر اس کمیٹی کے پریسیڈنٹ رہے اور بڑی مستعدی سے اس کے کاموں میں حصہ لیتے رہے۔

سرسید کے انتقال کے چند ماہ بعد علی گڑھ میں سرسید میموریل فنڈ کے متعلق ایک بڑا جلسہ ہوا اور سر جیمس لاٹوش لفٹیننٹ گورنر یو۔ پی نے علی گڑھ میں آکر جلسے کی صدارت کی۔ اور ایک معقول رقم چندے کی جمع ہوئی۔ چندے کی اپیل شائع ہوئی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے منعقدہ لاہور میں سب سے اول ریزولیشن سرسید میموریل فنڈ کی تائید میں پاس ہوا۔

ریاستوں اور پبلک سے چندے کی درخواستیں کی گئیں اور چندہ جمع کرنے کے لیے ایجنٹ رکھے گئے۔ غرض یہ کہ فراہمی چندہ کا کام بڑی مستعدی سے ہونے لگا۔ آفتاب احمد خاں اور میں چند مقامات پر گئے اور وہاں جلسے کیے۔ ان میں سے بلند شہر کا جلسہ بھی تھا۔ کلکٹر بلند شہر نے جن کا نام مسٹر ریڈی چی تھا صدارت کی تھی۔

سرسید کے جانشین

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے سرسید نے اپنی زندگی میں اپنے بعد کالج کے کام کا انتظام کیا تھا اور سید محمود مرحوم اپنے بیٹے کو قوانین کالج میں لائف سکریٹری مقرر کیا تھا۔ یہ قوانین ان دنوں میں بنے تھے جب سید محمود مسلمانوں کی قوم میں ایک نہایت قابل مسلمان تصور ہوا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ سید محمود کی صحت گرتی گئی اور اس کے ساتھ ہی ان کے دماغی قویٰ میں بھی ضعف آتا گیا۔ جب میں نے ان کو اول ہی اول طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تو ان کی حالت کچھ گر چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک شان دار اور شاداب درخت کو گھن لگ گیا ہے اور وہ اپنی طبعی عمر کے آخری وقت تک زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کی کمر جھکتی جاتی تھی اور بال سفید ہوتے چلے جاتے تھے اور انحطاط کی تمام علامتیں ان پر طاری تھیں۔ پہلے پہل تو مجھے بہت اشتیاق ہوا کہ ایسے بڑے آدمی کے پاس جانا مفید ہوگا لیکن رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ سید محمود کی قابلیت قریب قریب ختم ہوگئی ہے۔ دماغ میں اعتدال اور جسم میں صحت باقی نہیں رہی تھی۔ لوگ ان کے پاس جانے سے گھبراتے تھے۔ کیونکہ ایک مرتبہ اگر ان کے پاس جاؤ تو وہ پیچھا نہیں چھوڑتے تھے اور کہتے تھے کہ بیٹھے رہو۔ مالی مشکلات ان کو ہر وقت ستاتی تھیں۔ لوگوں کے کہنے سے انھوں نے وہ

کوٹھی جس میں سرسید، محمود بیگم اور وہ خود رہتے تھے محمود بیگم کے نام بیع کر دی۔ مجھ سے کہا کہ بیع نامہ لکھ دو۔ میں نے کہا کہ میرا کیا تجربہ ہے کہ اتنے بڑے بیع نامہ کا مسودہ لکھنے کی جرأت کروں۔ انھوں نے کہا کہ اچھا ہم خود بیع نامہ لکھواتے ہیں تم رجسٹری کرا دینا۔ چنانچہ انھوں نے کسی منشی کو بلا کر بیع نامہ لکھوانا شروع کیا۔ اس میں قرآن شریف کی آیتوں کی آیتیں اور سورتوں کی سورتیں نقل کرادیں۔ جب مسودہ تیار ہو گیا تو مجھے بلایا کیونکہ میں اس وقت قانون کے امتحان میں کامیاب ہو چکا تھا اور کہا کہ اس کی رجسٹری کرادو۔ مجھ کو بالکل یاد نہیں رہا کہ آیا یہ بیع نامہ سرسید کی حیات میں رجسٹری ہو گیا تھا یا بعد میں رجسٹری ہوا لیکن رجسٹری ضرور ہوئی اور میں نے کرائی اور سب رجسٹرار کو بلا کر سید محمود کی کوٹھی پر رجسٹری کرائی۔ سب رجسٹرار نے رجسٹری تو کر دی لیکن جب اس نے کھول کر دیکھا تو اس میں بہت زیادہ عربی کی عبارت تھی یعنی قرآن شریف کی آیات اور سورتیں تھیں۔ سب رجسٹرار کو اختیار تھا کہ وہ رجسٹری کرنے سے انکار کر دیتا کیونکہ رجسٹری یا تو انگریزی زبان کے کاغذوں کی ہو سکتی ہے یا ہندوستانی زبان میں لکھے ہوئے کاغذ کی۔ سب رجسٹرار نے جج کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا کہ میرے دفتر میں کوئی شخص اس دستاویز کی نقل نہیں کر سکتا اس لیے مجھ کو اجازت ہو کہ کچھ اجرت دے کر کسی عرضی داں سے اس کی نقل کرواؤں۔ چنانچہ جج نے اجازت دے دی اور بیع نامہ رجسٹری کے دفتر میں نقل ہو گیا۔

اس وقت جن لوگوں نے سنا انھوں نے کہا کہ یہ بیع نامہ ہندوستان کی تاریخ میں اپنی قسم کا ایک ہی بیع نامہ نکلے گا۔ سید محمود نے بیچ میں شراب ترک کر دی تھی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی تندرستی بہت کچھ سنبھل گئی۔ ہاتھ اور ٹانگیں اور منہ پر جو جھریاں تھیں اور کھال لٹک رہی تھی وہ گوشت سے سب بھر گئی اور سید محمود ایک بڑے قد آور تنومند آدمی دکھائی دینے لگے۔ سید محمود کا قد چھ فیٹ سے بھی زیادہ تھا۔ رنگ بہت اجلا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں یہ نہایت حسین جوان ہوئے ہوں گے۔ ان ہی دنوں میں وہ کانفرنس کے جلسوں میں اکثر اوقات مختلف مضامین پر نہایت مدلل اور شستہ گفتگو بھی فرمایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے جدید تعلیم کی ترقی کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی تھی جو بہت ہی مقبول ہوئی تھی اور اب بھی بہت مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اور جو لوگ تعلیم کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو وہ اس کتاب سے بہت مدد حاصل کرتے ہیں۔ وہ اپنی جج

کے زمانے میں تعلیمی کمیشن کے ممبر بھی رہے تھے۔ان کے خیالات اس قدر اونچے تھے کہ ان میں فرقہ وارانہ کسی خیال کی بو بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔وہ اگر گاندھی جی مہاراج کے عروج کے زمانے میں حیات ہوتے تو گاندھی جی ان کو اپنا ہم خیال سمجھ کر دوست بنا لیتے اور اپنی ملکی اصلاحوں میں ان سے مدد لیتے۔اس بدلی ہوئی حالت کو دیکھتے ہوئے ہر شخص سمجھتا تھا کہ سر سید کا جانشین اس بڑے کام کے لیے تیار ہو رہا ہے،جس کے لیے سر سید نے ان کو اپنے بعد کالج کا لائف سکریٹری ہونا نامزد کیا تھا۔اس زمانے میں بیرونجات سے جو لوگ آیا کرتے تھے وہ سر سیدؒ مرحوم سے ملاقات کے علاوہ سید محمود سے بھی قصد کر کے ملتے تھے اور ان کی باتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ان دنوں سر سید کوٹھی موسومہ انگلش ہاؤس کے جنوبی اور مشرقی حصے میں رہتے تھے اور مغربی حصے میں سید محمود رہتے تھے اور اندر کی طرف محمود بیگم رہا کرتی تھیں۔

یہ دن اور یہ حالت سر سید کی زندگی کے اطمینان بخش تھے گو یہی دن تھے جن دنوں میں ان کو شیام بہاری لال کے تغلب سے صدمۂ عظیم پہنچا تھا۔لیکن سید محمود کی حالت کو دیکھ کر وہ اپنی تحریکوں کی آئندہ کامیابی کے متعلق مایوس بھی نہیں ہوتے ہوں گے۔ان ہی دنوں ایک انگریز سید محمود کا دوست بطور سیاح کے سفر کرتا ہوا علی گڑھ ان سے ملنے کے لیے آ گیا۔وہ کچھ دنوں تک سید محمود کے پاس علی گڑھ میں رہا اور اس کے بعد دونوں مختلف مقامات پر قدیم عمارتیں اور یادگاریں دیکھنے کے لیے نکلے۔دہلی،آگرہ،لکھنؤ،بنارس اور دیگر مقامات پر قریب ایک ماہ سے زیادہ گشت لگاتے رہے۔یہ ان کے دوست کا ان کے پاس آنا ان کے حق میں سم قاتل ہو گیا۔پرانی مے نوشی کی عادت پھر عود کر آئی اور ذوق شاعر کا یہ کہنا ان پر کلیتاً صادق ہو گیا،شعر:

اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اب ادھر تو مے نوشی پھر شروع ہو گئی اور اُدھر مالی مشکلات بھی ان کے سامنے پیش آنے لگیں۔ان کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ چھ سو روپے ماہوار ان کو پنشن کے ملتے تھے،جن کے آنے کا انتظار رہتا تھا اور جس کے آتے ہی ان کا تیا پانچہ ہو جاتا تھا (ختم ہو جاتی تھی) پھر تمام تندرستی خاک میں مل گئی،اب یہ دوبارہ جو پینا شروع کیا تو پھر صاف یہ معلوم ہوتا تھا کہ قبر کی طرف جا رہے ہیں۔

سر سید کے انتقال کے وقت سید محمود کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ ہم لوگ اس کوٹھی کے احاطہ میں جانے سے ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ کیا دیکھا کہ کھٹیا پر ارتھی بنے لیٹے ہوئے ہیں اور بھنگیوں سے کہا کہ چارپائی اٹھا کر چلو۔ بھنگی ادھر سے اُدھر احاطہ میں چکر لگا رہے تھے اور سید محمود زبان سے کہتے جاتے تھے کہ رام رام ست ہے بولو ہمارے حضور کی جے ہے۔ ایک موقع پر مجھے کسی کام سے بلایا۔ اوّل تو چاہا کہ ٹال جاؤں۔ پھر ان کی مہربانیوں کا خیال کر کے چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ایک مٹی کے تھوبے پر پاؤں رکھے ہیں۔ چارپائی سے ٹانگیں لٹکا رکھی ہیں اور اُپلے انگیٹھی میں جلا رکھے ہیں اور تمام کمرے میں دھواں گھٹ رہا ہے۔ میں جا کر بیٹھا تو کمرے میں بہت بڑے بڑے چوہے ادھر اُدھر دوڑ لگا رہے تھے۔ میں نے ان چوہوں کی طرف جو توجہ کی تو سید محمود بولے دیکھا کیسے بڑے بڑے چوہے پال رکھے ہیں۔ کیا کسی اور نے بھی اتنے بڑے بڑے چوہے پالے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ٹین کے جو برتن رکھے ہوئے تھے چوہوں نے ان پر حملہ کرنا شروع کیا اور کھٹ کھٹ شروع ہوئی۔ سید محمود نے ادھر دیکھ کر کہا کہ مذاق کی باتیں تو در کنار ذرا ان چوہوں کو تو مارو کہیں میرا کھانا نہ کھا جائیں۔ میں نے جا کر وہ ٹین کے برتن اٹھائے۔ ان میں بازار کے تیل کی پکی ہوئی کچھ چیزیں تھیں اور آبجور کی چٹنی تھی۔ یہ بازار کے تیل کی پکی ہوئی چیزیں اس لیے کھایا کرتے تھے کہ ان کو وہم ہوگیا تھا کہ کہیں کوئی مجھ کو زہر نہ دے دے اس لیے گھر کی پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے شاید یہ بھی کہا تھا کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ یہ چیزیں بازار سے منگوائی تھیں اگر کمبخت چوہے یہ بھی کھا جاتے تو میں بھوکا ہی مر جاتا۔ بہر حال یہ دن ان کی زندگی کے ایسے تھے کہ ہر شخص کو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ آخر عمر میں اس قسم کے دن اس کو پیش نہ آئیں۔ اس موقع پر سید محمود کو اُپلوں سے دھونی رمائے بیٹھے دیکھ کر مجھ کو انشاء اللہ خاں شاعر کی آخری زندگی کا خیال آ گیا جس کا تذکرہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے ''آب حیات'' میں کیا ہے۔ انشاء اللہ خاں کی نسبت میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان کو بھی شراب پینے کی لت تھی یا نہیں لیکن اودھ کے بادشاہ نے جو ایک وقت میں ان کے بڑے مربی تھے اور ایک وقت میں دولت و ثروت سے ان کو عروج پر پہنچا دیا تھا آخر میں ان سے ناراض ہو کر ان کو بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا۔ بہر حال وجہ کوئی بھی ہو مگر سید محمود کی جو حالت میں نے دیکھی وہ اس حالت کے بالکل مطابق تھی جو انشاء اللہ

خاں کی آخر میں آکر ہوئی تھی۔

میں نے سید محمود کی جانشینی کا واقعہ قصداً سب سے بعد میں رکھا ہے تا کہ ان کی زندگی کے دیگر واقعات سے واقفیت ہو جائے کہ آیا وہ سرسید کی جانشینی کے قابل تھے یا نہیں۔ سرسید کی وفات کے بعد لوکل ٹرسٹیوں نے تا انتخاب کسی جانشین کے کالج کا کل مالی انتظام مسٹر بیک پرنسپل کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ مسٹر بیک اوّل تو محسن الملک کے مخالف تھے جن کو ٹرسٹی سکریٹری شپ کے لیے منتخب کرنا چاہتے تھے۔ نواب محسن الملک حیدر آباد سے جب علاحدہ ہوئے تو ریذیڈنٹ نے ان پر کچھ الزام لگائے تھے۔ سب انگریز حسب عادت محسن الملک سے بدظن ہو گئے تھے کہ ان کی قوم کے ایک آدمی نے ان پر الزام لگایا تھا مگر مسٹر بیک رفتہ رفتہ سید محمود سے بھی منحرف ہو گئے۔ آفتاب احمد خاں صاحب اور دوسرے ٹرسٹی کوشش کر رہے تھے کہ نواب محسن الملک کو سکریٹری بنائیں، لیکن نواب محسن الملک رضامند نہیں ہوتے تھے کہ محمود جیسا بھی ہے بھلا یا بُرا مگر وہ میرا دوست ہے میں اس کے خلاف کھڑا نہیں ہوں گا۔ ٹرسٹیوں کے جلسہ تک نواب محسن الملک انکار ہی کرتے رہے۔ جلسہ سے چند روز قبل آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اور ان کے ساتھ کوئی اور صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا محسن الملک کے پاس گئے اور بیک صاحب نے ان کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ آپ کے اور میرے درمیان جو غلط فہمی تھی اب مجھ کو اس کا کچھ خیال نہیں ہے اور آپ بھی یہ بات دل سے نکال دیجیے اور سکریٹری شپ منظور کر لیجیے۔ آفتاب احمد خاں صاحب نے جا کر کہا کہ ہمیں بیک صاحب اور ٹرسٹیوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ سکریٹری شپ کے معاملہ میں آپ سے گفتگو کریں۔ نواب صاحب نے چھوٹتے ہی یہ شعر پڑھا۔

حضرت ناصح اگر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ | کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آفتاب احمد خاں کو شاعری سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں تھا نہ یہ معلوم کہ وہ اس شعر کا پورا مطلب سمجھے یا نہ سمجھے۔ انھوں نے یہ شعر سن کر بہت برا مانا اور وہ وہاں سے چلے آئے۔ آخر کو بزرگ ٹرسٹیوں کے درمیان رضامندی دے دی۔ جب ٹرسٹیوں کا جلسہ ہوا تو بہت سے ٹرسٹی جمع ہوئے۔ نواب محمد حیات خاں صاحب جو ان دنوں میں پنجاب کے کسی ضلع میں جج تھے وہ صدر قرار پائے۔ یہ معلوم ہوا کہ سید محمود ایک بڑا سا لٹھ لیے ہوئے آ رہے ہیں۔ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے کہا

کہ بھئی پولیس کا انتظام کرنا چاہیے کہیں سید محمود کوئی دنگا نہ کر بیٹھیں۔ ٹرسٹیوں نے اس بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔ میں اس وقت ٹرسٹی تو نہیں تھا لیکن بحیثیت اولڈ بوائے کے بہت سی باتوں میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس ٹرسٹیوں کے جلسہ میں بھی میری شرکت تھی۔ میں جلسہ کے کمرے کے دروازے پر موجود تھا اور میرے ساتھ کچھ اور بھی طالب علم تھے۔ آخر کو سید محمود نمودار ہوئے۔ ایک بہت بڑا کاغذوں کا پلندہ اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھے اور ایک لٹھیا ان کے ہاتھ میں تھی۔ سید محمود جب کمرے میں داخل ہوئے تو سب ٹرسٹی کھڑے ہوگئے۔ وہ جا کر اپنے کاغذوں کا پلندہ صدر کی میز پر رکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے کاغذوں کو دیکھ کر صدر سمجھ گئے کہ یہ بہت جھنجھٹ اور وقت ضائع کریں گے۔ جلسہ شروع ہوا تو صدر نے اعلان کیا کہ ہر بولنے والے کو پانچ منٹ کا وقت ملے گا۔ اس کے بعد مجھ کو یاد نہیں رہا کہ درمیانی کیا کارروائی ہوئی لیکن جلسہ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی سید محمود تقریر کرنے کو کھڑے ہوئے۔ سید محمود نے اس قدر زبردست تمہید باندھی کہ اگر ان کو اجازت دے دی جاتی تو وہ کئی دن تک تقریر کیے جاتے۔ لیکن ابھی تمہید ایک چہارم بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ پانچ منٹ کا وقت گزر گیا اور صدر نے گھنٹی بجا دی کہ وقت ختم ہوگیا۔ سید محمود نے کہا کہ کیا میرے لیے بھی پانچ منٹ ہی ہوں گے، میری تو ابھی تک تمہید بھی ختم نہیں ہوئی کہ میرا وقت گزر گیا۔ صدر نے کہا کہ سب کے لیے برابر وقت دیا جائے گا۔ آپ کا وقت ختم ہوگیا۔ آپ تشریف رکھیے۔ مطلب کی کوئی بات آپ کی زبان سے نہیں نکلی تمہید بھی آپ ختم نہ کر سکے اتنا وقت ہم لوگوں کے پاس نہیں ہے کہ ہم بیٹھے پرانے قصے سنا کریں اس لیے مناسب ہے کہ آپ تشریف رکھیں۔ سید محمود نے اپنا کاغذوں کا پلندہ اٹھایا اور نظیر اکبرآبادی کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے باہر کی طرف چلے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

لیکن ابھی وہ دروازے تک پہنچنے بھی نہ پائے کہ نواب محسن الملک اپنی کرسی سے اٹھے اور اپنی ٹوپی اتار کر سید محمود کے قدموں پر رکھی۔ اوّل تو سید محمود بہت چیں بہ جبیں ہوئے لیکن جب محسن الملک کو زار زار روتے دیکھا تو جھک کر ان کو اٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا۔ اس پر انتخاب کا معاملہ آسان ہوگیا۔ سید محمود بھی آکر کرسی پر بیٹھے اور غالباً "نواب محسن الملک" کے انتخاب کی انھوں نے بھی

رضامندی دے دی اور نواب محسن الملک سکریٹری منتخب ہوئے اور سرسید کے جانشین بن گئے۔

ان واقعات سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ کوئی انسان اپنی طرف سے خواہ کچھ بھی اپنے بعد کے لیے انتظام کرے لیکن بعد والوں کو حالات کے لحاظ سے کام چلانے کا معقول انتظام کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہماری مقدس تاریخ میں جو واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت کے انتخاب کا پیش آیا ہمیشہ کے لیے نسلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔ گو شیعہ صاحبان کا خیال ہے کہ انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کسی موقع پر اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ سنی علما اور عوام کو اس سے سخت اختلاف ہے لیکن مجھ کو اس مسئلہ کے متعلق نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ کسی سے اتفاق ہے نہ اختلاف لیکن یہاں پر صرف اپنا خیال درج کرنا چاہتا ہوں کہ کسی کے مورث اگر اپنے بعد اپنی جانشینی کا کوئی انتظام کریں تو اس کے بعد کے واقعات کے اثرات سے اس کی جانشینی کا انتظام ہوگا نہ کہ متوفی کی خواہش و تجویز کے مطابق۔ اس لیے کوشش بالکل بے کار ہے کہ کوئی شخص اپنے بعد کے زمانے کے لیے اپنی زندگی میں کسی کو اپنا جانشین منتخب کر لے۔ ایک شخص تمام آئندہ کے حالات و واقعات پر حاوی نہیں ہوسکتا اس لیے اس کو بعد کی ضرورتوں اور انتظامات کو آئندہ کے حالات پر چھوڑ دینے چاہییں۔

سید محمود صاحب گو سکریٹری تو نہیں ہوئے لیکن ان کو برائے نام اشک شوئی کے لیے ٹرسٹیوں کی جماعت کا پریسیڈنٹ مقرر کیا گیا جو بالکل ایک بے کار بات تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بحیثیت پریسیڈنٹ نہ کوئی کام کیا اور نہ کسی کام میں دخل دیا۔ سید محمود کی اپنی دماغی اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے خانگی زندگی میں بہت سخت تلخی پیدا ہوگئی تھی۔ سرسید کے بعد انھوں نے یہ کوشش کی کہ ان کا بیٹا راس مسعود انگریزی نہ پڑھے اور کچھ دنوں کے لیے اس کو مدرسہ سے الگ کر لیا لیکن مسٹر بیک اور سر تھیوڈور ماریسن بیچ میں پڑے اور راس مسعود کو ان کی قید سے چھڑا کر اپنے پاس لائے اور اس کے بعد 1904 تک سید راس مسعود انگلش ہاؤس میں پڑھتے رہے اور پھر گورنمنٹ نے ان کو ولایت کا وظیفہ دیدیا اور وہ انگلستان چلے گئے۔ برٹش گورنمنٹ نے سرسید کے خاندان سے ان کے بعد جو احسانات کیے وہ قابل ذکر ہیں۔ گورنمنٹ نے سید راس مسعود، محمود بیگم اور سرسید کی دوسری بہو بیوہ سید حامد سب کے لیے معقول وظائف مقرر کر دیے اور اگر ان کو یہ وظائف نہ ملتے

تو سخت تکلیف میں رہتے۔ سید راس مسعود جب بیرسٹری پاس کر کے انگلستان سے واپس آئے تو صوبہ بہار میں ان کو محکمہ تعلیم میں ملازمت دیدی اور انسپکٹر مقرر کر دیا۔

سید محمود علی گڑھ چھوڑ کر سیتاپور صوبہ اودھ میں اپنے چچازاد بھائی سید محمد احمد کے پاس چلے گئے تھے۔ اور وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔ ان کا جنازہ علی گڑھ لایا گیا اور یونیورسٹی کی مسجد میں سرسید کے مزار کے پاس دفن کیا گیا۔ سید محمود کی زندگی کے متعلق میں اور کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ اگر کوئی قانون پیشہ آدمی توجہ کرے تو الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لاء رپورٹوں میں ان کے بڑے بڑے فیصلے ملیں گے جن سے ان کی قانونی قابلیت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ اگر ان فیصلوں کو کوئی کتاب کی صورت میں چھپوا دے تو یہ مجموعہ سید محمود کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ ہوگا اور آئندہ قانون پیشہ جماعت کے لیے ایک کارآمد کتاب ثابت ہوگی۔

سر سید کے رفقا اور دیگر شخصیات

نواب محسن الملک

نواب محسن الملک مرحوم کی سوانح عمری کسی اعلیٰ مصنف کو لکھنی چاہیے۔ میں جیسا کے اوپر کہہ چکا ہوں کہ میں یہ واقعات کا مجموعہ بطور ایک تاریخ کے مرتب نہیں کر رہا ہوں بلکہ فقط اپنے زمانے کے چشم دید واقعات کی یادداشتیں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ مجھ کو یہ نہیں معلوم کہ آئندہ نسلیں اس زمانہ کے حالات دلچسپی سے پڑھیں گی یا نہیں یا ان سے کوئی فائدہ حاصل کریں گی یا نہیں۔ لیکن میرے زمانہ کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جن کی غالباً جداگانہ کوئی تاریخ مرتب نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے میری یہ یادداشتیں آئندہ کسی مکمل تاریخ کی ترتیب کے وقت مصنفین کے کام آئیں گی۔

نواب محسن الملک اٹاوہ صوبہ یو۔پی کے رہنے والے تھے۔ وہ اہل شیعہ اثناء عشری کے خاندان سے تھے۔ ان کی تعلیم پرانے مکاتیب کی تعلیم تھی۔ وہ فارسی بہت اچھی جانتے تھے، عربی بہت کم جانتے تھے لیکن اردو زبان اور لٹریچر پر بہت عبور تھا اور اپنے زمانے کے مسلمانوں میں اپنی فصاحت اور بلاغت کے لیے یکتا سمجھے جاتے تھے۔ نواب محسن الملک اوّل کسی نہایت قلیل تنخواہ پر کسی دفتر میں ردّیاں چھانٹنے کے لیے ملازم ہوئے جیسا کہ ان کا خود بیان تھا اور پھر نائب تحصیل دار ہوئے اور پھر تحصیل دار ہوئے۔ تحصیل داری کے زمانہ میں سر سید سے ان کے بہت گہرے

دوستانہ تعلقات ہو گئے اور جہاں جہاں وہ تحصیل دار رہے وہاں انھوں نے رفاہ عام کا بھی بہت کام کیا۔ اس زمانہ میں ان کے مذہبی خیالات میں بہت تغیر پیدا ہوا جس کی وجہ سے شیعہ فرقے کے اعتقاد کو ترک کر کے وہ سنّی ہو گئے اور اس زمانہ میں انھوں نے ایک کتاب آیات بیّنات کے نام سے تصنیف کی جس میں شیعہ مذہب کے اعتقادات کی تردید کی اور سنّی مذہب کے اعتقادات کی تصدیق کی۔ اس زمانہ میں سر سالار جنگ ریاست حیدر آباد کے پرائم منسٹر تھے، انھوں نے شمالی ہندوستان سے قابل مسلمانوں کو بلا کر انتظامی کاموں پر مقرر کیا۔ انھوں نے سر سید سے خواہش کی کہ وہ مالیات کے محکمہ کے لیے کسی قابل آدمی کی سفارش کریں۔ چنانچہ سر سید نے نواب محسن الملک کی سفارش کی اور غالباً اسی زمانہ میں نواب وقار الملک کی بھی سفارش کی۔ یہ دونوں صاحبان حیدر آباد چلے گئے اور وہاں جا کر بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہو گئے اور اپنی انتظامی قابلیت کا سکہ حیدر آباد کے حکمراں اور عوام کے دلوں پر بٹھا دیا۔ حیدر آباد میں نواب محسن الملک نے مالی انتظام میں وہی شہرت حاصل کی جو اکبر کے وزیر ٹوڈرمل نے اپنے زمانہ میں کی تھی۔ نواب محسن الملک نے سر سید کے کاموں میں جو کچھ امداد دی اس کی مختصر سی تفصیل حیات جاوید میں موجود ہے۔ مجھ کو اس پر اضافہ کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ میرے پاس کوئی زائد مواد ہے کہ میں اضافہ کر سکوں۔ نواب محسن الملک جس وقت حیدر آباد سے مستعفی ہو کر واپس آئے تو اس وقت ان کی عمر کم و بیش ساٹھ سال کی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ 1893-94 میں حیدر آباد سے واپس آ گئے تھے اور وہ سیدھے علی گڑھ ہی میں آئے اور یہیں پر مقیم ہوئے۔

حیدر آباد کی ریاست ان دنوں اندرونی حالات کے لحاظ سے بہت بدنام ہو گئی تھی۔ ریاست کے مصاحبین اور وزرا نہایت ہی خود غرض لوگ تھے اور حالات سن سن کر ہم لوگ شمالی ہند میں یہ خیال کیا کرتے تھے کہ حیدر آباد میں کسی کے پاس ضمیر باقی نہیں رہا اور نہ ایمان داری کو وہاں کے انتظام میں کوئی دخل ہے۔ نواب محسن الملک پر بھی ایک الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے کسی بڑے انگریز کو رشوت دینے کا مشورہ نظام وقت کو دیا تھا۔ اس معاملہ کا پردہ جب فاش ہو گیا تو ریذیڈنٹ نے نظام پر زور ڈالا کہ ان کو حیدر آباد سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ وہ حیدر آباد سے علاحدہ کر دیے گئے اور ان کی پنشن ہو گئی۔ اس زمانہ میں نواب فتح نواز جنگ جن کا نام جہاں تک

مجھے یاد پڑتا ہے مہدی علی تھا ممکن ہے کہ مہدی حسین ہو نواب محسن الملک کا نام بھی مہدی علی تھا۔ اور ایک عمارت نواب محسن الملک کی یاد میں سرسید نے مہدی منزل کے نام سے خود تعمیر کرائی تھی جو اسٹریچی ہال کے برابر میں واقع ہے۔ علاوہ ان دو صاحبوں کے کچھ اور بھی صاحب جو حیدر آباد سے نکالے گئے تھے وہ بھی علی گڑھ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ غرض یہ کہ ان دنوں میں جو لوگ بھی حیدر آباد سے نکالے گئے تھے انھوں نے علی گڑھ میں مستقل طور پر یا عارضی طور پر بسیرا لیا۔ اس پر اس زمانے کے سب سے ظریف اخبار 'اودھ پنچ' نے لکھا کہ اب اس مقام کا نام علی گڑھ نہیں ہونا چاہئے بلکہ تکیۂ مردوداں ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو شخص کہیں سے رد کیا جاتا ہے وہ یہاں آ کر پناہ لیتا ہے۔ نواب محسن الملک نے اپنے سکریٹری شپ کی آٹھ سالہ زندگی میں بہت مفید کام کیے۔ اوّل تو انھوں نے سرسید میموریل فنڈ کے صدر کی حیثیت سے چندہ جمع کرنے میں بہت امداد دی۔ یہ راقم ان کا سکریٹری تھا اور قریب قریب ہر روز ان سے ملاقات رہتی تھی۔ اگر سرسید میموریل فنڈ قائم نہ ہوتا اور اس میں چندہ نہ جمع ہوتا تو یونیورسٹی کا قائم ہونا دشوار تھا۔ 1911 تک میں آنریری سکریٹری اس فنڈ کا رہا۔ میرے زمانے میں جس قدر اس فنڈ میں روپیہ جمع ہوا اس میں نواب محسن الملک مرحوم کی کوشش کا ایک معقول حصہ تھا۔ سرسید میموریل فنڈ کا طریقہ کار یہ تھا کہ اس کا دفتر میرے مکان پر تھا۔ ایک کلرک اور بعض وقت دو کلرک کام کرتے تھے۔ ایک وقت میں پینتالیس ایجنٹ میں نے چندہ جمع کرنے کے لیے مقرر کیے۔ ان سب ایجنٹوں میں مولوی امام الدین صاحب گجراتی کا کام قابل تحسین رہا۔ مولوی صاحب مذکور کسی اسکول میں ہیڈ مولوی تھے اور ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے سرسیدؒ میموریل فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے کی کوشش شروع کی۔ وہ سرسید کے معتقدین میں سے تھے اور صوفی منش آدمی تھے۔ وہ سرسیدؒ میموریل فنڈ میں کام کرنے کی تنخواہ وغیرہ کچھ نہیں لیتے تھے صرف سفر خرچ لیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کو کالج میں تعلیم حاصل کرنے میں کالج نے بہت مدد کی۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب مرحوم نے گجرات (پنجاب) سے مجھ کو لکھا کہ ٹوانا قوم کے رؤسا میں سے ایک رئیس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے چھ مہینہ سرسید میموریل فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے میں صرف کریں گے لیکن چھ ماہ کے بعد وہ کام شروع کریں گے۔ مجھ کو یہ خط کچہری میں ملا اور میں نے پڑھ کر یہ ارادہ کر لیا کہ میں اس شخص سے جا کر ضرور ملوں گا۔ جب

میں لوٹ کر گھر آیا تو میں نے فوراً ارادہ کرلیا کہ ابھی چلنا چاہیے۔ سامان بندھوا کر میں اسٹیشن پر پہنچ گیا اور دوسرے روز دس گیارہ بجے گجرات پنجاب پہنچ گیا جہاں پر مولوی امام الدین صاحب کا مکان تھا۔ مولانا امام الدین صاحب کو مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میں کیسے آگیا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے بلانے سے آیا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو نہیں بلایا۔ میں نے جواب دیا چلیے مجھے ان رئیس صاحب سے ملا دیجیے جنھوں نے چندہ جمع کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ مجھ کو ٹوانا ملک صاحب کے پاس لے گئے۔ ملک صاحب بہت اخلاق سے پیش آئے اور فرمایا کہ میں نے آپ کے کام میں مدد کرنے کا وعدہ کرلیا ہے اور میں کام شروع کروں گا لیکن چھ ماہ کے وقفہ کے بعد۔ میں نے کہا کہ ملک صاحب میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور شکریہ کے لیے حاضر ہوا ہوں لیکن آپ کے چھ ماہ کے وقفہ کی شرط مجھے یہاں بلالائی ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل دنیا کا کیا حال ہو جائے گا اور ہمارا کیا حال ہوگا۔ دنیا چلتی پھرتی ہے اور انسان فانی ہے اور چھ ماہ کی میعاد بہت بڑی میعاد ہے۔ آپ نے جو نیک ارادہ کیا ہے اگر ممکن ہو تو اس کے پورا کرنے میں تعویق نہ فرمایئے خدا آپ کو نیک اجر دے گا اور قوم ہمیشہ آپ کی ممنون رہے گی۔ اس لیے آپ اس کام کو جلد شروع کر دیجیے۔ ملک صاحب کے دل پر میرے کہنے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے وعدہ فرمالیا کہ میں کل ہی سے کام شروع کر دوں گا۔ انھوں نے کام کیا اور دیہات وقصبات میں جا کر چندہ وصول کیا۔ وہ ضلع شاہ پور کے بہت بڑے بااثر زمیندار تھے۔ اس لیے ان کی کوشش سے کم وبیش پچاس ہزار روپیہ جمع ہوا۔ میں اس وقت اپنے محسن ملک صاحب کا نام بھولتا ہوں کاغذوں میں مل سکتا ہے لیکن کون ڈھونڈے۔ اس واقعہ کو قریب چالیس سال ہو گئے لیکن اس قدر ان کا نام خیال میں آتا ہے کہ یا تو ملک مبارک خاں یا ملک مبارز خاں تھا۔ وہ ضلع شاہ پور کے ٹوانا خاندان کے سربرآوردہ اشخاص میں سے تھے۔

سرسید میموریل فنڈ کے ساتھ ایک اور شاخ ون روپی فنڈ کی کھلی یعنی ایک روپیہ فی کس کے حساب سے چندہ وصول کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ ہمارے انگریز پروفیسروں میں مسٹر پٹنگ ایک پروفیسر تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے ایک جلسے میں تقریر کی اور اس میں انھوں نے یہ تجویز کی کہ چھوٹے چندوں سے دوسرے ملکوں میں امور خیر کے لیے روپے بہت جمع ہو جاتے ہیں

اس لیے سرسید میموریل فنڈ کو بھی ایک شاخ ون روپی فنڈ کی قائم کرنا چاہیے۔ امید ہے کہ اگر کام ٹھیک ہوا تو روپیہ کافی جمع ہو جائے گا۔ اس کام کو سید جعفر حسین صاحب انجینیر نے اپنے ہاتھ میں لیا اور دو یا تین سال تک اس کے ذریعہ سے روپیہ وصول کرتے رہے۔ چندہ کچھ زیادہ وصول نہیں ہوا۔ میرے دوست ظفر عمر صاحب نے بھی اس فنڈ میں قریب قریب ایک سال تک چندہ جمع کرنے کی کوشش کی لیکن بہت زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ اس لیے روپی فنڈ بند کر دیا گیا۔ سب سے زیادہ مدد کانفرنس کے مختلف اجلاس سے ملی۔ اس سے قبل ایک ممبئی کی کانفرنس کے واقعات کا ذکر آچکا ہے اور دوسرے نواب محسن الملک مرحوم کے رنگون جانے کا ذکر آچکا ہے۔ دیگر مقامات پر بھی جہاں جہاں کانفرنس ہوتی تھی ہر سال روپیہ جمع ہوتا تھا۔

حضور نظام محبوب علی خاں مرحوم نے پانچ لاکھ روپیہ عطا فرمایا تھا اور دوسری ریاستوں یعنی بھوپال، بھاول پور وغیرہ سے بھی معقول رقمیں ملی تھیں۔ یہ فراہمی چندہ کا سلسلہ برابر جاری تھا کہ 1911 میں بمقام ناگپور کانفرنس کا جلسہ ہوا اور ہز ہائی نس سر آغا خاں اس کے صدر مقرر ہوئے۔ ان دنوں نواب وقار الملک مرحوم اس فنڈ کے صدر تھے اور میں سکریٹری تھا اور آفتاب احمد خاں مرحوم اس فنڈ کی فراہمی میں ایک زبردست معین و مددگار تھے۔ میرا چندہ جمع کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ جہاں میں کانفرنس کے جلسوں میں جاتا تھا اپنے بعض سر برآوردہ ایجنٹوں کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور کل معززین سے ان کا تعارف کرا کے ان کو اسی مقام پر مہینہ دو مہینہ تک چھوڑ دیتا تھا۔ وہ اکثر مقامات پر چندہ جمع کرتے رہتے اور اس میں خوب کامیابی ہوتی۔

ناگپور سے ہم لوگ الہ آباد آئے اور ہز ہائی نس سر آغا خاں بھی آئے۔ ہز ہائی نس نے وہیں پر کام شروع کر دیا اور علیا حضرت مرحومہ ہر ہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرما روائے ریاست بھوپال بھی الہ آباد میں موجود تھیں، کیونکہ ان دنوں الہ آباد میں ایک بہت بڑی نمائش ہو رہی تھی اور وہاں پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں بیگم صاحبہ مرحومہ مغفورہ کے پاس گئے اور ان سے چندہ کی درخواست کی بیگم صاحبہ مرحومہ نے ایک لاکھ روپیہ چندہ مرحمت فرمایا۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں نے بھی وہیں پر اپنی طرف سے ایک لاکھ کے چندہ کا اعلان

فرمایا۔ ان کے علاوہ اور لوگوں نے بھی چندہ دیا اور ہز ہائی نس سر آغا خاں کی توجہ سے کام سرگرمی سے شروع ہوگیا۔ میں نے علی گڑھ میں آ کر سرسید میموریل فنڈ کی کمیٹی کا جلسہ کر کے اس کو ختم کر دیا اور ایک دوسری کمیٹی یونیورسٹی فنڈ کے نام سے قائم کر دی۔ انتظام تو وہی رہا جو پہلے تھا اور میرے سپرد چندہ کی آمد و خرچ کے حساب کا کام کیا گیا اور نواب وقار الملک بدستور صدر رہے اور دوسرے احباب جو پہلے سرسید میموریل فنڈ کے ممبر تھے وہ بھی اس جدید کمیٹی کے ممبر ہوئے۔

مولانا شوکت علی مرحوم نے چندہ کی فراہمی کے لیے دورے کا ارادہ کیا اور ایک بہت بڑا بل سفر خرچ کا پیش کیا۔ میں نے اس کو پاس نہیں کیا اور نواب وقار الملک مرحوم کے سپرد کر دیا کہ آپ اس کو طے کر دیجیے۔ جہاں تک مجھے واقفیت ہے علی برادران نے کوئی چندہ وصول کر کے علی گڑھ کے خزانے میں کبھی جمع نہیں کیا۔ انھوں نے ڈھاکہ میں جا کر ایک جلسہ کیا اور لکھا کہ ساٹھ ہزار روپیہ جمع ہوا ہے۔ ہم انتظار کرتے رہے کہ روپیہ آتا ہے لیکن جب سال بھر تک روپیہ نہیں آیا تو یاد دہانی کی گئی تو وہاں سے جواب آیا کہ شوکت علی صاحب نے تو کہا تھا یہ روپیہ جمع کر کے ڈھاکہ میں ایک مسلم ہال تعمیر کراؤ اور اس کی فراہمی میں جو کچھ خرچ ہوگا وہ علی گڑھ سے دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ بارہ ہزار روپے کا بل بھی بھیج دیا کہ یہ ہمارا خرچ ہوا ہے یہ آپ دیجیے۔ جب شوکت علی صاحب سے کہا کہ کل ہندوستان کے اسلامی ادارے مسلم یونیورسٹی میں شامل ہیں۔ مسلم ہال بھی مسلم یونیورسٹی کا ایک جزو ہے ہال کے لیے ان لوگوں کو یہ روپیہ ادا کر دیجیے۔ اس سے ان کی بہت تالیف قلوب ہو جائے گی۔ نواب وقار الملک کے سامنے جب یہ معاملہ پیش ہوا اور واقعات بیان کیے گئے تو انھوں نے فرمایا کہ شوکت علی بہت ہی خفیف الحرکات آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہم سے تو کہا تھا کہ ساٹھ ہزار روپیہ یونیورسٹی کے لیے جمع کیا ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان سے کہہ دیا کہ تم مسلم ہال بناؤ اور خرچہ کا روپیہ ہم دیں گے اور ہم کو بھی سبز باغ دکھاتے رہے کہ تمھارے لیے اس قدر روپیہ جمع کر دیا۔ نواب صاحب کو اس سے بہت رنج ہوا لیکن مولانا شوکت علی صاحب اس کے بعد کسی سفر خرچ کا کوئی بل لے کر دفتر میں نہیں آئے۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں، مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دیگر چند اصحاب کو لے کر دورے کے لیے نکلے اور ان کی کوشش سے بہت سا روپیہ جمع ہوگیا۔ انھوں نے ایک خط حضور نظام کے پاس بھی

بھیجا تھا۔ حضور نظام نے بھی جدید تحریک کے سلسلہ میں پانچ لاکھ روپیہ مرحمت فرمایا۔ یہ دوسری تحریک اس وقت تک جاری تھی جب تک خلافت کی تحریک مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں ہوئی تھی۔ خلافت کی تحریک کیا تھی وہ ایک ہنگامہ تھا۔ اس میں کوئی قومی، ملکی، اخلاقی یا مذہبی بنیادی اصول شامل نہیں تھا۔ وہ یورپ کی عیسائی اقوام کے مظالم کا ایک نہایت ہی کمزور جواب تھا۔ جو صدیوں سے ٹرکی اور دیگر وسط ایشیا و شمالی افریقہ کی مسلمان اقوام برداشت کر رہی تھیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ کل مظالم جو مسلمانوں پر نازل ہو رہے ہیں یہ انگریزی قوم کے تعصب کی وجہ سے ہو رہے ہیں جو اس کو ترکوں اور دیگر اسلامی ممالک سے رہا ہے۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ اگر ہندوستان میں ہم شورش برپا کریں گے تو انگریزوں کو اپنی حکومت قائم رکھنے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ اور وہ مرعوب ہو کر اسلامی ممالک کے خلاف سازشیں کرنا چھوڑ دیں گے۔ اس کا سب سے پہلا جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ اور مہاراجہ محمود آباد اور سیٹھ چھوٹانی اور مسلمانوں کے دیگر بڑے بڑے لیڈر بھی شریک تھے۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی نے ایک تقریر فرمائی اور نہایت غیض وغضب کے لہجہ میں ان لوگوں پر حملہ کیے جو ان کی صدارت کے مخالف تھے۔ اس جلسے میں کوئی اصولی بات طے نہیں ہوئی اور آپس میں بےلطفی کے مظاہرے ہوئے۔ اس جلسہ کی حالت کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ جدید تحریک کوئی کام انجام نہیں دے سکے گی۔ اس جلسہ میں فقط اس امر پر گفتگو ہوئی کہ ہم اپنے خلیفہ وقت یعنی سلطان ٹرکی کی کس طور پر مدد کریں۔ کوئی بات قطعی طے نہیں ہوئی۔ میں وہاں سے مایوس ہو کر چلا آیا اور شام کی ریل میں بیٹھ کر علی گڑھ آ گیا۔ اس کے بعد ایک زبردست طوفان پیدا ہوا جس کا ذکر علاحدہ کیا جائے گا۔ اس وقت تک تو صرف یہ دکھانا تھا کہ اس خلافت کی تحریک کی وجہ سے یونیورسٹی کے چندوں کا دروازہ بند ہو گیا۔

جب سرسید میموریل فنڈ کی تحریک کو میں نے بند کیا تھا تو سید عبدالباقی صاحب مرحوم بر سر نے ایک نقشہ تیار کیا تھا۔ جس میں یہ دکھایا تھا کہ سرسید میموریل فنڈ اور ون روپی فنڈ کی کوشش سے چھبیس لاکھ روپیہ جمع ہوا ہے۔ یہ چھبیس لاکھ کل نقد نہیں تھا۔ بلکہ کچھ نقد تھا اور کچھ سالانہ گرانٹ تھی، سالانہ گرانٹ کی اس وقت کی قیمت لگانے کے بعد سید عبدالباقی صاحب مرحوم نے یہ دکھایا

تھا کہ یہ کل رقم جو اس طور پر جمع ہوئی اس کی مجموعی تعداد چھبیس لاکھ ہے۔ جب ہز ہائی نس سر آغا خاں کی دوسری تحریک کا خاتمہ ہوا اس وقت بھی ہمارے دفتر سے یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ بہت سا روپیہ ہز ہائی نس سر آغا خاں اور مہاراجہ صاحب محمود آباد اور سر محمد شفیع اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں اور دوسرے احباب کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اگر یہ دونوں رقمیں کالج کے ہاتھ میں نہ ہوتیں تو یونیورسٹی قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ سر سید کا جب انتقال ہوا تھا تو انھوں نے ستر ہزار روپیہ سال کی آمدنی چھوڑی لیکن سوا لاکھ روپیہ کالج پر قرض بھی تھا جو شیام بہاری لال کے تغلب کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ لیکن سر سید میموریل فنڈ کے روپے سے بہت سی عمارتیں جو نامکمل پڑی تھیں ان کی تعمیر ہوئی۔ اور اس کے بعد دونوں مذکورہ بالا تحریکوں کے طفیل 1920 میں جب یونیورسٹی قائم ہوئی تو یونیورسٹی کی آمدنی تین لاکھ سالانہ تک پہنچ گئی تھی اور قرضہ بھی کوئی باقی نہیں تھا۔

نواب محسن الملک کی سکریٹری شپ کے بقیہ حالت مختصر طور پر بیان کرنے ضروری ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کے سکریٹری شپ کے دوسرے ہی سال اردو اور ہندی کا قضیہ پیدا ہوا۔ یہ ذکر اوپر آچکا ہے کہ سر سید کی زندگی ہی میں پنڈت مدن موہن مالویہ اور دیگر ہندو لیڈروں نے سر اینٹونی میکڈانلڈ لیفٹننٹ گورنر کے سامنے ایک عرض داشت پیش کی کہ یو پی میں ہندی جاری کی جائے۔ سر اینٹونی میکڈانلڈ نے اس وقت تو ایک امید افزا جواب درخواست دینے والوں کو دیا۔ لیکن اس کے بعد جب سر سید کا انتقال ہو گیا تو ایک سرکلر جاری کیا کہ آئندہ جو شخص چاہے ہندی میں اپنی درخواست عدالتوں میں پیش کر سکتا ہے۔ اب اس وقت اس سرکلر کے بعد مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا۔ علی گڑھ میں ایک کمیٹی بنی۔ اس کے صدر نواب لطف علی خاں رئیس طالب نگر مقرر ہوئے اور نواب محسن الملک اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ کمیٹی کے کام میں اس راقم نے بہت زیادہ مستعدی اور جوش سے حصہ لیا۔ اور سر ڈاکٹر ضیاء الدین بھی بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرے ساتھ شریک رہے۔ ہم دونوں نے ملک میں بہت جوش پیدا کر دیا۔ علی گڑھ سے چار پانچ نوجوان طالب علموں کو جن میں سر سید رضا علی بھی تھے مختلف مقامات پر دورے کے لیے بھیجا جنھوں نے جا کر چاروں طرف کے قصبات اور شہروں میں مسلمانوں کے بڑے بڑے جلسے

کرائے اور مسلمانوں کی طرف سے لیفٹیننٹ گورنر کوان کے ہندی کے سرکلر کے بارے میں اظہار ناراضگی کے تار دلوائے۔

نوجوانوں میں جو یہاں سے گئے تھے ایک اور نوجوان سید الطاف علی بھی تھے۔ ان کا نام مجھ کو یاد ہے۔ وہ اودھ کے کسی شہر میں لوگوں سے ملنے گئے اور شام ہوگئی تھی کہ ایک گھر میں جا گھسے جہاں پر ان کو پتہ چلا تھا کہ کوئی معزز شخص مقیم ہے۔ جب وہ ڈیوڑھی کے اندر جانے لگے تو انھیں کسی بڑھیا نے روک دیا اور پکار کر کہا کہ بی بی یہ وہی پلیگ والے ہیں جو بیماری کے جراثیم پھیلاتے پھرتے ہیں۔ یہ سن کر ایک اور نوجوان عورت جھاڑو لے کر آئی اور سید الطاف علی صاحب کی جھاڑو سے خوب مرمت کی اور زبان سے کہتی جاتی تھی کہ منڈی کاٹے موئے باہر تو بیماری پھیلا رہا تھا اب گھروں میں بھی پھیلانے لگا۔ جھاڑو کی مار کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ جن صاحب سے وہ ملنے گئے تھے وہ وہاں نہیں تھے۔ (اس واقعہ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے عوام نہایت سخت جہالت کی تاریکی میں مبتلا ہیں۔ جن دنوں کا یہ واقعہ ہے ان دنوں ہمارے صوبہ کے اکثر شہروں میں پلیگ پھیلا ہوا تھا اور جاہلوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ انگریز اپنے آدمی بھیج کر سب جگہ بیماری کے جراثیم پھیلاتے ہیں۔ اسی جاہلانہ خیال نے ہمارے "دوست الطاف علی کو جھاڑوں کی مار کھلوائی")۔

مختلف مقامات سے بیسیوں تار سر انٹونی مکڈانلڈ کے پاس پہنچے اور اس کے بعد علی گڑھ میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں سر انٹونی مکڈانلڈ کے سرکلر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ اور ایک بڑی عرض داشت سید محمود نے انگریزی میں لکھی اور سر انٹونی مکڈانلڈ کے پاس بھیجی گئی۔ یہ عرض داشت اوّل تو کسی اور نے لکھی تھی لیکن ہم لوگ ڈرتے ڈرتے سید محمود کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ اس کو سن لیجیے اور اگر اس میں اصلاح کی ضرورت ہو تو کر دیجیے۔ اول تو انھوں نے سننے سے ہی انکار کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ اچھا پڑھو تو سہی۔ جب تھوڑا سا پڑھا گیا تو سید صاحب مارے غصہ کے آگ بگولہ ہو گئے اور کہا کہ یہ میموریل کسی سائیس کا لکھا ہوا ہے اس کو نہیں بھیجنا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ اچھا لکھو۔ ہم لوگوں نے لکھنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک سید محمود کے دماغ میں علمی اور قانونی عنصر باقی ہے۔ انھوں نے نہایت اعلیٰ درجہ کا میموریل لکھوایا جس کو پڑھ کر سب لوگ خوش ہو گئے۔

وہ میموریل سر اینٹونی مکڈ انلڈ لیفٹیننٹ گورنر کے پاس بھیجا گیا۔ وہ بھی ایک ضدی آدمی تھے۔ انھوں نے لکھا کہ اور مقامات سے تار اور خطوط آرہے تھے، لیکن علی گڑھ سے مجھ کو یہ امید نہیں تھی کہ وہاں سے اس قدر برہمی کی صدا بلند ہوگی۔ اس کے بعد میں نے یہ ارادہ کیا کہ اب ایک عام جلسہ مسلمانان ہند کا کسی صدر مقام پر منعقد کیا جائے اور ایک میموریل لیفٹیننٹ گورنر کے پاس بھیجا جائے۔ چنانچہ میں نے صوبہ بہار و صوبہ یو۔ پی کا دورہ کیا اور ایک رسالہ بھی لکھا کہ مسلمانوں کو اردو کے بند کرنے سے کیا نقصان پہنچے گا۔ بہار میں جا کر میں نے مسٹر سید شرف الدین صاحب اور مسٹر حسن امام صاحب اور سر سید علی امام صاحب اور شاد عظیم آبادی سے ملاقات کی اور شاد صاحب کے یہاں میں مقیم ہوا کیونکہ وہاں ہندی جاری ہو چکی تھی اس لیے مجھ کو وہاں کے حالات دریافت کرنے ضروری تھے۔ وہاں کے کاغذات کے بہت سے نمونے لے کر میں چمپارن اور فیض آباد کے راستے سے ایک ایک دو دو دن ہر جگہ ٹھہرتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ اور مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا کے مکان پر قیام کیا۔ اور وہاں پر یہ مشورہ قرار پایا کہ نواب محسن الملک کی صدارت میں لکھنؤ میں ایک بڑا جلسہ کیا جائے۔ نواب محسن الملک اس وقت ممبئی میں تھے۔ ان کو لکھا گیا کہ وہ مہربانی سے ہندو مسلمان کے درمیان جو ہندی اور اردو کے بارے میں لیفٹیننٹ گورنر کے سرکلر سے ایک اختلاف پیدا ہو گیا ہے اس پر غور کرنے کے لیے لکھنؤ میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہونا ضروری سمجھا گیا ہے۔ اور جناب کو اس کا صدر نامزد کیا گیا ہے، جناب قبول فرمائیں۔ اور اپنی آمد کی تاریخ سے اطلاع دیں۔ نواب صاحب موصوف نے اول تو صدارت سے انکار کیا۔ لیکن لکھنؤ سے متواتر مختلف احباب کے خطوط اُن کے پاس گئے۔ اور ان سے اصرار کیا گیا کہ وہ ضرور صدارت منظور فرمائیں۔ آخر کو انھوں نے صدارت منظور فرمائی۔ جلسہ کی تاریخ مقرر ہوئی۔ میں علی گڑھ سے بہت سے احباب کو لے کر لکھنؤ پہنچ گیا۔ اور جلسہ کے انعقاد کی بڑے شد و مد کے ساتھ تیاری شروع ہوئی۔ تاریخ مقررہ پر نواب محسن الملک ممبئی میل سے لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچے۔ مسلمانوں نے بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم اور آؤ بھگت کی۔ اسٹیشن پر اُن کی پیشوائی کے لیے ہزاروں آدمی جمع ہو گئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں ایک خاص جوش پیدا ہو گیا ہے۔ جب وہ گاڑی سے اترے تو چاروں طرف سے مسلمانوں نے ان پر پھول برسانے شروع کیے اور اتنے پھول برسائے کہ پلیٹ فارم پر

پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ وہاں پر کچھ انگریز بھی کھڑے تھے۔ وہ حیرت زدہ ہو گئے کہ ایسا کون بڑا آدمی آ گیا ہے کہ جس کے لیے کل پلیٹ فارم پر اس قدر کثرت سے پھول بچھا دیے گئے ہیں۔ کسی دوست سے ایک انگریز نے پوچھا کہ کون شخص ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ نواب محسن الملک ہیں جو علی گڑھ کالج کے سکریٹری ہیں۔ اُس نے کہا کہ یہ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ پاس والوں نے سن کر کہا کہ ہاں صاحب بہت بڑے آدمی ہیں۔ نواب صاحب مرحوم ومغفور جا کر راجہ صاحب سر تصدق رسول خاں تعلقدار جہانگیر آباد کی کوٹھی پر مقیم ہوئے اور وہیں پر سبجیکٹ کمیٹی کے اجلاس ہوئے اور پروگرام تیار ہوا۔ اس جلسہ میں پنجاب، بہار، کلکتہ، بمبئی، راجپوتانہ اور ممالک متوسط کے لوگ شریک ہوئے۔ باہر سے آنے والوں کی تعداد بہت تھی۔

یہ جلسہ قیصر باغ کی بارہ دری میں ہوا۔ کل بارہ دری کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شاعروں نے درد انگیز نظمیں پڑھیں۔ صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنی تقریر میں جلسہ کے مقاصد بیان کیے۔ اور نواب محسن الملک سے استدعا کی کہ وہ کرسی صدارت پر رونق افروز ہوں۔ نواب صاحب مرحوم نے اس جلسہ میں بہت ہی مؤثر اور دل چسپ تقریر کی۔ میں نے علی گڑھ اور دیگر مقامات پر نواب صاحب کی بیسیوں تقریریں سنیں تھیں لیکن اس تقریر میں نواب صاحب نے قومی جذبات کچھ ایسے انداز سے اُکسائے کہ سیکڑوں سامعین کبھی آبدیدہ ہو گئے اور کبھی جوش میں آ کر اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے۔ آپ نے دوران تقریر میں فرمایا کہ جب ہندوستان کی اکثریت اور گورنمنٹ دونوں اردو زبان کو مٹانا چاہتے ہیں تو ہمارے اس جلسہ کو ماتمی جلسہ سمجھنا چاہیے کہ اپنی محبوب زبان کے خاتمہ کے وقت جو کچھ ہم اظہار رنج والم کریں وہ کم ہے اور پھر مصرعہ ذیل رقت آمیز الفاظ میں پڑھا:

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس جلسے میں بہت سے ریزولیوشن پاس ہوئے جن کا ترجمہ بعد میں ایک انگریز ایڈیٹر اخبار ٹیلی گراف سے یا کسی اور اخبار کے ایڈیٹر سے کرایا گیا۔ وہ ترجمے انگریزی اخبار میں شائع کرائے گئے اور کمیٹی منتظمہ کی طرف سے ان کی نقول لیفٹیننٹ گورنر کے پاس بھیجی گئیں۔ میں نے بھی چند موقعوں پر اس جلسے میں تقریریں کیں اور چونکہ میں نے کام کیا تھا اور رسالہ لکھا تھا اس لیے کئی مرتبہ تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔

اس جلسے کی روداد اور ریزولیوشن سر اینٹونی مکڈانلڈ کے پاس پہنچے تو وہ مارے غصے کے آگ بگولہ ہوگئے۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ تدبیر کی کہ علی گڑھ کی کمیٹی جو تحفظ اردو زبان کے نام سے قائم تھی اس کو ختم کرادیا۔ نواب لطف علی خاں صاحب جو اس کے صدر تھے اور کبھی ان کو خان بہادری کا خطاب ملا تھا اور اس کے بعد ان کو (نواب) کا خطاب ملا تھا اور جب وہ کمیٹی کے صدر بنائے گئے تو نواب لطف علی خاں کے نام سے وہ صدر بنائے گئے۔ سر اینٹونی مکڈانلڈ جو ہندوستانی رئیسوں کی رگ خوب پہچانتے تھے انھوں نے لکھنؤ کے جلسہ کے بعد نواب لطف علی خاں کو لکھا کہ پہلے آپ خان بہادر تھے اب آپ کو خان بہادری سے بڑا خطاب نواب کا مل گیا۔ یہ خان بہادری آپ کے لیے بے کار ہوگئی۔ اس لیے آپ یہ خطاب واپس کر دیجیے۔ نواب لطف علی خاں نے سمجھا کہ لاٹ صاحب مجھ سے اردو کمیٹی کی صدارت کی وجہ سے ناراض ہوگئے ہیں، اس لیے وہ مجھ سے خان بہادری کا خطاب چھیننا چاہتے ہیں، وہ فوراً لاٹ صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے اور صدارت قبول کرنے کی غلطی کی معافی مانگی۔ اور لاٹ صاحب سے کہہ دیا کہ میں نے استعفیٰ لکھ دیا ہے کہ میں اس کمیٹی سے علاحدہ ہوتا ہوں۔ نہ معلوم لاٹ صاحب نے اس کا کیا جواب دیا لیکن واپس آنے کے بعد انھوں نے فوراً استعفیٰ دے دیا جس سے قیاس کیا گیا کہ لاٹ صاحب نے ان سے کہہ دیا ہوگا کہ اگر کمیٹی سے آپ استعفیٰ دے دیں تو پھر آپ کا خطاب واپس نہ ہوگا۔

نواب محسن الملک کا انتقال

نواب محسن الملک مرحوم کا انتقال 16 راکتوبر 1907 کو ہوا۔ آخری دو سال میں ان کی تندرستی بہت گر گئی تھی لیکن اس پر بھی مرحوم چھ چھ گھنٹے روزانہ بیٹھ کر کالج کا کام کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے قبل فروری کے مہینہ میں طالب علموں نے اسٹاف کے خلاف ہو کر ہڑتال کر دی تھی جس پر ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس رفیق صاحب تھے اور یہ راقم اس کا سکریٹری تھا۔ نواب صاحب مرحوم کو اس طوفان بدتمیزی سے جو لڑکوں نے برپا کیا تھا بہت صدمہ ہوا۔ کالج کے پروفیسروں مسٹر ٹول وغیرہ کو بعض طالب علموں نے مغلظات گالیاں سنائی تھیں۔ کمیٹی نے کچھ ممبران اسٹاف کو ملازمت سے برطرف کرنے کا حکم دیا اور شورہ پشت طالب علموں کو کالج سے نکالنے کا حکم دیا۔ نواب صاحب مرحوم کو طالب علموں کی اس شورش کا بڑا

صدمہ تھا کیونکہ بعض طالب علموں نے ٹرسٹیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر آپ لوگ اس معاملہ میں دخل دیں گے تو ہم آپ کی عزت اور وقعت کا کچھ لحاظ نہیں کریں گے۔ ایسے لوگوں کو کالج سے نکالے بغیر کوئی علاج نہیں تھا۔

نواب محسن الملک مرحوم کی وفات پر رسالہ خاتون ماہ اکتوبر 1907 میں میں نے مرحوم کی زندگی اور وفات کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جس کو میں یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ اس وقت جس قدر واقعات میرے حافظہ میں تھے وہ بالکل تازہ تھے اس لیے اب پرانے واقعات کو حافظہ پر زور دے کر لکھنے سے بہتر ہے کہ وہی مضمون نقل کر دیا جائے۔ مضمون حسب ذیل ہے۔

نواب محسن الملک مرحوم

آج وقت آ پہنچا جس کا کھٹکا کچھ عرصہ سے دل کو لگا ہوا تھا۔ نواب محسن الملک کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے لیکن مشیت ایزدی میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ چوں و چرا کا کوئی موقع نہیں اور سوائے رنج و افسوس اور حسرت کے کچھ چارہ بھی نہیں۔

نواب محسن الملک کی وفات سے قوم کے سر سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا جیسے کہ میدان جنگ میں معرکہ کے وقت فوج کے سر سے اس کا سپہ سالار اٹھ جائے یا کسی ریگستان کی دشت نوردی میں قافلہ کا رہنما یکایک قافلے سے علاحدہ ہو جائے۔ یا سخت طوفان کے وقت جبکہ جہاز یا کشتی کو اسی شخص کی ضرورت ہو جس نے اس وقت تک اہل کشتی کی جان بچانے میں کامیابی حاصل کی ہے وہ خود موجوں کا شکار ہو جائے اور کشتی کو اہل کشتی کی قسمت پر چھوڑ جائے۔

یہ سب مثالیں نواب محسن الملک مرحوم کے اور مسلمانوں کے حسب حال ہیں۔ سرسیدؒ کی وفات کے بعد نواب صاحب مرحوم برابر ہماری فوج کے سپہ سالار اور ہمارے قافلے کے رہنما اور ہماری کشتی کے ناخدا رہے۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی دوسرے کام میں صرف نہیں کیا اور برابر ایک ہی دھن میں اور ایک ہی کام میں اپنے پر درد دل کو مصروف رکھا اور اسی مصروفیت کے عالم میں ہماری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ ہائے افسوس وائے افسوس کہ ہم سے ایسا محسن اور زبردست لیڈر چھن گیا۔

نواب محسن الملک مرحوم کا اصلی نام سید مہدی علی تھا۔ وہ سادات اٹاوہ کے خاندان کے ایک فرد تھے اور سرسیدؒ کے بہترین شاگردوں میں سے تھے۔ ان کی سوانح عمری اگر تحقیقات اور سلیقہ سے مرتب کی گئی تو وہ آئندہ نسلوں کے سامنے ایک بڑے قومی لیڈر کی زندگی کا بیش بہا نمونہ ثابت ہوگی۔ نواب صاحب مرحوم بہ لحاظ اپنے حسب ونسب کے ہندوستانی اعلیٰ شرفا میں سے تھے لیکن بہ لحاظ ان کی ذاتی ترقی اور قابلیت ومراتب اور کام کے وہ اپنے خاندان میں اپنی مثال آپ ہی تھے اور منجملہ اس گروہ کے تھے کہ جس نے زمانہ کی رفتار اور انقلاب کو پہچانا اور اس کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ سرسید مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم اور چند دیگر بزرگ جو اس وقت بقید حیات موجود ہیں اور چند اور بزرگ جو اس سے پیشتر گزر چکے ہیں وہ سب اسی ایک کمیٹی یا سوسائٹی کے ممبر کہلانے کے مستحق ہیں جو سرسید کی کوشش اور توجہ سے قائم ہوئی تھی۔ یہی وہ بزرگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے زمانہ کا رنگ بدلا ہوا دیکھا اور محسوس کیا کہ حالات میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کو بہ لحاظ ان کے قومی محسوسات کے اگر دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو ان دو حصص کی حد فاصل غدر 1857 کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ غدر کے پیشتر کی کل تاریخوں اور سوانح واقعات اور انقلابات سے جو ہم تک پہنچے ہیں ہم آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جب سے مسلمان ہندوستان آئے ہیں ان کے دلوں میں سرسید کے وقت تک کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے باشندے ہونے کے لحاظ سے ایک جداگانہ قوم قرار پا سکتے ہیں یہ ایک قوم ہونے کا احساس سب سے اول ان کے دلوں میں سرسید نے پیدا کیا۔ اس سے قبل مذہب ہر چیز پر غالب تھا اور قومیت کا احساس مذہب سے جداگانہ ان کے دلوں میں نہیں تھا، مذہبی اتحاد اور قومی اتحاد میں تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ مذہبی اتحاد مسلمانوں کو ایک قوم بنانے کے لیے کبھی کافی ثابت نہیں ہوا۔ مسلمان ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے۔ مذہبی اتحاد کے ارشاد یا قانون نے ان کی اس خانہ جنگی اور کشت وخون سے کبھی نہیں روکا۔ دیگر ممالک کے مسلمان تو ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے۔ لیکن ہندوستان میں آکر انھوں نے اس میدان میں کوئی کمی نہیں کی سب سے اول تو پٹھان جب یہاں آئے تو ایک دوسرے سے برابر لڑتے رہے۔ پھر جب مغل آئے تو انھوں نے پٹھانوں

کی ریاستوں کو چن چن کر برباد کیا۔ دکن کی پانچ اسلامی ریاستوں کے خلاف اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب برابر لڑتے رہے اور آخر ان کا خاتمہ کر کے چھوڑا۔

مسلمان قومیت کے لیے کبھی نہیں لڑے بلکہ اپنے سرداروں اور بادشاہوں اور رئیسوں کے ساتھ مل کر دوسرے مسلمانوں سے ہمیشہ لڑا کیے۔ یورپ کی قومیں اپنے اہل ملک کی بہبودی اور اپنی بیوی و بہنوں اور بیٹیوں کی عزت و آبرو کے لیے تاریخی زمانہ سے لڑتی رہتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے دل میں اس کا احساس بہت کم رہا ہے۔ جس سپہ سالار بادشاہ یا فوجی افسر نے ان کو اپنے ساتھ لگا لیا اس کے ساتھ ہو گئے اور دوسرے مسلمانوں کا خون بہانا شروع کر دیا۔ ہم کل دنیا کے اہل اسلام کو اس غلطی کا مرتکب قرار نہیں دے سکتے کہ وہ اپنے ملک کی محبت پر اپنا جان و مال قربان نہیں کیا کرتے تھے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت ہم کو مجبوری سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں یہ قومی اور ملکی محبت کی خصوصیت نہیں تھی جس چیز کو ہم قومیت کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد سب سے پہلے اسلام ہی نے ڈالی تھی۔ لیکن ہندوستان میں آ کر یہ خیال ان کے دل سے یا تو نکل گیا اور یا اس میں کمزوری آ گئی۔ ہم غدر کے بعد سب سے اوّل سر سیدؒ مرحوم کو اس قومی خیال کے میدان میں کھڑا دیکھتے ہیں۔

ممکن ہے کہ غدر کے واقعات نے سرسید کی آنکھیں کھولی ہوں اور انھوں نے اس بات کو محسوس کیا ہو کہ جب تک مسلمان اس ملک میں ایک جماعت یا گروہ کا جامہ پہن کر اپنی ترقی کے لیے مجموعی کوشش نہ کریں گے وہ مثل صحرا بکھرے ہوئے دانوں کے انقلابات کی ہوا کے جھونکوں سے ہمیشہ پریشان رہیں گے اور ان کو کبھی اطمینان یا قرار یا قیام نصیب نہ ہوگا۔ ہم کو اس وقت بھی اس بات میں شبہ ہے کہ آیا مسلمانوں نے اس قومیت کے راز یا باریکی کو سمجھا بھی ہے یا نہیں لیکن سرسید نے اور ان کے شاگردوں نے اس راز کو ضرور سمجھا تھا اور اس پر ان کا عمل تھا۔ وہ مسلمانوں کو فقط اپنا مذہبی بھائی ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ قومی بھائی بھی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک شیعہ، سنّی، حنفی، وہابی، شافعی، مالکی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سب ان کے بھائی تھے۔

سرسید کی وفات پر اور آج نواب محسن الملک کی وفات پر ہم کو اس بات کا ثبوت ملا ہے کہ مذکورہ بالا قومیت کا خیال مسلمانوں کی ایک بڑے گروہ کے دلوں میں پیدا ہو گیا ہے جس خیال

کے بانی سرسید تھے اور ان کے بعد سب سے بڑے اس کے واعظ نواب محسن الملک بہادر تھے۔

سرسید کی وفات پر تمام ہندوستان کے قصبات دیہات اور بڑے چھوٹے شہروں میں ان کے لیے ماتمی جلسے ہوئے تھے اور اسی قسم کے جلسے نواب محسن الملک کے لیے ہو رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ جلسے اتحاد قومی کے لیے ایک بڑی دلیل ہے اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس بات پر متفق ہوتے جاتے ہیں کہ کل مسلمان ایک قوم ہیں اور اس قوم کا لیڈر جو جس وقت کے لیے ہوتا ہے اس کی وفات کل قوم کے لیے باعث صدمہ ورنج ہوتی ہے۔

قومی احساس واتحاد پیدا کرنے میں سرسید اور ان کے بعد نواب محسن الملک کو جو وقت پیش آئی ان کی کچھ کچھ جھلک سرسید کی سوانح حیات یعنی حیات جاوید مصنفہ شمس العلما مولانا حالی میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ خدمات ان بزرگوں کی ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کو ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا خیر خواہ تصور کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس سے پیشتر جلیل القدر بادشاہ اور بڑے بڑے مصنف اور مدبر شاعر، مشائخ اور علما گزرے ہیں لیکن ایسی کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں ہے کہ جس نے اپنی قومی تباہی اور مصیبت پر عمر بھر آنسو بہائے ہوں اور جن کے دل میں حاضر و غائب، ادنیٰ و اعلیٰ، چھوٹے اور بڑے، غریب اور امیر، جاہل اور عالم کا یکساں اور برابر درد ہو اور اس درد کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر ان کی سفید نورانی داڑھیوں پر سے موتیوں کی طرح زمین پر گرے۔ نواب محسن الملک گو آج ہمارے درمیان سے اٹھ گئے ہیں لیکن ان کے کام ان کی شخصیت ان کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور بہت دنوں تک رہے گی۔ ہم اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں اپنی شکر گزاری کا خراج ان کی زندگی کے کاموں کی یاد میں پیش کرتے رہیں گے۔

ترقی کی منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے جس بڑے زینہ کے تیار کرنے کی ضرورت ہے سرسید نے اس کی تعمیر شروع کر کے بہت سی سیڑھیاں تیار کر دی تھیں۔ ان کے بعد نواب محسن الملک نے اور بہت سی سیڑھیوں کا اضافہ کیا۔ یہ دو بڑی مثالیں قوم کو ابھارنے کے لیے ہمارے سامنے ہیں۔ اگر آنے والی نسلیں اسی طریقے کی پیروی کریں جو طریقہ سرسید اور محسن الملک کا تھا تو یقین ہے کہ ایک روز منزل کی سب سے اوپر کی سیڑھی تک یہ زینہ تیار ہو جائے گا۔ ہم نے اس نوٹ میں

نواب محسن الملک کی سوانح عمری کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے کیونکہ سوانح عمری لکھنے کے لیے بہت وقت اور محنت کی ضرورت ہے۔ ہم نے ان کے کام کا صرف ایک پہلو دکھایا ہے جس کی وجہ سے وہ قوم میں اس قدر محترم اور ہردلعزیز سمجھے گئے تھے۔ ہماری خواہش ہے کہ کوئی قابل بزرگ نواب محسن الملک کی سوانح عمری مرتب کریں تا کہ جو کام انھوں نے اپنی زندگی میں کیا ہے اس کے حالات بطور مثال کے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ رہے۔ نواب محسن الملک کی وفات مسلمانوں کی قوم کے لیے ایک سخت سے سخت صدمہ کا باعث ہے۔ قوم ایک بڑے ہمدرد ریفارمر اور فصیح و بلیغ مقرر کے کاموں سے محروم ہوگئی۔ اگر سچ پوچھیے تو فصاحت و بلاغت کا جو حق ہوتا ہے وہ نواب محسن الملک پر ختم ہوگیا۔ آئندہ ہم کو قوم میں ایک شخص بھی نظر نہیں آتا جس کی تقریریں سننے والوں پر جادو کا اثر پیدا کرے اور پتھر سے زیادہ سخت دلوں کو پگھلا کر پانی کر دے، جتنے آدمیوں کو رلا دیں اور روتے ہوئے آدمیوں کو ہنسا دیں۔ یہ خداداد بات تھی اور جو محض حاصل کرنے سے نہیں ہو سکتی۔

نواب محسن الملک کی وفات نے مسلمانوں کو ایک بڑے مدبر کی رہنمائی سے محروم کر دیا۔ سرسیدؒ کی وفات کے بعد پنجاب سے لے کر مدراس تک اور بنگال سے لے کر بمبئی تک کے مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے متفق اور متحد کرنے کی تدبیر نواب محسن الملک ہی کا حصہ تھا۔ سال گزشتہ جملہ صوبہ جات ہند کے مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن جن کے لیڈر ہز ہائی نس سر آغا خاں تھے، وائسرائے ہند کے پاس شملہ گیا تھا۔ اس ڈیپوٹیشن کی تیاری اور ترتیب نواب محسن الملک مرحوم نے ایک ماہ کے اندر کر کے دکھائی۔ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ اس قدر کام اتنے وسیع پیمانہ پر ایک ماہ کے اندر کیسے انجام پا گیا۔ نواب محسن الملک کے کارناموں میں سے یہ کارنامہ بہت عالی شان تھا۔

ایم اے او کالج علی گڑھ کو جو ترقی سرسید کی وفات کے بعد ہوئی اس میں سب سے بڑا حصہ نواب محسن الملک کا تھا۔ سرسید کا جب انتقال ہوا تو اس وقت کالج کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ کل کالج میں قریب دو سو طالب علم تھے۔ آمدنی صرف ستر ہزار سال کی تھی اور اس پر ایک لاکھ بیس ہزار کا قرضہ کالج پر تھا۔ نواب محسن الملک نے جب کام ہاتھ میں لیا تو ان کی فصاحت، خلوص اور مستعدی کی وجہ سے قوم یکا یک بیدار ہوگئی اور دل کھول کر لوگوں نے روپیہ دینا شروع کر دیا۔ اپنی پیرانہ سالی میں نواب محسن الملک تمام صوبوں میں اس احقر کو ساتھ لے کر گئے اور بہت سا

روپیہ جمع کیا کہ قرض بھی ادا ہو گیا اور بہت سی عمارتیں بھی بن گئیں اور کالج کی خالص آمدنی دو لاکھ روپے سے زیادہ ہو گئی۔

نواب محسن الملک کی وفات سے محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کی کشتی بھی ایک قابل اور ہوشیار ناخدا کی طرف سے محروم ہو گئی۔ آج نواب محسن الملک کی وفات کی وجہ سے سرسید میموریل فنڈ بے سر ہو گیا اور آئندہ اس کی کامیابی اور تکمیل میں بہت دقتیں معلوم ہو رہی ہیں۔ غرض کہ نواب صاحب مرحوم کی زندگی کے جس پہلو پر نظر دوڑاتے ہیں کہ جہاں جہاں وہ مصروف کار نظر آتے تھے ہم کو وہ جگہ خالی دکھائی دیتی ہے اور ہمارے مختلف کام ایک نہایت ڈراؤنی اور بے کسی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

نواب محسن الملک کی وفات کے متعلق اخبارات میں اس سے پیشتر بہت کچھ چھپ چکا ہے۔ اس مقام پر ہم بھی ان کے آخر دنوں کے حالات اور ان کی وفات کے واقعات سپرد قرطاس کرتے ہیں۔ نواب محسن الملک اب دنیائے فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی میں پہنچے ہیں اور جو کچھ ان کو روحانی و جسمانی تکالیف تھیں ان کی نیک اور پاک روح پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ نواب صاحب کے دل پر گذشتہ فروری سے بہت سے صدمے پڑے جن کی وجہ سے ان کی تندرستی پر بہت برا اثر پڑا۔ فروری کے مہینہ میں کالج کے طلبا نے ایک سخت شورش برپا کی جس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا جس کے صدر جسٹس رفیق تھے اور یہ راقم اس کا سکریٹری تھا۔

کمیشن کے سامنے نواب صاحب مرحوم کے بیانات بھی ہوئے اور مولانا محمد علی نے ان سے جرح کی اور جرح ایسی مخالفانہ کی کہ نواب صاحب کو اس سے بہت صدمہ ہوا۔ وہ جلسے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے اور وہاں جا کر ایک آرام کرسی پر ٹھنڈے سانس بھرتے ہوئے گر گئے اور فرمایا کہ اس کمبخت دل میں پہلے ہی بہت زخم لگے ہوئے تھے۔ ان زخموں پر مسٹر محمد علی نے اور بھی نمک چھڑک دیا۔ ہم زندگی سے تنگ آ گئے ہیں۔ اس کے بعد سے وہ اپنی وفات تک کالج کے کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ممبئی تشریف لے گئے اور وہاں جاتے ہی بیمار ہو گئے۔ وہاں سے راقم کو وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہے۔ چنانچہ سب سے آخری خط جو انھوں نے ممبئی سے لکھا تھا اس میں گورنمنٹ کے اس عطیہ کی بابت مجھ کو مبارکباد دی تھی جو گرلس اسکول کے لیے ملا تھا۔ یکا یک یہ

خبر سنی کہ نواب صاحب بوجہ علالت اپنے بڑے بھائی صاحب کے یہاں اٹاوہ آ گئے ہیں۔ وہاں پر ان کے بھائی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ وہاں سے شب برأت کے روز علی گڑھ آئے ان کی حالت دیکھ کر ان کی زندگی سے قطعی مایوسی ہوتی تھی۔ شب کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے مکان پر ہم سب نے ایک جگہ کھانا کھایا۔ نواب صاحب نے مشکل سے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا۔ چہرے پر آثار ضعف و ناتوانی نمایاں تھے۔ نیچے کے سب دانت گر گئے تھے۔ ایسی حالت میں انھوں نے شملہ کے سفر کا قصد کیا اور کہا کہ مجھ کو لکھنؤ ہو کر 27 ستمبر کو شملہ پہنچنا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ ایسی حالت میں سفر مناسب نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ممکن ہے شملہ کی آب و ہوا سے فائدہ ہو اور نیز 27 تاریخ وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے ملاقات طے ہوگئی ہے اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔ شملہ وہ وقت پر پہنچ گئے اور معلوم ہوا کہ وہاں پہنچنے کے کچھ دن بعد وہ بیمار ہو گئے۔ راقم کے تار کے جواب میں نواب صاحب کا دستی خط آیا کہ سرخ بادہ کی بیماری ہوگئی ہے جو پہلے بھی ہو جایا کرتی تھی۔ امید ہے کہ صحت ہو جائے گی۔ یہاں ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب ان کے قدیم معالج کو شملہ بھیجا گیا۔ لیکن موت کا علاج سوائے مرنے کے اور کچھ نہیں ہے اور خدا کے احکام کے سامنے علاج معالجے سب ہیچ ہیں۔ 16 اکتوبر 1907 بروز بدھ وہ شاندار ہستی جس پر ہم کو فخر تھا اور جس پر ہر قومی بات میں ہم کو بھروسہ تھا اپنی قوم کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر دنیا سے چل دیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راقم ان دنوں ممبئی میں تھا۔ نواب صاحب کی وفات کی نسبت کچھ کو سب سے اول اخبار ٹائمز آف انڈیا کے تار سے ممبئی میں اطلاع ملی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ نواب صاحب مرحوم اٹاوہ میں دفن کیے جائیں گے۔ میں نے اسی وقت بیگم محسن الملک کو تار دیا کہ نواب صاحب مرحوم کو علی گڑھ میں سرسید کے پاس دفن کرنا چاہیے۔ اٹاوہ میں دفن کرنے کا ارادہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر علی گڑھ میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب و حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب اور دیگر ٹرسٹی موجود تھے انھوں نے بھی بیگم صاحبہ کو اسی مضمون کے تار دیے۔ بیگم صاحبہ نے باوجود بعض رشتہ داروں کے اصرار کے کہ ان کو اٹاوہ میں دفن ہونا چاہیے اجازت دے دی کہ ان کو سرسید کے قریب میں دفن کیا جائے۔ اس جگہ کا انتخاب کالج والوں کو بہت پسند آیا اور جن لوگوں کا اصرار تھا کہ ان کو اٹاوہ میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہونا

چاہیے تھا وہ بھی چند سال میں شکر گزار ہوں گے کہ علی گڑھ والوں نے مناسب جگہ تجویز کی ۔ جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ کے نواب صاحب کالج میں سرسید کے داہنے ہاتھ پر دفن کیے گئے ۔ یہ راقم ممبئی سے اُسی روز جب کہ تار ملا سہ پہر کی میل گاڑی سے علی گڑھ کو روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز شام کو جب آگرہ گاڑی پہنچی تو وہاں پر سید امیر حسن صاحب برادر حقیقی نواب صاحب مرحوم اور سید علی حسن صاحب ان کے چچازاد بھائی سے ملاقات ہوئی ۔ وہ بھی نواب صاحب کی وفات کی خبر سن کر علی گڑھ کی طرف آرہے تھے ۔ آگرہ فورٹ سے ہم تینوں رات کے گیارہ بجے کے بعد علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچے اور اسٹیشن ہی پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب علی گڑھ میں کالج کی مسجد میں دفن ہو گئے ہیں ۔ ہم تینوں رات کو گیارہ بجے کے بعد کالج کی مسجد میں پہنچے اور نواب صاحب کے دونوں معزز عزیزوں نے بالاتفاق فرمایا کہ جو کچھ ہوا مناسب ہوا اور یہ کہہ کر وہ اسی وقت اٹاوہ کے لیے ریل میں سوار ہو گئے ۔

نواب صاحب مرحوم کی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن کل قوم بمنزلۂ ان کی اولاد کے ان کی وارث تھی ۔ نواب صاحب کا ماتم کرنے والی قوم ہی ہے ۔ ان کی بیگم صاحبہ ہنوز حیدرآباد ہی میں ہیں اور سنا ہے کہ ان کی صحت بھی اچھی نہیں ہے ۔ ہم کو ان سے نہایت ہمدردی ہے ۔ خدا ان کو صبر اور صحت عطا فرمائے ۔ نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین رئیس امروہہ و سابق وزیر ریاست حیدرآباد آنریری سکریٹری مقرر ہوئے ۔ نواب وقار الملک صاحب موصوف کی سکریٹری شپ کے متعلق آئندہ حالات لکھے جائیں گے ۔

نواب وقار الملک کی سکریٹری شپ

یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ نواب وقار الملک مرحوم نواب محسن الملک مرحوم کے بعد کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے ۔ نواب وقار الملک مرحوم کی زندگی نہایت پاک اور بے لوث تھی ۔ کالج کے حسابات اور حفاظت کا محض خیال ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنی زندگی کا زیادہ وقت اسی کی دیکھ بھال میں صرف کرتے تھے ۔ بڑے راست گو آدمی تھے ۔ دوستوں کے دوست تھے اور کبھی کسی کو دشمن بنانے کا خیال بھی نہیں کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اور نواب وقار الملک مرحوم میں کسی بات پر اختلاف پیدا ہو گیا اور ہوتے ہوتے معاملے نے بہت

طول کھینچا۔ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب مرحوم ہمارے یہاں کے پرانے ٹرسٹی تھے، وہ نواب وقارالملک مرحوم کے بڑے منہ چڑھے دوستوں میں سے تھے اور علاوہ ان کے خان بہادر سید جعفر حسین وغیرہ جن کو صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم سے کچھ تقیض تھا۔ وہ سب کے سب نواب وقار الملک صاحب کے ساتھ ہوئے اور پبلک میں انھوں نے نواب وقار الملک اور صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے اختلاف کو بہت اہمیت دے دی۔

نواب صاحب نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا کہ وہ کالج کے سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے دیں گے۔ ان کے اس ارادے کے باعث ٹرسٹیان کالج کو زحمت اٹھا کر علی گڑھ میں ایک جلسہ کرنا پڑا۔ اس جلسے میں بہت بڑے بڑے جید ٹرسٹی جمع ہوئے۔ جب جلسہ ہوا تو میں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے کہا کہ اس معاملے میں اس بات کا دیکھنا دشوار ہے کہ کس کی غلطی سے یہ جھگڑا پیدا ہوا۔ نواب صاحب کے دل میں کوئی کدورت نہیں رہتی ہے آپ اس کو صاف کر سکتے ہیں اور باہمی مصالحت ہو سکتی ہے تاکہ ٹرسٹی صاحبان کو اس ناخوش گوار معاملے میں اپنا کوئی فیصلہ نہ دینا پڑے۔ آفتاب احمد خاں صاحب بڑے صاف دل آدمی تھے لیکن ظاہر طور پر جس طور پر جیسے دنیا میں اور پٹھان ہوتے ہیں وہ بھی تھے، طبیعت میں ضد تھی اور جہاں تک ہو سکتا تھا وہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ بڑے صاف دل اور منکسر آدمی تھے لیکن ظاہری اخلاق میں روکھے پھیکے تھے۔ جب میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ نواب صاحب سے مصالحت کر لیں۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھ ہی سے کہتے ہو نواب صاحب سے کیوں نہیں کہتے۔ اس پر باہر کے ٹرسٹی کچھ برہم سے ہو گئے اور مجھ کو یاد ہے کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد نے فرمایا کہ اس جھگڑے میں قصور کسی کا بھی ہو لیکن ہم لوگ جج نہیں ہیں کہ اختلافات کی تنقیح کر کے اس کا فیصلہ کریں بلکہ ہم تو نواب صاحب کی بزرگی کو دیکھ رہے ہیں اور پبلک کے دل میں جو کچھ ان کی عزت اور وقعت ہے اس کو دیکھ رہے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کالج کی بہبودی اور انتظام کی مصلحتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ہم صفائی سے کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا فیصلہ نواب صاحب کے ساتھ ہے اور ہم ان کو کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ نہیں دینے دیں گے۔

یہ کہہ کر سب ٹرسٹی اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اب ہمیں زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے۔ ابھی ان میں سے

بعض لوگ دروازے پر پہنچے تھے کہ میں جا کر سامنے کھڑا ہو گیا اور میں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد سے کہا کہ آپ نے جو رائے قائم کی ہے ہم سب آپ کے ساتھ ہیں لیکن اس بے لطفی کو جو پیدا ہو گئی تھی اس طور پر بیچ ادھر میں چھوڑ کر چلے جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ اس کو ختم کرا کے جائیے۔ ذرا دس منٹ تک بیٹھ جائیے سب نے مہربانی کی اور میرا کہنا مانا۔ پھر میں نے نواب صاحب سے اپیل کی کہ آفتاب احمد خاں صاحب مثل آپ کے بچے کے ہیں آپ ہمیشہ ان پر شفقت کرتے رہے ہیں۔ اب ان کے آپ کے درمیان جو نقیض پیدا ہوا ہے اس کو طشت از بام کرنے سے کالج کو نہایت سخت نقصان پہنچے گا اور آپ کی بزرگی سے یہ توقع نہیں ہے کہ آپ اس معاملے کو اس قدر اہمیت دیں کہ کالج کے معاملات پر اس کا اثر پڑے۔ آپ آفتاب احمد خاں کا قصور معاف کر دیجیے اور وہ آپ سے معافی مانگیں گے کیونکہ وہ آپ سے چھوٹے ہیں۔ آفتاب احمد خاں صاحب کی معافی کا ذکر میں نے اپنی طرف سے کیا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ جب ٹرسٹیوں نے نواب صاحب کا ساتھ دیا ہے تو ان کی ضد بھی ختم ہو گئی ہوگی۔ پھر میں نے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں سے اپیل کی کہ آپ نواب صاحب سے معافی مانگیے وہ آپ کے بزرگ ہیں اور آپ سے بڑے ہیں ان کی مخالفت کا پارا بہت نیچے چلا آیا تھا اور کیونکہ وہ بڑے سچے اور مخلص آدمی تھے انھوں نے نواب صاحب سے معافی مانگ لی۔ اس پر نواب صاحب آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور انھوں نے فرمایا کہ میں خود آفتاب احمد خاں سے معافی مانگتا ہوں۔ اس پر معاملہ بخیر وخوبی ختم ہوا۔ آفتاب احمد خاں صاحب کے مخالفوں کو رنج ہوا کہ جیتا ہوا معاملہ ہم ہار گئے اور آفتاب احمد خاں صاحب کا اس میں کچھ نہ بگڑا۔ اس کے بعد نواب صاحب اور آفتاب احمد خاں صاحب میں تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔ روزانہ آنا جانا رہتا تھا اور کام بدستور ہوتے رہے۔

نواب وقار الملک بڑے اونچے پایہ کے انسان تھے۔ وہ کئی مرتبہ میری خواہش پر یو پی کے کئی مختلف شہروں میں چندے کے لیے جلسوں میں شریک ہوئے اور تقریریں کیں۔ میں سرسید میموریل فنڈ کا سکریٹری تھا اور نواب صاحب صدر تھے جب میں کہیں جانے کے لیے ان سے درخواست کرتا تھا تو ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ اب مجھ میں کیا رکھا ہے مجھے کیوں گھسیٹتے ہو لیکن اکثر میری درخواست منظور کر لیتے تھے اور جلسوں کی شرکت کے لیے بڑھاپے اور ضعیفی کے باوجود

زحمت برداشت کیا کرتے تھے۔

نواب وقار الملک پرانے مسلمانوں میں ایک نمونے کے آدمی تھے۔ان کی مثال کو لوگ قابل تقلید سمجھتے تھے۔نواب وقار الملک کے زمانے میں ایک ریاست کے بڑے وقف کا مسئلہ پیش آیا اور وہ مرحلہ یہ تھا کہ 1908 میں نواب عظمت علی خاں رئیس کرنال نے اپنی مظفر نگر کی ریاست کا ایک بڑا حصہ وقف کر دیا تھا۔ مقاصد وقف میں بہت سی درس گاہیں اور خانقاہیں شامل تھیں ۔علی گڑھ کالج کو روپے میں ایک آنہ کا حصہ دیا تھا۔کرنال کی مسجد اور عربی مدرسے کے لیے چار آنہ کا حصہ دیا تھا۔حمایت الاسلام، مدرسہ دیوبند اور ندوۃ العلما کے علاوہ اور بھی چھوٹے اداروں کو حصہ دیا تھا۔ یہ وقف واقف کے برادران کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔واقف کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ان کے دو برادران نواب رستم علی خاں اور نواب عمر دراز علی خاں تھے۔ یہ دونوں صاحب واقف کے سوتیلے بھائی تھے۔ان دونوں نے اول تو وقف نامہ لکھنے کی سخت مخالفت کی اور ڈپٹی کمشنر کرنال مسٹر بیک کو کسی طرح اپنے قبضے میں لائے اور اس سے ایک حکم نامہ سب رجسٹرار مظفر نگر کے نام جاری کرایا کہ اگر نواب عظمت علی خاں کوئی دستاویز رجسٹری کے لیے تمھارے سامنے پیش کریں تو اس کی رجسٹری نہ کرنا۔

اس زمانے میں ہمارے کالج کے اولڈ بوائے مولانا طفیل احمد صاحب مظفر نگر میں سب رجسٹرار تھے۔مولانا قدرتاً کالج کے ہمدرد تھے۔انھوں نے دیکھا کہ قانوناً ڈپٹی کمشنر کرنال کو ان کے نام کوئی حکم امتناعی جاری کرنے کا مجاز نہیں ہے تو انھوں نے نواب عظمت علی خاں کی دستاویز جو ان کے سامنے پیش ہوئی رجسٹری کر دی اس کے بعد مقدمہ بازی شروع ہوئی جو عدالت ماتحت کے فیصلے سے اپیل میں تین مرتبہ ہائی کورٹ گئی اور اس کے بعد پریوی کونسل گئی۔

نواب وقار الملک کا اس مقدمہ سے یہ تعلق تھا کہ انھوں نے اس سانجھی ہنڈیا کی مشکلات کو اپنی مستقل مزاجی سے حل کر دیا۔اگر وہ ہاتھ نہ دھرتے تو دوسرا کوئی ادارہ ایسا نہ تھا جو اس مقدمے کو لڑ سکتا۔اس مقدمے کو چلانے کے لیے میرٹھ میں خان بہادر بھیا شیخ وحید الدین صاحب کے مکان پر ایک جلسہ ہوا اس میں ان لوگوں کو بلایا گیا جن کے حق میں وقف ہوا تھا۔کچھ وکیل صاحبان بھی موجود تھے۔ میں علی گڑھ سے نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق جلسے کی شرکت کے لیے میرٹھ

وقت پر پہنچ گیا تھا۔ جلسے میں بعض لوگ مقدمہ چلانے کے موافق تھے اور بعض خلاف تھے۔ ایک بڑے مولوی صاحب جن کا نام ملّا مراد صاحب تھا وہ ایک بڑا فتویٰ لے کر جلسے میں آئے۔ ان کی اور ان کے فتوے کی غرض یہ تھی کہ یہ وقف بالکل ناجائز ہے اور بہت سی احادیث کا حوالہ دیا جن میں لکھا تھا کہ کسی شخص کو اپنے ورثے سے ورثاء کو محروم نہیں کرنا چاہیے اور چونکہ اس وقف کا نتیجہ یہ ہے کہ ورثاء محروم ہو جائیں گے اس لیے یہ وقف ناجائز ہے۔ بعض وکلاء نے رائے دی کہ مقدمہ دیگر وجوہات سے کمزور ہے لڑانا نہیں چاہیے۔ نواب صاحب کے فرمانے سے میں نے سب اعتراضات کے جواب دیے اور ایک حدیث مجھ کو بھی یاد تھی وہ پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروقؓ کو اجازت دی تھی کہ اپنا ایک مکان اپنی مطلقہ بیٹیوں کے حق میں وقف کر دیں اور انھوں نے وقف کر دیا تھا۔ اس میں باقی اولاد محروم ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ فقہ کی کتابوں میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے بڑے بڑے وقف کیے اور اس وقت ہندوستان کے ہر شہر اور ہر صوبے میں کروڑوں روپے کی مالیت کی جائدادیں وقف ہیں۔ اگر مولوی صاحب کا اعتراض تسلیم کیا جائے تو ان اوقاف میں سے ایک بھی جائز نہیں رہے گا۔ مولوی صاحب کچھ فرماتے تو رہے لیکن آخر کو کھسیانے ہو گئے اور چُپ ہو گئے۔ جو لوگ وقف کی حمایت کے لیے آئے تھے انھوں نے نواب صاحب کے فرمانے سے یہ طے کیا کہ سب حصہ داروں کو مل کر مقدمہ لڑانا چاہیے اور بڑے بڑے حصہ داروں کو برابر برابر روپیہ خرچ کے لیے دینا چاہیے۔ مصطفیٰ خاں مرحوم وقف کے مقدمات کے پیروکار تھے انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ شیخ صاحب کو رضامند کر دیں کہ وہ مقدمے میں وکالت قبول کریں اور مقدمہ لڑائیں۔ وہاں تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ علی گڑھ آ کر مصطفیٰ خاں نے مجھ سے بہت کچھ کہا تو میں نے حامی بھر لی اور شروع سے لے کر آخر تک مقدمہ لڑایا۔ عدالت ماتحت میں تو سب کام میں نے ہی کیے۔ ہائی کورٹ کے کسی بیرسٹر یا وکیل کو نہیں بلایا حالانکہ دوسری جانب سے تین تین چار چار وکیل ہائی کورٹ سے بلائے گئے اور سنا گیا کہ دوسرے فریق نے ایک لاکھ سے زیادہ رقم وکلا کی فیس پر خرچ کی۔ جب یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں گیا تو میں وہاں بھی پیروی کرنے کو گیا اور سر تیج بہادر سپرو کو وکیل کیا جن کے سامنے میں نے ایک ہزار روپیہ پیش کیا۔ وہ انھوں نے منظور کر لیے۔ دوسری طرف سے سر سندر لال الٰہ آباد

ہائی کورٹ کے سب سے بڑے وکیل پنڈت موتی لال جی آنجہانی پیروی کرتے تھے لیکن اپیلانٹیان نے سرراس بہاری گھوش کو بھی کولکتا سے بلا کر مقدمے میں بحث کرائی۔اس بحث میں کوئی ایک ہفتہ لگا۔سرراس بہاری گھوش بڑے نامی وکیل تھے۔ان کی قابلیت مسلّمہ تھی لیکن ان کو بلانے کی ایک اور بھی وجہ تھی کہ وہ بنگالی تھے اور ہائی کورٹ کے جن دو ججوں کے سامنے مقدمہ پیش تھا ان میں ایک جج مسٹر بنرجی بنگالی تھے۔موکلوں نے یہ سمجھا کہ وہ بنگالی وکیل کی وجہ سے کچھ رعایت کریں گے۔لیکن آخر کو وقف مقدمہ جیت گیا۔سرتیج بہادر سپرد کی بحث قابل تحسین رہی۔ مقدمہ جیتنے کے بعد انھوں نے وہ ایک ہزار روپیہ جو میں نے ان کو دیا تھا اس میں سو روپے اپنے پاس سے ملا کر گیارہ سو روپے کا ایک چیک کالج کے نام لکھ دیا کہ یہ بطور عطیہ کے قبول کیا جائے۔ یہ جائداد موقوفہ اس وقت تک ٹرسٹیان وقف کے قبضے میں ہے اور ہر سال چالیس پچاس ہزار روپے کا منافع حصہ داروں میں تقسیم ہوتا ہے۔نواب وقار الملک مرحوم کی روح اپنی ابتدائی کوشش کی کامیابی سے ضرور خوش ہوتی ہوگی۔

نواب وقار الملک میں اتنی خوبیاں تھیں کہ جس کی تفصیل اس مختصری اور محض یادداشت کی کتاب میں درج کرنا دشوار ہے۔نواب صاحب خود اپنی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ میں کلکٹری علی گڑھ میں پیشکار تھا اور جمعہ کی نماز کے لیے میں بلا ناغہ ایک گھنٹہ کے لیے دفتر سے غیر حاضر ہو جایا کرتا تھا۔ایک نئے کلکٹر آئے انھوں نے کہا کہ ہمارا کام مقدم ہے آپ نماز کسی اور وقت پڑھ لیا کیجیے اور یہاں سے غیر حاضر مت ہوا کیجیے۔انھوں نے کہا کہ میں نماز پڑھنے ضرور جاؤں گا کیونکہ میرے لیے نماز کا وقت مقرر ہے۔فرنگی نے کہا کہ میرے کام کا وقت بھی مقرر ہے۔اس پر دونوں جانب سے کچھ حجت ہوئی اور آخر کو نواب صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ مثال نواب صاحب کے عزم اور ہمت کا ثبوت دیتی ہے۔نواب صاحب کچھ دنوں کے لیے علی گڑھ میں مقیم رہے اور سرسید کے ساتھ کام کرتے رہے۔ایک دفعہ کا ذکر کرتے تھے کہ سائنٹیفک سوسائٹی کا مکان دیکھنے کے لیے کوئی بڑے افسر آرہے تھے کہ جن کے سامنے سرسید کو عمارت کی لاگت کا حساب پیش کرنا تھا۔لیکن ایک روز قبل یہ معلوم ہوا کہ حساب بالکل تیار نہیں ہے۔سرسید بہت پریشان ہوئے۔نواب صاحب نے کہا کہ وقت تو تھوڑا ہے لیکن جو کچھ ہو سکے گا میں آپ کو مدد

دوں گا اور حساب لے کر بیٹھ گئے۔ کھانے کا وقت آیا سرسید نے بلایا تو فرمایا کہ مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے۔ رات بھر حساب کی درستی میں لگے رہے۔ سرسید آ آ کر دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ بیمار ہو جاؤ گے ذرا سو تو لو لیکن وہ رات بھر بالکل نہیں سوئے۔ اب صبح ہوئی نماز کا وقت آیا نواب صاحب نے نماز سے قبل حساب درست کر دیا اور پھر نماز پڑھ کر جا کر تھوڑی دیر سو رہے۔ سرسید نے جب دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم نے میری پریشانی رفع کر دی۔

علیا حضرت آنجہانی نواب سلطان جہاں بیگم نواب صاحب کی شخصیت اور ان کی پاکیزہ زندگی کی بہت مدّاح تھیں اور بعض خانگی معاملات میں بھی وہ اپنے افسروں کو نواب صاحب سے مشورہ کرنے کے لیے بھیجا کرتی تھیں۔ نواب صاحب بہت بڑے محتاط آدمی تھے۔ لباس نہایت ہی سادہ پہنتے تھے، کھانا بہت سادہ کھاتے تھے۔ ہر شخص جو ان کے پاس آتا تھا اس سے اس قدر اخلاق برتتے تھے کہ اس کو یقین دلا دیتے تھے کہ مجھ کو یہ اپنے سے بڑا سمجھتے ہیں۔ نواب صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گزرا۔ وہاں کے پرائم منسٹر نواب آسمان جاہ بہادر کو ان کی دیانت وامانت اور راست بازی پر اس قدر اعتبار تھا کہ وہ بلا ان کے مشورے کے ریاست کا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ انگریز جو ریاست کو اپنے پنجے میں دبا کر رکھنے کے متمنی رہتے تھے وہ بعض وقت نواب صاحب کی صاف گوئی سے ناخوش ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ نواب صاحب نے ریزیڈنٹ سے کہا کہ ہم برار کے صوبے کے متعلق کاغذات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جن شرائط سے یہ صوبہ ریاست سے لیا گیا تھا وہ شرائط پوری ہو چکی ہیں۔ اب وہ واپس ہونا چاہیے۔ نواب صاحب نے اس کے بارے میں کچھ تفصیل سے بیان نہیں کیا تھا لیکن خارجی بیانات سے معلوم ہوا کہ اسی ناخوشی کی وجہ سے نواب صاحب کو ریاست کی اعلیٰ ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور پنشن دے کر ملازمت سے ان کو سبکدوش کر دیا۔

نواب صاحب کی سوانح عمری ایجوکیشنل کانفرنس نے بہت سا روپیہ لگا کر لکھوائی ہے لیکن مجھے نواب صاحب کی اس سوانح عمری میں ان کی زندگی کے متعلق دلچسپی پیدا کرنے کی کوئی چیز نہیں ملی۔ سرکاری کاغذات کی نقلیں یا جلسوں کی روئدادوں کی نقلیں کسی کی زندگی کو دلچسپ نہیں بنا

سکتیں۔سوانح عمری کو دلچسپ بنانے کے لیے ذاتی واقفیت اور گہرے تعلقات بھی ضروری ہیں۔
نواب صاحب کالج کے سکریٹری تھے۔میں صیغۂ مال کا ممبر تھا نیز وہ سر سید میموریل فنڈ کے صدر تھے
اور میں سکریٹری تھا۔ وہ کالج کے آنریری سکریٹری تھے اور میں کورٹ کا ممبر تھا۔ان کے ساتھ
میں نے کئی مرتبہ سفر بھی کیا۔جن ذاتی تعلقات کی وجہ سے میرے دل پر نواب صاحب کی عظمت کا
نقش قائم ہو گیا تھا وہ اس وقت تک قائم ہے۔میں ان کو اس معزز گروہ کا ممبر سمجھتا ہوں جو سر سید کے
نورتن پر مشتمل تھا۔میری عمر بہت کم تھی اس لیے میرا شمار تو نورتن میں نہیں ہوسکتا تھا لیکن سر سید کے بعد
ان کے حواریوں کے اعلیٰ اخلاق اور عادات کا میرے دل پر بہت گہرا اثر پڑا۔میرے نزدیک سر سید
کی مثال دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں میں مقابلے کے لیے پیش کی جاسکتی ہے۔وہ ہستیاں گو قومی
حیثیت سے سر سید سے بہت بالاتر تھیں لیکن ان کے ظاہری کاموں کا کچھ عکس سر سید کے کاموں
میں پایا جاتا ہے۔جن بڑی ہستیوں کی طرف میرا اشارہ ہے ان میں سب سے اعلیٰ تر ہستی ہمارے
پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام
انسانوں سے بالاتر تھی۔ان کی مثال تو کسی دوسرے پر عائد نہیں ہوسکتی لیکن آنحضرت نے اپنے
ساتھ باخلوص نیک بندوں کا ایک گروہ لے لیا تھا جن کو صحابہ کرامؓ کہتے ہیں۔حضرت مسیح علیہ السلام
نے بھی اپنے ساتھ حواریوں کا ایک گروہ پیدا کر لیا تھا۔دُنیا میں جتنے نامی مصلحان اقوام پیدا ہوئے
ان سب نے اچھے آدمیوں کا ایک گروہ اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔

ہندوستان میں گرونانک ایک بڑے پائے کے مصلح گزرے ہیں انھوں نے بھی اپنے
شاگردوں یا سکھوں کا ایک گروہ پیدا کر لیا تھا اور زمانہ حال میں سر سید نے نواب وقار الملک اور محسن
الملک و مولانا حالی اور مولانا نذیر احمد جیسے بزرگوں کو اپنے اوصاف حمیدہ کی گرویدگی میں لے کر کام
کرنے والوں کا ایک گروہ بنا لیا تھا۔سر سید کے علاوہ کبھی کسی مسلمان نے کوئی گروہ خالص قومی
خدمت کے لیے نہیں بنایا جو بے لوث طریقہ سے اصلاحی امور میں ان کو مدد دیتے۔یہ شرف سر سید
ہی کو نصیب ہوا کہ انھوں نے قوم کے لیے اپنی زندگیاں نثار کر دیں۔اور خلوص کے ساتھ سر سید کے
مشن میں دم واپسیں تک منہمک رہے۔نواب محسن الملک بڑے ذہین فصیح اور بلیغ افراد قوم میں سے
تھے لیکن نواب وقار الملک اپنے وقار اور خلوص کی وجہ سے قوم کی نظر میں کسی دوسرے سے کم نہیں

تھے۔ کیونکہ کسی میں اس قدر ظاہری اور باطنی کشش کے لیے اوصاف نہیں تھے کہ بڑے بڑے قابل آدمی ان کے اثر میں آ کر ان کی پیروی کرنے لگیں اور ان کے کاموں میں شریک ہو جائیں۔

نواب وقار الملک آخر میں بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ ذرا چلنے پھرنے میں تکلف ہوتا تھا۔ ان کو اپنے بیٹے محمد احمد کی وفات کا بہت صدمہ تھا۔ محمد احمد نے کسی میم سے شادی کر لی تھی۔ مرحوم بیٹے کی بیوہ سے نواب صاحب نے وہی سلوک کیا جو ایک باپ اپنی بیٹی سے کرتا ہے۔ وہ جب تک ہندوستان میں رہیں ان کا کل خرچ نواب صاحب خود ہی دیتے رہے اور ہر سال موسم گرما میں ان کو پہاڑ پر جانے اور رہنے کا خرچ دیتے تھے۔

مجھے نواب صاحب کی زندگی کا وہ حصہ دیکھنے کا موقع ملا کہ جب وہ جوانی کی عمر سے بہت تجاوز کر گئے تھے اور بڑھاپا ان پر طاری ہو چکا تھا۔ انھوں نے دوسری شادی اپنی برادری میں ہی کر لی تھی جن سے ایک بیٹا مشتاق احمد پیدا ہوا جس نے ولایت میں تعلیم پائی اور جو اس وقت حیدر آباد میں ملازم ہے۔ نواب صاحب کی ایک صاحبزادی کا انتقال ان کے سکریٹری شپ کے آخر زمانے میں ہوا۔ میں ان کے پاس ایک روز صبح کے وقت گیا تو معلوم ہوا کہ صاحبزادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے ہمدردی ظاہر کی۔ فرمایا، کسی کے بس کی کیا بات ہے ہم سب اُدھر ہی کو چل رہے ہیں اور ایک روز یہ فانی زندگی ختم ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر پھر کام میں مصروف ہو گئے۔ کاغذات اور مثلیں لوٹ کر ان پر نوٹ لکھتے جاتے تھے۔ ان دنوں ایک بجے دن کے ریل گاڑی مراد آباد جایا کرتی تھی۔ نواب صاحب ساڑھے بارہ بجے تک کام کرتے رہے اس کے بعد کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور گھر میں گئے۔ کپڑے پہن کر چلے آئے اور گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں بھی اسٹیشن تک ہمراہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا اور ابھی جنازہ دفن نہیں ہوا وہ جب سلام کرتے تھے تو نواب صاحب بڑے تپاک سے ان سے ملتے تھے اور اپنے چہرہ پر اس سخت صدمے کے آثار ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے جو اس وقت ان کے دل میں تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس قدر اعلیٰ خیال اور مضبوط دل کے انسان تھے۔

نواب صاحب مرحوم آخر میں زیادہ معذور ہو گئے تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے دماغ پر بھی کچھ اثر ہے۔ وہ جب یہاں سے عہدہ چھوڑ کر چلے ہیں تو میں بھی اسٹیشن پر الوداع کہنے

گیا۔ کمر جھک گئی تھی۔ چلنے پھرنے میں تکلف تھا لیکن چہرے پر بشاشت بدستور تھی، میں نے اس کے بعد کچھ فقرات نواب صاحب کے بارے میں کچھ اخبار میں لکھے تھے جو ان کی سوانح عمری میں نقل کیے گئے ہیں۔ میں نے ان کی سکریٹری شپ کے زمانے میں ان کی زندگی اور کام کے متعلق ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا جو ان کی سوانح عمری میں نقل ہو گیا ہے یہاں پر اس مضمون کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا انتقال بمقام امروہہ ان کے وطن میں ہوا اور وہیں وہ اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے خدا مرحوم کی غریق رحمت کرے۔

نواب وقار الملک مرحوم کے جانشین

نواب وقار الملک نے اپنی زندگی میں خود کالج کی سکریٹری شپ کے بارے میں اپنی جانشینی کا معاملہ طے کر دیا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ نواب صاحب سے عرض کیا تھا کہ آپ عزیز مرزا صاحب جو حیدر آباد کے پینشنر تھے اپنی جانشینی کے لیے نامزد فرمائیے۔ انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں مجھ کو جواب دیا تھا۔ شیخ صاحب آپ نے بھی انسان فانی پر کیا امید باندھی ہے کہ میں ان کو ابھی سے نامزد کر دوں، نہ معلوم وہ پہلے دنیا سے رخصت ہو جائیں یا میں، عزیز مرزا صاحب مرحوم نواب صاحب کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے اور ایک طرح سے نواب صاحب کے ارشاد کی تصدیق ہو گئی۔ لیکن جب نواب صاحب نے قطعی ارادہ کر لیا کہ اب وہ سکریٹری شپ کا عہدہ چھوڑ دیں گے تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ کسی کو سکریٹری شپ کے عہدے کے لیے نہ صرف نامزد کیا جائے بلکہ مقرر کر دیا جائے۔ کیوں کہ اب میں کام نہیں کر سکتا۔ عزیز مرزا تو دنیا سے رخصت ہو گئے اب بتائیے کہ کس کو ترجیح دی جائے۔ میرے ذہن میں پہلے ہی سے نواب اسحاق خاں صاحب کا خیال تھا کہ ان کو نواب صاحب کے بعد کالج کا سکریٹری مقرر کیا جائے۔ میں نے ان کا ذکر نواب وقار الملک سے کیا کہ نواب اسحاق خاں صاحب اب اپنے ججی کے عہدے سے پینشن لے کر علاحدہ ہونے والے ہیں۔ اس وقت ان سے بہتر آدمی ہمیں نہیں ملے گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ اچھا اب آپ جائیے اور ان کو تیار کیجیے۔

نواب اسحاق خاں صاحب ان دنوں فتح گڑھ میں تھے۔ میں نے ان کو خط لکھا اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ فلاں تاریخ کو میں اپنے عہدہ کا چارج چھوڑ دوں گا۔ میں نے

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم سے مشورہ کیا کہ نواب اسحاق خاں صاحب کو مجبور کیا جائے کہ وہ نواب وقار الملک کے بعد سکریٹری شپ کا عہدہ قبول کریں۔ آفتاب احمد خاں صاحب میری طرح نواب محمد اسحاق خاں صاحب کے دوست بھی تھے اور ان کے اجلاس میں وکالت بھی بہت کر چکے تھے۔ لیکن ان کے سکریٹری ہونے کے متعلق ان کی اور میری رائے میں اختلاف رہا۔ غالباً نواب وقار الملک مرحوم سے بھی آفتاب احمد خاں کی بات چیت اس بارے میں ہو چکی تھی۔ میں نے آفتاب احمد خاں صاحب سے کہا کہ اس وقت کوئی دوسرا آدمی اس عہدے کے لیے موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ نواب اسحاق خاں صاحب کے تعلقات اس کالج سے بہت پرانے ہیں ۔سرسید نے ان کو ایک مرتبہ کانفرنس کا صدر بھی مقرر کیا تھا اور میں نے ان کے ذاتی مقدمے بھی لڑائے ہیں اور ان کے خیالات سے بھی مجھ کو واقفیت ہے۔ اس لیے میں ان کے خلاف کوئی بات نہیں دیکھتا کہ وہ کالج کے سکریٹری کیوں نہ مقرر کیے جائیں۔ صاحب زادہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب کو اور تم کو اختیار ہے مجھے اس معاملے میں بیچ میں لانا مناسب نہیں ہے۔

آفتاب احمد خاں صاحب سے گفتگو کے تیسرے چوتھے روز میں فتح گڑھ گیا۔ جس روز میں فتح گڑھ پہنچا اس روز وکلا نے ان کو رخصتی پارٹی دی تھی اور میں بھی اس میں شریک ہوا۔ گھر پر آکر ان سے بہت طویل گفتگو ہوئی۔ وہ انکار کرتے تھے۔ مجھے یہ کام دشوار معلوم ہوتا ہے، میں اس کی اہلیت نہیں رکھتا اس لیے مجھ کو معاف کیا جائے۔ میں نے یہ کہا کہ اگر قوم کا ہر ایک آدمی اس قسم کا جواب دینے لگے تو پھر ہم کو سکریٹری شپ کے لیے کوئی آدمی ملے گا ہی نہیں۔ نواب اسحاق خاں صاحب بہت ہی بامروت شریف انسان تھے۔ آخر کار انھوں نے فرمایا کہ اچھا جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی کروں گا۔ میں نے کہا کہ نواب وقار الملک ٹرسٹیوں کے جلسے کے لیے کوئی تاریخ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دیں گے اور خود اس عہدے کی علاحدگی سے بھی آپ کو اطلاع دیں گے۔ آپ خود ہی تشریف لائیے گا لیکن تشریف لانے سے قبل نواب صاحب کو اور مجھ کو اطلاع دیجیے گا۔

اس گفتگو کے بعد میں رات کی گاڑی میں سوار ہو کر علی گڑھ آ گیا اور نواب وقار الملک کو اطلاع دی کہ نواب اسحاق خاں صاحب آنے کو تیار ہیں آپ ان کو سکریٹری مقرر کرا دیجیے۔ چنانچہ حسب قرارداد مذکورہ وہ سکریٹری مقرر ہو گئے اور یہاں آکر عہدہ کا چارج لے لیا۔ نواب

اسحاق خاں صاحب نے بہت قابلیت سے سکریٹری شپ کا کام کیا۔ وہ سر سید اور محسن الملک مرحوم کی طرح مسلمان پبلک سے واقف نہیں تھے تاہم اپنے خلوص اور روزمرہ کے باقاعدہ کام کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے دل میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔ وہ جتنے دنوں تک بھی رہے بہت نیک نام رہے لیکن علی برادران نے ان کے ساتھ بہت گستاخیاں کیں۔ اخبارات میں روزانہ ان کے خلاف مضامین لکھے۔ حاجی بغلول کا ان کو خطاب دیا۔ علی برادران کے اخبار ہمدرد کے ہر نمبر میں ان کے خلاف مضامین ہوتے تھے اور نہایت دریدہ ذہنی اور بدتمیزی سے مضامین لکھے جاتے تھے۔ ان مضامین کا کوئی سر اور پیر نہیں ہوتا تھا لیکن بازاری زبان لکھنے میں ان دونوں بھائیوں کو بڑی مہارت تھی اس لیے لوگ اودھ پنچ اخبار کی طرح ان کے اخبار کو بھی دل چسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ مجھے اس وقت ان گندے مضامین کی تفصیل تو یاد نہیں لیکن جب نواب اسحاق خاں صاحب نے اپنی علالت کی وجہ سے کئی مرتبہ کالج کی سکریٹری شپ سے علاحدگی کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو ہمدرد میں ایک نہایت لغو مضمون علی برادران نے لکھا کہ آپ ہمیشہ دھمکی دیتے ہیں کہ اب علاحدہ ہوں گے ہم انتظار کرتے کرتے تھک گئے کہ کب آپ سے پیچھا چھوٹتا ہے۔ لیکن آپ اب تک جمے بیٹھے ہیں اور مفصلہ ذیل شعر لکھ کر اپنی بداخلاقی اور خفیف حرکت کا ثبوت دیا۔ شعر:

> ہم ڈھونڈتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا　　مرنے کی اپنے روز اڑانا خبر غلط

نواب صاحب بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ ان پر ان بدتمیزوں کا کچھ زیادہ اثر تو نہ ہوا لیکن آخر کو نواب صاحب کی صحت جواب دے گئی اور وہ سکریٹری شپ کے عہدے سے علاحدہ ہو گئے۔ نواب صاحب میرے بہت بڑے مہربان دوست بھی تھے۔ میں نے ان کے بڑے بڑے مقدمے لڑائے تھے۔ میں ان سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا۔ دل کے نہایت صاف زبان کے سچے اور اپنے قول و قرار اور وعدوں کے پکے تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی ایسی خامی نہیں تھی کہ ان پر بے دردانہ حملے کیے جاتے۔ لیکن علی برادران کی طبیعت کا مقتضا یہی تھا کہ جو شخص ان کی رائے اور خیالات سے اتفاق نہیں کرتا تھا وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور سوسائٹی کے معمولی ظاہرہ اخلاق کو بھی پس پشت ڈال دیتے تھے اور گالی گلوچ پر اُتر آتے تھے۔

نواب اسحاق خاں صاحب مرحوم نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ رئیس دہلی و جہانگیر آباد کے صاحبزادے تھے اور نواب مرتضیٰ خاں صاحب کے پوتے تھے۔ ان کے مورث بہت بڑی جائداد کے مالک تھے لیکن غدر 1857 میں سب جائداد چھن چھنا گئی۔ صرف جہانگیر آباد کے تعلقہ کے دیہات ان کو ملے۔ نواب صاحب نے بہت دنوں تک سیشن ججی کی تھی اور جائداد کو ترقی دی۔ میرٹھ میں ایک بہت بڑا مکان مصطفیٰ کاسل کے نام سے تعمیر کرایا۔ اپنے صاحبزادوں کو ولایت میں تعلیم دلائی۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب جو ہمارے وائس چانسلر رہ چکے ہیں ان کے بڑے صاحبزادے ہیں۔

نواب محمد اسحاق خاں صاحب مرحوم کے جانشین

سید محمد علی صاحب جن کا سرسید سے قریب کا رشتہ تھا جس کی تفصیل مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے لیکن جہاں تک مجھے خیال ہے کہ وہ سرسیدؒ کی بہن کے بیٹے تھے اور جنھوں نے مثل نواب اسحاق خاں صاحب مرحوم کے سیشن ججی سے پینشن پائی تھی۔ وہ تعلیم نسواں کے بہت حامی تھے اس لیے مجھ سے بہت ربط ضبط تھا۔ وہ پینشن کے بعد علی گڑھ ہی میں آکر مقیم ہو گئے تھے اور نواب اسحاق خاں صاحب کے بعد سوائے سید محمد علی صاحب کے اور کوئی دوسرا آدمی سکریٹری شپ کے لیے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی لیکن جب ان کی سکریٹری شپ کا معاملہ آیا تو آفتاب احمد خاں نے مخالفت کی۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی مخالفت کسی نفسانیت پر مبنی نہیں ہوتی تھی۔ وہ سچائی اور ایمان داری سے جس بات کو ٹھیک سمجھتے تھے اس سے اتفاق کیا کرتے تھے۔ لیکن روزمرّہ کے کاموں میں کسی کی ذاتیات کا وہ خیال نہیں کیا کرتے تھے۔ جو کام ان کے سامنے آجاتا تھا اس سے واقعات کی بنا پر اتفاق یا اختلاف کرتے تھے۔ نہ کہ اس خیال سے کہ یہ معاملہ کس سے تعلق رکھتا ہے اور کون اس کا حامی ہے۔ تاہم وہ سیّد محمد علی صاحب سے میری بہ نسبت بہت زیادہ واقف تھے لیکن ان کی سچی رائے یہ تھی کہ یہ کام نہیں چلا سکیں گے۔ اس لیے انھوں نے اختلاف کیا تھا۔ لیکن جب سید محمد علی صاحب سکریٹری مقرر ہو گئے تو پھر شرکت عمل میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

سید محمد علی صاحب کی سکریٹری شپ کے زمانے میں خلافت کا ہنگامہ زوروں پر تھا اس لیے

ان کو اپنا کام کرنے میں امن نہ ملا تاہم رائے کی پختگی کے وہ اپنے کام میں کامیاب رہے۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ نہایت اچھا تھا۔ حسابات کی نگرانی خوب کرتے تھے لیکن اسی دوران میں علی برادران نے گاندھی جی کے ساتھ لے کر کالج کو برباد کرنے کا تہیہ کر کے کالج پر یورش برپا کی اور کلکتہ سے علی گڑھ تک گاندھی جی کو ہمراہ لے کر آ گئے جیسا کہ خلافت کے مضمون میں اوپر اس کا ذکر آ چکا ہے۔ گو ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کی رائے کی غلطی سے کالج کو سخت صدمہ پہنچا لیکن آخر کو سید محمد علی صاحب سکریٹری کالج کی کوشش سے علی برادران اور ان کے حواری اولڈ بوائز لاج سے پولیس اور مجسٹریٹ کے ذریعہ سے نکلوائے گئے اور کالج کے حالات میں امن پیدا ہوا۔

اس سے قبل لکھا جا چکا ہے کہ علی برادران نے اپنے نزدیک کالج کو مار کر دفن کر دیا تھا۔ لیکن، ہم لوگوں نے سر ہارکورٹ بٹلر اور مہاراجہ صاحب محمود آباد کی مدد سے قبر میں سے مردے کو ایک دوسری اچھی شکل میں نکال کر کھڑا کر دیا یعنی یونیورسٹی کا افتتاح کرا دیا اور مہاراجہ صاحب محمود آباد وائس چانسلر مقرر ہوئے اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم پرو وائس چانسلر مقرر ہوئے، اور سید محمد علی صاحب ٹریزرار بنائے گئے۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد اور ڈاکٹر سر ضیالدین سے نہیں بنی اس لیے مہاراجہ صاحب نے وائس چانسلری سے استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم ٹریزرار کا عہدہ قبول کرو۔ میں نے کوشش کی کہ سید محمد علی صاحب بدستور کام کرتے رہیں۔ لیکن سید محمد علی صاحب کو جب آفتاب احمد خاں کے ارادے کی اطلاع مل گئی کہ وہ نہیں چاہتے تو انھوں نے ٹریزرارشپ چھوڑ دی اور اس عہدے کا بار میرے کندھوں پر ڈالا گیا۔ میں نے قریب چھ سال تک ٹریزرارشپ کا کام کیا۔ میرے زمانے میں آفتاب احمد خاں اور نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب یکے بعد دیگرے وائس چانسلری کے عہدوں پر رہے اور میں ان دونوں صاحبان کے ساتھ کام کرتا رہا لیکن جب سید راس مسعود وائس چانسلر مقرر ہوئے تو میں نے ٹریزرارشپ کا عہدہ چھوڑ دیا۔

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم پنجاب کی ریاست کنج پورے کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد گوالیار میں بہت دنوں تک منسٹر رہے۔ وہ ایک بڑے پایہ کے انسان

تھے۔ ریاست گوالیار میں ان کی قابلیت، انصاف اور دیانت داری و امانت کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کا نام نواب غلام احمد صاحب تھا۔ وہ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں "مثنوی صبح نور" ایک مشہور کتاب ہے جو صوفیانہ رنگ میں لکھی گئی ہے اور جو ان کے انتقال کے بعد ان کی سالانہ برسی کی تقریب کے روز ان کے مزار پر پڑھی جایا کرتی تھی۔ ان کا انتقال علی گڑھ ہی میں ہوا۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے خانقاہ شاہ جمالؒ صاحب، واقع علی گڑھ کے احاطے میں دفن کیا اور ان کی قبر کے ملحق ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ آفتاب احمد خاں صاحب نواب صاحب کے چھوٹے بیٹے تھے اور سر سلطان احمد خاں صاحب ان کے بڑے بیٹے تھے۔ آفتاب احمد خان صاحب اور سلطان احمد خاں صاحب دونوں نے ولایت میں تعلیم حاصل کی اور بیرسٹری کی سند لے کر ہندوستان آئے۔ سر سلطان احمد خاں صاحب نے دہلی میں وکالت شروع کی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے علی گڑھ میں۔ غالباً یہ دونوں بھائی 1894 میں ولایت سے واپس آئے اور اسی سال وکالت شروع کر دی۔ میں اس وقت فورتھ ایئر کلاس کا طالب علم تھا۔ سر سید کے مکان پر آفتاب احمد خاں سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت ہی گورے چٹے وجیہ انسان تھے اور اول روز ہی کی ملاقات کے بعد مجھ سے جو باتیں ہوئیں ان سے مجھ کو اندازہ ہوا کہ یہ دنیا میں کچھ کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور کچھ کام کریں گے۔ میں جب علی گڑھ آیا اس وقت وہ ولایت جا چکے تھے۔ مجھ کو یہاں آ کر معلوم ہوا کہ جانے سے قبل انھوں نے ڈیوٹی سوسائٹی قائم کی تھی اور جن طالب علموں کے ہمعصر تھے وہ ان کی بہت تعریف کرتے تھے کہ بڑے جوشیلے نوجوان ہیں اور قومی کاموں میں ان کو بہت دلچسپی ہے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کے کیپر یا منتظم ان دنوں ہمارے پروفیسر سر تھامس آرنلڈ تھے۔ ڈیوٹی سوسائٹی میں میرا تعلق اس طور پر قائم ہوا کہ 1893 میں بوجہ علالت کے میں شملہ گیا اور وہاں پر میں نے کوشش کر کے ڈیوٹی سوسائٹی کے لیے ایک معقول رقم جمع کی جو لا کر سر تھامس آرنلڈ کے سامنے پیش کی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور میرا نام ڈیوٹی سوسائٹی کے ممبروں میں لکھ دیا۔ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک میں ڈیوٹی سوسائٹی کا ممبر ہوں۔ اس کو 55 سال کا زمانہ گزر چکا ہے۔

آفتاب احمد خاں ایک بڑے صالح نوجوان تھے اور جہاں تک میرا تجربہ ہے وہ نہ جھوٹ بولتے تھے اور نہ غیبت کرتے تھے۔ وہ سر سید کے زمانے میں کالج کے ٹرسٹی مقرر ہو گئے تھے۔ اور قومی

لیڈروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ سرسید کے انتقال پر انھوں نے بڑی گرمجوشی سے کالج کے مختلف کاموں میں شرکت شروع کی اور نواب محسن الملک کی سکریٹری شپ کے زمانے میں کالج کے کاموں میں ان کا بہت بڑا دخل تھا۔ محسن الملک مرحوم کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہیں کرتے تھے۔ سرسید سے ان کو بہت محبت تھی اور اکثر بڑی گرمجوشی سے سرسید کا ذکر کرتے تھے۔ سرسید کے بعد جو سرسید میموریل فنڈ قائم ہوا اس میں اوّل روز وہ سکریٹری مقرر ہوئے اور جہاں تک مجھے خیال ہے نواب محسن الملک اس کے صدر مقرر ہوئے۔ میں اور ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے کیونکہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب اکثر دوروں کے مقدمات میں علی گڑھ سے باہر دیگر اضلاع میں جاتے تھے اور کئی کئی دن غیر حاضر رہتے تھے۔ اس لیے ان کو سرسید میموریل فنڈ میں کام کرنے کی مطلق فرصت نہیں تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم میرے ساتھ جوائنٹ سکریٹری تھے لیکن وہ بھی اپنے امتحانوں کی تیاری کررہے تھے اور ولایت جانے کی فکر میں تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی سرسید میموریل فنڈ کے کام میں کچھ حصہ نہیں لیا۔ میں نواب محسن الملک کے ساتھ کام کرتا رہا اور آخر کو سرسید میموریل فنڈ کمیٹی نے مجھے سکریٹری مقرر کردیا۔ 1911 تک میں سکریٹری رہا اور اس زمانے میں سرسید میموریل فنڈ اور ون روپی فنڈ میں قریب 62 لاکھ روپیہ جمع ہوا جس کا ایک نقشہ سید عبدالباقی بیرسٹر مرحوم اور میرے دستخطوں سے مرتب ہوا جو کالج کے دفتر میں محفوظ تھا۔ ممکن ہے کہ اب بھی موجود ہو۔ سرسید میموریل فنڈ کے ابتدائی دنوں میں آفتاب احمد خاں صاحب نہایت جوش سے اس کے ہر کام میں حصہ لیا کرتے تھے۔

سرسید کے انتقال کے چند ماہ بعد سر جیمس لاٹوش لفٹنٹ گورنر صوبہ یوپی کی صدارت میں ایک جلسہ چندے کی فراہمی کے لیے ہوا اور علی گڑھ و نیز بیرونجات کے روٗسا نے اس میں چندے دیے اور ایک اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ اس ابتدائی زمانے کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر ہے اور علاوہ عبرت خیز ہونے کے دلچسپ بھی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ سے ایک وفد نواب صاحب رام پور سے عطیہ لینے کے لیے گیا۔ اس کے ممبران نواب محسن الملک مرحوم، سرتھیوڈور ماریسن، آنجہانی صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اور کچھ کالج کے اولڈ بوائز تھے لیکن نواب محسن الملک مرحوم نے اپنی فراخ حوصلگی کا ثبوت دینے کے لیے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو بھی اس وفد کی

شرکت کے لیے کہا اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم نے اس میں شریک ہونا منظور کر لیا۔ رام پور پہنچ کر مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے نواب محسن الملک مرحوم کے خلاف نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم سابق والی رام پور سے کچھ ایسی باتیں کہیں جو کالج کے خلاف پڑتی تھیں اور جن سے کالج کے منتظمین اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے درمیان تفیض کی بو آتی تھی۔

نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم نے پچاس ہزار روپے کے عطیہ کا اعلان کیا۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ فوراً ڈاکخانہ پہنچے اور وہاں جا کر سر جیمس لاٹوش لفٹیننٹ گورنر کو تار دیا کہ میں وفد لے کر رام پور پہنچا اور نواب حامد علی خاں صاحب نے پچاس ہزار روپیہ عطیہ دیا ہے۔ واقعات کا یہ حصہ تو ہمارے زمانے کے مسلمانوں کی اخلاقی حالت کے انحطاط کا پتا دیتا ہے کہ جو کام تنہا ہم نے انجام نہیں دیا ہم اس کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اب اس معاملے کا دلچسپ پہلو سنیے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے دو اولڈ بوائے ضیاء اللہ خاں اور ایک اور صاحب بھی ڈاکخانہ اُسی وقت پہنچ گئے جب مولوی سمیع اللہ خاں صاحب پہنچے۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم نے انھی ہمارے اولڈ بوائے سے کہا کہ ہمارا تار لکھ دو۔ ہمارے اولڈ بوائے بھانپ گئے کہ یہ ترکیب لفٹیننٹ گورنر سے اپنے لیے خوشنودی حاصل کرنے کی ہے اور نواب محسن الملک کو پس پشت ڈالنے کی ہے اور یہ کوشش کہ اس وفد کے سرغنہ یا سر دھرے بھی تسلیم کیے جائیں اور محسن الملک کا کام اور شہرت مٹی میں دبا دیا جائے۔ ہمارے اولڈ بوائز نے تار تو لکھا لیکن نواب محسن الملک کی طرف سے لکھا اور روانہ کر دیا۔ مولوی صاحب کیونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے لہٰذا ان کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ جب علی گڑھ میں اس عطیہ کی خبر ملی تو بہت خوشیاں منائی گئیں اور دوسرے روز ممبران وفد بھی واپس آ گئے۔ نواب حامد علی خاں صاحب والی رام پور نے ممبران وفد کے سامنے یہ راز افشاء کر دیا کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ جو عطیہ آپ دیجیے اس میں میرا نام بھی شامل کر دیجیے اور یہ لکھ دیجیے کہ اس روپے کے خرچ میں میرا بھی ہاتھ ہوگا۔ یہ بات لیفٹیننٹ گورنر تک پہنچائی گئی۔ لیفٹیننٹ گورنر نے نواب صاحب رام پور سے دریافت کیا کہ یہ واقعہ صحیح ہے یا نہیں تو نواب صاحب رام پور نے تصدیق کر دی کہ ہاں واقعہ صحیح ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سے اس قدر برہم ہوئے کہ ان کو ایک خط

لکھا کہ آج سے ہمارے اور آپ کے دوستانہ تعلقات بالکل منقطع ہوتے ہیں اور میں آج سے آپ کو ایک غیر سمجھنے پر مجبور ہوں۔ اس کے بعد سرسید میموریل فنڈ کا کام برابر جاری رہا۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے کہ 12- 1911 میں میں سکریٹری شپ سے علاحدہ ہوا اور میری علاحدگی کے ساتھ ساتھ سرسید میموریل فنڈ بھی مرگیا۔ اس دوران میں آفتاب احمد خاں صاحب سے جب کچھ کسی امداد کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کبھی دریغ نہیں کیا۔

آفتاب احمد خاں صاحب مہاراجہ صاحب محمود آباد کے بعد وائس چانسلر ہوئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ آفتاب احمد خاں صاحب کے مکان پر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی موجودگی میں میں نے ان دونوں صاحبوں کو یاد دلایا کہ سرسیدؒ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے کالج کو اس وقت فروغ ہوگا جب اس کالج کے تعلیم یافتہ نوجوان اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ میں نے کہا کہ اب دیکھ لیجیے کہ اس یونیورسٹی کا انتظام کالج کے تعلیم یافتہ اشخاص کے ہاتھ میں آگیا ہے ۔ وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر اور ٹریزرار اس یونیورسٹی کے اولڈ بوائز ہیں اور کل یونیورسٹی کے کاموں کے سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ اب سرسید کی پیشین گوئی پورا کرنے کی ذمہ داریاں ہم لوگوں پر ہیں۔ آفتاب احمد خاں صاحب نے اس خیال کو پسند فرمایا اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب مرحوم نے بھی تائید کی۔ آفتاب احمد خاں صاحب کی صحت جواب دیتی جاتی تھی تاہم وہ بڑے ایثار سے دن رات کالج کے کام میں منہمک رہتے تھے۔ دو سال کے بعد چاروں طرف سے آوازیں اٹھنے لگیں کہ وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر میں آپس میں اتفاق نہیں کام میں خرابی ہو رہی ہے۔

سر قاضی عزیز الدین

اس کمیٹی کے ممبروں میں در پردہ سر قاضی عزیز الدین جو اس زمانہ میں علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور جو لاٹ صاحب کے خوف کے مارے اپنا نام ممبروں میں دکھانا نہیں چاہتے تھے لیکن نہایت گرمجوشی کے ساتھ ہر کام میں مدد دیتے تھے اور میرے بہت بڑے دوست تھے۔ جب نواب لطف علی خاں نے استعفیٰ دے دیا تو قاضی صاحب کی گرمجوشی کا پہلو بالکل بدل گیا اور وہ مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے شور بیجا کے نام سے ایک رسالہ لکھا کہ جو کلکٹروں، کمشنروں اور سکریٹریوں اور لاٹ صاحب کے سامنے پیش ہوا۔ اس میں مرحوم نے مجھ پر خوب فقرے کسے اور میری گرم جوشانہ کوشش پر

حملے کیے اور لکھا کہ اس ہندی اردو کی بحث میں سوائے خیالی اندیشوں کے اور کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ قاضی صاحب نے تم سے چال کھیلا ہے۔ کہ اول تو خوب بھڑکایا کہ زور سے کام کرو اور اصل مقصد ان کا یہ تھا کہ جب گورنمنٹ کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہو تو آپ کی اور کل تحریک کی مخالفت کر کے لاٹ صاحب کی نگاہ میں وفاداری اور نیک نامی کا کوئی تمغہ حاصل کریں۔ اس وقت تو مجھ کو اس کا یقین نہ آیا لیکن نتائج سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے اپنی زندگی کا ایک پروگرام مقرر کر رکھا تھا۔ اور ان کی مخالفت بھی اسی پروگرام کی ایک کڑی تھی۔ انھوں نے رفتہ رفتہ بہت ترقی حاصل کی۔ اول خان بہادر کا اور پھر سر کا خطاب پایا۔ بہت دنوں تک دیسی ریاستوں میں دیوان رہے۔ ریاست دتیا کی نسبت یہ مشہور تھا کہ یہ ریاست قاضی کی خاص ملکیت ہو چکی ہے۔ اور قاضی صاحب اپنی زندگی میں اس کو نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

قاضی صاحب کے متعلق اس وقت جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں مرحوم کی بہت کچھ برائی بھی لکھ دی ہے۔ لیکن قاضی صاحب برے آدمی نہیں تھے۔ انگریزوں کی خوشامد ان کے نزدیک سب سے مقدم عمل تھا اور اس عمل کا نتیجہ ان کو مل گیا۔ لیکن قطع نظر اس کے قاضی صاحب مرحوم کے دل میں مسلمانوں کی ہمدردی بہت کافی تھی اور مسلمانوں کے حقوق کے تلف ہونے سے بھی ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ وہ صاحب تصنیف بھی تھے۔ انھوں نے ایک رسالہ لکھا جو سول سروس کے نصاب میں شامل ہوا۔ یہ رسالہ ایک ناول کی صورت میں تھا۔ اور اس میں مسلمانوں کی خانگی زندگی کا تاریک پہلو دکھایا تھا۔ وہ لوگ جو مسلمانوں کی تمدنی زندگیوں کی خامیوں سے واقف تھے انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کے خیال سے اس رسالہ کو معیوب نہیں سمجھا لیکن جب سول سروس کے نصاب میں شامل ہو گیا تو لوگوں کو یہ خیال ضرور پیدا ہوا کہ انگریز کا بچہ جب سول سروس کا امتحان دے کر ہندوستان میں آئے گا تو وہ شروع ہی سے ہندوستانیوں کی تمدنی زندگی کا ایک برا نقش اپنے دل میں لے کر یہاں پہنچے گا۔ لیکن اگر یہ رسالہ نہ ہوتا تو بھی انگریز ہندوستانیوں کی ذلت اپنے ذہن میں ہمیشہ سے لیے ہوئے تھا۔ ممکن ہے کہ اس میں تھوڑا سا اور اضافہ ہوا ہو۔

قاضی صاحب بڑے زود نویس تھے۔ سر سید نے جب کانگریس کے خلاف سب سے پہلی تقریر کی جس کا ذکر اوپر آیا ہے تو قاضی صاحب شاید اس زمانہ میں نائب تحصیلدار تھے اور سر سید

کی تقریر کے وقت وہ جلسے میں موجود تھے۔ انھوں نے بلا کسی کے کہے ہوئے سرسید کی تقریر لفظ بہ لفظ اپنے قلم سے لکھ دی۔ جب سرسید جلسے سے واپس آئے تو لوگوں نے کہا یہ آپ کی تقریر اخباروں میں چھپنی چاہیے، چونکہ مسلمان آپ کی رائے جاننے کے منتظر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سرسید نے فرمایا کہ میں اپنی تقریر کا خلاصہ تو لکھوا سکتا ہوں لیکن پوری تقریر لفظ بہ لفظ میں نہیں لکھوا سکتا کیونکہ میرے پاس نہ لکھی ہوئی تقریر تھی اور نہ تقریر کے نوٹس تھے۔ جو کچھ اس وقت میری سمجھ میں آیا میں نے کہہ دیا۔ خیالات میرے دماغ میں ہیں لیکن جو الفاظ میری زبان سے نکلے ان سب کا دہرانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

سر قاضی عزیز الدین صاحب مرحوم بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر سرسید سے کہا کہ آپ کی تقریر لفظ بہ لفظ میں نے لکھ لی ہے اور میری جیب میں ہے۔ انھوں نے تقریر جیب سے نکال کر سرسید کو سنائی۔ سرسید نے نہایت مسرت ظاہر کی اور قاضی جی سے فرمایا کہ تم نے میری تقریر زندہ کردی (یہ روایت قاضی جی کی زبانی سنی تھی) قاضی جی صاحب بڑے ملنسار اور مہمان نواز آدمی تھے۔ انھوں نے کم وبیش اسی سال کی عمر پائی اور آخری دو سال میں تمام کاموں سے کنارہ کش ہو کر اپنے موروثی قصبے بسوان ضلع سیتاپور میں رہے اور وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔

اس سلسلۂ ہندی اردو تحریک کی چند باتیں آئندہ واقفیت کے لیے سپرد قلم کی جاتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ جب نواب لطف علی خاں کے استعفیٰ کے بعد قاضی عزیز الدین نے رسالہ لکھا تو چاروں طرف سے نواب محسن الملک سے تقاضا ہونا شروع ہوا کہ کالج کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ اس ہندی اردو کی تحریک سے علاحدہ ہو جائیں۔ نواب صاحب نے ہم لوگوں سے مشورہ کیا تو آفتاب احمد خاں مرحوم تو دوسروں کی رائے کے حامی ہو گئے اور نواب صاحب سے کہا کہ ضرور آپ کمیٹی کی سکریٹری شپ چھوڑ دیجیے۔ میں نے یہ کہا کہ لکھنؤ کی تقریر کے بعد کمیٹی کی سکریٹری شپ چھوڑنا اپنے نام پر ایک دائمی دھبہ لینا ہوگا۔ کالج کی سکریٹری شپ اگر آپ چھوڑ دیں تو فقط ایک ادارے کو نقصان کا اندیشہ ہوگا لیکن ایک بڑی قومی تحریک سے کنارہ کشی کل قوم کے لیے صدمہ کا باعث ہوگی لیکن نواب صاحب نے آخر کو یہی فیصلہ کر لیا کہ مجھ کو اردو کی کمیٹی سے علاحدہ ہو جانا چاہیے۔ نواب صاحب کا کمیٹی سے الگ ہونا تھا کہ تحریک اس کے

ساتھ ہی مر کے دفن ہو گئی۔

یہاں سے اس کا دفتر لکھنؤ بھیجا گیا۔ لکھنؤ میں احباب چند ماہ یا چند سال تک ہاتھ پاؤں پیٹتے رہے اور اخبارات میں مضامین لکھتے رہے لیکن کل محنت رائیگاں گئی اور مسلمانوں کا جوش دودھ کا اُبال ثابت ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ نواب محسن الملک گرمیوں کی تعطیل میں جا کر بمبئی میں سمندر کے کنارے ہوٹل میں رہتے تھے کیونکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ سمندر کی آب و ہوا مجھے موافق ہے۔ ان دنوں میں بھی بمبئی جایا کرتا تھا اور واٹسن ہوٹل میں ٹھہرا کرتا تھا۔

نئے پرنسپل کا تقرر

مسٹر بیک آنجہانی نے 1900 میں وفات پائی۔ اس کے بعد سر تھیوڈور ماریسن پرنسپل ہوئے اور چار سال تک پرنسپل رہے۔ غالباً 1904 میں سر تھیوڈور ماریسن پرنسپل کے عہدہ سے سبکدوش ہو کر ولایت چلے گئے۔ جب وہ پرنسپلی سے علاحدہ ہوئے تو اس بات کی فکر ہوئی کہ اب کس کو پرنسپل بنایا جائے۔ ان دنوں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم ولایت میں تعلیم کی غرض سے موجود تھے وہاں پر اور بھی متعدد انگریز ایم۔ اے۔ او کالج کے ہمدرد موجود تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اور انگریز دوستوں کو لکھا گیا کہ ہمارے کالج کے پرنسپلی کے لیے کسی قابل انگریز کو تجویز کیجیے اور ہم کو نام و پتہ لکھیے کہ ہم مقرر کریں۔

مسٹر آرچی بولڈ

چنانچہ انگریز دوستوں اور ڈاکٹر ضیاء الدین نے کسی بڑی یونیورسٹی کے ایک ڈین کو جس کا نام مسٹر آرچی بولڈ تھا ایم اے او کالج کی پرنسپلی کے لیے تجویز کیا اور ان کی تجویز کے مطابق ٹرسٹیوں نے مسٹر آرچی بولڈ کو پرنسپل مقرر کر دیا۔ 1905 کی گرمیوں میں جب نواب صاحب بمبئی میں تھے اور میں بھی بمبئی میں موجود تھا۔ تو مسٹر آرچی بولڈ کا جہاز بندرگاہ پر پہنچا۔ نواب صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ جا کر ان کو اُتار کر لانا چاہیے۔ چنانچہ مولوی رفیع الدین صاحب لندنی کو اپنے ہمراہ لے کر میں بندرگاہ پر گیا اور جا کر مسٹر اور مسز آرچی بولڈ کو اتار کر نواب صاحب کے پاس لایا۔ مسٹر آرچی بولڈ تو چند روز بمبئی میں رہ کر علی گڑھ چلے آئے۔ کچھ دنوں کے بعد میں بھی چلا آیا۔ لیکن نواب صاحب مرحوم کچھ ہفتہ بعد آئے۔

فیضی خاندان

1905 میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ علی گڑھ میں ہوا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سب سے پہلا جلسہ عورتوں کی کانفرنس کا بھی کر دیا۔ میں جب بمبئی گیا تھا تو فیضی خاندان کی خواتین مس زہرہ فیضی اور مس عطیہ فیضی اور جسٹس بدرالدین صاحب کی صاحبزادیوں سے ملا تھا اور ان کو دعوت دی تھی کہ اگر وہ علی گڑھ آئیں تو ہم عورتوں کا ایک بڑا جلسہ وہاں کریں۔ ان بی بیوں نے مہربانی سے دعوت قبول کی اور کہا کہ اگر آپ جلسہ کریں گے تو ہم ضرور شریک ہوں گے۔

چنانچہ میں نے اس جلسہ کا بڑا اہتمام کیا اور جلسے کے ساتھ ہی عورتوں کی مصنوعات دستکاری نقاشی وغیرہ کی نمائش کا بھی ایک بہت بڑے پیمانے پر اہتمام کیا۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں عورتوں کا کوئی جلسہ کرنا یا ان کی مصنوعات کی نمائش کرنا دشوار تھا۔

نواب محسن الملک مرحوم سے استدعا کی گئی کہ وہ ایک پرانا مکان جس کو سرسید مرحوم و مغفور نے سائنٹیفک سوسائٹی کے نام سے 1865 میں تعمیر کرایا تھا جبکہ وہ علی گڑھ میں صدر اعلیٰ تھے، وہ مکان جلسہ اور نمائش کے لیے دے دیں۔ نواب صاحب مرحوم نے مکان کے استعمال کی اجازت دے دی لیکن بعد میں نواب صاحب پر لوکل مسلمانوں نے زور ڈالا کہ کالج کا کوئی مکان عورتوں کے کسی جلسے یا نمائش کے لیے شیخ عبداللہ کو نہ دیا جائے کیونکہ یہ ایک سخت بدعت ہے اور ہمارے قومی محسوسات کو اس قسم کی کارروائیوں سے صدمہ پہنچتا ہے (اس واقعہ کے حالات میں نے مختصر طور پر عبداللہ بیگم کی سوانح عمری میں بھی لکھے ہیں لیکن اس میں بہت اختصار کر دیا ہے) جب میں نواب محسن الملک سے ملا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ لوگ مخالفت کر رہے ہیں کہ سوسائٹی کا مکان آپ کو نہ دیا جائے۔ مجھ کو سخت مجبوری پیش آ گئی ہے کہ ادھر تو آپ کو زبان دے دی تھی کہ آپ اس مکان میں جلسہ کیجیے اور ادھر مجھ پر مخالفت کی یورش ہے کہ میں اس مکان میں عورتوں کا جلسہ نہ ہونے دوں۔ اس جلسہ میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے اور نمائش کا تمام سامان جمع ہو گیا تھا۔ نواب محسن الملک کی مجبوری دیکھ کر مجھے ترس آیا کہ ان بزرگ کو لوگ اس طور پر ستاتے ہیں اور مجبور کرتے ہیں کہ وہ عورتوں کا کسی قسم کا الحاق اس کالج سے نہ ہونے دیں۔ مجھے نہایت سخت تکلیف ہوئی اور ظاہراً کوئی مکان دکھائی نہ دیتا تھا جس میں جلسہ کیا جائے اور نہ توقع تھی کہ شہر میں

کوئی مسلمان اپنا مکان عورتوں کے جلسے کے لیے مستعار دے گا۔ عبداللہ بیگم مرحومہ اور ان کی ہمشیر گان نے سوسائٹی کے مکان کو اچھی طرح سے صاف کر دیا تھا لیکن ابھی تک چیزیں قرینہ سے نہیں لگائی تھیں۔ میں نے جا کر عبداللہ بیگم سے شام کے وقت ذکر کیا کہ نواب محسن الملک نے سوسائٹی کے مکان میں زنانہ جلسہ منعقد کرنے کی ممانعت کر دی ہے۔ ان کو اور ان کی ہمشیر گان کو یہ سُن کر بہت صدمہ ہوا اور مجھ کو مشورہ دیا گیا کہ میں اب جلسہ نہ کروں اور بمبئی سے جو بی بیاں آنے والی ہیں ان کو تار سے منع کر دوں کہ وہ نہ آئیں۔ لیکن بمبئی کی محترمات نے اس روز مجھ کو تار دے دیا تھا کہ ہم لوگ بمبئی سے روانہ ہو گئے ہیں۔ میں نے عبداللہ بیگم اور ان کی ہمشیر گان سے کہا کہ اب جلسے کے روکنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں خدا کوئی سامان پیدا کر دے گا۔ ان سے یہ کہہ کر سر شام ہی سے سو گیا کیونکہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔

صبح اٹھ کر میں مکان کی تلاش میں نکلا لیکن کسی شخص نے مکان دینے کی حامی نہ بھری مگر ایک پارسی دوست جو علی گڑھ میں تجارت کرتے تھے اور ان دنوں سیٹھ شاہ پور جی علی گڑھ کے بڑے پارسی تجار کی کوٹھی ان کے قبضہ میں تھی کیونکہ شاہ پور جی کا دیوالہ نکل گیا تھا اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ اپنا مال اور مکان فروخت کر کے لوگوں کا قرضہ ادا کر دیں اور وہ مکان اس وقت دوسرے پارسی دکاندار کے قبضے میں تھا۔ میں نے ان سے اپنی ضرورت اور حالات بیان کیے اور کہا کہ اگر شاہ پور جی والی کوٹھی چند روز کے لیے کرایہ پر یا مستعار آپ دے دیں تو ہماری اس وقت کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ انھوں نے مہربانی سے مکان دے دیا۔ میں گھر پہنچا۔ عبداللہ بیگم اور ان کی ہمشیر گان یہ خوش خبری سن کر بہت خوش ہوئیں اور اسی وقت آ کر مکان پر قبضہ کیا اور اس میں سفیدی کرائی اور سامان فرش فروش وغیرہ جو کافی جمع ہو گئے تھے ان کو قرینے سے لگانا شروع کیا۔ نمائش کا جو سامان تھا وہ کالج کے نظام میوزیم میں جمع ہو رہا تھا۔ طالب علموں اور دوستوں نے اس کو وہیں ترتیب سے لگانا شروع کیا۔ بہت سی الماریاں اور میزیں سامان سے بالکل بھر گئیں اور نمائش دیکھنے کے قابل ہو گئی۔ اس نمائش کی کامیابی کے لیے میں اپنے بعض نوجوان دوستوں کا اب تک ممنون ہوں جنھوں نے اس میں مدد دی تھی۔ ان میں مولوی احتشام علی صاحب اور مسٹر عبدالرحمٰن صاحب صدیقی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس نمائش اور جلسے کے لیے میرے پاس بہت ہی کم روپیہ تھا لیکن

کانفرنس کی کمیٹی منتظمہ نے ایک رقم عطا کی جس کی وجہ سے کام میں سہولت ہوئی۔ خدا کا شکر کیا کہ
ممبئی سے آنے والی بی بیوں کے پہنچنے سے قبل بہت کچھ انتظام ہو گیا اور ان کو اسی شاہ پور جی کی کوٹھی
میں ٹھہرایا گیا۔ عطیہ بی بی نے نمائش کی اشیا کی ترتیب میں بہت مدد دی جس کی وجہ سے نمائش
فی الواقع قابل دید ہو گئی اور نمائش کے لیے چین سے برما سے بصرہ اور بغداد سے اور افغانستان و
کشمیر سے بہت سے نمونے آئے تھے۔ ہندوستان سے تقریباً دو ڈھائی ہزار کی تعداد میں بہت
اچھے اچھے نمونے آئے۔ مکان میں گنجائش بہت کم تھی لیکن جیسے بھی ہو سکا چیزیں چاروں طرف
دیواروں پر میزوں اور الماریوں میں لگا دی گئیں۔ اس سال خصوصیت سے کانفرنس میں ایک بڑی
تعداد مسلمانوں کی شریک ہوئی۔ اتنی بڑی تعداد میں نے کبھی علی گڑھ میں نہیں دیکھی تھی اور وجہ یہ تھی
کہ رسالہ خاتون کے ذریعہ سے میں نے زنانہ کانفرنس اور نمائش کی بہت اشاعت کی تھی اور کسی
سال اتنی اشاعت نہیں ہوا کرتی تھی۔

جلسے میں بہت سے مقامات کی مستورات آ کر شریک ہوئیں۔ یو پی کے قریب قریب
ہر شہر سے دو دو چار چار بی بیاں آئیں۔ دہلی، لاہور اور امرتسر سے بہت زیادہ تعداد میں
آئیں۔ ان کے ٹھہرنے کا کوئی معقول انتظام نہ ہو سکا لیکن وہ اپنے مردوں کے ساتھ آئی تھیں
اس لیے جہاں مردوں کے قیام کا دوستوں کے مکانات پر انتظام ہوا وہیں ان کے ٹھہرنے کا بھی
انتظام ہو گیا۔ ایک روز شہر کی مستورات کے لیے نظام میوزیم کے چاروں طرف پردہ کر دیا گیا
کہ وہ آ کر نمائش دیکھ لیں۔ اس روز دن بھر عورتوں کے آنے جانے کا تانتا بندھا رہا۔ باہر کے
آنے والے مردوں نے نمائش دیکھی اور اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہماری عورتیں
صنعت اور کاری گری کے فن میں کسی دوسری قوم کی عورتوں سے کم نہیں ہیں۔ میں نہ کسی کی
تعریف سے خوش ہوا اور نہ کسی کی نکتہ چینی سے ناخوش ہوا۔ تعریف تھی تو وہ منہ دیکھے کی تھی اس کو تو
میں نے تحسین ناشناس سمجھ کر سن لیا اور نکتہ چینی کرنے والوں کی باتیں سن کر ہنستا رہا کہ یہ کیسے
جاہل لوگ ہیں کہ ایک طرف تو عورتوں کی مصنوعات کی نمائش بھی پردہ دری میں شامل ہے اور
دوسری طرف فرماتے ہیں کہ اگر ہم سے کہا جاتا تو ہم اس سے دو چند اچھی چیزیں لا کر جمع کر
دیتے۔ یہ ان کی جہالت کی بات تھی اور نکتہ چینی مقصد تھا نہ وہ چیزیں جمع کر سکتے تھے۔ اُس زمانہ

کے مسلمان آج کل کے مسلمانوں سے ذرا مختلف تھے ان میں جہل ہی جہل تھا لیکن جہل مرکب نہیں تھا لیکن آج کل کے مسلمانوں میں جہل مرکب بہت ہے۔ اس زمانے کے مسلمان جو بات کہتے تھے اس میں جہالت تو ضرور ہوتی تھی لیکن شرارت نہیں ہوتی تھی۔ آج کل کے مسلمانوں میں ایک بڑی قباحت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ جو بات وہ نہیں جانتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اور ہر بات میں شرارت اور اذیت رسائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ شاہ پور جی کی کوٹھی میں دو روز تک برابر عورتوں کے جلسے ہوئے اور میں نے سنا کہ بہت اچھی اچھی تقریریں ہوئیں اور لڑکیوں کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا کیونکہ وہ جلسہ کئی کئی پردوں میں ہوا تھا۔ دوہری دوہری قناتیں چاروں طرف کھڑی کی گئی تھیں کہ چشم فلک بھی جھانک کر کسی بی بی کو نہ دیکھ لے۔ ادھر مردانہ کانفرنس میں جلسے ہوئے اور بڑی بڑی تقریریں ہوئیں۔ میں ہر سال گذشتہ دو تین سال سے ایک مقررہ وقت تعلیم نسواں کے مقاصد کی اشاعت کے لیے کانفرنس سے لے لیا کرتا تھا اور اس میں بہت زیادہ لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔ 29 ردسمبر کی شب کا اجلاس میرے صیغہ کی کانفرنس کے لیے مخصوص ہوگیا تھا۔

خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ

اس سال خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ اس کانفرنس کی صدارت فرما رہے تھے۔ میرے جلسے میں بھی انھوں نے خود ہی کرسیِ صدارت کو رونق بخشی۔ میں نے لڑکیوں کی تعلیم کے مقاصد پر تقریر کی اور جو کام اس وقت تک کیا تھا اس کی رپورٹ پڑھی۔ رپورٹ اور تقریر کے بعد خلیفہ صاحب مرحوم مغفور نے ایک پُر زور تقریر فرمائی اور فرمایا کہ ہمارے نوجوان دوست شیخ عبداللہ کا کام قابل تحسین ہے۔ امید ہے کہ سب لوگ کھڑے ہو کر ان کا شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ ہزار بارہ سو حاضرین جو اسٹریچی ہال میں موجود تھے وہ سب کھڑے ہوگئے۔

مصطفےٰ حسین خبنا

یہ شکریہ اور اس درجہ گرم جوشی سے میرے کام کا اعتراف بعض اولڈ بوائز کو سخت ناگوار گزرا۔ ان اولڈ بوائز میں سے مصطفےٰ حسین خبنا نے ایک تقریر کی اور اس میں یہ عذر پیش کیا کہ شیخ عبداللہ صاحب سرسید میموریل فنڈ کے سکریٹری ہیں ان کو اپنا پورا وقت فنڈ کی فراہمی میں صرف کرنا

چاہیے، وہ ادھر اُدھر فضول اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں جس سے کچھ نفع نہیں ہوگا۔

نواب محسن الملک مرحوم ادھر کھڑے ہوئے اور مصطفےٰ حسین کے اعتراضات کی تردید فرمائی اور کہا کہ سرسید میموریل فنڈ کا میں صدر ہوں اور شیخ عبداللہ سکریٹری ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ فنڈ کی فراہمی کے لیے کس قدر کوشش کر رہے ہیں اور ان کا کام نہایت قابل اطمینان ہے اور مصطفےٰ حسین صاحب کا یہ اعتراض غلط ہے کہ وہ سرسید میموریل فنڈ کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ مولانا شوکت علی صاحب مرحوم نے جو سب سے زیادہ میرے مخالف تھے جنھوں نے مصطفےٰ حسین صاحب کو میری مخالفت کے لیے کھڑا کیا تھا اور اب اس قدر میری تعریف ان کی برداشت سے باہر ہوگئی تھی خود کھڑے ہو کر کہا کہ لڑکیوں کی تعلیم دینے کا خیال تو میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ شیخ عبداللہ اس خیال کو لے اڑے اور اپنی تعریف کرانے کے لیے جلسے کراتے ہیں اور نمائش کراتے ہیں۔ یہ کام جو کچھ ہو رہا ہے اس کو میرا کام سمجھنا چاہیے اور جو کچھ تعریف ہو اس کا میں مستحق ہوں۔ لوگوں نے یہ سن کر ایک قہقہ لگایا کیونکہ کالج کے طلبا، اولڈ بوائز ان کے اوصاف سے اور ان کی باتوں سے بخوبی واقف تھے۔ ہر شخص نے بعد میں کہا کہ شوکت علی صاحب حسد کی آگ میں جل بھن کر راکھ ہو گئے۔

(نوٹ) مصطفےٰ حسین کو میں نے خبنا کے لفظ سے یاد کیا ہے یہ لفظ طالب علموں نے اختراع کیا تھا اور چار الفاظ سے یہ لفظ بنا کر کل ان کی خوبیاں اس ایک فقرے میں جمع کر دی تھیں (خ) سے مطلب تھا کہ وہ خبطی ہیں (ب) سے مطلب تھا کہ وہ بیہودہ یا بے وقوف ہیں (ن) سے مطلب تھا کہ وہ نالائق ہیں اور (الف) سے مطلب تھا احمق۔ یہ لفظ اس قدر ان پر چسپاں ہوا اور اس قدر مقبول ہوا کہ لوگ مصطفےٰ حسین کا نام ہی بھول گئے اور وہ صرف خبنا ہی رہ گئے۔

تعلیم کے بعد نواب محسن الملک کی سفارش سے وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے لیکن رہے خبنا کے خبنا۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی تھی تو خود ہی فرماتے تھے کہ خبنا اب تک اپنی کالج کی زندگی کو نہیں بھولا ہے۔ دوستوں کا دیا ہوا خطاب سر آنکھوں پر ہے۔

مولانا شوکت علی صاحب کے حملے کا ذکر

دوسرے روز یعنی 30 ر دسمبر کو شام کے اجلاس کے بعد کانفرنس ختم ہونے والی تھی۔

تیسرے پہر کو ایک جلسہ ہوا اس میں بہت سی تقریریں ہوئیں اور قریب تین چار بجے کے جلسہ ختم ہوا۔ سب لوگ اسٹریچی ہال سے باہر نکل آئے۔ معلوم ہوا کہ شوکت علی صاحب میری تاک میں کھڑے ہوئے تھے کہ وہ صفیں چیرتے ہوئے یکا یک میرے پاس پہنچ گئے اور پیچھے سے میرے کندھے پر ایک مکا مار کر کہا کہ تم بلا کسی کام کرنے کی قابلیت کے ایک ڈھونگ بنا رہے ہو اور لوگوں سے اپنی تعریف کرا رہے ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم کو ایسی مار دوں کہ تم ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔ انھوں نے دوسرا مکا مارنے کو اٹھایا ہی تھا کہ لوگوں نے جو آس پاس کھڑے تھے بیچ بچاؤ کیا۔ میں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن حاضرین میں ایک تہلکہ مچ گیا اور سب نے کہا کہ جب اس قسم کا شہدہ پن یہاں ہو رہا ہے تو ہم کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گے۔ بہت سے لوگوں نے شام کے جلسے کا بھی انتظار نہیں کیا اور روانہ ہو گئے اور شام کا جلسہ ہونا بھی موقوف ہو گیا۔ تمام ٹرسٹی حضرات نواب سر فیاض علی خاں کی کوٹھی پر جمع ہوئے اور یہ طے ہوا کہ شوکت علی صاحب نے اس قدر نالائق حرکت کی ہے، اگر اس کی طرف توجہ نہ کی گئی تو کالج کی اور ٹرسٹیوں کی سخت تحقیر و رسوائی ہو گی۔ اس وقت میں اور شوکت علی مرحوم ٹرسٹیوں کی جماعت کے ممبر تھے اور دونوں جلسہ میں موجود تھے۔ ٹرسٹیوں نے فیصلہ کیا کہ شوکت علی صاحب کو ٹرسٹی شپ سے علاحدہ کیا جائے۔ چنانچہ اولڈ بوائز نے اسٹریچی ہال میں ایک جلسہ کیا اور باوجود مولانا محمد علی برادر مولانا شوکت علی کی آہ و زاری کے کہ مولانا شوکت علی کو سزا نہ دی جائے اولڈ بوائز نے یہی طے کیا کہ اس واقع کے بعد ان کو ٹرسٹی شپ سے علاحدہ کر دینا چاہیے۔ شاید اولڈ بوائز نے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر وہ ٹرسٹی شپ سے علاحدہ نہ ہوں گے تو ان کو اولڈ بوائز کی جماعت سے بھی خارج کر دیا جائے گا۔

میں اور مولانا شوکت علی دونوں اولڈ بوائز کی جماعت کے ممبر تھے۔ مولانا شوکت علی صاحب نے ٹرسٹیوں کی جماعت سے علاحدہ ہونا پسند کیا جیسا کہ ٹرسٹیوں نے طے کیا تھا اور میرے دوستوں اور مولانا شوکت علی کے دوستوں میں باہمی ایک تنازعہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ میرے دوستوں میں سب سے زیادہ گرم جوشی سے جنھوں نے حصہ لیا اور تقریریں کیں ان میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کا زبردست حصہ تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی میرے دوست مولانا شوکت علی کے خلاف ہو گئے۔ ٹرسٹیوں کے جلسے میں بجز سر علی امام کے باقی سب لوگ اس

رائے پر متفق ہو گئے کہ شوکت علی کو ٹرسٹیوں کی جماعت سے نکال دیا جائے۔ مولانا شوکت علیؔ صاحب مرحوم کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا ذکر دوسرے موقعوں پر کیا جائے گا۔ یہاں پر تو صرف مذکورہ بالا واقعہ اور اس کے نتیجہ کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

رنگون کا ڈیپوٹیشن

مجھ کو سال تو ٹھیک یاد نہیں ہے لیکن یہ واقعہ یاد ہے کہ نواب محسن الملک مرحوم اس تحریک کے متعلق رنگون تشریف لے گئے تھے اور رنگون جانے کی تجویز اس راقم نے کی تھی۔ اس تحریک کے متعلق ایک اہم واقعہ قابل ذکر ہے کہ مولوی انوار احمد صاحب ایجنٹ کو میں نے چندہ جمع کرنے کی غرض سے کولکتا بھیجا تھا۔ مولوی صاحب مرحوم کولکتا میں چندہ جمع کر رہے تھے کہ علی گڑھ سے ڈیوٹی سوسائٹی کا چندہ جمع کرنے کچھ لڑکے پہنچے۔ انھوں نے جا کر مولوی انوار احمد صاحب سے کچھ اکھاڑ پچھاڑ لگائی اور کہا کہ آپ چندہ جمع کرنا بند کر دیجیے کیونکہ علی گڑھ کی دو تحریکوں کے لیے ایک ساتھ چندہ جمع کرنے میں نہ آپ کو کچھ نفع ہوگا نہ ہم کو۔ انوار احمد صاحب نے ہمیں تار کے ذریعہ سے اس واقعہ کی اطلاع دی اور کہا کہ میں پہلے سے چندہ جمع کر رہا تھا اور مجھے چندے کی امید تھی اور ہے۔ طالب علم جو بعد میں یہاں آئے ان کو کام بند کرنا چاہیے نہ کہ مجھ کو۔ ادھر طالب علموں نے نواب محسن الملک کو تار دیا کہ انوار احمد صاحب کو منع کیا جائے کہ ہماری موجودگی میں چندہ جمع نہ کریں۔

نواب محسن الملک صاحب نے راجہ امیر حسن صاحب رئیس کولکتا کو لکھا کہ آپ طے کر دیجیے کہ کون چندہ جمع کرے؟ میں نے نواب صاحب سے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ راجہ صاحب کا فیصلہ طالب علموں کے حق میں ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب راجہ صاحب کا علی گڑھ تار آ گیا کہ طالب علم ہی چندہ جمع کریں مولوی انوار احمد صاحب نہ کریں تو میں نے انوار احمد کو لکھا کہ تم کولکتا چھوڑ کر رنگون چلے جاؤ۔ میں تین سو روپے خرچ کے لیے اپنے پاس سے تم کو بھیجتا ہوں۔ اگر تم کو رنگون میں کامیابی ہوئی تو میں اپنا روپیہ واپس لے لوں گا ورنہ فنڈ کے روپے پر اس نقصان کا بار نہیں پڑے گا۔ میں اپنی ذات سے اس کا ذمہ دار ہوں گا۔ چنانچہ مولوی انوار احمد صاحب رنگون چلے گئے۔ وہاں کے سب لوگوں نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور انھوں نے لکھا کہ اگر نواب محسن الملک

آجائیں تو یہاں فراہمی چندہ میں بہت کامیابی کی امید ہوگی۔ نواب محسن الملک اس وقت ممبئی میں تھے۔ میں نے نہایت زور اور اصرار سے نواب صاحب کو لکھا کہ آپ رنگون ضرور جائیے۔ نواب صاحب نے منظور فرمایا اور مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر اخبار "البشیر" اور سید شاہ سلیمان صاحب ساکن پھلواری شریف کو اپنے ہمراہ لے کر رنگون پہنچے۔ وہاں پر ان کی بہت خاطر داری ہوئی۔ چندہ بھی جمع ہوا اور سو روپیہ ماہوار کی ایک رقم جمال برادرس نے دی اور نقد چندہ کی رقم کی تعداد چالیس ہزار روپے ہوئی۔ لیکن سب سے زیادہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے تجارت پیشہ مسلمان جو اس دور دراز ملک یعنی برما میں رہتے تھے ان کے دلوں میں علی گڑھ کی تحریک کا بہت بڑا احساس ہوا اور وہ یہ سمجھے کہ مسلمانوں میں بھی ایک جگہ ایسی ہے جہاں پر کل قوم کی فلاح و بہبودی کے لیے کوشش ہو رہی ہے۔

ممبئی کے جلسہ کا ذکر جہاں عورتیں بھی شریک ہوئیں

1903 میں ممبئی میں کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اس جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ نواب محسن الملک اکیلے رہ گئے۔ میں سرسید میموریل فنڈ کی تحریک کی وجہ سے ممبئی گیا۔ بعد میں سر ٹامس آرنلڈ اور شیخ عبدالقادر صاحب بھی پہنچ گئے۔ اور مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر "البشیر" بھی تھے اور مولوی محبوب عالم صاحب اور مولوی ممتاز علی صاحب بھی لاہور سے بمبئی پہنچ گئے۔ لیکن باوجود ان صاحبان کے آنے کے بھی پنجاب اور یو۔ پی کے مسلمانوں کی نیابت کے لیے اس کانفرنس کے جلسے میں زیادہ تعداد نہیں تھی۔

اس جلسے میں ایک سخت وقت پیش آئی کہ جسٹس بدر الدین طیّب جی جو کہ ممبئی ہائی کورٹ کے جج تھے اور مسٹر حیدری جو کہ بعد میں سر اکبر حیدری کے نام سے مشہور ہوئے اور کئی سال تک ریاست حیدر آباد میں پرائم منسٹری کا کام کیا، یہ دونوں صاحبان مسلم یونیورسٹی کے قیام کے مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں علاحدہ کوئی یونیورسٹی نہیں بنانی چاہیے۔ یہ دونوں صاحبان کانگریس کے بڑے رکن تھے۔ ان دونوں صاحبان نے کہہ دیا کہ اس کانفرنس کے جلسے میں مسلم یونیورسٹی کے قائم کرنے کے لیے کوئی ریزولیوشن پاس نہیں ہونا چاہیے۔

نواب محسن الملک صاحب نے فرمایا کہ پھر کانفرنس کا جلسہ کرنا ہی فضول ہے۔ یونیورسٹی

قائم کرنا ہی ہماری تعلیمی تحریک کی روح ہے۔ اگر آپ اس ریزولیوشن کے مخالف ہیں تو ہم جلسہ نہیں کریں گے۔ ایک دن تک پوری کشمکش رہی۔ نواب صاحب مرحوم بہت ہی برہم تھے۔ وہاں پر سر برآوردہ آدمیوں میں ایک قاضی مرگھے تھا اور دوسرے صاحب کا نام سیٹھ لونڈے تھا۔ نواب صاحب نے ایک پرائیویٹ مشورہ کی میٹنگ میں طیش میں آ کر اپنی ترکی ٹوپی سر سے اتار کر دور پھینک دی اور سخت غصے میں چلا کر کہا کہ مجھ کو کہاں ان مرگھوں اور لونڈوں میں لا کر پھانسا ہے۔ نہ کوئی بات ان کی سمجھ میں آتی ہے اور نہ قومی مفاد کے لیے کچھ کرنے کو تیار ہیں۔

اس کے بعد بدرالدین طیب جی اور اکبر حیدری صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کانفرنس کا جلسہ ملتوی کرنے کا خیال کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہماری سخت بدنامی ہوگی۔ اس لیے ہم کو یونیورسٹی کے ریزولیوشن کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔ اور انھوں نے کہہ دیا کہ آپ یونیورسٹی کا ریزولیوشن جلسہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مجھ کو حکم دیا کہ تم یہ ریزولیوشن پیش کرو۔ چنانچہ دوسرے روز میں نے ریزولیوشن پیش کیا جو کانفرنس کی رپورٹ میں درج ہے۔ اور اس ریزولیوشن کی تائید مسٹر ٹامس آرنلڈ اور شیخ عبدالقادر صاحب نے کی۔ اس جلسے میں سب سے اوّل مرتبہ چلمنوں کے پیچھے بیٹھ کر عورتوں کو کانفرنس کی کارروائی دیکھنے اور سننے کی اجازت ملی اور کچھ تھوڑا سا چندہ عورتوں کی مصنوعات کی نمائش کے لیے بھی جمع ہوا جو 1905 کی علی گڑھ کانفرنس کے جلسے کے موقع پر مصنوعات کی نمائش پر صرف ہوا۔ وہ زمانہ عجیب وغریب تھا کہ شمالی ہند کے بعض مسلمانوں کو یہ بات بھی ناگوار تھی کہ عورتیں چلمنوں کے پیچھے بیٹھ کر جلسہ کی تقریریں سنیں۔ چنانچہ مولانا بشیر الدین صاحب ایڈیٹر ''البشیر'' نے اپنے اخبار میں عورتوں کے اس طور پر شریک ہونے پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں دیکھ رہا تھا، عورتیں چلمنوں میں سے جھانک رہی تھیں اور مجھے ان کی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔

میں نے جواب دیا کہ آپ شرع کی احکام کو اچھی طرح دیکھ لیجیے کہ آپ اس معاملے میں ملزم ٹھہرتے ہیں یا عورتیں؟ سب سے اوّل یہ بات ہے کہ میں بھی اس جلسے میں بیٹھا تھا لیکن میں ٹکٹکی باندھے چلمنوں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ آپ کو کیا حق تھا کہ آپ اپنی آنکھیں اوپر ہی لگائے رکھیں۔ دوسرے یہ بات ہے کہ شرع کا حکم ہے کہ جب عورت تمھارے سامنے آ جائے تو تم اپنی آنکھیں نیچی کر لو اور بجائے اس کے کہ آپ اپنی آنکھ نیچی کر لیتے، آپ گھور گھور کر عورتوں کی

چلمنوں میں سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھا کیے۔ بہر حال یہ جلسہ بخیر خوبی ختم ہو گیا اور سر سیدؒ میموریل فنڈ کو بجائے کسی قسم کے نقصان کے تقویت پہنچی۔

اس جلسے میں سب سے اوّل ممبئی کی تعلیم یافتہ خواتین سے تعارف کا اتفاق ہوا۔ ان خواتین میں تین تو جناب جسٹس بدرالدین مرحوم کی بیٹیاں تھیں۔ اور دو فیضی صاحب کی بیٹیاں زہرہ بیگم اور عطیہ بیگم تھیں اور ان کے علاوہ اور دو تین تعلیم یافتہ بیگمات ممبئی کے روشن خیال اور تعلیم یافتہ خاندان کی تھیں۔ اس جلسے میں ہم شمالی ہندوستان کے رہنے والوں کو سب سے اوّل اس بات کا علم اور اندازہ ہوا کہ بمبئی کے متمول تجارت پیشہ مسلمان اقوام میں باہمی سخت تفرقہ اور نفاق ہے۔ بمبئی میں سب سے زیادہ تعداد میمن فرقے کی ہے۔ یہ لوگ کاٹھیاواڑ اور کچھ کے رہنے والے ہیں اور اب تجارت کی وجہ سے کل ہندوستان کے مختلف مقامات اور ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی مقیم ہو گئے ہیں۔ اور کاروبار تجارت بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے پکے سنی ہیں اور شیعوں سے ان کا کوئی لگاؤ اور تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں کے آباواجداد تجارت پیشہ ہندو تھے جنھوں نے کسی وقت میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ سنی جماعت کے مسلمانوں سے اپنے تعلقات دوستانہ قائم رکھتے ہیں اور دوسرے مقامات پر جب جاتے ہیں تو سنّی مسلمانوں ہی سے ان کا میل جول رہتا ہے۔

دوسرا تجارت پیشہ مسلمانوں کا فرقہ بوہروں کا ہے۔ یہ لوگ بھی جہاں تک معلوم ہوا ہے ہندی النسل ہیں اور کسی وقت میں ان کے مورثوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ شیعہ مذہب کے ہیں لیکن بجائے بارہ اماموں کے ماننے کے صرف چھ اماموں کو مانتے ہیں۔ ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ شیعوں کے بارہ اماموں میں سے ایک امام نے اپنی گدی اپنے ایک بیٹے کو دی تھی۔ لیکن بعض مرید اس کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرا بیٹا امام ہو۔ چنانچہ ان مریدوں نے جو مخالف تھے اسی بیٹے کو اپنا امام بنا لیا جس کو وہ چاہتے تھے اور اب تک اسی کو اپنا امام مان رہے ہیں اور جس بیٹے کو مورث نے گدی دی تھی وہ اثناء عشری اہل شیعہ کے امام ہیں لیکن اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا ہے تو میں یقین رکھتا ہوں کہ اس امام کو جس کو مریدوں نے پہلے اور بڑے امام کی مرضی کے خلاف امام بنا لیا تھا اس کی امامت کا سلسلہ چھ اماموں پر ختم ہو گیا۔ ان لوگوں کے اس زمانہ کے پیشوا جناب مولانا سیف الدین طاہر ہیں جو سورت میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پیر کو

بہت مانتے ہیں اور پیر کی طرف سے جوان پر ٹیکس لگائے جاتے ہیں ان کو خوشی سے قبول کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں۔ مولانا مذکور کی طرف سے ہر مقام پر ایجنٹ رہتے ہیں جو ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مولانا کا ٹیکس مریدوں کی ہر چیز پر عائد ہوتا ہے۔ مثلاً ہر مہینہ کا کھانے پینے کا خرچ لباس اور دیگر ضروری اشیاء زندگی جو خریدی جاتی ہیں ان میں سے ہر چیز پر ٹیکس لیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص جا کر کسی ریسٹورنٹ میں چائے پیئے تو ایک پائی کا ٹیکس لگ جاتا ہے اور اگر مٹھائی بھی کھائے تو اس کی قیمت کے لحاظ سے ٹیکس لگتا ہے۔ مولانا موصوف بڑے دولت مند آدمی ہیں، سورت میں رہتے ہیں اور ان کے رہنے کے بڑے بڑے عالیشان محلات ہیں، ان کے مرید اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر مولانا مرتے وقت ایک پروانہ راہ داری دے دیں اور حضرت جبرئیل فرشتہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں تو مرنے والے کو بہشت میں ایک بڑا مکان رہنے کو مل جاتا ہے اور بعد از موت روح بہت خوش رہتی ہے۔ وہ سفارشی خط ایک گراں بہا معاوضہ لے کر لکھتے ہیں۔ بعض مرید تو اپنی زندگی میں لکھوا لیتے ہیں اور بڑی بڑی رقمیں مولانا کی نذر کر دیتے ہیں اور بعض کے ورثا روپیہ دے کر سفارشی خط لکھواتے ہیں اور وہ خط مردے کے ساتھ قبر میں دفن ہوتا ہے تا کہ فرشتہ کو اس کے دیکھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

مولانا کے مرید اعتقاد رکھتے ہیں کہ دوسری دنیا میں ان کے پیر کا بہت بڑا رسوخ ہے اور ان کی سفارش سے اور ان کی دعا سے گنہگار سے گنہگار مرید بھی اپنے گناہوں کی پاداش سے بچ جاتا ہے۔ بہر حال مولانا اچھے لوگوں میں سے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کو ایک لاکھ روپیہ دیا ہے۔ اور میں جب سورت کانفرنس کے سلسلہ میں گیا تھا تو مجھ کو خلعت دیا تھا اور میری بیٹی ممتاز جہاں بیگم، پرنسپل ویمنس کالج علی گڑھ ولایت جاتے ہوئے بمبئی میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو ان کو بھی خلعت دیا اور وعدہ کیا کہ گرلس کالج کی مدد کریں گے اور روپیہ بھی دیں گے۔ اگر روپیہ دیا تو میں مولانا کے حق میں دعا کروں گا اور نہایت شکر گزاری کا اظہار کروں گا۔

کچھ بوہرے سنی مذہب بھی ہیں اور ان کا الگ کوئی امام نہیں ہے لیکن قبر پرستی و توہمات میں عام مسلمانوں کے ہم خیال ہیں۔ وہ بھی تجارت پیشہ ہیں اور متمول لوگ ہیں۔ تیسری جماعت خوجوں کی ہے۔ ان خوجوں کی جماعت میں ایک بہت بڑی تعداد آغا خانی ہے۔ یہ آغا خانی خوجے

آغا خاں کو امام ہی نہیں مانتے بلکہ خدا مانتے ہیں۔

سر آغا خاں

ہز ہائی نس سر آغا خاں میرے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے بڑے لیڈر مانے گئے ہیں۔ وہ بہت ہی متمول آدمی ہیں اور لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کے متمول اشخاص کی جماعت میں وہ صف اوّل میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ میرے زمانے میں ان کی ایک پچاس سالہ جوبلی ہوئی اور اس میں ان کے مریدوں نے ان کو سونے سے تولا۔ دوسری جوبلی ساٹھ سالہ ہوئی جس میں ان کو ہیروں سے تولا گیا۔ ان کو گھوڑ دوڑ کے گھوڑے پالنے اور ان کو گھوڑ دوڑ میں شریک کرنے کا بہت شوق ہے۔ بڑی بڑی رقمیں دے کر وہ اچھی نسلوں کے گھوڑے خریدتے ہیں اور اکثر ان کے گھوڑوں کو بڑے بڑے انعام بھی ملے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ علی گڑھ میں آئے، ان کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ اس زمانہ میں نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب وائس چانسلر تھے۔ ان کے سامنے یونیورسٹی کے لیے کسی بڑے عطیہ کی اپیل پہلے سے موجود تھی۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب ہماری یونیورسٹی میں اچھے مقررین میں تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہز ہائی نس کی مالی امداد کے ہم ہمیشہ مداح اور شکر گزار رہے ہیں۔ اب اگر ہمیں ایک بڑا عطیہ مل جائے تو ہمارے طالب علم دعا مانگیں گے کہ گھوڑ دوڑ میں آپ کے گھوڑے اوّل رہیں۔ ایک موقع پر کسی کانفرنس کے جلسے میں مولانا شبلی نے فارسی میں ایک قصیدہ پڑھا اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ آپ خوجوں کے تو خدا ہیں اور ہماری قومی کشتی کے ناخدا ہیں۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں نے مسلم یونیورسٹی کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے بڑے خلوص سے کوشش کی اور ایک بیش بہا رقم ان کی کوشش اور توجہ سے وصول ہوئی۔ بہت سی کانفرنس کے جلسوں کی صدارت بھی کی۔ یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن تیار ہوتے وقت وہ بعض ضروری مواقع کے اوپر شریک رہے اور ان کی ہستی اور موجودگی سے مسلمانوں کو بہت تقویت پہنچتی رہی۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں ایک وقت میں مسلمانوں کے لیڈر بھی مانے گئے تھے۔ چنانچہ 1906 میں مسلمانوں کا جو بڑا وفد لارڈ منٹو وائسرائے کے پاس اپنی ایک بڑی عرض داشت لے کر گیا تھا، نواب محسن الملک مرحوم نے کل قوم کی طرف سے سر آغا خاں ہی کو اس وفد کا لیڈر بنایا تھا۔

سر آغا خاں ہندوستان کی اصلاحات کے معاملہ میں بہت دن تک پیش پیش رہے۔ مسلمان جن لیڈروں کی وجہ سے مطمئن رہے کہ ہمارے قومی حقوق زائل نہیں ہوں گے بلکہ ہم کو مل جائیں گے ان میں سب سے بڑے لیڈر ہز ہائی نس سر آغا خاں تھے لیکن من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال کی مثل ہم پر صادق آئی کہ آخر کو مسلمانوں کو ہندوستان کے دونوں سروں پر تقسیم کر کے دو ٹکڑے دے دیے گئے اور باقی قریب چار کروڑ مسلمانون کو بڑی سخت پولیٹکل مصائب میں مبتلا ہونا پڑا۔ یہ بات تو سر سید، محسن الملک اور سر محمد شفیع و دیگر اس زمانے کے لیڈروں کے خیال میں بھی نہ تھی کہ آگے چل کر ایسا ہوگا۔

لیکن خیر جو کچھ ہز ہائنس سر آغا خاں کی ذات سے مسلمانوں کو اپنی تعلیم میں یا سیاسی جدوجہد میں یا اپنا قومی اقتدار قائم رکھنے میں مستقل یا عارضی نفع پہنچا اس کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ خوجوں کی آغا خانی جماعت کو ہم مسلمان نہیں کہہ سکتے۔ خود سر آغا خاں کا کراچی کی کسی عدالت میں بیان ہوا تھا جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ تم مسلمان ہو یا نہیں تو انھوں نے فرمایا تھا کہ میں اس قسم کا مسلمان نہیں ہوں کہ جیسے دوسرے لوگ مسلمان ہیں لیکن آغا خانی خوجے سب ہز ہائی نس آغا خاں کو خدا مانتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیسے سمجھے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ایک خدا پر جس کا کوئی شریک نہیں ہے ایمان لاؤ اور کلمہ میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ خدا کو واحد لاشریک مانو، اب جبکہ ایک انسان کو خدا مانا جائے گا تو پھر پہلی ایمان کی شرط کی خلاف ورزی ہوگی اور جو شخص آغا خاں کو خدا مانے وہ قرآنی تعریف کے مطابق مسلمان نہیں ہو سکتا۔ سر آغا خاں کی نسبت ان کے ایک سابق مرید سونا والے جو بمبئی میں سونے کی تجارت کرتا ہے، راقم سے بمبئی میں ایک مرتبہ بیان کیا کہ وہ پہلے آغا خانی تھا اور اب خوجوں کے اس گروہ میں شامل ہے جس نے اپنے کو آغا خاں سے الگ کر دیا ہے جو اب سر آغا خاں کو نہ اپنا خدا مانتا ہے اور نہ امام سمجھتا ہے۔ اس نے کہا کہ کراچی کے مقام پر ایک مرتبہ آغا خاں نے اپنے ایک خفیہ جلسہ میں جس میں بجز ان کے مریدوں کے اور کوئی شریک نہیں ہو سکتا تھا بیان کیا کہ تم لوگ دھوکے میں نہ پڑنا کہ میں خدا نہیں ہوں میں جو کچھ کہوں گا اس کا مجھے اختیار ہے لیکن تم لوگ مجھ پر ویسا ہی اعتقاد رکھو جیسا کہ پہلے رکھتے تھے کہ میں خدا ہوں۔

مصر میں ایک مرتبہ سر آغا خاں نے اپنے مریدوں کے جلسے میں کہا کہ اب ہم امامت سے علاحدگی اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔ ہماری صحت اچھی نہیں ہے اب تم اپنا امام کسی دوسرے کو بنالو۔اس پر لوگ بہت پریشان ہوئے کہ ہمارا خدا ہم سے علاحدہ ہو رہا ہے۔مریدوں کی جماعت میں سے ایک بڑے میاں کھڑے ہوگئے اور آغا خاں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اے ہمارے خدا ایسی باتوں سے ہم کو آزمائش میں نہ ڈالیے۔ہم یہ بات نہیں مان سکتے کہ آپ کی صحت کیسے خراب ہوسکتی ہے یا آپ کیسے بیمار ہوسکتے ہیں یہ جو کچھ ظاہرہ صحت کی خرابی ہے یہ بھی ہم بدنصیب لوگوں کو ابتلا میں ڈالنے کی ایک ظاہری صورت ہے۔ہم پر رحم فرمائیے۔ہم گنہگار آپ کے بندے ہیں۔ اس پر ان کے مریدوں کی جماعت خوش ہوگئی اور سر آغا خاں کی بات کو بھی انھوں نے ایک آزمائش کا طریقہ قرار دیا۔اب سر آغا خاں دس پندرہ سال سے متواتر یورپ میں رہتے ہیں۔نئی نئی شادیاں کرتے ہیں۔اچھی سے اچھی شراب پیتے ہیں۔ناچ رنگ میں شریک ہوتے ہیں لیکن خوجوں کی نگاہ میں ان کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ انھوں نے اپنے اماموں میں سے کسی ایک امام کی روایت پر یقین کرلیا ہے یا خود وہ روایت اختراع کرکے اپنی مقدس روایت میں شامل کرلی کہ ہمارے اماموں میں سے ایک امام یورپ میں جا کر رہے گا۔اور ظاہرداری سے وہ شراب بھی پیے گا اور یورپ کی عورتوں سے شادی بھی کرے گا اور جو باتیں اور لوگوں کے خیال کے خلاف ہیں وہی باتیں اس کے عمل میں آئیں گی۔

آغا خاں کے مرید بہت سے ہندو بھی ہیں اور تمام دنیا میں ان کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ پنجاب کے بعض مقامات پر ہندو سناران کے مرید ہیں۔کشمیر اور افغانستان کے پہاڑوں میں بھی ان کے مرید موجود ہیں۔مصر اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک اور مشرقی افریقہ نیروبی دارالسلام وغیرہ میں ان کے مریدوں کی بہت بڑی تعداد تجارت کرتی ہے اور دولت مند ہے۔سر آغا خاں کی زیارت کے لیے جب ان کے مرید آتے ہیں تو بہت بڑی رقمیں دے کر ان کی زیارت کا موقع حاصل کرتے ہیں۔ممبئی میں جب وہ رہتے تھے تو میل میل بھر سڑک پر ان کے مکان سے دور دور تک ان کے مرید بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور اس انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ اگر اتفاق سے ادھر سے نکل جائیں تو ان کی زیارت نصیب ہوجائے۔یہ سنا ہے کہ کسی موقع پر وہ موٹر میں جا رہے تھے۔موٹر کی کھڑکیوں

میں سے ان کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ آگے جا کر دیکھا کہ بہت سے لوگ وہاں کھڑے ہیں۔ وہ سمجھے کہ یہ میرے مرید ہوں گے اور بلا کچھ لیے دیے ان کو زیارت ہو جائے گی۔ اسی لیے انھوں نے ایک اخبار لے کر اپنے چہرے کے سامنے رکھ لیا تا کہ ان کا چہرہ کسی کو دکھائی نہ دے۔ یہ بھی سنا ہے کہ جہاں وہ جاتے ہیں وہاں ٹب میں دودھ بھر کو ان کو غسل دیا جاتا ہے اور پھر دودھ نکال کر اس ٹب میں روپیہ بھر دیتے ہیں اور دودھ بطور تبرک سب مریدوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہز ہائی نیس سر آغا خاں کی زندگی کے واقعات کا سلسلہ اس بات سے شروع ہوا ہے کہ ان کے مرید خوجے ممبئی کے دیگر تجارت پیشہ فرقوں یا عام مسلمانوں سے بالکل الگ ہیں، یہ خوجے اور بوہرے اپنے کو بمبئی میں مسلمان نہیں سمجھتے بلکہ اپنے اپنے فرقوں کے نام سے مشہور ہیں۔

ایک مرتبہ پونا ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ایک نوجوان سے باتیں ہوئیں اور اس سے وہاں کے لوگوں کی ایک دوسرے سے منافرت اور علاحدگی کا حال معلوم ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ پونا اور بمبئی میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہاں کے مسلمان تو کچھ اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اگر کہیں تمول ہے تو ممبئی میں ہے۔ تم سے معلوم ہوا ہے کہ ممبئی کے مسلمان مفلس ہیں۔

اس نے کہا کہ جو لوگ دولت مند ہیں وہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ بوہرے خوجے اور میمن ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں مسلمان تو ہیں مگر ہم بوہرے خوجے اور میمن کے علاوہ دوسرے لوگوں کو مسلمان کہتے ہیں اور بوہروں کو بوہرہ خوجوں کو خوجہ اور میمن کو میمن کہتے ہیں۔ یہ سب لوگ آپس میں ایک نہیں ہیں۔ بیاہ شادی میں میل جول آپس میں بہت کم ہے۔ سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ یہاں کے لوگوں کا ایک دوسرے سے اس قسم کا تعلق ہے۔ بدرالدین طیب جی، عباس طیب جی اور سر اکبر حیدری مرحوم اور فیض طیب جی، ان کا گروہ دوسرے سب مسلمانوں اور فرقوں سے جدا ہے۔ ان کی جماعت بہت چھوٹی سی جماعت ہے اور اپنے کو سلیمانی بوہرہ کہتی ہے۔ لیکن ان لوگوں میں پڑھے لکھے اور قابل آدمی دوسرے فرقوں کی نسبت زیادہ ہیں اور ان کی مستورات بھی زیادہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلرس

نواب سر محمد مزمل اللہ خاں

سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بھیکم پور کے شروانی خاندان میں سے تھے۔ مولوی عبدالشکور خاں صاحب اس خاندان کے بڑے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ نواب مزمل اللہ خاں صاحب جو رشتہ میں ان کے بھتیجے ہوتے تھے وہ ان سے رقابت رکھتے تھے۔ لیکن ضبط اتنا تھا کہ ظاہرہ کبھی آپس میں دونوں کے درمیان تکدر یا تنفر نمایاں طور پر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نواب مزمل اللہ خاں صاحب کے بڑے سگے بھائی کا نام احمد سعید خاں تھا۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہم دونوں بھائیوں کو باپ کے ورثہ میں بارہ بارہ ہزار روپے سالانہ آمدنی کی جائداد ملی تھی لیکن اپنے انتقال سے چند سال قبل فرمایا کہ اب میرے پاس سوا ڈیڑھ لاکھ سالانہ آمدنی کی جائداد ہے۔ ان کی جائداد میں یہ اضافہ اس طور پر ہوا کہ کچھ تو اپنے بھائی کے ورثہ میں سے ان کو جائداد ملی اور کچھ بیٹوں کے ورثہ میں ملی۔ جن کو اپنے نانا سے جائداد ورثہ میں پہنچی تھی۔ علاوہ اس کے انھوں نے خود بھی بہت روپیہ پیدا کیا۔ ہمارے ضلع کے رؤسا میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہے کہ وہ اپنا بےکار روپیہ کسی کام میں لگا کر روپیہ پیدا کریں۔ ان کے پاس جو کچھ پس انداز ہوتا ہے وہ جوڑتے رہتے ہیں کہ اگر کسی غریب بھائی کی جائداد تھوڑی سی قیمت میں ہاتھ آجائے تو خرید لیں۔ اس طریقہ سے اپنا روپیہ جائدادوں میں لگانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ برادری کے جتنے چھوٹے

زمین دار تھے ان سب کی جائدادیں سمٹ سمٹا کر کسی بڑے رئیس کے قبضے میں آگئیں ۔ گو نواب مزمل اللہ خاں صاحب بھی اس عادت سے بچ نہیں سکے تھے لیکن انھوں نے اپنا ساندازروپیہ ایک روئی کے پیچ میں بھی لگایا تھا جس کی آمدنی بیس پچیس سال تک قریب پچاس ہزار روپیہ سال کے ان کو ہوتی رہی ۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب اپنی تمام رئیس برادری میں علاوہ نواب سر فیاض علی خاں صاحب ے زیادہ مخیر تھے ۔ ہمارے روٴسا کی بڑی خیرات یہ دیکھی ہے کہ جائداد کا ایک ٹکڑا وقف کر دیتے ہیں اور اس میں شرط لگا دیتے ہیں کہ عربی کا مدرسہ جاری کیا جائے اور ایک مولوی کو لا کر مسجد کے ایک حجرے میں بیٹھا دیتے ہیں جو عربی کا معلم کہلاتا ہے ۔ عام طور پر صوبہ یو ۔ پی، پنجاب وغیرہ علاقوں کے طالب علم ان مدارس میں تعلیم نہیں پاتے کیونکہ وہ لوگ اب بیدار ہو گئے ہیں اور عربی تعلیم میں اب زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے لیکن ایسے ایسے تاریک ملکوں کے نوجوان جیسے کہ کاشغر اور مشرقی بنگال اور آسام جو تلاش معاش میں گھر سے نکلتے ہیں وہ ان مدارس میں کہیں نہ کہیں آ کر ٹک جاتے ہیں اور عربی پڑھانا شروع کر دیتے ہیں ۔ روٹیاں کھانے کو مل جاتی ہیں اور پھر دس بارہ سال میں کچھ پرانی کتابوں کے خلاصے پڑھ لیتے ہیں اور پھر دستار فضیلت باندھ کر اپنے ملک کو واپس جاتے ہیں اور وہاں جا کر بڑے مولوی صاحب بن کر کسی مسجد میں قبضہ کر بیٹھتے ہیں یا پیش امام ہو جاتے ہیں یا معلم ہو جاتے ہیں ۔ نواب محسن الملک مرحوم ان لوگوں کو کاشغر کے طوطے اور بنگال کی مینا کہا کرتے تھے ۔ نواب سر احمد سعید خاں رئیس چھتاری لال خانی بلند شہر اور علی گڑھ کے بڑے روٴسا میں سے ہیں ۔ ان کے دادا صاحب نواب محمود علی خاں نے اپنی جائداد کا ایک معقول حصہ عربی کی تعلیم اور غربا کی پرورش کے لیے وقف کر دیا تھا ۔ غربا کی پرورش ہوتی ہوگی مجھ کو اس کی واقفیت نہیں لیکن عربی کا ایک مدرسہ ضرور ہے اور ایک مقدس صورت مولوی طالب علموں کو عربی پڑھاتے ہیں ۔ طالب علموں کی تعداد دو چار سے زیادہ کبھی نہیں دیکھی وہ بھی سرحد کی طرف کے یا بنگال کی طرف کے ہوتے ہیں ۔

نواب سر احمد سعید خاں صاحب نے ایک مرتبہ قصہ سنایا کہ ایک بنگال کا طالب علم بارہ سال تک ان کے مدرسے میں پڑھتا رہا ۔ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ ایک طالب علم ہے اور پڑھتا ہے باقی اس سے ان کو اور کوئی واقفیت نہیں تھی ۔ یہاں تک کہ ایک روز اس طالب علم کے سر پر دستار

فضیلت باندھی گئی اور ہیڈ معلّم صاحب ان کو لے کر نواب صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ یہ طالب علم فارغ التحصیل ہو گئے ہیں۔ ان کو زاد راہ عنایت کیجیے تا کہ اپنے وطن کو واپس چلے جائیں۔ نواب صاحب نے تازہ دستار بند مولوی صاحب سے پوچھا کہ تم کو کچھ بھی آتا ہے انھوں بنگالی اردو میں جواب دیا کہ ہم پڑھا ہے لکھا نہیں ہے مولوی صاحب یعنی ہم سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جو بنگال سے آتے ہیں لکھنا نہیں سیکھتے فقط پڑھنا سیکھتے ہیں۔ نواب صاحب نے ان کو سفر خرچ کے لیے کچھ دے دیا اور وہ خوشی خوشی بارہ سال کے قیام کے بعد چھتاری سے انسانیت سے عاری انسانی تجربے سے بے بہرہ فقط چند عربی کتابیں رٹنے کے بعد اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔

میں نے کسی رئیس کو بجز نواب سر فیاض علی خاں صاحب اور نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے موجودہ زمانے کی عام ضرورتوں یا تعلیمی مقاصد کے لیے کوئی بڑی رقم عطا کرتے نہیں دیکھا۔ نواب سر فیاض علی خاں صاحب نے ضرور بڑی رقمیں کالج کو دیں اور اسی طور پر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب نے بھی کالج کے لیے بڑی بڑی رقمیں دی تھیں۔

ہمارے رئیسوں کو لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق ایک تعصب ہے۔ اس کے لیے وہ تعلیم نسواں پر روپیہ خرچ کرنا گناہ یا نیم گناہ سمجھتے ہیں۔ اب کچھ زمانے سے اپنی لڑکیوں کو علی گڑھ کے مدرسے میں تعلیم کے لیے بھیجنے لگے ہیں گو اس کو بھی وہ اپنے دل میں گناہ ہی سمجھتے ہوں گے لیکن اپنی جیب سے مدرسے کے لیے کچھ دینا تو ایک گناہ ضرور ہے لیکن صرف نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب ایک ایسے رئیس تھے کہ جنھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کی لیے بھی کچھ مدد دی تھی۔ مجھ کو استانیوں کے لیے مکان کی سخت ضرورت تھی میں نے ان سے کہا کہ آپ میری مدد کیجیے۔ انھوں نے سات ہزار روپیہ چار استانیوں کی رہائش کے قابل مکان تعمیر کرنے کو دے دیا جس کو بعد میں انھوں نے اپنی مرحومہ بیٹی کے نام سے کوٹھی کو نامزد کرنے کو کہا۔ میں نے سنگ مرمر کا ایک پتھر سامنے کی دیوار پر ایک کتبہ لکھ کر نصب کر دیا۔ اس سے میری ایک بہت بڑی دقّت رفع ہو گئی۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بڑے با اخلاق آدمی تھے۔ دوستوں سے بہت محبت اور مروّت کرتے تھے۔ نواب صاحب کی پہلی شادی سے ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں دونوں لڑکوں کا یکے بعد دیگرے عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا۔

جن کی جائداد خود نواب صاحب کو ملی جس کا اوپر بیان ہوا ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی خان بہادر عبدالمقیت خاں صاحب رئیس بوڑہ گاؤں سے ہوئی جن سے تین لڑکیاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نواب صاحب کی چھوٹی لڑکی بڑی شاعرہ تھی جو اپنا تخلص ز۔خ۔ش کرتی تھی اور صاحب تصنیف بھی تھیں۔ یہ تخلص ان کا ان کے نام کا اختصار تھا یعنی ز سے زاہدہ، خ سے خاتون، ش سے شروانیہ، ان کی نظمیں اس وقت تک رسالوں میں چھپتی ہیں اور بہت سے گہرے تخیلات کا پتا دیتی ہیں۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کے انتقال کے بعد بہت آخر عمر میں دوسری شادی کی تھی جس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے جو حیات ہیں اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ صاحبزادے فقط حیات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا نام بھی حیات میاں ہے۔

نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کچھ دنوں کے لیے یو۔ پی کونسل کے ہوم ممبر بھی ہو گئے تھے اور ہوم ممبری کے زمانے میں انھوں نے اپنی انتظامی قابلیت کا پورا پورا ثبوت دیا۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کی فیاضی عام تھی یعنی اس کا دائرہ فقط مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہندو ہم وطن بھی ان کے ہمیشہ ممنون احسان رہے۔ ان کے اداروں اور کار خیر کے لیے نواب صاحب نے کشادہ دلی سے ان کی امداد کی۔ اپنی ہوم ممبری کے زمانے میں ایک مرتبہ وہ بنارس یونیورسٹی میں گئے اور وہاں جا کر یونیورسٹی کو دس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ وہاں کے منتظمین سے کہا کہ تم لوگ تو بہت بیدار مغز اور آزاد خیال لوگ ہو جیسا کہ تم بیان کرتے ہو تمھارے یہاں جو مسلمان طالب علم ہوں ان کو ذرا میرے سامنے لاؤ۔ وہ لوگ طلبا کی چھ سات ہزار کی تعداد میں سے انجینئرنگ کالج کے فقط تین مسلمانوں کو نواب صاحب کے سامنے لائے۔ نواب صاحب نے ان لوگوں کا رہنے کا مکان دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسا کہ ہندوؤں کے گاؤں کے قرب میں ایک چمر ہانہ ہوتا ہے جہاں پر اچھوت قوم کے لوگ رہتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت رنج ہوا کہ ہمارے ہم وطن ہندو صاحبان اس زمانے میں بھی دوسرے مذہب کے لوگوں سے اس طرح کا سلوک کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کے ہم وطن ہیں۔

نواب صاحب نے کوئی اسی سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنی کوٹھی موسومہ نیا قلعہ کی مسجد کے ایک گوشہ میں دفن ہوئے۔ یہ مقام علی گڑھ سے پچیس میل کے فاصلے پر بھیکم پور میں واقعہ

ہے۔ میں دو مرتبہ ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کو گیا۔ عبرت ناک حالت تھی جہاں پر سیکڑوں آدمی ہر وقت کھڑے رہتے تھے۔ وہاں پر ایک چوکیدار چمار ہاتھ میں لاٹھی لیے کھڑا دیکھا باقی ہو کا عالم تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ مع اپنے بچوں کے علی گڑھ میں رہتی ہیں اور نواب صاحب کے تعمیر کردہ نئے قلعہ میں اب کوئی جا کر جھانکتا بھی نہیں۔

نواب مزمل اللہ خاں صاحب کے بعد رحمت اللہ خاں کمیٹی کی سفارشات کے مطابق دوسرا وائس چانسلر مقرر ہونے کی نوبت پیش آئی۔ اس وقت کوئی عمر رسیدہ شخص اس عہدے کے لیے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُدھر سر راس مسعود نبیرۂ سر سید احمد خاں جو حیدر آباد میں ملازم تھے اور جو اپنے عہدے کی میعاد ختم ہونے کے بعد علاحدہ ہو گئے تھے انھوں نے وائس چانسلر کے عہدے کی ذمہ داری کی خواہش کی اور پچاس ساٹھ ممبران کورٹ کے دستخطوں سے اپنی نامزدگی کرائی۔ رحمت اللہ کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لیے ممبران کورٹ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اسٹاف کے ممبر جو اس کونسل میں ہیں ان کو گروہ بندیوں کا موقع ملتا ہے اس لیے کام میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے کونسل کے ممبروں کی تعداد تیس سے گھٹا کر صرف دس کر دی جائے اور اسٹاف کے ممبران کی تعداد بہت کم کی جائے اور علی گڑھ کے رہنے والے ممبران کو بھی اس کونسل میں زیادہ دخل اور جگہ نہ دی جائے۔ اس پر بہت بحث ہوتی رہی۔ ایک دن برابر کشمکش رہی آخر کو صاحب زادہ سر عبدالقیوم صاحب رئیس صوبہ سرحد نے جو کہ اس کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے کہا کہ رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ کے بعد ہم کسی کونسل کے تقرر کے موافق نہیں ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ کسی ایک شخص کے ہاتھ میں بطور ڈکٹیٹر یونیورسٹی کا انتظام دے دیا جائے۔ اس رائے سے بھی لوگ متفق نہ ہوئے۔ آخر کو یہ بات طے ہوئی کہ کونسل میں صرف تین آدمی رہیں۔ اس میں ایک وائس چانسلر دوسرے پرو وائس چانسلر اور تیسرے ٹریزرار۔ گو میرا اس سے اتفاق نہیں تھا لیکن مجبوری بھی تھی کہ کسی طرح سے یہ معاملہ طے ہو۔ اب سر راس مسعود جو وائس چانسلر مقرر ہو گئے تھے ان کے ہاتھ میں ان کے دادا کی بنائی ہوئی یہ درس گاہ آ گئی۔ وہ سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے۔ غریب پرو وائس چانسلر اور ٹریزرار کی کیا مجال تھی کہ ان کی مرضی کے خلاف کسی معاملے میں آواز اٹھائیں۔

سر راس مسعود

سر راس مسعود میں خاندانی بہت سی خصوصیات تھیں ۔لیکن سر سید احمد خان جیسا نہ ایثار تھا اور نہ وقار اور نہ سید محمود جیسی اعلیٰ ذہانت تھی اور نہ علمی تبحر تھا۔ باتوں کے بڑے دھنی تھے۔ جتنے دنوں تک وائس چانسلری کی وہ ایک خود مختار بادشاہ کی شان دکھاتے رہے۔ان کی وائس چانسلری میں فقط ایک یادگار کی بات ہے جو ہمیشہ رہے گی کہ انھوں نے کوشش کر کے اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد سے دس لاکھ روپیہ یونیورسٹی کے لیے حاصل کیا۔ لیکن جو کچھ وہ لائے تھے اور جو کچھ روپیہ رکھا ڈھکا یونیورسٹی کے پاس تھا وہ قریب قریب سب خرچ کر دیا۔ سائنس کی لیبوریٹریاں بنوائیں ۔ ایک مارکیٹ بنوائی۔ایک نالا برساتی پانی نکلنے کے لیے بنایا۔

ایک یورپین اسٹون برج نامی کو عمارات کے لیے اپنا مشیر بنایا۔لیبوریٹریوں کی جو عمارات ہیں وہ یونیورسٹی میں ہمارے سامنے ہیں اور اچھی ہیں لیکن جو برساتی پانی کا نالا بنایا وہ نا کامیاب رہا۔ کیونکہ نالے کے ذریعہ سے جو پانی یونیورسٹی کے احاطے سے باہر جانا ہیے تھا وہ پانی باہر نہ جا سکا اور خلاف اس کے باہر کا برساتی پانی احاطہ یونیورسٹی میں نالے کے ذریعہ سے آنے لگا۔ اس میں سر راس مسعود کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انجینئر اس کے پورے ذمہ دار تھے۔ سب لوگ راس مسعود کی ہر وقت دل جوئی کی کوشش کیا کرتے تھے کہ وہ خوش رہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ جنھوں نے ان کو رنج پہنچایا۔وہ چھ سال سے زیادہ وائس چانسلر نہ رہے 1935 یا 1936 میں انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور یہاں سے بھوپال چلے گئے۔ وہاں پر کیبنٹ کے ممبر رہے اور آخر کو وہیں پر ان کا انتقال ہو گیا۔

ان کی عمر بھی اپنے باپ ہی کے برابر ہوئی۔ دادا کے برابر نہیں ہوئی ۔وہ شکایت کیا کرتے تھے کہ مجھ کو گردہ کی تکلیف رہتی ہے۔اس عارضہ میں آخر کو دنیا سے رحلت کی۔ بھوپال سے ان کا جنازہ علی گڑھ آیا اور سر سید کی قبر کے قرب میں یونیورسٹی کی مسجد میں دفن ہوئے۔

اس یونیورسٹی کی مسجد کے قبرستان میں اس وقت چھ اشخاص دفن ہیں اوّل تو سر سید احمد خاں کو دفن کیا گیا۔ان کے بعد مولوی سید زین العابدین خاں دفن ہوئے۔ان کے بعد سید محمود دفن ہوئے ۔ پھر نواب محسن الملک دفن ہوئے۔ان کے بعد سر راس مسعود دفن ہوئے۔اب آخر میں طلبا

یونیورسٹی نے زبردستی سے منتظمین کی مخالفت کر کے ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب کو جا کر سر سید مرحوم کی قبر کے بغل میں دفن کر دیا۔ میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے اس مقام پر دفن ہونے کے موافقت میں نہیں تھا کیونکہ کالج کی مسجد کو قبرستان بنانا نہیں چاہتا تھا بلکہ میں یہ چاہتا تھا کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی قبر یونیورسٹی ہی کی زمین میں ہو اور اس پر ایک مقبرہ بنایا جائے جس کے لیے ان کے دوست کافی چندہ دیتے اور میں بھی چندہ دینے کو تیار تھا۔ یونیورسٹی کی منتظمین بھی ڈاکٹر سر ضیاء الدین کو یونیورسٹی کی مسجد میں دفن کرنے کے قطعی خلاف تھے لیکن آخر طالب علموں کے اصرار کی وجہ سے ایک جگہ مسجد میں ہی مقرر کر دی کہ یہاں پر ان کی قبر کھودی جائے۔ وہاں پر قبر کھد گئی لیکن بغاوت پسند طالب علموں نے کہا کہ یہ جگہ سر سید کی قبر سے ذرا فاصلے پر ہے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین کو سر سید کی قبر سے اتنے نزدیک ایک بالشت کا بھی فاصلہ نہ رہے اور راتوں رات جا کر طلباء نے سر سید کے برابر قبر کھدوادی اور پہلی کھدی ہوئی قبر بھروادی۔ اس سے کالج کے منتظمین کی کمزوری بھی ظاہر ہے۔ لیکن اس زمانے کے طالب علموں کی شورہ پشتی کی بھی ایک نمایاں مثال ہے۔ یا تو طالب علم ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے مخالف تھے، اکثر سڑکوں پر ضیاء الدین مردہ باد کے نعرے بلند کرتے پھرا کرتے تھے اور ان کے مرنے کے بعد ان کو زبردستی سر سید کے پہلو میں دفن کر دیا اور افسران یونیورسٹی کے حکم کی سخت متمردی کی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی سوانح کے متعلق نہایت مختصر حالات بعد میں قلم بند ہوں گے۔ کیونکہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب کی وائس چانسلری اور سر راس مسعود کی وائس چانسلری کے درمیان ایک اور وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ ان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سر شاہ محمد سلیمان

سر شاہ محمد سلیمان صاحب جج ہائی کورٹ الٰہ آباد اور بعد میں جج فیڈرل کورٹ انڈیا اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے۔ سر شاہ محمد سلیمان مولوی سید محمد عثمان صاحب وکیل جونپور کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے ولایت میں جا کر تعلیم پائی اور بہت امتیاز کے ساتھ ڈگریاں حاصل کیں۔ جب ہندوستان لوٹ کر آئے تو انھوں نے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ وکالت شروع ہی سے اچھی چلی اور بہت روپیہ کمایا۔ الٰہ آباد میں ایک بڑی کوٹھی بھی تعمیر کرائی۔ اپنے پیشے میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ اس کے بعد ہائی کورٹ الٰہ آباد کے جج ہوئے تو ان

کی عمر اڑتیس سال کی تھی۔ لوگوں نے ان کے خلاف بہت کچھ چہ میگوئیاں کیں اور سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اڑتیس سال کی عمر میں اگر کسی کو ججی کے عہدے پر فائز کیا جاتا ہے تو بہت زمانے تک وہ اس عہدے پر جما بیٹھا رہے گا۔ دوسروں کو موقع نہیں ملے گا۔ بہ ہر حال وہ جج مقرر ہو گئے اور ججی بھی انھوں نے بہت اچھی طرح سے کی۔ قریب 1936-37 میں وہ فیڈرل کورٹ کے جج ہوئے اور نیز مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ وائس چانسلری کے زمانے میں انھوں نے بےلوث طریقہ سے اس عہدہ کا کام انجام دیا۔ اس کی مثال بھی بہت کم ملے گی۔ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً دہلی سے علی گڑھ آیا کرتے تھے اور کسی مکان میں جس کا کرایہ یونیورسٹی کو ملتا ہو نہیں ٹھہرتے تھے تا کہ یونیورسٹی کا نقصان نہ ہو۔ نہ تو یونیورسٹی کے روپے سے کوئی چیز لینا پسند کرتے تھے۔ کھانا بھی یونیورسٹی کے باورچی خانے سے کبھی نہیں لیتے تھے نہ یونیورسٹی کے روپے سے اپنے لیے کھانا پکواتے تھے۔ وہ ریل سے اتر کر سیدھے یونیورسٹی کے دفتر میں آ جاتے تھے اور دفتر کے ملحق جو کمرہ بطور آرام کمرے کے استعمال کیا جاتا تھا اس میں پلنگ بچھا کر سوتے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ جب تک وہ علی گڑھ رہتے تھے کسی دوست کی دعوت بھی نہیں قبول کرتے تھے۔ مجھ سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے ایک مرتبہ چاہا کہ ان کو چائے پر بلاؤں لیکن انھوں نے معذرت کر دی اور کہا اگر میں ایک جگہ جاتا ہوں تو سب لوگ مجھے بلائیں گے اور مجھے انکار کرنا دشوار ہو جائے گا اس لیے میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے یہاں میں نہ آ سکوں گا۔

سر شاہ محمد سلیمان سے ہمارے اسٹاف کے بعض ممبر خوش نہیں رہے کیوں کہ پروفیسری کے عہدے حاصل کرنے کے بعد اگر وہ ریسرچ کا کوئی کام نہ کریں تو پھر ان کی ذات سے اعلیٰ علوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا لیکن ہماری یونیورسٹی میں ریسرچ کے کاموں سے ہمیشہ ہمارے ریڈر اور پروفیسروں کو اور لکچرار کو بے التفاتی رہی۔ باوجود شاہ صاحب کی رائے کے کسی پروفیسر نے بھی ریسرچ کا کام شروع نہ کیا اور نہ طلبا کو ریسرچ کے رستے پر لگایا۔ کبھی کبھی کونسلوں کے جلسوں میں کہا جاتا ہے کہ فلاں لڑکا ریسرچ کر رہا ہے۔ لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہ لڑکا خود بخود کہیں غائب ہو جاتا ہے اور پھر اس کا نام سننے میں نہیں آتا۔ غائب ہونے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ دنیا سے چلا جاتا ہے بلکہ میرے بیان کی غرض یہ ہے کہ وہ ریسرچ کا کام چھوڑ کر کہیں نوکر ہو جاتا ہے اور

نوکری کے بعد پھر وہ کسی علمی تحقیقات کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

ہماری یونیورسٹی کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ غیر مستطیع اور ہونہار طلبا کی مالی امداد نہیں کرے گی کہ وہ اطمینان سے چند سال تک یونیورسٹی میں رہ کر کسی مضمون میں تحقیقات کریں ،اس وقت تک ہمارے یہاں ریسرچ اور تحقیقات کا سلسلہ شروع نہیں ہوگا۔ یہ توقع رکھنا کہ ایک غریب کا لڑکا جس نے جوں توں کر کے ایم۔اے یا ایم۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی ہے جو اپنے سامنے صرف ایک نصب العین لیے ہوئے ہے کہ میں کہیں نوکری کر کے اپنے ماں باپ کی بھی مدد کروں اور خود بھی اطمینان سے اپنی زندگی بسر کروں ،وہ لڑکا بلا ایک معقول مالی امداد کے اپنی زندگی کا زاویہ کیسے بدل سکے گا۔ ہماری یونیورسٹی کا فرض ہے کہ وہ ایک ایک مظمون کے لیے دو دو ریڈر یا پروفیسر مقرر رکھنے کے بجائے ایک ایک پروفیسر اور ایک ایک ریڈر رکھے اور یہ کہ مضمون میں کم از کم دو دو طلبا کو مالی امداد دے کر علمی تحقیقات کا موقع دیں۔ لیکن جہاں یہ کام آسان معلوم ہوتا ہے وہاں اس کی دشواریوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ دشواری سب سے بڑی یہ ہے کہ علمی تحقیقات کا کام موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے لیے بالکل ہی انوکھی بات ہے۔ ایک مرتبہ اگر کچھ لوگ ایثار سے اور جفاکشی سے کچھ مضامین میں تحقیقات کر کے نام پیدا کریں اور وہ پبلک کی نگاہ میں اپنے کو قابل احترام ثابت کریں تو ممکن ہے کہ کہیں ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہو جائیں لیکن موجودہ صورت میں کوئی امید نہیں کہ اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد یہ نوجوان مسلمان ملازمت کی اُمیدوں پر خاک ڈال کر عسرت کی مصیبتیں برداشت کر کے علمی تحقیقات کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ پس مجھے سر شاہ محمد سلیمان کے خیال سے قطعی اتفاق ہے کہ علمی تحقیقات کے میدان میں مسلمانوں کو کچھ کر کے دکھانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب کی نسبت یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ انھوں نے کوئی ایسی صورت نہ نکالی کہ نوجوان علمی تحقیقات کے میدان میں داخل ہو سکیں۔

شاہ صاحب کو آخر میں کچھ ایسی بیماری ہو گئی کہ چند روز کے لیے وہ بے ہوش رہے اور بے ہوشی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی عمر انتقال کے وقت ساٹھ سال سے کچھ کم تھی۔ ان کے انتقال کا مسلمانوں کو عام طور پر بہت رنج ہوا تھا کیوں کہ وہ بہ لحاظ اپنی قانون دانی

اور بے لوث زندگی کے مسلمانوں کی قوم میں ایک ممتاز آدمی تھے۔ سر شاہ محمد سلیمان صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مرحوم میرے کلاس فیلو تھے لیکن میرے مضامین ان کے مضامین سے مختلف تھے۔ میرے مضامین فلاسفی انگریزی اور فارسی تھے۔ ان کا مضمون ریاضی تھا۔ انھوں نے ریاضی میں بہت امتیاز حاصل کیا تھا۔ یہ بات مسلمانوں میں عام طور سے مشہور تھی اور اب بھی ہے کہ مسلمانوں کو حساب نہیں آتا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے اپنے تعلیمی زمانے میں ریاضی کے مضمون میں وہ شہرت حاصل کی کہ ہندو بھی کہتے تھے کہ ان کے مقابلے کا دوسرا کوئی ہندوستان میں نہیں ہے۔ انھوں نے علی گڑھ کالج میں پڑھ کر الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا۔ پھر انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کا امتحان دیا اور پاس ہوئے اور اس امتحان میں پاس ہوجانے کی وجہ سے وہ ڈاکٹر ضیاء الدین ہو گئے۔ پھر انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس قدر اعلیٰ امتحان پاس کرنے کی وجہ سے ان کو گورنمنٹ سے ولایت کی یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے وظیفہ ملا۔ ولایت جا کر انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی میں تین سال رہ کر اعلیٰ امتحان پاس کیے اور اسمتھ پرائز کے نام سے کوئی انعام مقرر ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان پاس کرنے والوں کو ملتا ہے وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کو مل گیا۔ تین سال کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین جرمنی چلے گئے۔ وہاں جا کر گوٹن جن یونیورسٹی میں تعلیم کی تکمیل کی۔ اتنی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد ایم اے او کالج میں آ کر ملازمت کر لی۔ اور علمی تحقیقات کی طرف توجہ نہیں کی۔ اتنی اتنی ڈگریوں کے حاصل کرنے کے بعد اگر وہ ریاضی کے کسی شعبہ کی تحقیقات کے کام میں لگ جاتے تو پھر ہندوستان پر وہ مثل شمس چمکتے اور آج دنیا کے علم دوست اقوام میں مثل یورپ اور امریکہ کے ریاضی کے بڑے عالموں کے زمرے میں ان کا بھی نام روشن ہوتا اور مسلمانوں کی قوم ان کا نام بڑے ناز اور فخر کے ساتھ لیتی۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے کتابی علم میں جو تبحر حاصل کیا وہ کتابوں ہی میں محفوظ رہا اور ان کی ذات سے اس مضمون میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا۔ اور مسلمان دست حسرت مل مل کر ہائے

قسمت وائے قسمت کہتے رہ گئے۔ مسلمانوں کو اس کا بڑا رنج تھا کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین جیسے ریاضی دان نے اپنے مضمون میں کوئی نام حاصل نہیں کیا۔ اور نہ آنے والی نسلوں کے لیے انھوں نے کوئی قابل یاد تصنیف اپنی تحقیقات سے مرتب کی۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین 1918 تک کالج کے پروفیسر رہے پھر پرنسپل ہو گئے۔ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد وہ پرو وائس چانسلر ہو گئے۔ اور رحمت اللہ کمیٹی کی تحقیقات تک پرو وائس چانسلر ہی رہے۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ سر شاہ محمد سلیمان کے انتقال کے بعد وائس چانسلر ہوئے۔ ان کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ نہ تو پرو وائس چانسلری میں اور نہ وائس چانسلری کے زمانے میں ان کو موقع ملا کہ وہ یونیورسٹی میں کوئی تعلیمی کام ایسا کریں کہ جس کو آئندہ نسلیں یاد کریں بلکہ جب وہ پرو وائس چانسلر تھے تو وائس چانسلروں سے ان کی کبھی نہ بنی اور جب وائس چانسلر ہوئے تو پرو وائس چانسلر مسٹر اے بی اے حلیم سے ان کی نہ بنی اور پروفیسر حلیم کو ملازمت چھوڑنی پڑی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین اس طبیعت کے آدمی تھے کہ جو بلا شرکت غیرے تو بہت کام کر جاتے ہیں لیکن کسی کی شرکت میں کام نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم میں یہ وصف سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کام کرنے میں بہت زیادہ مستعد اور ہوشیار تھے۔ ان کی مستعدی کی مثال اس زمانے کے لوگوں میں بہت کم ملے گی۔ وہ اپنے عہدے کا بھی کام انجام دیتے تھے اور سنٹرل اسمبلی میں ممبری کا بھی کام کرتے تھے۔ اور بیسیوں دوسری کمیٹیوں میں ممبر مقرر کیے جاتے تھے۔ جن کا کام کرنا ان کو لازمی ہوتا تھا اور اس کی وجہ سے وہ کبھی مانگرول اور کبھی بنگلور پہنچ جاتے تھے۔ کبھی کولکاتا اور کبھی ڈھاکہ اور کبھی لکھنؤ اور کبھی کراچی۔ غرض یہ کہ مہینہ بھر میں ایک ہفتہ یا دس روز وہ علی گڑھ سے باہر رہتے تھے۔ لوگ ان کی غیر حاضری کی وجہ سے پریشان بھی بہت رہتے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ظاہرہ طور پر کام میں خرابی نہیں آنے دیتے تھے۔ لیکن ہر کام کی اندرونی حالت قابل اطمینان نہیں تھی۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اس قدر زمانے کے لیے ہمیشہ علی گڑھ سے باہر رہے گا اس کا کام کبھی قابل اطمینان نہ ہوگا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین جب سے وائس چانسلر ہوئے وہ اس کوشش میں رہے کہ یونیورسٹی کی کورٹ میں اور کونسلوں میں لوگ ان کی پارٹی میں شامل رہیں۔ کورٹ کے لیے انتخابات میں وہ بہت بڑا حصہ لیتے تھے۔ جن لوگوں کو وہ چاہتے تھے کہ یہ

ممبر ہوں اکثر وہی ممبر ہو جاتے تھے۔ امیدوار اس بات کی جستجو میں رہتے تھے کہ آیا ان کا نام ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی فہرست میں آیا ہے یا نہیں۔ اگر اس فہرست میں ان کا نام آ جاتا تو وہ اطمینان کی نیند سوتے تھے کہ ہم ممبر ہو جائیں گے اور اگر معلوم ہو جاتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی فہرست میں ان کا نام نہیں ہے تو اکثر امیدوار مایوس ہو جاتے تھے اور بعض امیدواری چھوڑ بیٹھتے تھے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین حکام رس مشہور تھے۔ وہ بڑے بڑے انگریزی حکام سے میل ملاقات اور اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ طلبا سے ان کو بہت اُنس تھا۔ طلبا کی فرو گذاشتوں کو اکثر نظر انداز کر دیتے تھے اور ان کو نوکریاں دلانے میں جس قدر ڈاکٹر سر ضیاء الدین کوشش کیا کرتے تھے میں نے کسی اور مسلمان کو اس قدر کوشش کرتے نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین کو جن لوگوں سے محبت یا عداوت ہوتی تھی وہ دل سے ہوتی تھی اور جن سے کدورت ہوتی تھی ان کی طرف سے مشکل سے دل صاف ہوتا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے کہہ بھی دیا تھا کہ میرے دل میں جب کبھی کسی کی طرف سے کدورت بیٹھ جاتی ہے تو پھر مشکل سے نکلتی ہے۔ جلسوں کا اہتمام وہ بڑی خوبی سے کرتے تھے۔ روپے کی یوں تو سب کو حرص ہوتی ہے لیکن علی گڑھ کے دوستوں کے حلقہ میں وہ اس معاملے میں سب سے بڑھ کر سمجھے جاتے تھے۔

1946 میں طلبا سے اور ان سے بہت ان بن ہو گئی اور اس مخالفت کی وجہ ان گہرے اثرات پر مبنی تھی جو طالب علموں کے دل میں غبار کی طرح عرصے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ آخری وجہ یہ ہوئی کہ یونین کے وائس پریزیڈنٹ کے لیے انتخاب ہوا۔ اس انتخاب میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی پارٹی کے طالب علم ہار رہے تھے اور جو لوگ ان کے مخالف تھے وہ جیت رہے تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے دہلی سے واپس آ کر جب یہ حالت دیکھی تو انھوں نے ایک حکم نامہ جاری کر دیا کہ یہ انتخاب میں منسوخ کرتا ہوں۔ طالب علموں کا بہت بڑا گروہ ان کی پارٹی کے گروہ کے خلاف تھا اور جن کی تعداد بھی قلیل تھی۔ کثیر تعداد گروہ نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب کو دفتر میں آ کر گھیرا اور کہا کہ آپ نے جو حکم نافذ کیا ہے وہ بالکل غلط ہے آپ اپنے عہدے سے استعفیٰ دیجیے۔ طالب علموں کے تیور دیکھ کر ڈاکٹر صاحب گھبرائے اور غسل خانے میں گھس گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لیکن مجبوراً دروازہ کھولا اور استعفیٰ لکھ کر طالب علموں کے ہاتھ میں دے دیا۔ ان کا استعفیٰ جب باہر لا کر پڑھا گیا تو بعض

لوگوں نے اس میں کچھ سقم بتایا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب اپنی موٹر میں سوار ہوکر گھر کو جارہے تھے کہ طالب علموں نے جا کر پکڑ لیا اور پھر کھینچ کر دفتر میں لائے اور کہا کہ اس استعفیٰ کی پوری تکمیل کیجیے۔ اتنے میں ٹیلی فون کے ذریعہ سے عبدالمجید صاحب قریشی بھی بلائے گئے جنھوں نے آکر طالب علموں کو سمجھایا کہ ڈاکٹر صاحب کی عمر دیکھو اور اپنی عمر دیکھو۔ عمر بھر انھوں نے تمھاری خدمت کی ہے اب اس آخر وقت میں ان کے ساتھ بدسلوکی کررہے ہو اور گستاخی کررہے ہو۔ طالب علموں نے جو باہر کھڑے ہوئے تھے ایک نعرہ بلند کیا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین مردہ باد۔ جوں توں کر کے اور نعروں کی اس بوچھار سے نکل کر اور موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب اپنے گھر پہنچے۔ اب یہ حالت تھی کہ مخالف گروہ کے طالب علم ان کے گھر پہنچ کر مردہ باد کے نعرے بلند کرتے تھے اور ان کے بعد ان کی قلیل پارٹی کے طالب علم پہنچتے تھے اور وہ زندہ باد کے نعرے بلند کرتے تھے۔

اس کے بعد کونسل کا ایک جلسہ ہوا اس میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین سے کہا گیا کہ آپ دو ماہ تک آرام کیجیے اور اپنے عہدے کا کام موجودہ ٹریزرار جناب مولوی عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے سپرد کر دیجیے۔ دو ماہ کے بعد کونسل کا پھر ایک جلسہ ہوا۔ اس میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے دوستوں نے کہا کہ جو استعفیٰ ڈاکٹر صاحب سے لیا گیا ہے وہ بالکل غیر موثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے عہدے سے علاحدہ نہیں ہوئے اس لیے کہ جب تک کورٹ کا جلسہ نہ ہو وہ اپنے عہدے کی خدمت بدستور انجام دیتے رہیں گے۔ چنانچہ یکم مارچ 1947 سے کورٹ کے جلسے تک جو اپریل میں ہوا ڈاکٹر صاحب ہی وائس چانسلر رہے اور کورٹ کے جلسے میں وہ استعفیٰ جو ڈاکٹر صاحب نے طالب علموں کے سامنے دیا تھا وہ منظور ہوگیا اور وائس چانسلری کا کام ٹریزرار عبید الرحمٰن خاں صاحب کے سپرد ہوا کہ تا تقرر مستقل وائس چانسلر کے وہ اس کام کو انجام دیں۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم جب وائس چانسلری سے علاحدہ ہوئے تو ان کو بہت دور دور کی باتیں سوجھنے لگیں۔ اوّل تو انھوں نے مشرقی بنگال میں جا کر مسٹر سہروردی سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ امریکہ میں جا کر بڑے بڑے کارخانوں کی مشینیں خرید لاؤں اور مشرقی بنگال میں کارخانے قائم ہوں تا کہ ملک کی ثروت بڑھے۔ وہ امریکہ جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ 15 راگست 1947 کو ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کا اعلان ہوگیا اور مشرقی بنگال پاکستان کا

ایک صوبہ بن گیا اور پرانی کونسل جس کے پرائم منسٹر مسٹر سہروردی تھے ختم ہوگئی۔ اب مشرقی بنگال کی نئی منسٹری بنی جس کے وزیر اعظم خواجہ سر ناظم الدین ہوئے۔ خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ ہم ابھی امریکہ سے مشینیں خریدنے کا انتظام نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب انگلستان اور امریکہ جانے کی تیاری کر چکے تھے۔ ان کی بے چین طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ وہ اتنی تیاری کے بعد اپنا جانا ملتوی کریں۔ انھوں نے سفر کا تہیہ کرلیا کہ ہم ضرور جائیں گے اور چلتے وقت کہا کہ مشرقی بنگال کی گورنمنٹ جب دیکھے گی کہ میرے سفر کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا ہوا تو وہ سفر خرچ دینے میں دریغ نہ کرے گی۔ چنانچہ وہ یہاں سے روانہ ہو کر انگلستان پہنچے وہاں کچھ دنوں تک کام کیا پھر وہ امریکہ چلے گئے۔ لیکن صحیح واقعات نہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے انگلستان میں کیا کیا اور امریکہ میں جا کر کیا کیا۔ امریکہ سے واپس انگلستان آئے اور انگلستان سے سر آغا خاں صاحب سے ملنے کے لیے پیرس پہنچے۔ پیرس سے ہوائی جہاز کے ذریعہ سے وہ لندن جا رہے تھے کہ بدقسمتی سے ان پر فالج گرا۔ لندن میں جب جہاز پہنچا تو وہ بے ہوش تھے۔ ان کو لندن کے اسپتالوں میں داخل کر دیا گیا اور وہاں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے قریب دو یا تین ہفتہ تک ان کا علاج کیا۔ ڈاکٹروں کو شروع ہی سے مایوسی ہوگئی تھی۔ آخر کو اسی بیماری میں دنیا سے رحلت فرما گئے۔ ان کا جنازہ ہندوستان آیا اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے یونیورسٹی کی جامع مسجد میں سرسید کے مزار کے قریب طالب علموں نے ان کو دفن کر دیا۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے انتقال سے قوم کو ضرور نقصان پہنچا۔ وہ بڑے کام کے آدمی تھے اگر زندہ رہتے اور تندرست رہتے تو انڈین یونین کے چار کروڑ مسلمانوں کو ان کی موجودہ مصیبتوں میں کچھ نہ کچھ سہارا ملتا لیکن خدا کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہمارے خیالی منصوبے اور امیدیں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین مسلمانوں کی ہمدردی میں ہمہ تن منہمک رہے گو منتظمین یونیورسٹی کی رائے سے ان کی رائے نے کبھی ٹکر نہیں کھائی لیکن جن دنوں میں وہ یونیورسٹی کی ملازمت سے علاحدہ ہوئے اور کئی سال تک علاحدہ رہے اس اپنی علاحدگی کے زمانے میں بھی وہ یونیورسٹی کے لیے کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہے۔ آخر کو انھوں نے ایک ایسا کام کیا کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے

ان سے زیادہ بہتر کام اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑے نبض شناس آدمی تھے۔ 1944 تک عالم گیر جنگ میں بہت سے تغیرات ہوتے رہے اور آخر کو 1944 میں جرمنی اور جاپان اور ان کے ساتھی سب کے سب شکست کھا کھا کر بیٹھ گئے اور اتحادیوں کا بہت ہی زور دوزہ ہو گیا۔ اس زمانے میں کمانڈر انچیف نے اشارتاً ذکر کیا کہ ہم کو ایک میڈیکل کالج کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے زخمی سپاہی اس میں داخل کیے جا سکیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین بھانپ گئے کہ اس وقت انگریزوں کو ایک میڈیکل اسپتال کی سخت ضرورت ہے اس لیے علی گڑھ میں میڈیکل کالج اور اسپتال قائم کرنے کا انھوں نے اعلان کر دیا اور چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ یہ کوشش تنہا ڈاکٹر سر ضیاء الدین ہی کی کوشش تھی۔ یونیورسٹی نے یعنی کورٹ یا کونسل نے اس میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کا میل ملاپ اور حکام رسی اس وقت ان کے بہت کام آئی اور بڑے بڑے حکام سے والیان ریاست اور دیگر متمول اشخاص کے نام سفارشیں لکھوائیں۔ وہ زمانہ ہندوستان میں دولت کے لحاظ سے بہت اچھا زمانہ تھا۔ امریکہ اور یورپ کی دولت کی، بقول ایک ساہوکار کے، ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ایسے موقع سے ڈاکٹر صاحب نے بڑے ہوشیاری سے فائدہ اٹھایا اور دو تین سال کے اندر بہت روپیہ جمع ہو گیا۔ اس کی صحیح تعداد تو مجھے نہیں معلوم ہوئی لیکن عام طور پر مشہور ہے کہ پچاس لاکھ روپیہ جمع ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اگر امریکہ اور یورپ نہ جاتے اور اطمینان سے یہاں بیٹھے میڈیکل کالج کے قائم کرنے کے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے کوشش کرتے رہتے تو میڈیکل کالج ان کی زندگی ہی میں قائم ہو جاتا اور اب ہمارا ملک ان کی کوشش سے نفع حاصل کرتا دکھائی دیتا۔ افسوس ہے کہ ان کی بے چین طبیعت ان کو امریکہ اور یورپ لے گئی اور سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ روپے جمع کرنے کے بعد بھی وہ کالج قائم نہ کر سکے اور یہ معاملہ اب تک ادھر میں لٹکا ہوا ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کے کاموں کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یونیورسٹی کا قانون بنانے میں میری اور ان کی پوری شرکت رہی۔ متعدد مرتبہ ڈیپوٹیشن کے ساتھ ہم لوگ شملہ گئے اور پھر لکھنؤ اور دہلی اور علی گڑھ میں قوانین کے تیار کرنے کے مسودات تیار ہوتے رہے۔ ان مسودات کے تیار کرنے میں ہم دونوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ گورنمنٹ کے سامنے ایک مسئلہ میں ان کا اور میرا اختلاف تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اسٹاف کے ممبر تھے اور میں کورٹ یعنی پرانی ٹرسٹیوں کی جماعت کا

ممبر تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ قانون ایسا بنے کہ اسٹاف کورٹ کا اثر مانے اور اس کے مطابق عمل کرے اور ڈاکٹر سر ضیا الدین بھی کہتے تھے کہ کورٹ میں ایسے لوگ شامل ہوں گے جو تعلیم کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتے ہوں گے۔ اس لیے انتظامی معاملات میں کورٹ کو زیادہ دخل نہیں ہونا چاہیے اور اسٹاف کو کام کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک انگریز سکریٹری جن کا نام میں اس وقت بھولتا ہوں، ڈاکٹر سر ضیاءالدین کے ہم خیال تھے اور مجھے مسٹر کورٹ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اگر جلسے میں ذرا دیر میں پہنچتا تھا تو پوچھتا تھا کہ مسٹر کورٹ کہاں ہیں۔ یہ ایک مذاق کی بات تھی، لیکن یہ انگریز گو غیر قوم اور غیر ملک کا آدمی تھا لیکن مسلمانوں کی تعلیم سے اس کو ہمدردی تھی۔ وہ اس ملک کے حالات سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ دوسری کسی یونیورسٹی میں مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے اچھے مواقع نہیں مل سکتے اس لیے ان کو ایک جداگانہ یونیورسٹی کی سخت ضرورت ہے۔

یہ میرا مضمون ڈاکٹر سر ضیاءالدین کی سوانح عمری پر پورا حاوی نہیں ہے۔ ان کی سوانح عمری کوئی اور صاحب لکھیں گے۔ امید ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ کوئی بات اس زمانے کے حالات کے خلاف نہ لکھی جائے۔ سوانح عمریاں لکھنے والے اپنے اپنے ممدوح کے جانب دار بن جاتے ہیں اور ان کے سر پر کامیابی کا سہرا باندھنے کے لیے بہت سی سچی اور جھوٹی باتیں لکھ دیا کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاءالدین کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے گا اور کیونکہ میں نے عمر بھر ان کے ساتھ کام کیا اس لیے مجھے کسی غلط یا مبالغہ آمیز بات لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ عبداللہ کمیٹی کا ذکر رحمت اللہ کمیٹی نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ عبداللہ کمیٹی میں صرف اکیلا میں ہی نہیں تھا بلکہ اسٹاف کے ممبروں میں سے دو تین آدمی تھے جو ڈاکٹر سر ضیاءالدین کے مخالف نہیں تھے۔ اور جو کورٹ کے ممبران میں سے تھے وہ بھی ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے خلاف نہیں تھے۔ اس لیے کوئی بات ایسی نہیں لکھی گئی تھی جس سے ڈاکٹر ضیاءالدین پر کوئی حرف آتا۔ بائیس ممبران اسٹاف کی شہادت لی گئی تھی اور ان ہی کی شہادت پر یہ رپورٹ مرتب کی گئی تھی۔ اگر ڈاکٹر سر ضیاءالدین مرحوم اس رپورٹ کو مان لیتے اور اس پر عمل کرتے تو گورنمنٹ کے قائم کیے ہوئے کمیشن کی ضرورت نہ پڑتی اور معاملہ سلجھ جاتا۔ عبداللہ کمیٹی

کی رپورٹ میں کل واقعات آ گئے تھے جو رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ میں آئے۔ لیکن ان دونوں کمیٹیوں کی رپورٹیں دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت اگر ایک ہی بات دو آدمیوں کے منہ سے نکلے تو سننے والے کہنے والوں کی زبان سے جو بات نکلی ہے اس کے متضاد معنی پیدا کریں گے۔ یہی بات عبداللہ کمیٹی کی رپورٹوں پر صادق آتی ہے۔

خان بہادر مولوی عبیدالرحمٰن شروانی

مولوی عبیدالرحمان صاحب 1947 کے قیامت خیز ہنگاموں کے دوران ٹریزرارشپ کے عہدے سے رخصت لے کر کسولی اپنے بیمار بیٹے کو دیکھنے گئے اور کورٹ میں اپنا جلسہ کر کے مسٹر زاہد حسین صاحب کو وائس چانسلر مقرر کر دیا۔ عبیدالرحمٰن صاحب کو گورنمنٹ سے خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا اور یوپی کونسل کے ممبر بھی تھے۔ وہ مستقل طور پر کبھی وائس چانسلر نہیں رہے لیکن طالب علموں کی شورش کے زمانے میں وقتاً فوقتاً ان کو موقعے ملے کہ وہ وائس چانسلری کا کام انجام دیتے رہے کیونکہ انھوں نے آزادی سے کوئی مستقل کام نہیں کیا تھا اور نہ ان کو اختیارات تھے کہ وہ کوئی مستقل کام کریں اس لیے ان کے اوصاف وائس چانسلری کے متعلق لکھنے کی زیادہ توضیح کی گنجائش نہیں ہے۔

زاہد حسین

زاہد حسین صاحب ایک بہت بڑے قابل حساب داں آدمی تھے۔ گورنمنٹ کے صیغۂ حسابات و مالیات میں شروع سے کام کیا اور یونیورسٹی کی ضرورتوں کی وجہ سے ان سے خواہش کی گئی کہ وہ کسی مستقل وائس چانسلر کے تقرر تک عارضی طور پر وائس چانسلری کے عہدے کا کام کرتے رہیں۔ انھوں نے اس بات کو منظور فرمایا اور جتنے مہینے بھی وہ یہاں کام کرتے رہے ان کی قابلیت کا لوہا تمام دفاتر مانتے رہے۔ ایک موقع پر مجھے یاد ہے کہ میرا ایک کام تھا جو بہت دنوں سے تعویق میں پڑا ہوا تھا اور دفتر والے بیسیوں حجتیں پیش کرتے تھے اور معاملہ بیچ میں ویسا ہی لٹک رہا تھا۔ ایک دن وہ معاملہ میں نے زاہد حسین صاحب کے سامنے پیش کرایا۔ کلرک متعلقہ کو بلایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ تم اس معاملے کو ڈھیل میں کیوں ڈال رہے ہو۔ انھوں نے بیسیویں حجتیں پیش کیں جن میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی کہ جس کے اوپر کوئی افسر توجہ کرے۔ محض حجتیں ہی حجتیں تھیں اس لیے زاہد صاحب نے کاغذ اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے قلم سے خود ہی حکم لکھ ڈالا اور زبان سے یہ کہتے

جاتے تھے کہ قانونی قبضیں اپنی جگہ پر ہیں لیکن کام میں خرابی نہ آنی چاہیے اور اتنے دنوں سے رُکا ہوا معاملہ انھوں نے دو منٹ میں فیصل کر دیا۔ میرے خیال میں اگر کسی محکمہ یا ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسران اسی اصول پر عمل کرنا شروع کر دیں کہ کام میں خرابی نہیں آنی چاہیے اور قانونی عذرات جو غیر موثر ہیں ان کی وجہ سے کام میں تعویق نہیں ہونی چاہیے تو سو میں سے نوے معاملات نہایت آسانی سے ضرورت کے وقت طے ہو سکتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد جب پاکستان کی گورنمنٹ بنی تو پاکستان کے منسٹروں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اچھے کام کرنے والوں کو ہندوستان سے اپنے ساتھ لے جائیں اور ان کے سپرد کام کریں۔ چنانچہ زاہد صاحب سے بھی خواہش کی گئی کہ تم بھی ہمارے ساتھ پاکستان چلو۔ وہ رضامند ہو گئے اور یونیورسٹی کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں جا کر اسٹیٹ بینک پاکستان کے گورنر ہو گئے۔

نواب محمد اسماعیل خاں

نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کو مسلم یونیورسٹی کورٹ نے مستقل وائس چانسلر مقرر کیا اور نواب صاحب کا خاندانی حق تھا کہ وہ کالج کی خدمت کریں۔ ان کے والد مرحوم نواب محمد اسحاق خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد نے نواب وقار الملک مرحوم کے بعد عرصہ چار سال تک ایم اے او کالج کی سکریٹری شپ کا کام بڑی کامیابی سے انجام دیا تھا۔ نواب اسحاق خاں صاحب مرحوم نے اپنے تین صاحبزادے چھوڑے۔ سب سے بڑے صاحبزادے کا نام محمد اسماعیل خاں تھا اور جن کو اپنے باپ کی جگہ نوابی کا خطاب ملا تھا۔

نواب محمد اسماعیل خاں صاحب اپنی خاندانی شرافت اور نیک مزاجی کی زندہ تصویر تھے۔ وسیع النظر اور بہی خواہ قوم وملت تھے۔ نواب صاحب نے بیرسٹری کا امتحان انگلستان جا کر پاس کیا تھا۔ نواب محمد اسحاق خاں صاحب کے بعد جائداد پر بحیثیت مہتمم انہی کا قبضہ ہوا اور اپنے بھائیوں اور دوسرے عزیزوں کے جو کچھ حقوق اس جائداد میں تھے بڑی دیانت سے ان سب کو اپنے اپنے حقوق دیتے رہے۔

نواب محمد اسماعیل خاں صاحب نے بمقام میرٹھ اپنی وکالت شروع کی اور بعد میں چھوڑ دی اور اپنی جائداد کا انتظام کرتے رہے۔ لیکن جب ایم۔ اے۔ او کالج یونیورسٹی میں تبدیل

ہو گیا تو ایک ٹریزرار یا خزانچی کا عہدہ یونیورسٹی کے قوانین میں قائم ہوا۔ اس وقت سب سے اوّل اس عہدے پر نواب سید محمد علی صاحب مقرر ہوئے۔ اس کے بعد قریب چھ [illegible]ل تک میں نے اس عہدے کا کام انجام دیا اور میرے بعد تھوڑے دنوں تک خان بہادر سید ز[illegible] مدین صاحب نے یہ کام کیا۔ پھر نواب محمد اسماعیل خاں صاحب نے چند سال تک اس عہد[illegible] کا کام کیا۔ درمیان میں کچھ دنوں کے لیے عارضی طور پر وائس چانسلر کے عہدے کا کام بھی ا[illegible] دیا تھا۔ لیکن آخر کو نواب اسمٰعیل خاں صاحب کو کورٹ نے مستقل وائس چانسلر مقرر کیا جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ نواب صاحب نے کوئی ڈیڑھ سال تک اس عہدے کا کام انجام دیا۔ لیکن چونکہ ان کو عمر بھر تعلیمی اشغال سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور اس زمانے کی یونیورسٹیاں خواہ صحیح خواہ غلط خیال سے اس بات پر مصر ہیں کہ کسی بڑی تعلیمی درس گاہ کا افسر اعلیٰ (جیسی کہ یونیورسٹیاں ہیں) کسی ایسے شخص کو ہونا چاہیے جس کو اپنی عمر کے بہت بڑے حصے میں تعلیمی معاملات میں شغف رہا ہو۔

نواب محمد اسماعیل خاں صاحب خود بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے لیکن جب ان سے ایک مرتبہ جناب مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے اشارتاً ذکر کیا کہ گو آپ وائس چانسلری کے ہر طرح سے مستحق و قابل ہیں لیکن اگر کوئی شخص جس کی عمر تعلیمی معاملات میں گزری ہو اور آپ کی جگہ وائس چانسلر ہو جائے تو اس کی موجودگی سے یونیورسٹی کی اندرونی اور بیرونی حالت پر اچھا اثر پڑیگا۔ نواب صاحب نے (جو ایک نہایت شریف طبع اور بے شر انسان تھے) اس تذکرہ کا خیال اپنے دل میں رکھا اور اس تذکرہ کے بعد جو کورٹ کا جلسہ ہوا تو نواب اسمٰعیل خاں صاحب نے اس عہدے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو خود نامزد کیا۔ کورٹ نے ان کی نامزدگی منظور کی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب 1948 کے آخر میں وائس چانسلر کے عہدے پر مقرر ہو گئے اور نواب محمد اسماعیل خاں صاحب علاحدہ ہو گئے۔ نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کے زمانۂ وائس چانسلری میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ اس کو خصوصیت سے نمایاں کیا جائے۔ لیکن نواب صاحب کی نامزدگی ایک ایسا واقعہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسا آدمی یونیورسٹی کو ملا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے آنے سے واقعی یونیورسٹی کے اندرونی اور بیرونی حالات پر بہت اچھا اثر پڑا ہے اور خدا اگر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو صحت عطا کرے تو ان کے زمانے میں

یونیورسٹی بہت کچھ ترقی کرے گی۔اور یونیورسٹی میں جو کام ان کے ہاتھ سے انجام پائیں گے ان کی وجہ سے یونیورسٹی کو ایک خصوصیت اور نام آوری کی عزت ملے گی۔اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کام کر رہے ہیں اس لیے ان کی وائس چانسلری کے بارے میں مختتم طور پر کوئی بات نہیں لکھی جا سکتی۔البتہ ایک بات ان کے عہدے کے دوران میں ایسی پیش آ چکی ہے جس کا ذکر اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔اور وہ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب دل کی علالت کے مریض ہیں ان کو دل کے دورے پڑتے ہیں اور ڈاکٹر لوگ ان کو کام کرنے سے منع کرتے ہیں۔ علاوہ بریں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کی پارلیامنٹ کے ممبر بھی ہیں اور ان کو بعض اوقات علی گڑھ سے غیر حاضر رہنا پڑتا ہے۔اس لیے ڈاکٹر صاحب نے کچھ دنوں کے لیے اپنا کام پروفیسر حیدر خاں صاحب مرحوم کے سپرد کر دیا تھا۔حیدر خاں صاحب مرحوم نے جس قابلیت اور خوبی سے اس قائم مقامی کے زمانے میں کام انجام دیا اس کا ذکر مختصر الفاظ میں کرنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب قائم گنج کے ایک معزز خاندان کے فرد ہیں۔انھوں نے علی گڑھ کے ایم۔اے۔او کالج میں تعلیم حاصل کی۔لیکن خلافت کے ہنگامے کے وقت جب علی برادران مہاتما گاندھی کو اپنے ساتھ لے کر علی گڑھ کالج کو ختم کرنے کی غرض سے علی گڑھ آئے اور انھوں نے یہاں پر ایک شورش برپا کی اور طالب علموں پر اثر ڈالا جس کی وجہ سے کالج کے تقریباً سات سو طلبا نے کالج کی طالب علمی سے ہڑتال کی اور کالج چھوڑ کر چلے گئے۔اسی گروہ میں ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی شریک ہو گئے اور وہ بھی کالج چھوڑ کر چلے گئے۔یہاں سے جانے کے بعد وہ بغرض تکمیل تعلیم جرمنی چلے گئے۔اور وہاں جا کر انھوں نے تعلیم حاصل کی اور اقتصادیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ان کی غیر حاضری میں علی برادران نے علی گڑھ میں ایم۔اے۔او کالج کے مقابل میں ایک ادارہ قائم کیا اور جس کا نام جامعہ ملیہ رکھا۔علی برادران کوئی تعمیری کام کرنے کے امیدوار یا خواہش مند کبھی نہیں رہے۔ہر جگہ ہنگامہ پردازی ان کا مسلک رہا۔اس لیے ایم۔اے۔او کالج کو نقصان پہنچانے کے بعد انھوں نے جو تعمیری کام کے لیے ادارہ قائم کیا اس میں خود کوئی کام

نہیں کیا۔ بلکہ جناب عبدالمجید صاحب خواجہ بیرسٹر کو اس ادارہ کا شیخ الجامعہ بنایا۔ شیخ الجامعہ صاحب بھی غالبًا اس ادارے پر اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے ہوں گے۔ اس لیے اس میں کوئی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جناب حکیم اجمل خاں صاحب اور جناب ڈاکٹر انصاری صاحب نے اس ادارے کو دلّی میں منتقل کرنے کی رائے دی اور وہاں ان کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسے ایک نہایت قابل تعلیم یافتہ نوجوان مل گئے اور ان کو ترغیب دی کہ وہ اس جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ چنانچہ اب خواجہ صاحب کی جگہ وہی شیخ الجامعہ ہو گئے اور ادارہ دِلی منتقل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑے ایثار و خلوص کے ساتھ اس ادارے کے کام میں اپنا وقت دینا شروع کیا، گو بہ لحاظ اُن کی تعلیمی قابلیت کے ان کو کوئی اچھی نوکری مل سکتی تھی لیکن انھوں نے اسی ادارے کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس ادارے کے پاس کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ملک میں ایثار کی ایک مثال قائم کی اور اپنے روز مرّہ کے خرچ کے لیے پچھتر روپیہ ماہانہ لینا قبول کیے۔ اس ادارے کے لیے بعد میں روپیہ بھی آتا رہا اور اس میں کام بھی ہوتا رہا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے باوجود روپے کے ہونے کے بھی صرف پچھتر ہی روپے ماہوار پر اکتفا کیا۔ اوّل تو کچھ عرصہ کے لیے گورنمنٹ سے اس ادارے کے لیے نہ کوئی گرانٹ مانگی اور نہ قبول کی۔ لیکن بعد میں سنٹرل گورنمنٹ نے اپنی فیاضی سے اس ادارہ کو امداد دینی شروع کی۔ لیکن مجھ کو معلوم نہیں کہ گورنمنٹ کی امداد کے بعد اپنے لیے تنخواہ زیادہ کرائی یا نہیں۔ لیکن عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ ڈاکٹر صاحب ایثار سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے اس ایثار کی وجہ سے میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ اور دو تین مرتبہ جب میں دلی گیا تو قصد کر کے اوکھلے کے مقام پر جہاں ان کی رہائش تھی ان سے ملنے گیا۔ گورنمنٹ کی امداد کے بعد انھوں نے اس ادارے کے لیے عمارات بھی بنوائیں۔ جن عمارات کی سفید سفید گملیاں دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ انہی عمارات میں کچھ تالیف اور تصنیف کا بھی کام ہوتا تھا۔ اور بعض نوجوانوں نے اپنی توجہ تصنیف اور تالیف کی طرف لگائی اور یہ بھی ملک کے لیے ایک اچھی مثال اور نمونہ تھی کہ جو لوگ اس ادارے میں کام کرتے تھے وہ بھی جب تک روپیہ نہیں ملا اپنے خرچ کے لیے کچھ معمولی رقم لیتے رہے اور کہیں نوکری یا کوئی نفع کا کاروبار نہیں کیا۔ ان میں اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے جن کے متعلق جزوی حالات سے مجھ کو واقفیت نہیں۔ اسی

دوران میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے کسی قابل اور ہمدرد وائس چانسلر کی ضرورت ہوئی تو مولانا ابوالکلام صاحب آزاد وزیر تعلیمات حکومت ہند نے نواب محمد اسماعیل خاں صاحب سے جو اس عہدے کا کام کر رہے تھے، کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس عہدہ کے لیے نامزد کیا جائے۔ نواب صاحب موصوف نے بھی ایک ایثار کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے قائم کیا اور کورٹ کے جلسے میں خود ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا نام پیش کیا۔ اور خود اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ کورٹ کے جلسے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کی جگہ پر بالاتفاق ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا تقرر ہو گیا۔ اس عہدہ پر قریب آٹھ سال تک ڈاکٹر صاحب موصوف نے کام کیا اور مسلم یونیورسٹی کی مالی حالت ان کے زمانے میں بہت بہتر ہو گئی۔ سنٹرل گورنمنٹ سے اس امداد پر جو پہلے ملا کرتی تھی بہت اضافہ ہو گیا۔ اور سنٹرل گورنمنٹ کی ایک تجویز کے تحت ان یونیورسٹیوں میں یہ یونیورسٹی بھی شامل کی گئی جن کو سنٹرل یونیورسٹیاں مانا گیا اور سالانہ امداد 15/ لاکھ تک پہنچی۔ اور متعدد بڑی بڑی عمارات کی تکمیل بھی ہوئی۔ بالخصوص انجینیرنگ کالج کی بلڈنگ کی تکمیل ہوئی۔ ان ہی کے زمانے میں انجینیرنگ کالج کے لیے خاص امداد ملی اور اسٹاف وطلبا کی تعداد میں بہت اضافے ہوئے اور سالانہ کم وبیش سو سو طلبا پاس ہو کر نکلنے لگے۔ ان سے پہلے ہمارے انجینیرنگ کالج کے پاس شدہ طلبا کا حکومت ہند کے عہدوں پر تقرر مشکل سے ہوتا تھا اور مسلمان پاس شدہ طلبا مجبور ہو کر پاکستان چلے جاتے تھے۔ اور وہاں ان کو نوکریاں مل جاتی تھیں۔ انھوں نے کوشش کی تو حکومت ہند بھی مسلمان طلبا کو نوکریاں دینے لگی۔ چونکہ زیادہ تر روپیہ حکومت کا اس کالج پر صرف ہوتا تھا۔ اس لیے ہندو احباب نے تقاضا کیا کہ اس کالج سے ہندو طالب علم زیادہ پاس ہونے چاہییں اور ان کو نوکریاں ملنی چاہییں۔ چنانچہ ان کی وائس چانسلری کے آخری تین چار سال میں ہندو مسلمانوں کی تعداد قریب قریب برابر اس ادارے سے ہر سال کامیاب ہو کر نکلنے لگی اور سب کو حکومت ہند کی نوکریاں ملنے لگیں۔

اس یونیورسٹی کے چانسلر زیادہ تر ہندوستانی ریاستوں کے مسلمان رئیس ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ شروع شروع میں علیا حضرت عرش آشیانی ہز ہائی نس بیگم صاحبہ بھوپال اس کی چانسلر ہوتی تھیں۔ ان کے بعد نواب حمید اللہ خاں صاحب چانسلر رہے۔ ان کے بعد ہز اگزالٹڈ ہائی نس

نظام حیدرآباد کئی سال تک چانسلری کے عہدے پر فائز ہوتے رہے۔ان کے بعد ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کا اس عہدے پر تقرر ہوتا رہا۔چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں نواب صاحب رام پور بھی چانسلری سے خود علاحدہ ہو گئے اور اب ملک میں کوئی مسلمان حکمراں باقی نہ رہا۔کیونکہ تمام ملک میں ریاستیں ختم ہو گئی تھیں اور اس بات کی فکر ہوئی کہ اس عہدے پر کس کا تقرر کیا جائے۔ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے غور وفکر کے بعد اس عہدے کے لیے جناب سیّدنا مولانا ملّا طاہر سیف الدین صاحب کو تجویز کیا۔سب لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے رائے سے اتفاق کیا اور سیّدنا صاحب موصوف چانسلر مقرر ہو گئے۔ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے زمانے ہی میں ان کی میعاد تقرر ختم ہونے کے بعد کوئی دوسرا آدمی دکھائی نہ دیا اور دوبارہ سیدنا موصوف ہی کا اس عہدہ پر تقرر ہوا اور اب سیدنا موصوف ہی اس یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔سیّدنا موصوف ایک بڑے پایہ کے بزرگ ہیں۔وہ عربی کے بڑے عالم ہیں اور بوہروں کی جماعت کے مذہبی پیشوا ہیں اور ان کے دل میں قوم کی محبت ہے۔وہ وقتاً فوقتاً علی گڑھ میں آکر قیام کرتے ہیں اور یونیورسٹی کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ایک بڑے ہوسٹل کے لیے جس کا نام سیفی ہوسٹل ہوگا اس کی تعمیر کے لیے سیدنا موصوف نے ایک گراں قدر عطیہ مرحمت کیا ہے جس کی تعمیر عنقریب شروع ہونے والی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا 1956 میں دوسرا ٹرم تھا اور لوگ چاہتے تھے کہ پھر دوبارہ ان ہی کا تقرر کیا جائے لیکن انھوں نے منظور نہیں فرمایا۔اور یہاں سے جا کر جامعہ ملّیہ میں پھر اپنی سکونت اختیار کی اور ممبران کورٹ نے کوشش کر کے سید بشیر حسین صاحب زیدی کو ان کی جگہ وائس چانسلر مقرر کیا۔جن کا دور وائس چانسلری امید ہے بہت مبارک ہوگا۔اور مسلم یونیورسٹی کو بہت فائدہ پہنچے گا۔کرنل زیدی صاحب نے آتے ہی یونیورسٹی کے کاموں میں دل سے کام کرنا شروع کیا اور بہت سے کام جن میں تساہل ہو رہا تھا ان کو نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور امید ہے کہ ان کے زمانے میں میڈیکل کالج جو معرض التوا میں پڑا ہوا تھا اور جس کے لیے قریب ساٹھ لاکھ کے روپیہ یونیورسٹی کے پاس جمع ہے وہ پائے تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے مستحق تھے کہ گورنمنٹ ان کو کوئی بڑا عہدہ عطا کرے۔چنانچہ اس سال یعنی 1957 میں حکومت ہند نے صوبہ بہار کا ڈاکٹر صاحب موصوف کو گورنر مقرر کر دیا،اس عہدہ کا چارج

انھوں نے 6 رجولائی 1957 کو لے لیا۔ہم صوبہ بہار کے رہنے والوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کو ڈاکٹر صاحب موصوف جیسا بیدار مغز اور ہمدرد انسان ملا ہے۔میری خدا سے دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف زندہ اور تندرست رہیں اور ان کو جمہوریہ ہند میں بڑے سے بڑا عہدہ ملے۔آمین۔

کرنل ایم حیدر خاں

کرنل ایم حیدر خاں صاحب کو ''کرنل'' یہ فوجی عہدے کا خطاب گورنمنٹ سے ملا تھا۔ وہ کئی سال تک یو۔پی کے یو۔ٹی۔سی کے اعلیٰ افسر رہے تھے اور اس افسری کی وجہ سے وہ کیپٹن پھر میجر پھر لفٹیننٹ کرنل اور پھر کرنل کے خطابات ملے تھے۔کرنل حیدر خاں بڑے خوش انتظام انسان تھے۔جس کام کو وہ اپنے ہاتھ میں لیتے تھے اس کو بہت انہماک اور کامیابی کے ساتھ کرتے تھے۔وہ ہر سال گرمیوں کے موسم میں کسی پہاڑی مقام پر یو۔ٹی۔سی کے طلبا کا دستہ لے کر جایا کرتے تھے اور وہاں ان کو فوجی کرتب سکھاتے تھے۔ان کی ماتحتی میں اور بھی لوگ ہوتے تھے۔لیکن روپے وغیرہ کا انتظام ان ہی کے سپرد ہوتا تھا۔فوجی افسروں اور سول کے افسروں میں وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔سب کی نگاہ میں ان کی بہت عزت تھی۔

کرنل حیدر خاں صاحب مرحوم حشمت اللہ خاں صاحب مرحوم لکھنوی کے صاحب زادے تھے۔حشمت اللہ خاں صاحب مرحوم نے خود کوئی زیادہ تعلیم نہیں پائی تھی لیکن آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں سے بہت زیادہ اچھا کام کرنے والے افسر تھے۔انھوں نے صرف مکتب کی تعلیم پائی تھی اور لکھنؤ سے جا کر ریاست نابہن ضلع انبالہ میں نوکر ہو گئے تھے اور وہاں لکھنؤ سے جا کر ریاست کشمیر میں چلے گئے اور وزیر وزارت یعنی کلکٹری کے عہدے پر مقرر ہو گئے۔وہ زیادہ تر گلگت ایجنسی میں ہی رہے اور اپنی زمانۂ ملازمت میں ایک ایسا کام کر گئے جو آج تک کسی دوسرے نے نہیں کیا اور وہ کام یہ ہے کہ انھوں نے ایک بہت بڑی ضخیم کتاب لکھی اور اس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کی پنجاب کی حکومت کے عروج و زوال پر بہت خوبی سے روشنی ڈالی اور اس کے بعد راجگان کشمیر کے خاندانی حالات اور ان کے عروج و زوال کی مفصل تاریخ لکھی۔ان کی کتاب اپنے مضمون کے لحاظ سے ایک بے مثل اور نادر کتاب ہے۔انھوں نے ایسے واقعات اپنی کتاب میں درج کیے ہیں جن کا کسی دوسری جگہ پتہ و نشان بھی نہیں تھا۔مہاراجہ گلاب سنگھ جموں کے ایک ڈوگرہ راجپوتوں کے خاندان

سے تعلق رکھتے تھے۔ سکھوں کی حکومت پنجاب اور کشمیر کے بعد کشمیر کی حکومت پر قابض ہو گئے۔
مہاراجہ گلاب سنگھ، ان کی اولاد اور حکومت کے حالات اس کتاب میں تفصیل سے ملتے ہیں۔

مہاراجہ گلاب سنگھ ایک معمولی ڈوگرہ سپاہی تھے۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں انھوں نے ملازمت کی اور سپاہی کے درجہ سے ترقی کر کے رسالے کے ایک بڑے افسر ہو گئے اور اپنے بھائی راجہ دھیان سنگھ کو بھی اپنے پاس بلا لیا جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بہت بڑے معتمد وزیروں میں شمار ہونے لگے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی پیدائش جموں کے علاقے میں ہوئی تھی۔ جموں کے علاقے میں ڈوگرہ راجپوت اس زمانے میں حکومت کرتے تھے۔ لیکن گلاب سنگھ حکمرانوں کے خاندان کے آدمی نہیں تھے۔

جب سکھوں کی حکومت کا زوال ہوا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کا بازار گرم ہو گیا تو مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے بھائی دھیان سنگھ نے بہت بڑے بڑے کام انجام دیے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں انگریزوں کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ پنجاب کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کریں لیکن جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد ان کا بیٹا اور پوتا اور دوسرے لوگ یکے بعد دیگرے اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے تو انگریزوں نے موقع دیکھ کر پنجاب پر چڑھائی کر دی۔ تاریخوں میں طالب علموں کو بعض لڑائیوں کا ذکر پڑھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ جن میں ملتان، جلیان والہ اور گجرات کی لڑائیاں بہت مشہور ہیں۔ ان لڑائیوں میں بعض وقت انگریزوں کو شکست بھی ہوئی لیکن چونکہ اس وقت سکھوں کا کوئی سر دھرا باقی نہ رہا تھا۔ اور آپس میں مخالفت اور حسد کے مظاہرات روزانہ ہوتے رہتے تھے اس لیے انگریزوں کا روکنا کچھ آسان نہیں تھا۔ آخر کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خوردسال لڑکا دلیپ سنگھ باقی رہ گیا اور اس کی طرف سے افسران فوج نے اور بالخصوص گلاب سنگھ نے انگریزوں سے 1846 میں ایک عہد نامہ کیا اور ان عہد نامہ کی رو سے پنجاب مع کشمیر کے انگریز کمپنی کے سپرد کر دیا گیا۔ اور دلیپ سنگھ کو چار لاکھ روپے سالانہ کی پینشن دے کر پنجاب سے باہر بھیج دیا گیا اور بعد کو انگلستان بھیج دیا گیا اور وہیں پر دلیپ سنگھ نے شادی وغیرہ کی اور وہیں بچے ہوئے اور آخر کو سب وہیں پر مر کھپ گئے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ نے کمپنی کو طمع دے کر کشمیر انگریزوں سے خرید لیا اور پچھتر لاکھ روپیہ

انھوں نے انگریز کمپنی کو دیا اور کشمیر کے کلیتاً مالک ہو گئے اور کشمیر کے ساتھ انھوں نے نیت خور داور لاسہ وہزارہ کا ضلع بھی شامل کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اس علاقے کی قدر و قیمت سمجھنے میں قاصر رہے تھے، ورنہ اتنی کم قیمت میں اتنا بڑا علاقہ نہ دیتے۔ خود مہاراجہ گلاب سنگھ کے پاس اتنی ، ولت تو نہیں ہو سکتی تھی لیکن خانہ جنگیوں اور خلفشار کے زمانے میں سکھوں کی ریاست کے وہ مالک تھے اس لیے انھوں نے سکھوں ہی کے خزانے سے وہ رقم دی ہوگی۔ لیکن اس کا پتہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا اور نہ حشمت اللہ خاں صاحب مرحوم ہی نے اپنی کتاب میں اس کی کوئی صراحت کی ہے۔

حشمت اللہ خاں کی یہ مجلد کتاب میرے پاس ہے اور اگر کسی کو فرصت ہو اور کام کرنے کی خواہش بھی ہو تو وہ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر دے تو مجھے یقین ہے کہ انگلستان اور دوسرے ملکوں میں اس تصنیف کی بہت بڑی قدر ہوگی کیونکہ ایسی کتاب آج تک سکھوں کے آخری زمانے کی حکومت اور کشمیر کی حکومت پر کہیں نہیں ملے گی۔

حشمت اللہ خاں صاحب مرحوم جب کشمیر میں تھے انھوں نے حیدر خاں صاحب مرحوم کو علی گڑھ کے ایم۔اے۔او کالج میں تعلیم کے لیے بھیجا تھا۔ حیدر خاں صاحب نے ایم۔اے۔او کالج سے بڑی کامیابی کے ساتھ بہت اچھے درجہ میں بی۔اے پاس کیا پھر ان کا دل چاہا کہ وہ ولایت جا کر اپنی تعلیم کی تکمیل کریں۔ ان دنوں ٹاٹا کے تعلیمی فنڈ سے ہونہار طالب علموں کو وظائف بطور قرض کے ،کرتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب ملا کرتے ہیں یا نہیں لیکن حیدر خاں صاحب نے اس وظیفہ کو بطور قرض کے لینے کی کوشش کی اور درخواست دی۔ ان کی درخواست منظور ہوگئی اور وہ حصول تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے اور وہاں جا کر کیمبرج یونیورسٹی سے اعلیٰ امتحان پاس کیا اور نیز بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ ولایت سے لوٹ کر آئے تو علی گڑھ میں ہی مقیم ہوئے اور وکالت کرنی شروع کی۔ کچھ تھوڑے ہی دن وکالت کرنے پائے تھے کہ ایم۔اے۔او کالج میں لکچرار ہو گئے اور بڑھتے بڑھتے پروفیسر ہو گئے اور جو لوگ ان کے زمانے میں کالج سے تعلق رکھتے تھے یا کالج میں کام کرتے تھے اور جو ان کے کاموں سے واقف تھے ان کی متفقہ شہادت یہ ہے کہ ان سے زیادہ طلبا کے اندر ہر دلعزیز اور کوئی استاد نہیں تھا۔

کرنل حیدر خاں صاحب بڑے اصول کے انسان تھے جس بات کو وہ سمجھتے تھے کہ یہ

اچھی ہے اس کے لیے وہ ہر نوع سے کوشش کرتے تھے کہ وہ خوش اسلوبی سے انجام پائے اور جس کام کو وہ سمجھتے تھے کہ اس سے یونیورسٹی کو یا قوم کو مضرت پہنچے گی اس کی طرف وہ کبھی توجہ نہیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں نظر انداز کر دیتے تھے اور اصولی اور بڑی باتوں کے لیے اگر ضرورت ہوتی تھی تو سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کی انجام دہی میں ہر طرح سے کوشش کرتے تھے۔ اپنے اسٹاف کے ممبروں سے ان کو بہت زیادہ انسیت تھی۔ سب ان سے خوش رہتے تھے۔ طلبا یہ خیال کرتے تھے کہ ہمیں اگر کسی بات کی ضرورت ہوگی تو ہمارے حیدر خاں صاحب موجود ہیں، اپنی ضرورت ان ہی کے سامنے پیش کریں گے اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری ضرورت پوری ہو جائے گی۔ طالب علم کو اگر امتحان کے وقت کل فیس داخل کرنا ضروری ہوتی تھی اور اگر طالب علم کو وقت پر روپیہ کہیں سے نہ ملتا تھا تو وہ حیدر خاں کے پاس پہنچتا تھا۔ یہ طریقہ طالب علموں کا ہمیشہ سے تھا۔ کچھ وائس چانسلری پر ہی اس کا انحصار نہیں تھا۔ حیدر خاں طالب علم کی ضرورت کا حال سن کر سخت برہم ہوتے تھے اور اس کو کمرے سے نکال دیتے تھے کہ تم نے پہلے سے کیوں نہیں انتظام کیا تھا جو آج پریشان پھرتے ہو لیکن وہاں سے اٹھ کر جب دفتر میں آتے تھے تو اس طالب علم کی طرف سے اس کے ذمہ کا روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیتے تھے۔

جب اس طرح کی خبریں طلبا میں پہنچتی تھیں تو حیدر خاں کی ہمدردی اور محبت کے اور بھی گرویدہ ہو جاتے تھے۔ اور ایسی متعدد مثالیں ہر سال پیش آتی تھیں جیسی کہ اوپر بیان کی گئی ہیں۔ آخر میں مرض ذیابطیس کے سبب سے حیدر خاں صاحب زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ مارچ 1950 میں مسلم یونیورسٹی کونووکیشن کا جلسہ ہوا جس میں بحیثیت وائس چانسلر کے انھوں نے کل کام کیے۔ پنڈت گوبند بلبھ پنت وزیر اعظم اُتر پردیش کو اور اس احقر کو اور خان بہادر مولانا بشیر الدین صاحب کو اور خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب کو آنریری ڈگریاں ملیں۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد نواب صاحب رام پور اور پنڈت پنت نے اصرار کیا کہ بنارس میں جو تعلیم کے متعلق ایک بڑا جلسہ ہونے والا ہے اس میں اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ضرور شریک ہونا چاہیے۔ حیدر خاں صاحب بہت تھکے ہوئے تھے انھوں نے اوّل تو جانے سے انکار کر دیا لیکن نواب صاحب رامپور نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ میری کار سے دہلی چلے چلیے اور وہاں پر آپ کو ہوائی جہاز مل جائے گا تو کل صبح آپ

بنارس پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ وہ مجبوراً یہاں سے دہلی چلے گئے۔ وہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بنارس پہنچے لیکن راستے میں ہوائی جہاز کے سفر کی وجہ سے ان کے پھیپھڑے پر نمونیہ کا اثر ہوا اور دوسرے روز خبر ملی کہ وہ نمونیہ میں مبتلا ہیں۔ یہاں سے ممتاز جہاں بیگم ان کی بیوی بنارس پہنچیں۔ لیکن ان کا مرض بڑھتا ہی گیا اور آخر انھوں نے ملکٹر علی گڑھ کو لکھا کہ میرا تنفس خراب ہو گیا ہے سانس بہت دقت سے لیا جاتا ہے اس لیے میرے بچوں کو میرے پاس بھجوا دیجیے۔ چنانچہ لڑکا اور لڑکی دونوں یہاں سے بنارس بھیج دیے گئے۔ وہاں سے دن میں کئی کئی دفعہ خبر آتی تھی۔ کبھی کچھ اطمینان بخش ہوتی تھی اور کبھی تشویشناک ہوتی تھی۔ آخر کو 18/ مارچ 1950 کو خبر ملی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی بیوی جنازہ لے کر علی گڑھ آ رہی ہیں۔ دن کے دس بجے کی ٹرین سے ان کا جنازہ علی گڑھ پہنچا اور مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں چار بجے کے قریب دفن ہوئے۔

حیدر خاں کی خوبیاں سب کے سامنے موجود ہیں لیکن حیدر خاں زمین کے اندر بے حس و حرکت پڑے ہیں۔ ان کی بیوی ممتاز جہاں بیگم پر ایک تو اپنے شوہر کے انتقال کا صدمہ پڑا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کے خسر یعنی حیدر خاں کے والد حشمت اللہ خاں کا بھی علی گڑھ میں ہی انتقال ہو گیا اور جس طور پر وہ اپنے شوہر کا جنازہ بنارس سے علی گڑھ لائی تھیں اسی طور پر اپنے خسر کا جنازہ علی گڑھ سے لکھنؤ لے گئیں اور وہاں جا کر اس قبرستان میں دفن کیا جہاں ان کی بیوی دفن تھیں۔ حشمت اللہ خاں صاحب نے لکھنؤ میں ایک اپنا قیمتی مکان چھوڑا۔ ان کے تین بیٹے جو حیات ہیں وہ پاکستان میں ہیں۔ ان کو جائداد پر موجودہ قوانین کی کشمکش کی وجہ سے قبضہ نہیں ملا۔ جا ئداد کسٹوڈین کے قبضے میں آ گئی ہے۔ ممتاز جہاں بیگم کو کئی بار اس کی پیروی کے لیے لکھنؤ جانا پڑا ہے اور اب تک معاملہ ایسے ہی لٹکا ہوا ہے۔ ممتاز جہاں بیگم کے دونوں بچے لڑکا اور لڑکی نینی تال میں انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ لڑکے کا نام سلمان حیدر ہے جو شیرووڈ کالج میں پڑھتا ہے اور ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل رہتا ہے اور مختلف ورزشی کھیلوں میں بھی ہمیشہ مشغول رہتا ہے۔ لڑکی کا نام شہلا حیدر ہے جو کوئین میری کونوینٹ میں پڑھتی ہے۔ وہ بھی اپنی کلاس میں بہت اچھی رہتی ہے۔ دونوں بچے ماشاء اللہ نہایت ذہین اور برخوردار ہیں۔ ماں ان پر مفتوں ہیں اور وہ ماں پر مفتوں ہیں۔ دونوں حیدر خاں کی نشانیاں ہیں۔ حیدر خاں کی شرافت اور نیکی ان میں بھی دکھائی دے رہی

ہے اور اب ممتاز جہاں بیگم کی تربیت اور نگرانی ان کے لیے سونے پر سہاگے کا کام دے گی اور خدا نے چاہا تو یہ دونوں بچے اپنی ماں کو خوش رکھیں گے اور حیدر خاں کا نام روشن کریں گے۔ ممتاز جہاں بیگم میری بیٹی ہیں اور یہ دونوں بچے میرے نواسی اور نواسے ہیں۔

عبداللہ کمیٹی

اس زمانے میں میں ایک مرتبہ لکھنؤ گیا تو مجھے یہ خبر ملی کہ ہماری یونیورسٹی کے حالات کی تحقیقات کرنے کی گورنمنٹ کوئی کمیشن مقرر کرنے والی ہے۔ اس دوران میں ایک ریزولیوشن میں نے یونیورسٹی کونسل میں پیش کیا کہ ہماری یونیورسٹی کے متعلق شکایات بہت بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اس کا اندیشہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے کوئی تحقیقات کی کمیٹی مقرر ہو اس لیے مناسب ہے کہ ہم خود ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کریں تا کہ گورنمنٹ کو معلوم ہو جائے کہ ہم غافل نہیں ہیں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے اس کی مخالفت کی لیکن باقی ممبروں نے اتفاق کیا کہ تحقیقاتی کمیٹی ضرور مقرر ہونی چاہیے۔ چنانچہ کمیٹی مقرر ہو گئی اور مجھ کو مجبور کیا گیا کہ میں اس کمیٹی کی صدارت کروں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب اور ان کے جن دوستوں کے ووٹ میرے خلاف تھے لیکن شام کے وقت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب میرے مکان پر آئے اور کہا کہ اگر مجھ کو اس کمیٹی کے ممبروں میں شامل کر لیجیے تو میں مخالفت نہیں کروں گا۔ میں نے کہا کہ تحقیقات تو تمھارے ہی کام کی ہو رہی ہے کیا اپنے کاموں کی تحقیقات کے لیے تم ہی کو جج بنا دیا جائے گا۔ وہ سخت ناراض ہو کر میرے مکان سے چلے گئے۔ آفتاب احمد خاں صاحب اپنی علالت کی وجہ سے اس کے بعد مسوری چلے گئے اور اپنے کام کا چارج مجھ کو دے گئے میں نے فوراً کمیٹی کے جلسے کی تاریخ مقرر کر کے سوالات کی ایک لسٹ تیار کر کے ممبران اسٹاف لوکل ممبران کورٹ کے پاس بھیج دی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کہلا بھیجا کہ میرے اسٹاف کا ایک ممبر بھی آپ کی کمیٹی کے سامنے نہیں آئے گا۔ میں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ فقط ممبران اسٹاف ہی نہیں بلکہ خود آپ کو بھی آ کر کمیٹی کے سامنے اظہار دینا پڑے گا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے بعض ممبران اسٹاف سے کہا کہ تم لوگ مت جانا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ سب نے جواب دے دیا کہ اگر ہم کو نوکری کرنی ہے تو ضرور جواب دینا پڑے گا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اظہار نہ دیں۔ آخر کو ڈاکٹر ضیاء الدین سمجھ گئے کہ اس مخالفت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا

اس لیے انھوں نے مجھ کو لکھا کہ وہ خود بھی اظہار دیں گے۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ بائیس ممبران اسٹاف اور ممبران کورٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے اور انھوں نے اظہارات دیے اور ممبران اسٹاف میں ڈاکٹر ضیاء الدین بھی تھے اور جن ممبران اسٹاف کے بھروسے پر وہ یہ سمجھا کرتے تھے کہ میرے ساتھ ایک بڑا جتھا ہے ان سب کو میں نے بلایا اور وہ سب آئے اور اظہار دیے۔ اظہارات سننے کے بعد رپورٹ لکھی گئی جو عبداللہ کمیٹی کی رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ دفتر یونیورسٹی میں موجود ہے۔ جب یہ رپورٹ نکلی تو اس کی ایک کاپی میں نے آفتاب احمد خاں صاحب کے پاس مسوری بھیجی۔ اس کو پڑھ کر آفتاب احمد خاں صاحب نے لکھا کہ جو باتیں رپورٹ میں لکھی گئی ہیں ان ہی کی طرف ہمیشہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین کو توجہ دلاتا رہا لیکن انھوں نے میری کوئی بات نہیں مانی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے میری رپورٹ کے متعلق تو کچھ نہ لکھا۔ لیکن آفتاب احمد خاں صاحب سے الجھ پڑے اور ان کو لکھا کہ آپ کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی۔ آپ کو تو لقوے کی بیماری ہے۔ آپ معاملات کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس کے بعد کچھ اور خط و کتابت ہوئی۔ آخر جب آفتاب احمد خاں صاحب مسوری سے لوٹے تو یہ دیکھ کر کہ ڈاکٹر ضیاء الدین پر اس رپورٹ کا کچھ اثر نہیں ہوا انھوں نے کہا کہ جس تحقیقاتی کمیٹی کے روکنے کے لیے یہ اپنی نجی کمیٹی مقرر کی تھی اس سے کچھ نفع نہ پہنچا۔ بہتر ہے کہ گورنمنٹ اپنی تحقیقاتی کمیٹی بھیجے یا یہ معاملہ چانسلر کے سپرد کیا جائے۔ ان دنوں علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال چانسلر تھیں وہ بھی ڈاکٹر سر ضیاء الدین سے خوش نہیں تھیں۔ انھوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین سے کہا کہ تم استعفیٰ دے دو تا کہ جھگڑا طے ہو۔

رحمت اللہ کمیٹی

ڈاکٹر ضیاء الدین حیلے حوالے کرتے رہے۔ آخر کو انھوں نے ایک کمیٹی مقرر کر لی جس میں دو انگریز ممبر اور سر ابراہیم رحمت اللہ تھے اور ابراہیم رحمت اللہ ہی صدر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی نے علی گڑھ میں آ کر تحقیقات شروع کی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین بہت خوش تھے کہ اب عبداللہ کمیٹی کی رپورٹ کی کوئی حقیقت نہیں رہے گی اور دونوں انگریز ممبران کے دوست ہیں اس لیے اس کمیٹی کی رپورٹ بالکل ان کے موافق رہے گی۔ اس کمیٹی نے بھی بہت سے لوکل ممبران کورٹ اور

ممبران اسٹاف کے اظہار لیے۔ بعض ممبران کورٹ اور دوسرے اشخاص نے ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف سخت اتہام لگائے۔ میرا بھی اس میں اظہار ہوا۔ میں نے کہا کہ جو کچھ بھی واقعات تھے سب میری رپورٹ میں موجود ہیں اس سے زیادہ اب جو کچھ آپ دریافت کریں گے وہ نہ صرف غیر متعلق ہوں گے، بلکہ اظہار دینے والے واقعات کے خلاف ایسی باتیں کریں گے کہ آپ کو بھی بلا وجہ رنج ہوگا۔ اس کے بعد اس کمیٹی نے رپورٹ لکھی جو رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ کے نام سے مشہور ہے اور اس وقت تک ڈاکٹر ضیاء الدین کے مخالفین ان کے خلاف پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس رپورٹ میں صاف طور پر اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ عبداللہ کمیٹی کی رپورٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ عبداللہ کمیٹی کی رپورٹ پر عمل ہونا چاہیے۔

اس رپورٹ سے قبل ہی آفتاب احمد خاں صاحب بوجہ علالت علاحدہ ہو گئے تھے اور نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب وائس چانسلر مقرر ہو گئے تھے اور رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ کے وقت وہی وائس چانسلر تھے۔ اب ڈاکٹر ضیاء الدین بہت زیادہ پریشان ہو گئے کیونکہ رحمت اللہ کمیٹی نے ان کے متعلق سخت خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان کا وہ خیال کہ کمیٹی میں میرے دو انگریز دوست بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنی خوش نودی کی کچھ سند دیں گے۔ لیکن معاملہ بالکل برعکس ہوا۔ اگر عبداللہ کمیٹی کی رپورٹ پر وہ عمل کرنا شروع کر دیتے تو معاملہ وہیں ختم ہو جاتا۔ انھوں نے خود اس معاملے کو بڑھایا اور نقصان اٹھایا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے ٹرسٹی جمع ہوئے اور انھوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین کی علاحدگی کالج کی اصلاح کے لیے ضروری خیال کی اور کونسل میں ڈاکٹر ضیاء الدین کی گروہ بندی پر خاص طور پر توجہ کی اور یہ طے کیا کہ اس کونسل میں تیس ممبر نہیں ہونے چاہئیں بلکہ وائس چانسلر پرو وائس چانسلر اور ٹریزرار تین آدمی کافی ہیں جس کے بعد سوال مستقل وائس چانسلر کا پیش آیا۔ سر راس مسعود جو حیدر آباد میں تعلیمات کے ڈائریکٹر تھے ان کے دوستوں نے ممبران کورٹ کی ایک بڑی تعداد سے دستخط کرا کر ایک سفارش نامہ بھیجا کہ سر راس مسعود سے بہتر کوئی دوسرا وائس چانسلر یونیورسٹی کو نہیں ملے گا چنانچہ سر راس مسعود وائس چانسلر ہو گئے اور مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ میں ٹریزرار کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام نہیں کر سکوں گا اس لیے میں نے ٹریزرارشپ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

جو واقعات اوپر بیان کیے گئے ہیں یہ واقعات آفتاب احمد خاں صاحب اور نواب مزمل اللہ خاں صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے کے ہیں۔ان دونوں کی ذاتی حالات اور اوصاف کے متعلق مختصر طور پر کچھ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں صاحب میرے دوست تھے اور دونوں کے ساتھ میں نے کام کیا تھا۔

آفتاب احمد خاں صاحب کے حسب ونسب کی نسبت پہلے لکھا جا چکا ہے اور کہیں کہیں ان کے ذاتی اوصاف کے متعلق بھی اشارے کیے گئے ہیں۔آفتاب احمد خاں بہت سیدھے سچے مسلمان تھے مگر ایک کمزوری جو اس زمانے کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتی تھی وہ آفتاب احمد خاں صاحب میں بھی تھی وہ کمزوری یہ تھی کہ آفتاب احمد خاں صاحب اپنی تحریروں اور تقریروں میں انگریزی حکومت کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کی حکومت ہندوستان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے اور ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ انگریزوں کے خیر خواہ اور ہمدرد رہیں اور ہمیشہ ان کی مدد کرتے رہیں اور کوئی بات ایسی نہ کریں جو ان کی حکومت میں کمزوری پیدا کرے۔آفتاب احمد خاں صاحب کے اس خیال سے میرا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ جن وجوہات سے آفتاب احمد خاں صاحب انگریزوں کے اس قدر گرویدہ ہیں وہ وجوہات بھی قابل لحاظ ہیں۔

آفتاب احمد خاں صاحب کنج پورے ضلع کرنال کے رہنے والے تھے۔اس علاقہ پر سکھوں نے بہت دنوں تک حکومت کی تھی۔سکھوں نے مسلمانوں کے اوپر اپنی حکومت کے زمانے میں جو جو مظالم کیے تھے اس کی داستانیں خونی حرفوں سے تاریخ میں لکھنے کے لائق ہیں۔سکھوں کی حکومت کی نسبت ایسے مسلمانوں نے جو اس زمانے میں موجود تھے اور آفتاب احمد خاں صاحب کی اوائل عمری میں زندہ تھے جو حالت بیان کیے ان کو سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔سکھ ظالموں کو بسا اوقات مسلمانوں کو قتل کرنے کا جنون بے چین کر دیتا تھا اور وہ جتھے بنا بنا کر مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے دیہاتوں میں پھیل جاتے تھے اور ہزار ہا بے گناہ بندگان خدا کا خون بہا کر اپنی چھاونی اور قلعوں میں واپس آجایا کرتے تھے۔ان داستانوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پنجاب میں مسلمان بہت کمزور ہو گئے تھے۔وہ نہ سکھوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور نہ اپنی حفاظت کر

سکتے تھے۔ایک مسلمان عمر رسیدہ آدمی نے بیان کیا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی وہاں رفتہ رفتہ ہزاروں رہ گئے تھے۔سرسید احمد خاں نے سکھوں کے متعلق بہت سے قصے بیان کیے تھے اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جو قصے بیان کیے وہ بہت ہی دردناک تھے۔بس اگر آفتاب احمد خاں صاحب گذشتہ پنجاب کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھ کر انگریزوں کا ہندوستان میں آنا خدا کا ایک بڑا انعام سمجھتے ہوں تو وہ غلطی پر نہیں تھے۔

آفتاب احمد خاں صاحب دوستوں کے بڑے دوست تھے اور اپنی دوستی کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں کرتے تھے۔وہ کالج سے بہت محبت رکھتے تھے اور کانفرنس کے جلسوں میں سرسید اور ان کے بعد نواب محسن الملک مرحوم ان سے تقریر کرنے کی فرمائش ضرور کیا کرتے تھے۔ان کی تقریر نواب محسن الملک کے برابر مؤثر نہیں ہوتی تھی لیکن آفتاب احمد خاں صاحب کے ہم عمر لوگوں میں سب سے بہتر ہوتی تھی۔آفتاب احمد خاں صاحب کو میں نے جھوٹ بولتے بہت کم دیکھا اور اگر کبھی سہواً ان کے منہ سے کوئی خلاف واقعہ بات نکل جاتی تھی تو وہ بعد میں اپنے دوستوں سے معذرت بھی کر لیتے تھے۔آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر تھے اور فوجداری کی وکالت ان کی اچھی تھی لیکن ان کی وکالت کو اتنا زیادہ فروغ نہیں ہوا تھا کہ لوگ ان کو ایک نامی بیرسٹر کہیں۔آفتاب احمد صاحب اپنے اوقات کے پابند تھے،کھانے پینے کے بہت محتاط تھے۔اپنی تندرستی کا بہت خیال رکھتے تھے صبح اٹھ کر دودھ کی ایک پیالی پی کر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔بکری کا گوشت یا بیف بہت کم کھاتے تھے۔مرغی کا گوشت زیادہ استعمال کرتے تھے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ نواب وقار الملک سے ان کا نقیض ہو گیا تھا،اُسی طور پر نواب محسن الملک سے بھی اکثر ان کے اختلافات رہتے تھے لیکن نواب محسن الملک کے خیالات میں بہت گنجائش تھی اس لیے نواب صاحب سے اس حد تک اختلاف کی نوبت کبھی نہیں پہنچی جیسے کہ نواب وقار الملک سے اختلاف ہو گیا تھا۔

آفتاب احمد خاں صاحب کو عمارات کے بنوانے کا بہت شوق تھا۔اس زمانے کے متعدد بورڈنگ ہاؤس اور مکانات ان ہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئے تھے۔میرا اور ان کا عمارات کے انتظام کے متعلق چند مرتبہ اختلاف بھی ہوا۔ایک مرتبہ میں نے اس انتظام کے متعلق ایک تحریر بھی

لکھی جو کسی میٹنگ میں پیش ہوئی جس میں مولانا محمد علی بھی تھے۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ اس تحریر سے خلوص کی بو آتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اگر آپ گہری نگاہ سے دیکھیں تو میری اور آفتاب احمد خاں صاحب کی ہر بات میں خلوص کی بو معلوم ہوگی۔ اگر ہم ضرورت دیکھتے ہیں تو دوستوں پر بھی نکتہ چینی کر دیتے ہیں لیکن آپ ہم لوگوں کی ہر ایک بات کو ایمان داری اور خلوص سے خالی سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ ہر وقت ہم لوگوں سے لڑا کرتے ہیں۔

آفتاب احمد خاں صاحب انڈیا کونسل کے ممبر ہو گئے تھے اور پانچ چھ سال تک وہاں رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو ان کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ پھر وکالت کا بھی ان کو زیادہ موقع نہ ملا۔ یونیورسٹی کے کاموں میں زیادہ وقت دینے لگے اور قریب 1925 کے ان کی تندرستی اس قدر خراب ہوگئی کہ اسی سال یونیورسٹی جوبلی کا جو ایک بڑا جلسہ ہوا اس میں بھی وہ خاطر خواہ طور پر حصہ نہ لے سکے۔ 1925 کے جوبلی کے جلسے سے متعلق ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے جو مجھ سے اور عورتوں کی تعلیم و آزادی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جلسے کا انتظام ڈاکٹر سر ضیاء الدین کرتے تھے اور اعلیٰ انتظام کے افسر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں تھے۔ عورتوں نے خواہش کی کہ ان کو بھی پردے کے پیچھے سے تقریریں سننے کا موقع دیا جائے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور نواب صدر یار جنگ نے منع کر دیا۔ عطیہ فیضی نے اس حکم کی مخالفت کی۔ میں تو عطیہ فیضی کے ساتھ تھا ہی لیکن سر شاہ محمد سلیمان اور بہت سے دوسرے مسلمان بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ میں جلسہ چھوڑ کر ایک علاحدہ خیمہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ نواب صدر یار جنگ سکریٹری کانفرنس میرے پاس آئے اور کہا کہ میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ آپ کو جانے نہ جانے کا اختیار ہے لیکن میں تو اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک پردے کے پیچھے سے عورتوں کو تقریریں سننے کا موقع نہ ملے گا۔ اس اختلاف میں سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب درمیان میں پڑے اور انھوں نے پنڈال کے ایک کونے میں نہایت بُری سی جگہ عورتوں کے بیٹھنے کے لیے تجویز کر دی اور چاروں طرف سے پردے لگوا دیے۔ عورتوں غریبوں کو وہاں کچھ سنائی نہیں دیا۔ مجھ سے شکایت ہوئی۔ میں نے کہا کہ تم نے قرآن پاک میں پڑھا ہے کہ نہیں کہ ان اللّٰہ مع الصابرین اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اس وقت برداشت کر لو تم دیکھو گی کہ بہت تھوڑے دنوں میں عورتیں کھلے منہ پنڈال میں بیٹھا کریں گی۔

آفتاب احمد خاں صاحب اس جلسے کے بعد پھر کوئی کام کالج کا نہ کر سکے۔ آخر کو جنوری 1930 میں ان پر فالج کا تیسرا دورہ پڑا اور اس میں مبتلا رہ کر دنیا سے رحلت کی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آفتاب احمد خاں صاحب کی نسبت اتنا کہنا ضروری ہے کہ وہ اس زمانے کے لوگوں میں ایک امتیاز کا درجہ رکھتے تھے اور جو مخصوص خوبیاں ان میں تھیں وہ کم لوگوں میں نظر آتی ہیں۔ غیبت کم کرتے تھے۔ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ مسکینوں اور اندھوں اور جذامیوں سے بہت ہمدردی رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ہمدرد تھے لیکن ہندوؤں سے بھی مخالفت یا نفرت نہیں رکھتے تھے۔ دوسروں کی طرح اپنی قوم کے افراد کے خلاف گورنمنٹ کے افسروں کے سامنے جا کر بدگوئی نہیں کرتے تھے۔ میرے خیال میں یہ اوصاف اس زمانے کے مسلمانوں کی سوسائٹی میں ان کی زندگی کو ایک مقتدر زندگی اور ایک مقتدر ہستی ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ملک کی تقسیم اور ہندوستان پاکستان کا تعین

ہندوستان کی مختصر تاریخ

مسلمانوں کی سلطنت بارھویں صدی کے وسط سے شروع ہوئی اور سترھویں صدی تک بڑی شان اور دبدبے سے قائم رہی۔ بعدازاں مسلمانوں کی حکومت زوال پذیر ہوئی۔ اور مرہٹوں اور سکھوں نے بغاوتیں کیں اور دکن و پنجاب میں اپنے اثرات قائم کر لیے۔ اسی دوران میں انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے ملک پر قبضہ کرنا سیکھ لیا۔ وہ نام کے طور پر ایک مغلوں کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن حکومت کلیتاً انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اکبر اور اورنگ زیب کا جا نشین سترہویں صدی میں انگریزوں کا وظیفہ خوار دہلی کے قلعہ میں محصور تھا لیکن 1857 کے غدر میں اس مغل بادشاہ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب تک جو انگریزوں کی حکومت تھی وہ ایک کمپنی کے نام سے تھی۔ جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا لیکن 1857 میں ایک طرف تو مغل بادشاہوں کی حکومت اور نام ختم ہوگیا دوسری طرف جو کمپنی اس وقت تک حکومت کرتی تھی انگریزوں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا اور ہندوستان کا ملک باقاعدہ برٹش حکومت کا جز بن گیا اور انگلستان کا بادشاہ ہندوستان کا بھی بادشاہ قرار دیا گیا۔

اس کے بعد سے انگریزوں کو بہت عروج ہوا اور ہندوستان کی وجہ سے یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں سب سے طاقتور سلطنتوں میں شمار ہونے لگے لیکن ہندوستان کے لوگ

آزادی چاہتے تھے اور گاندھی جی کی سرکردگی میں انھوں نے سخت مظاہرے کیے اور آخر کو انگریزوں کو یقین ہوگیا کہ اس ملک پر ہم ہمیشہ کے لیے اپنی حکومت قائم نہیں رکھ سکتے اس لیے انگلستان کے دور بین وزرا نے یہ مناسب سمجھا کہ ہم کو اپنی خوشی سے ہندوستان کی حکومت اہل ہند کے سپرد کردینی چاہیے اور ان کو اپنی قومی زندگی کے سیاہ وسفید کا مالک بنادینا چاہیے اور یہ تبدیلی ایسے طور پر عمل میں آنی چاہیے کہ کسی مخالفت کا اثر ہندوستانیوں یا انگریزوں کے دل میں یادگار کے طور پر باقی نہ رہے۔اس خیال کی تکمیل میں انگریزوں نے ہندوستان کے اہلِ رائے لوگوں سے ایک سمجھوتہ کیا اور ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلاف تھا اس کی بھی ایک تدبیر نکالی۔جس حصۂ ملک میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے اور باقی حکومت کی باگ ڈور ہندو اکثریت کے ہاتھ میں رہے چنانچہ 1947 میں انگریزوں نے حکومت کے اختیارات ہندوستانیوں کے ہاتھ میں سونپ دیے۔14 اگست 1947 کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند نے کراچی میں جاکر پاکستان کی حکومت کی باگ ڈور قائدِ اعظم محمد علی جناح کو سپرد کردی اور 15 اگست 1947 کو دہلی میں آکر کانگریس پارٹی کے وزرا کے ہاتھ میں اس حصہ ملک کی زمام حکومت سونپ دی۔اس طور پر ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا جو ہندوستان اور پاکستان کہلاتے ہیں۔تقسیم کی خبر سنتے ہی دونوں جانب ایک خونریز ہنگامہ برپا ہو گیا۔ہندوستان کے لوگوں نے ،بالخصوص ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کا قتل وغارت کرانا شروع کیا اور یہاں سے رخصت ہوجانے کے لیے مجبور کیا۔اس کا ذکر تقسیم سے آگے آئے گا۔لیکن یہاں پر اس امر کا تذکرہ بے موقع نہ ہوگا کہ گو انگریزوں کی طرف سے تو امن وامان کے ساتھ ملک کی تقسیم کا ہونا تجویز ہوا تھا لیکن اتنے بڑے ملک کی تقسیم بلا لاکھوں آدمیوں کی بھینٹ سے عمل میں آنی مشکل تھی۔کہا جاتا ہے کہ کئی لاکھ مسلمان ہندوستان میں قتل ہوئے اور تقریباً اسی قدر مجبور کیے گئے کہ وہ ملک چھوڑ دیں اور اسی قدر ہندو اور سکھ پاکستان سے نکالے گئے اور ان کا بھی خون بہایا گیا۔اتنی بڑی بھینٹ اور خونریزی کے بعد ہندو اور مسلمان عقل سے کام لیں تو امن اور عزت کی آزاد زندگی بسر کرنے کا انھیں بہت موقع حاصل ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ وہ عقل سے کام لیں گے بھی یا نہیں۔

محمد غوری کے حملے کے بعد سے سات سو سال تک کل ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اول مستقل حکومت قطب الدین ایبک محمد غوری کے غلام نے قائم کی اور یہ حکومت خاندان غلامان کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ خاندان غلامان کے بعد خاندان خلجی کی حکومت قائم ہوئی۔ اور اس کے بعد خاندان تغلق نے حکومت کی اور تغلق کے بعد لودی خاندان کی حکومت قائم ہوئی اور لودی کا بادشاہ ابراہیم لودی تھا جس کو بابر نے پانی پت میں شکست دے کر مغلیہ سلطنت ہندوستان میں قایم کی۔ مغلیہ سلطنت بڑی شان اور عظمت کی حکومت تھی۔ اپنے زمانے میں جو قوت اس مغلیہ حکومت کو حاصل ہوئی وہ کسی اور سلطنت کو حاصل نہیں ہوئی۔ مغلوں کی سلطنت کا عروج اکبر کے وقت میں مکمل ہوا اور اورنگ زیب کی وفات تک قائم رہا۔ اورنگ زیب کے بعد وہ کل کے مالک اس کے وارث ہی رہے لیکن اورنگ زیب کی وفات کے تھوڑی ہی دنوں بعد عروج اور طاقت ختم ہونا شروع ہوگئی حتیٰ کہ اورنگ زیب کی وفات کے پینتیس سال کے بعد نادر شاہ نے ایران سے آ کر اس سلطنت کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی اور اورنگ زیب کی نسل میں دہلی کے تخت پر 1857 تک نام نہاد بادشاہ یکے بعد دیگرے رہے لیکن انگریز کمپنی کے پینشنر کی حیثیت سے اپنی گزر کرتے رہے۔

اورنگ زیب کی زندگی میں ہی مہاراشٹر اور پنجاب میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مہاراشٹر میں شیواجی نے اپنی ایک ریاست قائم کر دی تھی اور پنجاب میں سکھوں نے اپنی حکومت بنالی تھی۔ شیواجی تو اورنگ زیب کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے لیکن سکھوں نے جو حکومت پنجاب میں قائم کی وہ حکومت اورنگ زیب کے کچھ دنوں بعد سخت گیر ہوگئی اور نہایت جابرانہ حکومت ثابت ہوئی۔ سکھوں کا یہ خیال تھا کہ ہم کو اپنے آخری گرو گوبند سنگھ نے ہدایت کی ہے اور ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم مسلمانوں کی قوم کو ہندوستان سے نکال دیں یا ختم کر دیں اور اس عہد کی نشانی ہمارے سر پر ہے کہ جب تک ہم اس عہد کو پورا نہ کریں ہم بال نہیں ترشوائیں گے یا کٹوائیں گے۔

ہندو راجپوتوں میں قدیم سے ہی یہ رسم چلی آتی تھی کہ اگر ان کو کسی سے بدلہ لینا ہوتا تھا وہ عہد کر لیتے تھے کہ جب تک وہ بدلہ نہ لے لیں گے اپنے سر کے بال نہ کٹوائیں گے۔ اس قسم کا عہد گرو گوبند سنگھ نے بھی اپنے مریدوں سے لیا تھا۔ سکھوں کی قوم کوئی جداگانہ قوم نہیں ہے بلکہ۔۔

ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے۔ یہ فرقہ گرونانک جی نے بابر کے حملہ کے زمانے میں پنجاب میں قائم کیا تھا۔ گرونانک وحدانیت کی تلقین کرتے تھے اور مسلمان فقرا بابا فرید وغیرہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ گرونانک صاحب کی زندگی میں مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں اور ہندو کہتے تھے کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے۔ چنانچہ ان کی وفات پر ہندو کہتے تھے کہ ان کو جلائیں اور مسلمان چاہتے تھے کہ ان کو دفن کریں۔ اس بات پر ہندو مسلمانوں میں آپس میں جھگڑا ہوا لیکن جہاں تک خیال پڑتا ہے کہ ہندو جیت گئے۔

گرونانک کی تعلیم پر اگر عمل ہوتا اور لوگ اس تعلیم پر قائم رہتے اور گرو گوبند سنگھ اس میں تبدیلی نہ کر دیتے تو سکھوں کی قوم بہت ہی امن پسند قوم ہوتی اور سوائے خدا کے اور کسی کو نہ پوجتی لیکن گرو گوبند سنگھ نے آ کر ان کی ذہنیت میں بہت کچھ تبدیلی کر دی اور پنتھ کے نام سے ان کا الگ فرقہ قائم کر کے ان کو فوجی تربیت کی ترغیب دی اور اس وقت کے بعد سے سکھ ایک جنگجو قوم بن گئے۔ کچھ زمانے تک تو وہ ڈرا ڈرا کر مار مار کر پنجاب کے شہریوں اور دیہاتیوں سے روپیہ وصول کرتے رہے۔ اس ڈاکہ زنی کو وہ اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے جائز سمجھتے تھے۔ انھوں نے دس جتھے پنجاب میں قائم کیے۔ یہ سب ڈاکہ زن جتھے تھے اور مسلوں کے نام سے مشہور تھے آخر کو گجرانوالہ کے مسل میں جس کے سرغنہ مہا سنگھ پدر رنجیت سنگھ تھے قوت پکڑی اور دوسرے سب جتھوں یا مسلوں کو ختم کر کے خود پنجاب میں بہت بڑا غلبہ حاصل کر لیا۔

مہا سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ نے اب ڈاکہ زنی چھوڑ کر فوج منظم کی اور کانگڑہ، چمبہ اور دوسری پہاڑی ہندو ریاستوں پر حملہ کر کے ان کو شکست دی اور اپنی قوت میں بہت اضافہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلوں کی سلطنت کا ہیولا تو قائم تھا لیکن اس میں ذرہ برابر بھی سکت نہیں رہی تھی۔ پنجاب میں کہیں کہیں مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ اب ان سب کو رنجیت سنگھ نے ختم کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی قوت یہاں تک بڑھالی تھی کہ ہندوستان کے لوگ ان کو شیر پنجاب کہتے تھے۔ ان کی زندگی میں کسی باہر کی حملہ آور قوم نے پنجاب پر کبھی حملہ نہ کیا۔ برخلاف اس کے خود رنجیت سنگھ نے سکھوں کی دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر جو دریائے ستلج کے اس پار تھیں حملے کرنے شروع کیے۔ دریائے ستلج کی ریاستیں پٹیالہ، نابہ، جیند، کپورتھلا، فرید کوٹ احمد شاہ ابدالی

کے حملے کے وقت قائم ہوئیں۔اوّل ایک ہی ریاست تھی اس کا بانی پھول سنگھ ایک شخص تھا جو بڑا ڈاکو تھا۔ پھول سنگھ نے احمد شاہ ابدالی کو رسد رسانی میں بہت مدد دی تھی۔احمد شاہ ابدالی جو پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کو چور چور کر کے واپس جانے کو ہوا تو اس نے ستلج کے ادھر کے بہت سے علاقے پھول سنگھ کو انعام میں دیے۔گو اب سکھ راجگان یہ تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن تاریخی واقعہ یہی ہے کہ یہ ریاست احمد شاہ ابدالی نے قایم کرائی تھی اور پھول سنگھ ہی کے نام کی وجہ سے یہ ریاستیں پھلکیوں کے نام سے مشہور ہیں اور اب پھول سنگھ کی اولاد میں مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ نابہ، مہاراجہ جیند، مہاراجہ فرید کوٹ الگ الگ علاقوں میں حکمراں ہیں اور مہاراجہ کپور تھلا کی نسبت جہاں تک مجھ کو معلوم ہے کہ وہ پھول سنگھ کی اولاد نہیں ہیں بلکہ ان کا مورث پھول سنگھ کے رشتہ داروں میں سے کوئی شخص تھا یہ اس شخص کی اولاد ہیں۔(ممکن ہے اس میں کوئی غلطی ہو لیکن مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہی ہے۔)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی دست برد کے خلاف انگریز کمپنی نے پھلیان کی ریاستوں کو پناہ دی اور آخر کو اسی پناہ کی وجہ سے انگریزوں کو پنجاب فتح کرنے کا موقع ملا۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں نے مسلمان رعایا کو بہت قتل و غارت کیا حتیٰ کہ سوات بنیر تک یلغار کرتے ہوئے چلے گئے۔سوات بنیر پشاور سے آگے ایک علاقہ ہے۔وہاں اس قدر مظالم کیے جن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔سکھوں کو بڑا فخر ہے کہ ہم نے سرحد میں پٹھانوں کے دیہات مع مرد عورت اور بچوں کے جلا کر خاک سیاہ کر دیے تھے اور ان مظالم کی ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ اگر مسلمان کے کسی گاؤں میں ایک گائے اتفاقیہ بھی مر جاتی تھی تو یہ سکھ ظالم کل گاؤں کے مرد عورت اور بچوں کو تہ تیغ کر دیتے تھے اور گاؤں کو جلا دیتے تھے۔اس قوم کے دماغ میں ظلم کرنے کا اس قدر جنون تھا کہ وہ اس قسم کے کارناموں کو جیسے انھوں نے اپنے زمانے میں کیے تھے ایک بڑا کار ثواب سمجھتے تھے اور اب اس وقت بھی یہ لوگ امن پسندی کو کمزوری اور ظلم تعدی اور غارت گری کو بہادری سمجھتے ہیں۔لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد ان میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور انگریزوں کو موقع مل گیا کہ وہ سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیں۔پنجاب کا معاملہ اس طور پر ختم ہوا لیکن مہاراشٹر میں شیوا جی نے جو حکومت قائم کی تھی اس کی قوت بہت زیادہ تھی۔شیوا جی کے بعد ان کے ایک برہمن وزیر

نانا فرنویس نے پیشوا کے نام سے اپنے کو مرہٹوں کی ریاست کا حکمراں بنالیا۔ اور بہت دنوں تک اس کے جانشین حکومت کرتے رہے اور پیشوا کے فوجی افسروں نے تمام ملک کو تہہ و بالا کر دیا اور ہندوستان کے مختلف حصوں پر اپنی ریاستیں قائم کر لیں۔

پیشوا قوم کے برہمن تھے لیکن ان کے جنرل یا فوجی افسر ادنیٰ یا شودر اقوام کے لوگ تھے اور ان فوجی افسروں کی بنائی ہوئی ریاستیں اب تک قائم رہیں۔ لیکن اب انڈین یونین کی گورنمنٹ نے ان ریاستوں کو قطعی ختم کر دیا ہے۔ ان ریاستوں میں بڑی بڑی ریاستیں سیندھیا یعنی گوالیار کی ایک بڑی ریاست ہے اور گائیکواڑ یعنی بڑودہ کی، گجرات میں دوسری ریاست اور ہولکر یعنی اندور کی تیسری ریاست ہے۔ اور ایک ریاست ان ریاستوں سے چھوٹی کولھاپور کی ریاست ہے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور بھی ہیں۔ مرہٹہ حکومت شیواجی کے زمانے ہی سے ایک بڑی جابرانہ حکومت تھی۔ شیواجی خود لوٹ مار کیا کرتے تھے لیکن شیواجی کے بعد پیشواؤں کے زمانے میں ان کی فوجوں نے ایک بہت بڑا طوفان برپا کر دیا اور گجرات سے لے کر بنگال تک تمام ملک کو تہہ و بالا کر دیا۔ اور یہ لوگ جہاں پہنچتے تھے وہاں تمام مرد و زن کو تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ چنانچہ مرہٹوں کی خونخوار فوجیں اپنے پہاڑوں سے نکلتی تھیں اور یورش کرتی ہوئی کولکاتا تک پہنچ جاتی تھیں اور درمیان میں جس قدر شہر و دیہات آتے تھے ان کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی تھیں۔ ناگپور میں ایک اور ریاست بھونسلہ خاندان کی تھی اس کو عرصہ ہوا کہ ختم ہوگئی۔ جس وقت لوٹ مار کا بازار گرم تھا اس وقت انگریزی کمپنی نے اورنگ زیب کے بیٹے سے زمین لے کر شہر کولکاتا آباد کر دیا تھا اور مرہٹے اس شہر پر جب حملے کرنے لگے تو انگریز کمپنی نے شہر کے چاروں طرف ایک خندق کھودی تا کہ حملہ آور مرہٹے ان کو یا شہر کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اس خندق کا نام مرہٹہ خندق کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مرہٹے اپنی لوٹ مار کے جذبہ میں کسی کی تفریق نہیں کرتے تھے کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان ہے۔ سر جادو چندر سرکار نے جو ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے اس میں مرہٹوں کے مظالم و لوٹ مار کے حالات بہت واضح طور پر لکھ دیے ہیں۔ کاشی پرشاد ایک باوقعت ہندو نے اُڑیسہ میں مرہٹوں کے حملے کا ذکر کیا ہے اور مرہٹوں کے ہاتھ سے جو کشت و خون ہوا اس کو خوب

وضاحت سے لکھ دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان ظالموں کے ہاتھ سے نہ برہمن بچا اور نہ گائے بچی۔ ہندوؤں کی پاسداری کا مرہٹہ جو دعویٰ کر رہے ہیں یہ ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے۔ مرہٹہ جس ملک پر قبضہ کر لیتے تھے اس ملک کے باشندوں پر ظلم کا پہاڑ توڑتے رہتے تھے۔ مرہٹوں نے مالوہ کو جب فتح کر کے اپنی ریاست قایم کی تو وہاں پر اتنا سخت ٹیکس لگایا کہ رعایا بالکل تباہ ہوگئی۔ اگر سو روپے کا مال زمین میں پیدا ہوتا تھا تو اس کا 56 رفیصدی مرہٹہ بطور اپنے ٹیکس کے لیتے تھے اور چوتھ یعنی چہارم حصہ پیداوار کا مرہٹوں کا ایک معمولی ٹیکس تھا۔ مرہٹہ بھی کسی قانون کے پابند نہ تھے جیسے کہ سکھ کسی قانون کے پابند نہیں تھے۔ مرہٹے پنڈتوں سے عدالتی معاملات میں فتویٰ حاصل کیا کرتے تھے۔ فتوے دینے والے برہمن ان کے ملازم ہوا کرتے تھے اور جو بات حاکم کو مقصود ہوتی تھی اسی کے مطابق وہ فتویٰ دے دیتے تھے۔

سیندھیا یا گوالیار کی ریاست کا قائم کرنے والا فوجی افسر مہادا راؤ سیندھیا تھا۔ اس نے اور اس کے وارثوں نے اس قدر قوت پکڑی کہ وہ تمام یو۔ پی کے اوپر قابض ہوگیا اور یو۔ پی کے کل علاقوں میں مرہٹوں کے کہیں کہیں قلعے ملتے ہیں اور ان کی دی ہوئی بہت سی اسناد بہت سے لوگوں کے پاس ہیں۔ سیندھیا سے آخر تک انگریزوں کی لڑائی رہی اور 1852 میں لارڈ لیک انگریزوں کے جنرل نے سیندھیا کی فوجوں کو علی گڑھ کے مقام پر شکست دی۔ علی گڑھ میں مرہٹوں کا ایک قلعہ ہے اس کے گرد جو میدان ہے اس کو لاسواری کا میدان کہتے ہیں۔ لارڈ لیک کی جو لڑائی مرہٹوں سے ہوئی وہ لاسواری کے نام سے مشہور ہے۔ اس شکست کے بعد سیندھیا کی حکومت جو اس نے یو۔ پی میں قائم کی تھی وہ ختم ہوگئی اور انگریزوں نے ناگپور سے بھونسلہ نامی خاندان کی حکومت بھی ختم کر دی۔ پیشواؤں کا عروج احمد شاہ ابدالی نے ختم کیا۔ احمد شاہ ابدالی پنجاب پر حکومت کرتا تھا۔ مرہٹوں نے پنجاب کی حکومت پر مداخلت شروع کر دی اور چند لڑائیوں میں ان کو فتح ہوئی اور پٹھانوں کو شکست ہوئی اور اب مرہٹوں نے تہیہ کر لیا کہ ہم پنجاب سے مسلمانوں کی حکوت قطعی ختم کر دیں گے۔ اس منصوبے کو سامنے رکھ کر پیشواؤں نے ایک بہت بڑی جرار فوج تیار کی جس کے سردار یا سپہ سالار پیشوا کے بھائی بھاؤ جی بنے۔ اور بھاؤ جی نے کہا کہ میں جب تک نہیں جاؤں گا کہ جب تک ولی عہد یعنی پیشوا کا لڑکا نہیں جائے گا۔ چنانچہ پیشوا مجبور ہوا تو اس نے

اپنے بیٹے کو بھی فوج کے ساتھ کر دیا، یہ فوج جو مہاراشٹر سے چلی تعداد میں اتنی زیادہ تھی کہ ہندوستان کی تاریخ میں اور کوئی مثال نہیں ملتی کہ اتنی تعداد کے لاؤلشکر کے ساتھ کسی دوسرے ہندوستانی راجہ یا مہاراجہ نے کسی پر حملہ کیا ہو۔

پنڈاری ایک خانہ بدوش اور جرائم پیشہ مسلمانوں کی قوم تھی جو مرہٹوں کے زیر حکومت تھے۔ ان پنڈاریوں کو مجبور کر کے لشکر کی بار برداری کے لیے فوج کے ساتھ کیا اور یہ فوج دل بادل کی طرح دکن سے اٹھی اور راستے میں اس نے بڑے بڑے مظالم کیے۔ لوٹ مار کر کے لوگوں سے رسد حاصل کی اور مال و متاع لوگوں کا چھینا اور آخر کو پانی پت کے مقام پر یہ فوج پہنچ گئی۔ احمد شاہ ابدالی کو جب یہ خبر ہوئی کہ اتنی بڑی فوج لے کر مجھ پر حملہ کرنے کو مرہٹے نکلے ہیں تو وہ بھی اٹھارہ یا بیس ہزار پٹھانوں کا لشکر لے کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ مرہٹوں نے پانی پت کی شہر پناہ کے باہر ڈیرے ڈالے اور چاروں طرف کے دیہات سے زبردستی رسد حاصل کرنی شروع کی۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی آ کر مرہٹوں کی فوج سے کچھ فاصلے پر ڈیرے ڈالے۔ احمد شاہ نے اودھ کے بادشاہ اور حافظ رحمت خاں اور نجیب الدولہ روہیل کھنڈ کے سرداروں اور اکابر کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طور پر احمد شاہ کی فوج کی تعداد کوئی اڑتیس ہزار ہو گئی۔ اس نے فن سپہ گری سے پورا کام لیا اور جس طور پر ہو سکا دشمن کو بے دست و پا کرنے کی فکر کی۔ چنانچہ رسد رسانی کے جو رستے تھے اور جہاں سے مرہٹوں کو رسد پہنچتی تھی ان سب پر رفتہ رفتہ قبضہ کر لیا اور اب رسد بجائے مرہٹوں کے پاس پہنچنے کے احمد شاہ کے پاس پہنچنے لگی اور انھی لوگوں میں جنھوں نے احمد شاہ ابدالی کو رسد پہنچائی پھول سنگھ ڈاکو بھی تھا جو پٹیالہ وغیرہ والیان ریاستوں کا مورث ہوا ہے۔

اس موقع پر مرہٹے اس قدر مجبور ہو گئے کہ انھوں نے شہر پانی پت کے باشندوں سے کل اشیا خوردنی لوٹ لیں اور اہل شہر ہزاروں کی تعداد میں بھوک سے مر گئے۔ مرہٹے شہر پناہ سے آگے نہیں بڑھے اور یہ مرہٹوں کی سخت کمزوری تھی کہ انھوں نے اپنے کو ایک جگہ پر بٹھا دیا اور چاروں طرف ادھر اُدھر حرکت کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ بادشاہ اودھ کے ذریعہ سے بھاؤ سپہ سالار نے مصالحت کے پیغام دینے شروع کیے لیکن احمد شاہ ابدالی بھانپ گیا کہ اب مرہٹے مجبور ہو گئے ہیں اس لیے اب ان کو شکست دینا کوئی دشوار نہیں ہے۔ اس لیے احمد شاہ نے

مصالحت سے انکار کر دیا جب بھاؤ نے دیکھا کہ فوج بھوکی مر رہی ہے تو ایک دن اس نے رات کو پٹھانوں کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن احمد شاہ بھی غافل نہیں تھا اور یہ جانتا تھا کہ اب یہ حملہ کرے گا اس لیے اس نے اپنی فوج کو اس طور پر تربیت دے رکھی تھی کہ اگر ایک دستے پر کوئی حملہ کرے تو باقی فوج کے دستے بھی حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ جس روز رات کو مرہٹوں نے حملہ کیا اور لڑائی شروع ہوئی اس کی دوسرے صبح کا نقشہ لوگوں نے تیار کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹے چاروں طرف سے امنڈ کر پٹھانوں کی فوج پر حملہ کر رہے تھے اور پٹھانوں کی فوج سمٹ کر چھوٹے سے محاذ پر کھڑی تھی مگر قریب دوپہر کے احمد شاہ کی فوج نے پھیلنا شروع کیا اور مرہٹے گھیرے میں آنا شروع ہوئے اور بڑے زور کی خونریز جنگ ہوئی۔ چار بجے کے قریب مرہٹوں کی فوج بیچ میں آ گئی اور احمد شاہ ابدالی کی فوج کا زیادہ تر حصہ مرہٹوں کی فوج کے چاروں طرف پھیل گیا۔ چار بجے کے قریب بھاؤ نے بادشاہ اودھ کو لکھا کہ افسوس ہے تلوار ہی سے تصفیہ ہوگا تو ہوگا ورنہ نہیں۔ یہ کہہ کر وہ تلوار کھینچ کر مقابل کی فوج میں گھس گیا اور وہاں مارا گیا اور پیشوا کا ولی عہد بھی مارا گیا اور مرہٹوں کی فوج میں بھگدڑ پڑ گئی اور پٹھانوں نے اس قدر تلوار سے کام لیا کہ بہت زیادہ مرہٹہ فوج قتل ہوئی۔ اور باقی جو بچ گئے وہ بھاگ کر ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گئے اور لوٹ کر نربدا ندی پار ہو گئے۔

احمد شاہ ابدالی کے سامنے جب پیشوا کے ولی عہد کی لاش لائی گئی تو وہ اس کی خوبصورتی اور رعنائی کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا اور اس نے کہا کہ اس کا مردہ مصالحہ لگا کر خشک کیا جائے تا کہ ہم اسے کابل لے جا سکیں۔ لیکن شاہ اودھ نے جا کر احمد شاہ سے کہا کہ یہ بہت بُری مثال ہوگی۔ آپ اجازت دیجیے کہ بھاؤ کے ساتھ اسے بھی جلا دیا جائے۔ چنانچہ دونوں بڑے فوجی افسران جلا دیے گئے اور باقی ہزارہا لاشیں خندقیں کھود کر اس میں ڈالی گئیں یا جلائی گئیں اور مرہٹوں کا جو کچھ فوجی سامان تھا وہ پٹھانوں کے ہاتھ آیا۔

ادھر پیشوا کو خبریں پہنچیں کہ مرہٹوں کی بُری حالت ہو رہی ہے تو وہ ایک فوج کا دستہ لے کر دریائے نربدا تک پہنچا تھا کہ وہاں پر اس کو مرہٹوں کی شکست فاش کی خبر ملی۔ چنانچہ جب اس کو معلوم ہو گیا کہ میرا بھائی اور میرا بیٹا بھی مارے گئے اور تمام فوجی افسران اور بہت سی فوج بھی ماری گئی تو وہ مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گیا اور راج پاٹ کو چھوڑ کر نربدا کے کنارے پر ہی فقیرانہ لباس میں گیان دھیان

میں مشغول ہو گیا۔ اس شکست نے مرہٹوں کی اصلی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن سیندھیا، ہولکر اور گائیکواڑ اپنے اپنے علاقوں پر قائم تھے اور انگریز کمپنی اور نظام و ٹیپو سلطان یہ سب سلطنتیں ایک دوسرے سے ساز باز کر کے کبھی انگریزی فوج سے مقابلہ کرتے تھے اور کبھی آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ آخر کو ان ریاستوں کے اور انگریزوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ اور ان ریاستوں نے عہد کر لیا کہ ہم اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے اور انگریزوں نے عہد کیا کہ ہم تمھاری ریاستوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس طور پر یہ سب ریاستیں انگریزی حکومت کی دست بُرد سے بچ گئیں۔ اور اب تک قائم تھیں۔ لیکن 1947 کے بعد انڈین یونین گورنمنٹ نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں یورپ کی مختلف قوموں میں ایشیا، افریقہ اور امریکا میں پہنچ کر وہاں کے ممالک پر قبضہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ سب سے اوّل اہل پرتگال ہندوستان میں پہنچے اور انھوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل اور مالا بار پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اہل پرتگال بڑے ظالم تھے لیکن یورپ کی ان اقوام میں سے تھے جن کو جہاز رانی کا فن آ گیا تھا اور وہ چاروں طرف اپنے جہاز دوڑاتے پھرتے تھے اور جہاں کہیں کسی مقام کے لوگوں کو کمزور پاتے تھے وہاں اپنی فوجیں اتار کر اہل ملک کو اپنے قبضے میں کر لیتے تھے اور بعض اوقات سخت خوں ریزی بھی کرتے تھے۔ چنانچہ مقام گوا پر ایک رات میں ان لوگوں نے ساٹھ ہزار ہندوستان کے باشندوں کو قتل کیا تھا۔ اہل پرتگال ہندوستان کی بہت سی دولت لوٹ لوٹ کر یورپ پہنچا رہے تھے کہ اہل ہالینڈ و اہل فرانس اور انگریز بھی ہندوستان میں پہنچ گئے اور ان لوگوں میں اوّل آپس میں ہی بڑے خوں ریز ہنگامے ہوئے۔ فرانسیسیوں نے اہل پرتگال کی اور اہل ہالینڈ کی قوت ختم کر دی اور اب انگریزوں سے ان کی آویزش شروع ہوئی۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں میں بہت بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں اور یہ وہی زمانہ تھا جب یورپ میں نپولین شاہ فرانس یورپ کی مختلف قوموں کو اپنے پاؤں کے تلے روندر ہا تھا اور انگریزوں اور اس سے بڑی سخت لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ ہندوستان میں ڈوپلے نامی فرانسیسیوں کے ایک جنرل کے دل میں سب سے اوّل ہندوستان میں فرانسیسی حکومت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس نے

علاقہ مدراس کے ہندوستانیوں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کر کے ان کو تربیت دینی شروع کی۔
انگریزوں کے فوجی افسروں کو اس کی اس تیاری سے اندیشہ پیدا ہوا اور انھوں نے بھی مقابلے کی
تیاری کرنی شروع کی اور ہندستانیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر کے فوجی قواعد سکھائے۔ انگریزوں کو
ایک فیکٹری کا کلرک جس کا نام کلائیو تھا ایسا منصوبہ باز اور ہوشیار ملا کہ اس نے کلرکی کا کام چھوڑ کر
فوج میں کام کرنا شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ انگریزی فوج کا سپہ سالار بن گیا اور اب اس
نے ہندوستانی ریاستوں سے ساز باز کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہی تھا کہ جس نے اس راز کو سب سے
پہلے پہچانا کہ ہندوستان کے لوگ اس قدر عقل سے خارج ہوتے ہیں کہ وہ اپنے حریفوں کو شکست
دینے کے لیے باہر آنے والوں سے سازش کر کے جیسے بھی ہو سکے گا ان کو شکست دیں گے۔

چنانچہ کرناٹک کے چند اصاحب، میسور کے ٹیپو سلطان، نظام الملک نظام حیدر آباد اور
مرہٹوں کے سرداروں کو اس نے اپنی سازشوں کی زنجیر میں پھانس کر ایک دوسرے سے لڑانا شروع
کیا اور رفتہ رفتہ سب کو ختم کر کے خود ایک زبردست قوت حاصل کر لی تا کہ کوئی دوسرا مقابلہ نہ
رہ سکے۔ اس زمانہ میں اورنگ زیب کے ورثاء میں شاہ عالم ثانی وغیرہ کٹھ پتلیوں کے طور پر شہنشاہ
اکبر اور شاہ جہاں کے تخت پر قابض تھے اس میں اس قدر انحطاط آ گیا تھا کہ وہ ملک کی کوئی حفاظت
نہیں کر سکتے تھے۔ بنگال میں بادشاہ دہلی کا صوبہ دار علی وردی خاں تھا۔ اس کا ایک جانشین سراج
الدولہ تھا جس کی تواریخوں کے اندر انگریزوں نے بہت برائی لکھی ہے۔ حالانکہ اب ثابت ہوا کہ
سراج الدولہ کوئی برا آدمی نہیں تھا۔ لیکن انگریزوں نے جھوٹی تہمتیں لگا کر اس کے نامۂ اعمال کو
خوب سیاہ کیا۔ اس کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ اس نے انگریزوں کی کولکاتا کی بستی پر حملہ کر کے
انگریزوں کو وہاں سے نکال دیا اور کوئی ایک سو چھپیں آدمی پکڑ لیے اور ان سب کو ایک چھوٹی سی تنگ
و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا اور نہ ہوا آنے کا راستہ چھوڑا اور نہ ان کو پانی دیا اور ایک ہی رات میں ما
سوا چند آدمیوں کے سب مر گئے۔ جس کوٹھری میں ان کے بند کرنا بیان کیا جاتا ہے اس کوٹھری کا نام
بلیک ہول رکھا یعنی تاریک سوراخ۔ اس خبر کو شہرت دینے والا ہالول ایک انگریز بیان کیا جاتا ہے جو
منجملہ ان قیدیوں میں سے تھا جو بچ کر نکل آئے تھے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ہالول ان دنوں
کولکاتا میں موجود ہی نہیں تھا بلکہ اس نے ایک بے سروپا افسانہ گھڑا تھا تا کہ انگریزوں کو اشتعال

پیدا ہوا اور وہ سراج الدولہ کے خلاف لڑیں۔

کلائیو نے مدراس سے بنگال پر چڑھائی کی اس وقت سراج الدولہ کا سپہ سالار میر جعفر تھا۔ اس کی فوج کی تعداد کلائیو کی فوج سے زیادہ تھی لیکن کلائیو نے اپنی عادت کے موافق لڑنے سے قبل میر جعفر کو اپنے پھندے میں پھانسا اور اس سے بڑے بڑے وعدے کر کے اس کو سراج الدولہ سے علاحدہ کر دیا اور اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس میں ایک شخص امی چند بنگالی کو جو سراج الدولہ کا خزانچی تھا اس کو بھی شامل کر لیا۔ میر جعفر سے جو وعدے کیے گئے تھے ان کے مطابق ایک عہد نامہ لکھا گیا۔ جب امی چند کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ مجھے بھی اطمینان دلاؤ کہ مجھے کیا ملے گا ورنہ میں سراج الدولہ سے تمھارا راز فاش کرتا ہوں۔ چنانچہ کلائیو نے امی چند کو سخت دھوکا دیا اور میر جعفر و کلائیو نے مل کر دو عہد نامے لکھے۔ ایک عہد نامہ سچا تھا جس کا تعلق تنہا میر جعفر سے تھا اور دوسرا عہد نامہ جھوٹا اور جعلی تھا جس میں امی چند کو بھی شریک کیا گیا تھا۔ اس عہد نامے کے بعد لڑائی شروع ہوئی اور میر جعفر عین لڑائی کے دوران میں اپنی کل فوج لے کر کلائیو کی طرف چلا گیا اور سراج الدولہ کی باقی فوج بہت تھوڑی سی رہ گئی اس کو کلائیو اور میر جعفر کی فوج نے شکست دے دی۔ سراج الدولہ شکست کھا کر بھاگا لیکن میر جعفر کے لڑکے نے اس کو پکڑ لیا اور مار ڈالا۔ اس طرح بنگال پر انگریزوں کی حکومت ہوگئی۔ امی چند بنگالی سے اس کے بعد کہہ دیا گیا کہ تمھاری شرکت جس عہد نامہ میں ہوئی ہے وہ فرضی تھا تم کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ خاموش ہو بیٹھا اور میر جعفر سے جو کچھ وعدے کیے گئے تھے وہ کلائیو نے پورے کرنے شروع کیے اور ایک علاقہ اس کو جاگیر میں دے دیا۔

سراج الدولہ کے ساتھ لڑائی کا واقعہ سخت دھوکا دہی پر مبنی تھا اور سراج الدولہ کی نسبت اب مورخین نے یہ قطعی ثابت کر دکھایا ہے کہ سراج الدولہ برا آدمی نہیں تھا۔ اس کی نسبت جو کچھ واقعات لکھے گئے ہیں وہ سراسر جھوٹ اور غلط تھے اور بلیک ہول کا واقعہ قطعی بے بنیاد تھا۔ اب مورخین نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ سراج الدولہ میں اس قدر بیداری پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ان غیر ملکی باہر کے آنے والوں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہوگیا اور ایک فوج تیار کی۔ انگریز جنھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جس طور پر بھی ہو سکے گا ہم بنگال اور مدراس وغیرہ پر اپنا تسلط جما کر

یہاں کی دولت پر قبضہ کریں گے۔ انھوں نے سراج الدولہ پر چڑھائی کی اور جھوٹے عہد نامے بنا کر اور اس کے سپہ سالار کو اپنے ساتھ ملا کر اس کو شکست دے دی اور بنگال پر قابض ہو گئے۔ انگریز غیر ملکی تھے۔ ان کا ہندوستان میں آنا ہر طریقہ سے خطرناک تھا اور اگر یہاں کے لوگوں میں اتحاد ہوتا اور قوت ہوتی تو وہ کبھی انگریزوں کے قدم نہ جمنے دیتے۔ آپس کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے انگریزوں کو موقع مل گیا کہ ادھر تو انھوں نے فرانسیسیوں کو شکست دے کر صوبۂ مدراس کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور ادھر سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا اور شاہ دہلی سے ایک عہد نامہ کر کے بنگال اور بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا مالی انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے پنجاب کی حد تک پہنچے اور آخر کو سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا اور مہاراجہ گلاب سنگھ سکھوں کے فوجی افسر اور وزیر سے پچھتر لاکھ روپے لے کر کشمیر اس کے ہاتھ بیچ دیا۔

سراج الدولہ کی شکست کے بعد جو جو معاملات پیش آئے اور جن جن ریاستوں سے انگریزوں کی لڑائیاں ہوئیں ان کی تفصیل بہت زیادہ ہے ان کو یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن خلاصۂ کلام یہ ہے کہ رفتہ رفتہ انگریز کل ہندوستان کے حکمراں ہو گئے۔ اب یہاں پر ایک خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے زبردستی اس وسیع ملک کے اوپر قبضہ کیا اور مسلمانوں کی جو کچھ رہی سہی قوت تھی اسے ختم کر دیا اور مسلمانوں کو زیر کر کے ان کو نہایت ہی کمزور اور بے دست و پا کر دیا۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان ہندوستان کی دوسری اقوام کی نسبت اس قدر کمزور ہیں۔ انگریزوں نے اپنی پالیسی کے طور پر یہ تدبیر شروع کی کہ مسلمانوں کو تو وہ جس طور پر ہوتا تھا کمزور کرتے جاتے تھے اور ہندوؤں کو ابھار کر مسلمانوں سے آگے بڑھنے میں مدد دیتے تھے۔ جب مسلمانوں کی حالت اس قدر ابتر ہو گئی تو پھر ایک دوسرا خیال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر انگریز نہ ہوتے، سکھ اور مرہٹے ہی ہوتے تو شاید ہندوستان سے مسلمانوں کو دیس نکالا مل جاتا یا ہندوؤں کی جنگجو قومیں ان کو مار مار کر ختم کر دیتیں۔ ہندوؤں کو اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا کہ انھوں نے بدھوں کی آبادی کو جو کل ملک پر چھا گئی تھی اور سو میں سے نوے یا پچانوے آدمی اس مذہب کے پیرو تھے ان کو برہمنوں اور راجپوتوں نے آپس میں سازش کر کے ہندوستان سے نیست و نابود کر دیا اور اب اس بڑی آبادی میں سے ایک بدھ بھی کہیں باقی نہیں رہا اور علاوہ اس کے دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی مسلمانوں کو اس کا تلخ

تجربہ ہو گیا تھا کہ جہاں جا کر وہ تلوار کے زور سے حکمراں ہو گئے تھے وہاں سے کمزور ہونے کے بعد وہاں کی اصلی اقوام نے مار کے ختم کر دیا تھا۔ جیسا کہ ملک ہسپانیہ، میں ہوا کہ وہاں پر عرب اور مور MOOR مسلمان قومیں جا کر تلوار کے زور سے حکمراں ہو گئی تھیں اور پانچ چھ سو سال تک انھوں نے بڑی زبردست حکومت کی لیکن جب ان میں آپس میں تفرقے پڑے اور ایک سلطنت کی بہت سی سلطنتیں ہو گئیں اور عیاشی میں پڑ کر بالکل کمزور ہو گئیں تو وہاں کی قدیم عیسائی اقوام نے ان کو مار مار کر ختم کر دیا اور ایک فرد واحد بھی زندہ یا سر اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ ان تاریخی واقعات اور تلخ تجربوں کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سخت احتمال تھا کہ مرہٹہ، سکھ، راجپوت اور پہاڑی جنگجو قومیں جیسے کہ نیپالی، یہ سب مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کر دیتیں۔ اس خیال کے رو سے انگریزوں کا ہندوستان میں آنا غنیمت ہوا۔ لیکن جہاں انگریزوں کے آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی قوم ہلاک ہونے سے بچ گئی وہاں اس غیر ملک کی انگریز قوم نے مسلمانوں کو پھر پنپنے کا موقع نہ دیا اور اپنی حکومت کے مضبوط کرنے کے لیے ہندوؤں میں قومی جمعیت کا احساس پیدا کیا۔ جس احساس نے رفتہ رفتہ خود ان ہی کو ختم کر دیا۔ اور اس کے بعد اب ہندوؤں کی توجہ مسلمانوں کی طرف ہوئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کو اور کمزور کیا جاوے اور رفتہ رفتہ اقتصادی مشکلات مسلمانوں کے رستے میں ایسی پیدا کی جائیں کہ وہ یا تو ختم ہو جائیں اور یا اچھوتوں اور شودروں کی طرح ان کے غلام بن جائیں۔

ایسی حالت کو دیکھ کر بعض مسلمانوں کے دل میں حفاظت خود اختیاری کا خیال پیدا ہوا کہ ہم کو اپنی جمعیت قائم کرنی چاہیے تا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد اپنی حفاظت کر سکیں اور ہندوؤں کی اس تحریک میں شامل نہیں ہونا چاہیے جو انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے مشہور ہے اور جس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی کمزوری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اگر انگریز ایسی حالت میں گئے تو پھر مسلمانوں کی وہی حالت ہونے کا اندیشہ رہے گا جو حالت اسپین کے مسلمانوں کی ہوئی۔ اس خیال کی وجہ سے مسلمان ہندوؤں کی کانگریس میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن ہندو انگریزوں کی آنکھوں کے سامنے قوت پکڑتے جاتے تھے اور رفتہ رفتہ انھوں نے آزادی کا اعلان کرنا شروع کیا۔ انگریز بعض وقت ان کے لیڈروں کو

جیل خانے میں بھی ڈال دیتے تھے۔ لیکن جیل سے نکلنے کے بعد وہ پھر دو چند قوت کے ساتھ انگریزوں کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ مسلمانوں کی قوم کی آنکھ اچھے طریقے سے نہ کھلی اور وہ طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کرتے رہے کہتے رہے کہ جس ملک پر ہم نے سات سو سال تک حکومت کی ہے وہاں سے ہم کو ہٹانے وا ... بے دخل کرنے والا کون ہے۔ ہم ہندوؤں کی حکومت کا جُوا ابھی اپنے کندھے پر نہ لیں گے یہ خیال ان کا سخت حماقت کا خیال تھا۔ جب ہندو بلحاظ اپنی جمیعت اپنی قومی اتفاق اپنی کثرت آبادی اور اپنی دولت مندی کے قوت پکڑتے جاتے تھے تو بھی مسلمان انگریزوں کے جانے کے بعد اپنی حفاظت کرنے کے لیے کسی طور پر تیار نہ ہوئے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندوؤں نے صاف کہہ دیا کہ جمہوری حکومت ہم قائم کریں گے۔ اس میں مسلمانوں سے کسی خصوصیت کا برتاؤ نہیں کریں گے۔ ہم انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد تمام ملک کے باشندوں کو موقع دیں گے کہ وہ زور بازو سے ملک کی دولت کا جو حصہ کما سکیں وہ حاصل کرلیں۔ اور باقی دوسروں کو بھی اپنی کمائی سے بہرہ ور ہونے دیں۔ آزادی کے زمانے میں، دست خود دہان خود۔ گرنہ خوری زبان خود کا معاملہ رہے گا۔ اور یہ ہم نہیں کریں گے کہ مسلمانوں کی قوم اگر اس بات کی اہل نہیں ہے کہ وہ خود اپنی مدد کرے تو ہم بیٹھے ہوئے اس کے منہ میں لقمہ دیا کریں۔ ہم تو آزادی اور جمہوریت کو فروغ دیں گے۔ اور اگر کوئی قوم اس قابل نہ ہو کہ اس کشمکش کی زندگی میں اپنے لیے کچھ حاصل کر سکے تو اس کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیں گے اور اگر وہ ختم ہو جائے گی تو خدا کی خدائی میں کوئی زیادہ فرق نہیں آئے گا۔ ہندوستان ہندوؤں کا ملک تھا۔ اس کو مسلمان حملہ آوروں نے زبردستی ہندوؤں سے چھین لیا تھا۔ اگر مسلمان اپنی کمزوری کی وجہ سے ختم ہو جائیں اور ملک پھر ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے تو یہ ایک انصاف کی بات ہوگی۔ اس میں ہم کو مسلمانوں کو کسی قومی جتھے یا قوت کیساتھ زندہ رکھنے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ان کو جداگانہ انتخاب کا بھی کوئی موقع نہیں دیں گے اور نا ہی ان کے لیے ملازمت کے صیغوں میں آسانیاں پیدا کریں گے کہ اس قدر مسلمان فلاں صیغہ میں ضرور ملازم رکھے جائیں گے۔

اس آخر زمانے میں مسلمانوں کے سیاسی لیڈر مسٹر محمد علی جناح تھے جو قائداعظم کے نام

سے بھی پکارے جاتے تھے۔ قائداعظم کے معنی بڑا لیڈر ہے۔ مسٹر جناح ہندوؤں کی تحریریں اور تقریریں سن کر اور ان کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر سخت بے چین ہوئے اور انھوں نے مسلم لیگ کے ذریعہ جو مسلمانوں کی پولیٹیکل جماعت تھی یہ دعویٰ پیش کیا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ملک کی تقسیم ہونی چاہیے۔ اور جن علاقوں میں مسلمانوں کی کثرت ہو وہ علاقے تقسیم کر کے ان کو دے دیے جائیں تا کہ وہ ہندو اکثریت کی پرمضرت حکومت سے بچے رہیں۔ جو حصہ مسٹر جناح نے طلب کیا اس کا نام پاکستان رکھا گیا۔ یعنی پ سے پنجاب الف سے افغانستان ک سے کشمیر اور ستان سے بلوچستان اور سندھ۔ افغانستان سے سرحد کا علاقہ مراد تھا۔ جہاں افغان رہتے ہیں اور کابل کا حصہ اس میں شامل نہیں تھا۔ قائداعظم کے اس دعویٰ اور اعلان کے بعد ایک سخت کش مکش شروع ہوئی۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہم تو کوئی تقسیم نہیں کرنے کے۔ ہمارا تو اکھنڈ ہندوستان رہے گا۔ یعنی ایک ہی ملک جو بلا تقسیم کے ہو۔ اس پر بہت دنوں تک جھگڑے رہے لیکن مسٹر جناح اور مسلمان اس پر جم گئے کہ ہم تو ملک کی ضرور تقسیم کرائیں گے۔ اب ادھر انگریزوں نے یہ دیکھ لیا کہ اب ہندوستان پر جو کہ اس قدر بیدار ہو گیا ہے حکومت کرنا دشوار ہے۔ اور ہندوؤں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو تھوڑا سا علاقہ دے کر ان سے پیچھا چھڑاؤ تا کہ انگریز تو یہاں سے نکلیں۔ مسلمان بھی اس لالچ سے کہ تقسیم کروا کر ہمیں الگ ملک ملے گا انگریزوں کی حکومت سے پیچھا چھڑانے کے لیے رضامند ہو گئے اور انگریزوں نے بھی مان لیا کہ ملک تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ ملک تقسیم ہوا اور پنجاب و بنگال اور سندھ اور بلوچستان اور سرحد اور مشرقی بنگال اور آسام اوّل یہ علاقے مسلمانوں کو دینے تجویز ہوئے۔ لیکن ہندو اس پر اڑ گئے کہ صوبہ بنگال کے جن اضلاع میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہ ان کو نہ دیے جائیں اور پنجاب کے جن اضلاع میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہ بھی مسلمانوں کو نہ دیے جائیں۔ اور نہ صوبہ آسام ان کو دلوایا جائے۔ اس پر بہت کچھ ردو کد ہوتی رہی۔ لیکن آخر کو مسلمان اس خطرے سے مرعوب ہو گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو علاقہ کم یا زیادہ ہندو ہمیں دینے کے لیے تیار ہیں کہیں وہ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ نکل جائیں اس لیے وہ رضامند ہو گئے کہ پنجاب، بنگال اور آسام بھی تقسیم کر دیے جائیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے قبل جب آزادی

اور تقسیم کا اعلان کیا تو اس میں پنجاب اور بنگال اور آسام پاکستان میں شامل کیے لیکن اس کے ساتھ ہی سکھوں سے ہمدردی ظاہر کی کہ سکھوں کے قوم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا پاکستان میں رہ گیا اور دوسرا ٹکڑا ہندوستان میں شامل ہو گیا۔ اس اعلان کے بعد سکھوں نے پنجاب کی تقسیم کے متعلق ایک حشر برپا کر دیا اور مسلمانوں کو دھمکی دی کہ ہم مشرقی پنجاب کو کسی حالت میں بھی پاکستان میں نہیں رہنے دیں گے۔ بلکہ ہم تو دریائے چناب کو پاکستان اور ہندوستان کی سرحد قرار دیں گے۔ چونکہ دریائے چناب سے ادھر جتنے اضلاع ہیں ان سب میں سکھوں کی آبادی ہے اور سکھوں کے مقدس مقامات اور گوردوارے ہیں۔ اس کش مکش کے دوران میں مسلمان بھی ڈھیلے پڑ گئے اور یہ طے ہوا کہ پنجاب اور بنگال تقسیم کر دیے جائیں اور یہ تقسیم کمیشن کے ذریعہ ہو جس کے صدر انگلستان کی کسی بڑی عدالت کا جج ہو۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند ان دنوں ولایت گئے اور ان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ انگلستان کی ہائی کورٹ کے کسی جج کو اس تقسیم کی کمیٹی کی صدارت کے لیے مقرر کریں۔ چنانچہ انھوں نے انگلستان کے ہائی کورٹ کے ایک جج ریڈ کلف نامی کو نامزد کیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے ان کا تقرر منظور کر لیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان یہ بھی طے ہوا کہ جو کچھ فیصلہ ریڈ کلف کمیٹی کرے گی جو تقسیم کے لیے مقرر ہو گی اس کے خلاف کسی فریق کو عذر یا مزید چارہ جوئی کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بعد کمیٹی مقرر ہوئی، اس کے ممبروں میں دو ہندو اور دو مسلمان ہوئے اور ریڈ کلف اس کمیٹی کا صدر قرار پایا۔ اور اس نے وہی فیصلہ دیا جس کا مسلمانوں کو اندیشہ تھا جیسا کہ اس سے قبل مفصل طور پر اوپر ذکر آچکا ہے۔ ریڈ کلف کمیٹی نے جو تقسیم کی اس سے مسلمانوں کو سخت شکایت رہی۔

اب ہم اپنے تاریخی مضمون کا سلسلہ ملک کی دو حصوں میں تقسیم پر ختم کرتے ہیں۔ اس ہندوستان کی تقسیم سے اور انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے کی وجہ سے جو زبردست انقلاب اس ملک میں برپا ہوا ہے اس کا احساس ہر سمجھ دار ہندوستانی کے دل میں ہونا ضروری ہے۔ اور وہ انقلاب یہ ہے کہ ست جگ سے لے کر آج تک یہ ملک شخصی حکومتوں کا ماتحت رہا ہے۔ شخصی حکومت خواہ راجا مہاراجاؤں کی ہو یا پٹھان و مغل بادشاہوں کی ہو یا کسی انگریز بادشاہ کی ہو وہ سب خودمختار و غیر ذمہ دار اشخاص حکومتیں تھیں۔ ایک آدمی قابو پا کر ملک کی سیاہ و سفید کا مالک ہو جاتا تھا اور وہ کبھی

راجہ یامہاراجہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔یا بادشاہ یا نواب کہلاتا تھا۔یا پھر شہنشاہ ہندوستان کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ بات ایک ہی ہوتی تھی ۔لیکن اب انگریزوں نے اس سلسلے کو ختم کردیا۔اپنی حکومت ہندوستان سے ہٹالی اور رعایا کی حکومت قائم کردی۔خواہ وہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں لیکن سابق کی کل حکومتوں سے مختلف ہے ۔اللہ تعالیٰ ہندوستان اور پاکستان میں جمہوری حکومتوں کو راس لائے اور دونوں بڑھیں پھولیں پھلیں اور دنیا میں ناموری حاصل کریں۔آمین

ہنگامۂ خلافت اور خلافت کی تحریک

یہ خلافت دراصل عرب کی خلافت نہیں تھی بلکہ ہندوستان کے بعض مسلمانوں نے خلافت کے نام سے ایک جماعت بنالی تھی جس کا ذکر کیا جاتا ہے۔میرے زمانے کے لوگ ہندوستان میں خلافت کی تحریک اور خلافت کا کام اور اس کام کی بربادی کی جزیات وتفصیل سے بخوبی واقف ہیں لیکن آئندہ نسلوں تک بجز خلافت کے نام کے اور کوئی بات نہیں پہنچے گی کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی نے اس تحریک کی تاریخ نہیں لکھی ۔اوّل روز جو اس تحریک کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا اس میں میں بھی شریک ہوا تھا اور گو اس جلسے کے علاوہ میں کبھی کسی دوسرے جلسے میں شریک نہیں ہوا، تاہم میں نے اور گرلز کالج کی لڑکیوں نے خلافت کے لیے چندے بھی دیے اور اس کے کاموں سے واقفیت بھی ہوتی رہی اس لیے میں مختصر طور پر اس تحریک کی تاریخ اور حالات قلم بند کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے بہت مرتبہ خلافت کے ارباب حل وعقد سے سوال کیا کہ یہ تحریک کس اُصول پر مبنی ہے۔اس کا انجام کیا ہوگا۔مجھ کو تو کسی شخص نے کبھی کوئی معقول جواب نہیں دیا کہ اس تحریک سے آئندہ اسلام کو یا ترک قوم کو کیا نفع پہنچے گا۔البتہ دہلی میں ایک مرتبہ مولانا شوکت علی مرحوم کو جو اس تحریک کے زبردست حامی اور نمائندے تھے،ایک دوسرے مسلمان سے باتیں کرتے سنا جس سے مجھ کو اندازہ ہوا کہ اس تحریک کی کچھ اصلیت نہیں ہے۔یہ ایک نہایت بے اصولی سی تحریک ہے۔مولانا شوکت علی مرحوم نے اس مسلمان دوست سے کہا کہ اس زمانے میں ترکوں کی اور اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت انگریز کررہے ہیں جو ہمارے بادشاہ ہیں،ہم یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کے لیے بھڑوں کا چھتہ بن کررہیں کہ ترکوں کے خلاف کوئی زبردست کارروائی کرتے وقت ان کو یہ تو

اندیشہ رہے کہ ہم ان کی ہندوستان کی حکومت کو نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اب یہ صاف ظاہر ہے کہ خلافت کی تحریک اگر محض چندہ جمع کرنے کے لیے مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں ہوئی تھی تو یہ بھڑوں کا چھتہ بننے کا منصوبہ ایک بڑی قوم کے لیے کوئی قابل تحسین کام نہیں ہو سکتا۔ ہم اس تحریک کی تاریخ کے بڑے بڑے اور نمایاں واقعات قلم بند کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک کسی نے اس ہنگامہ خیز تحریک کی تاریخ اس وقت تک نہیں لکھی اور نہ شاید کوئی لکھے۔ اس لیے آئندہ نسلوں کی واقفیت اور عبرت کے لیے اس کی ابتدا، اس کی غرض، اس کا انجام اور اس کی تباہی کے واقعات قلم بند کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سب سے اول ہم خلافت کے مفہوم پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

خلافت کا مفہوم

خلافت کے لفظی معنی جانشینی کے ہیں۔ مسلمانوں میں ابتدا سے یہ لفظ جانشینی کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ اعتقاداً مسلمان یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو خدا نے اس دنیا میں اپنا خلیفہ بنانے کے لیے پیدا کیا تھا یعنی خدا کی تمام مخلوق پر جو زمین پر پیدا کی گئی اس پر حضرت آدم کو بطور اپنے جانشین کے حکومت کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ لیکن میں تو اس لفظ کا مفہوم بہت زیادہ محدود دائرے کے اندر رکھنا چاہتا ہوں یعنی میں خلافت کے لفظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی تک محدود کرتا ہوں۔ ہم کو قرآن پاک میں کہیں پتہ نہیں ملتا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لیے کسی فرد واحد کو نامزد کیا ہو اور نہ تاریخ میں یا حدیث میں اس کا کوئی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں موقع پر بالاعلان کسی شخص کو اپنا جانشین مقرر کیا کہ میرے صحابہ میں سے یا میرے عزیزوں میں سے میرے بعد فلاں شخص خلیفہ یا میرا جانشین ہوگا۔ شیعہ صاحبان اس زمانے میں کسی روایت پر استدلال کر کے کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر جب وہ حج سے واپس آ رہے تھے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اس روایت کی یاد تازہ کرنے کے لیے شیعہ صاحبان ایک خاص دن عید مناتے ہیں جس کو عید غدیر کہتے ہیں۔ لیکن سنّی اس روایت کو غلط ثابت کرتے ہیں کہ ایسا واقعہ کبھی نہیں ہوا اور آنحضرت نے آخر وقت تک کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔ خیر یہ مسئلہ تو متنازعہ فیہ ہے اور ہم خیالی باتوں پر توجہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ہم آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی جانشینی اس کو سمجھتے ہیں جو وقوع میں آئی اور کل دنیا نے جس کو دیکھا اور کل دنیا اس کو مانتی رہی ہے اور اب بھی مانتی ہے۔ وہ جانشینی کوئی خیالی جانشینی نہیں تھی اور نہ کسی غلط روایت پر مبنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رحلت سے قبل خلیفۂ اول کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ سنیوں کا یہ بیان کہ اپنی آخری یا مرض الموت کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اجازت دی تھی کہ وہ نماز اپنی امامت میں مسلمانوں کو پڑھائیں اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ فی الواقع آنحضرت نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ کیونکہ سنیوں کو آنحضرت کے کسی صریح ارشاد پر استدلال نہیں ہے۔ اس لیے ہم حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد والا پر مبنی نہیں کر سکتے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جس طور پر جانشین مقرر ہوئے وہ اس زمانے میں عام طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ مدینہ منورہ کے بعض انصار جن کے خیالات میں تزلزل تھا انھوں نے آنحضرت کے وصال کے فوراً ہی بعد اس جانشینی کے مسئلہ کو اٹھایا اور اس بات پر وہ غور ہی کر رہے تھے کہ انصار میں سے کس کو خلیفہ بنایا جائے کہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے ساتھ لے کر اس جلسے میں پہنچ گئے۔ انھوں نے انصار کو سمجھایا کہ دیکھو بعض قبائل اسلام سے انحراف کرنے کے لیے تلے ہوئے ہیں اور چار اشخاص نے پیغمبری کا دعویٰ بھی کر رکھا ہے جن کے ساتھ کچھ قبائل بھی ہو گئے ہیں۔ اب اگر تم آپس میں اختلاف پیدا کرو گے تو مخالفین کو تقویت پہنچے گی اور ہم لوگ کمزور ہو جائیں گے۔ جانشینی کا حق تو قریش ہی کو پہنچتا ہے کیونکہ وہ مکہ شریف و خانہ کعبہ کے محافظ ہیں اور تمام عرب قریش ہی کو اپنا پیشوا سمجھتا ہے۔ انصار قریش کے دوست ہیں اور دوست رہیں گے۔ ان کا مشورہ ہر کام میں شامل رہے گا۔ لیکن اس وقت آپ لوگ قریش میں سے کسی ایک شخص کو آنحضرت کا جانشین چن لیجیے تاکہ دوست اور دشمن دونوں کو اطمینان ہو جائے کہ امت محمد ﷺ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی کمزوری ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نامزد کیا اور فوراً ان کے ہاتھ پر خود بیعت کر لی۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے حضرات نے بھی بیعت کر لی اور یہ نہایت ہی خطرناک مرحلہ اس وقت ان دونوں دوستوں کی دوراندیشی سے حل ہو گیا۔

واقعات اس کی پوری تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جانشین مقرر ہونا اسلام کی آئندہ ترقی اور بہبودی کے لیے نہایت مبارک ثابت ہوا۔اس وقت چند خطرناک حالات درپیش تھے۔ایک تو شام کی طرف کے عیسائیوں کے حملے کا اندیشہ تھا جن کے مقابلے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک فوج کا دستہ تیار کر کے نوجوان صحابی حضرت اسامہ بن زید کی سرکردگی میں شام کی طرف مقابلے کے لیے جانے کا حکم دیا تھا لیکن ابھی یہ فوج مدینہ منورہ سے روانہ ہوئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا۔اب بحث یہ پیش آئی کہ آیا ایسے خلفشار کی حالت میں جو خود عرب میں چاروں طرف پیدا ہوگئی ہے اس فوج کا مرکز سے ہٹانا مناسب ہے یا نہیں۔قریب قریب سب کی رائے یہی تھی کہ اب اس فوج کو مدینہ منورہ میں ہی رہنا چاہیے۔لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اس بات پر اڑے رہے کہ جس بات کا حکم خود آنحضرت فرما گئے ہیں میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا خواہ دنیا ادھر سے ادھر کیوں نہ ہو جائے۔

اس خیال کی پختگی کا نہایت ہی اچھا نتیجہ نکلا۔اول تو قبائل عرب مرعوب ہوگئے کہ معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ کے پاس بہت زبردست قوت ہے کہ وہ اپنی فوج عیسائیوں کے مقابل میں شام کی طرف بھی بھیج رہے ہیں اور مدینہ منورہ کے گردونواح کے قبائل کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا ہے۔حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے عزم کے نہایت ہی پکے صحابی مسلمان اور خلیفہ ثابت ہوئے۔ادھر تو انھوں نے حضرت اسامہؓ بن زید کی سرکردگی میں ایک فوج کا دستہ شام کی طرف روانہ کردیا اور اُدھر مسیلمہ کذّاب وغیرہ چار جھوٹے مدعیان نبوت کی سرکوبی کے لیے یمن کی طرف صحابہؓ کا ایک دستہ بھیجا۔یمن میں جنگ شروع ہوگئی جو اندیشہ سے خالی نہ تھی۔لیکن اتنے میں حضرت اسامہؓ کی فوج شام میں دشمنوں کو شکست دے کر مدینہ منورہ میں واپس آگئی۔اب اس فوج کو بھی یمن کے جھوٹے مدعیوں کے مقابلے میں بھیج دیا گیا اور وہاں پہنچتے ہی اس فوج نے مسیلمہ کذّاب اور اس کے تین ساتھیوں کا قلع قمع کردیا اور یمن کے قبائل سے صلح ہوگئی اور ملک میں امن کی ایک اطمینانی صورت پیدا ہوگئی۔یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا سب سے پہلا کارنامہ تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کی نسبت کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے کسی حق دار کا حق غصب کیا تھا۔وہ بنی ہاشم میں سے تو نہیں تھے لیکن سرداران قریش میں ایک

نہایت ممتاز فرد تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر خاندان بنی ہاشم کے اشخاص نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی اس لیے اب ان کو غاصب کہنا واقعات کے خلاف ہے۔ جب اس وقت کے خلافت کے دعویداروں نے بیعت کرلی تو پھر آج کل کے علما بلا وجہ گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اہل اسلام کو اسی خلافت کے جھگڑے کی وجہ سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے جو اسلام کو بجائے فائدہ پہنچانے کے ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے ہیں اور اسلام میں ان مناقشات کی وجہ سے سخت کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کو خلیفہ اوّل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور خلافت راشدہ کے وہ ایک بہت بڑے رکن تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی عمر نے بہت زیادہ وفا نہ کی۔ وہ عمر رسیدہ آدمی تو تھے ہی لیکن دو سال سے زیادہ خلافت کے عہدے کے کام کے انجام دینے کا موقع نہ ملا اور خلافت کا عہدہ ملنے کے دو سال بعد ان کا وصال ہوگیا۔ وہ صحیح معنوں میں آنحضرت کے خلیفہ تھے کیونکہ ان میں انسانی ہمدردی، رحم، انصاف، اور دیگر آنحضرت کے اوصاف مبارک ورثہ میں ملے تھے جن کی انھوں نے بہت قدر کی اور حکومت کا وہی طرز قائم رکھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمر فاروقؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت اسلام کے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی۔ ان کی بہادری و جرأت اور عزم مسلّمہ تھے۔ ان کے زمانے میں ایک طرف تو شام اور مصر فتح ہوئے اور دوسری طرف ایران کی زبردست سلطنت کو مسلمانوں نے فتح کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ فتوحات کچھ معمولی نہیں تھیں بلکہ ان میں ایک زبردست کرشمہ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ عرب نہایت جاہل قوم تھی۔ اپنے ملک سے نکل کر کبھی کسی دوسری قوم پر حملہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اب تو انھوں نے دو نہایت زبردست سلطنتوں یعنی رومی سلطنت اور ایرانی سلطنت دونوں کو صرف فتح ہی نہیں کرلیا بلکہ ان دونوں ملکوں میں ہزار ہا سال سے سلطنتیں قائم تھیں۔ ان دونوں ملکوں سے ان کا نام و نشان مٹا دیا اور ان ممالک مفتوحہ میں جس قدر مخلوق تھی وہ عربوں کے انصاف و رواداری اور میل و محبت کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ سب مسلمان ہوگئے۔

کئی دن کا تھا۔ اس لیے لوگوں کو اعتراض کا موقع ملا۔ یہ بات خلافت کے ارباب حل وعقد نے خود تسلیم کی تھی کہ باون لاکھ روپیہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی امداد کے لیے دیا ہے۔ دوسرے لوگ تو اس چندے کا اندازہ زیادہ کرتے تھے کہ کئی کروڑ روپیہ جمع ہوا تھا لیکن ہم اس رقم کو تسلیم کیے لیتے ہیں۔ جو خلافت کے کارکنوں نے قبول کی تھی۔

تحریک کا کام ابھی جاری تھا کہ لوگوں نے تقاضے کرنے شروع کیے کہ بتاؤ روپیہ کیا ہوا؟ ترکی بھیجا گیا یا نہیں۔ اس پر مولانا محمد علی اپنے اخبار ہمدرد میں جواب دیتے رہے۔ پہلے تو کہا کہ اٹلی کے بینک نے جو رسید آپ کو دی ہوگی وہ آپ پیش کیجیے۔ اس پر جواب دیا کہ اٹلی کے بینک نے ہم کو کوئی رسید نہیں دی کیونکہ یہ کام انگریزوں سے خفیہ طور پر کیا گیا ہے۔ لوگوں نے اس پر بہت زیادہ تقاضا کیا اور آمد وخرچ کا حساب طلب کیا۔ مولانا محمد علی نے لکھا کہ حساب تو خدا ہی کے یہاں چل کر دیں گے۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ سیٹھ چھوٹانی کے لکڑی کے کارخانے سے بھی کوئی بہت زیادہ رقم وصول نہیں ہوئی۔ لیکن جو وصول ہوئی اس سے ایک مکان ممبئی میں دفتر خلافت کے لیے خریدا گیا۔ جو بعد میں مسٹر زاہد علی خلف مولانا شوکت علی کا مملوکہ ہوگیا اور اس وقت وہی اس مکان میں رہتے ہیں اور وہی تمتع حاصل کرتے ہیں کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں۔

ایک مرتبہ مسٹر نریمان کانگریس کے لیڈر کے ساتھ دہلی سے علی گڑھ تک میں نے سفر کیا۔ مسٹر نریمان نے فرمایا کہ آپ مسلمانوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی قوم غافل اور غیر منظم نہیں ہے۔ انھوں نے خلافت کے چندوں کی ابتری بیان کرنے کے بعد کہا کہ خلافت کے روپے سے ایک مکان ممبئی میں خریدا تھا وہ بھی مولانا شوکت علی اور ان کے بیٹے کی ملکیت ہوگیا۔ مجھے اس مکان کی خریداری یا ملکیت سے پہلے سے واقفیت نہیں تھی۔ سب سے اول مسٹر نریمان کی زبانی یہ حال معلوم ہوا اور اس کو سن کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ دوسروں کی نگاہ میں ہم اپنے آپ کو کس قدر ذلیل اور لالچی ثابت کر رہے ہیں۔

اس بات کا مجھے قطعی یقین ہے کہ ترکوں کے پاس اس مسلمہ باون لاکھ کی رقم میں سے ایک پیسہ بھی نہیں گیا اور مجھے یقین اس طرح پر ہوا کہ رؤف پاشا جو خلافت کی تحریک کے زمانے

میں ٹرکی میں وزیراعظم تھے وہ بعد میں جب پرائم منسٹری سے علاحدہ ہو گئے تو ہندوستان آئے اور ان سے ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ ہندوستان سے آپ کے پاس کتنا روپیہ پہنچا۔ انھوں نے سن کر کہا کہ یہ سوال مجھ سے اور لوگوں نے بھی کیا ہے اور جو جواب اوروں کو دیا ہے وہی آپ کو بھی دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اس روپے کی آلائش سے ہمارا ہاتھ بالکل پاک ہے۔ ہم سنتے رہے کہ ہندوستان میں ہمارے لیے روپیہ جمع ہو رہا ہے لیکن کبھی ہندوستان سے نہ روپیہ آیا اور نہ کسی ایسے روپے کی شکل دیکھنی ہم کو نصیب ہوئی۔ آپ لوگوں کو اگر افسوس ہے کہ روپیہ برباد ہو گیا تو ہم کو آپ سے زیادہ افسوس ہے کیونکہ جن معطیوں نے ہمارے لیے روپیہ دیا تھا وہ ہمارے کام نہ آیا۔ اگر ہم کو مل جاتا تو ہماری بہت سی ضرورتیں پوری ہوتیں۔

اب اس خلافت کے مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں اس افسوس ناک واقعہ کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو علی برادران کی ذات کی برکت سے ظہور میں آیا۔ اور وہ واقعہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ پر علی برادران اور مہاتما گاندھی کا جارحانہ حملہ ہوا تھا۔ غالباً 1919 میں کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کا جلسہ ہوا۔ اس وقت علی برادران بھی کانگریس میں شریک ہو گئے تھے۔ اس وقت ترک موالات اور عدم تعاون کا بہت زیادہ زور تھا۔ علی برادران پیش پیش تھے۔ اس سال کی کانگریس، نہ معلوم علی برادران کی تحریک سے یا کسی اور کی تحریک سے ایک ریزولیوشن پاس ہوا کہ انگریزی مدارس ختم کر دینے چاہییں کیونکہ ان سے جو طالب علم نکلتے ہیں وہ نوکریوں کی ہوس میں دیگر بڑے حکام کی خوشامد میں لگ جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے حکام کی اور انگریزی حکومت کی جڑیں ہلنے نہیں پاتیں۔ اس لیے تمام مدارس کو جس میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے ختم کر دیا جائے۔ علی برادران نے اس جلسہ میں اس بات کا ذمہ لیا کہ ہم علی گڑھ کالج کو ختم کر کے ایک نمونہ ملک کے سامنے پیش کریں گے۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد کانگریس کے کارکنوں کا مشورہ تھا کہ مدارس کے خاتمہ کا کام جلد شروع کیا جائے۔ کلکتہ میں جہاں چھوٹے بڑے سینکڑوں مدارس ہوں گے اور یونیورسٹی بھی تھی وہاں کسی منیجر یا جماعت منتظمہ سے کہنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے مدارس بند کر دیں۔ پھر علی برادران، گاندھی جی اور دوسرے اراکین کو اپنے ساتھ لے کر شمال کی طرف چلے۔ رستے میں کلکتہ اور علی گڑھ کے درمیان کئی سو چھوٹی اور بڑی درس گاہوں کے پاس سے گزرے۔

بنارس میں بنارس یونیورسٹی تھی، الٰہ آباد میں الٰہ آباد یونیورسٹی تھی، پٹنہ میں بھی یونیورسٹی تھی، کانپور میں کئی ڈگری کالج تھے۔ لیکن کسی درس گاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

یہ قافلہ یلغار کرتا ہوا علی گڑھ پہنچا اور عامر مصطفےٰ خاں مرحوم کے مکان پر گاندھی جی ٹھہرے اور علی برادران مع اپنے دوستوں کے اولڈ بوائز لاج میں ٹھہرے۔ جب ان کی آمد کی خبر پہنچی تو میں نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سے جو اس وقت پرنسپل تھے کہا کہ ان کو کالج میں ہرگز نہ گھسنے دو، وہ خواہ گاندھی جی ہوں یا علی برادران ہوں۔ جب یہ ہمارے انتظام میں خلل اندازی کی نیت سے آرہے ہیں تو ہم کو قانوناً اور اخلاقاً یہ اختیار حاصل ہے کہ ہم ان کو اپنے احاطے میں نہ آنے دیں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم اس موقع پر کمزوری دکھا گئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں ان لوگوں کا آنا روکتا ہوں تو جو طلبا ہمارے ساتھ ہیں، ہمارے خلاف ہو جائیں گے۔ جب یہ لوگ یہاں آگئے تو ڈاکٹر ضیاء الدین گاندھی جی کے پاس گئے اور کہا کہ اگر طالب علموں کو بہکا کر کالج چھوڑنے پر آمادہ کیا جائے گا تو اس سے کالج کو اور مسلمان قوم کو بہت سخت نقصان پہنچے گا۔ گاندھی جی نے کہا کہ جب ہمارا راج ہو جائے گا تو ہم تم کو اس سے بڑا کالج بنا دیں گے۔ اس وقت ہم بورڈنگ ہاؤس اور کالج کی عمارات کو طالب علموں سے خالی کرا کر ان میں کانگریس کا دفتر اور والنٹیر رکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔ میں نے اور دوسرے دوستوں نے ان کو خوب ملامت کی کہ وہ گاندھی جی کے پاس گئے ہی کیوں۔

تین دن تک برابر کشمکش رہی۔ علی برادران طالب علموں کو بہکا رہے تھے کہ ملک کی سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے اور ان کے ماتحت کالجوں کو ختم کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو ہمیشہ غلام رہو گے۔ مسلمان ہمیشہ بڑے بڑے کام کرتے رہے ہیں۔ انگریزوں کو نکالنے میں مسلمانوں ہی کو پیش دستی کرنی چاہیے لیکن طالب علم نہیں مانتے تھے کہ ہندوؤں کا ایک مدرسہ بھی تباہ نہیں ہوا اور آپ سب سے پہلے ہمارے کالج کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ طالب علموں سے جھوٹ بیان کیا گیا اور ان کو مغالطہ دیا گیا کہ اگر ہم چاہتے تو ہندو سب کے سب اپنے مدرسے بند کر دیتے اور اب بھی بند کر دیں گے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس بڑے کام کا سہرا پہلے علی گڑھ ہی کے سر رہے اس لیے ہم علی گڑھ سے ہی شروع کرنا

چاہتے ہیں۔اس پر بھی طالب علموں نے نہیں مانا پھر مولانا محمد علی کھڑے ہو کر خوب روئے اور کہا کہ لو ہم جاتے ہیں لیکن ایک سخت رنج اپنے دل میں لے کر جاتے ہیں۔تم عزیز بچوں نے ہمارا کہنا نہیں مانا۔ہماری امیدیں خاک میں مل گئیں اور اردو کا یہ شعر پڑھا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن   بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ سے ہم نکلے

اس پر طالب علم بہت متاثر ہوئے اور سات سو طالب علموں نے آمادگی بظاہر کر لی کہ ہم کالج چھوڑ دیں گے۔اسکول کے بچے ابھی ان کے قابو میں نہیں آئے تھے لیکن وہ اولڈ بوائز لاج میں بیٹھ کر ریشہ دوانیاں کر رہے تھے کہ ان بچوں کو بہکا کر نکال لے چلیں۔اب ہم کو ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے انتظام سے سخت مایوسی ہوگئی اور نواب سید محمد علی سیکریٹری ایم۔اے۔او کالج اور نواب سر محمد مزمل اللہ خاں اور موجودہ ٹرسٹیان نے باہمی مشورہ کیا۔اور یہ قرار پایا کہ علی برادران اور ان کے دوستوں کو پولیس کے ذریعہ سے کالج کے باہر نکال دیا جائے۔

علی برادران سے کہا گیا کہ آپ کالج کا احاطہ چھوڑ دیں۔انھوں نے کہا کہ ہم نہیں چھوڑیں گے اس لیے مجبوراً کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے امداد مانگی گئی اور علی برادران اور ان کے دوستوں کو کالج کے احاطے سے نکلوا دیا۔اس وقت کالج کی حالت نہایت خطرناک ہوگئی تھی اور یہ امید نہیں رہی تھی کہ کالج دوبارہ اپنی پرانی حالت پر آسکے گا۔لیکن خدا کی مہربانی شامل حال تھی کہ کالج کی صورت میں تو ادارہ دفن ہوگیا اور یونیورسٹی کی شکل میں قبر سے نکل آیا۔

اس وقت سر ہارکورٹ بٹلر صوبہ یو۔پی کے گورنر تھے اور مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم ان کی کونسل کے ہوم ممبر تھے۔دونوں نے ہماری مدد کی اور یونیورسٹی قائم ہوگئی۔یونیورسٹی بہت پہلے قائم ہو جاتی لیکن سات آٹھ سال سے معرض التواء میں پڑی ہوئی تھی۔کیونکہ گورنمنٹ نے جن شرائط پر یونیورسٹی دینی چاہی تھی، بنارس والوں نے اس کو منظور کر لیا تھا اور وہ اپنی یونیورسٹی چلا رہے تھے مگر ہم اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ جب تک ہماری شرطیں نہ مانی جائیں گی ہم یونیورسٹی جاری نہ کریں گے۔کالج کے مذکورہ بالا واقعہ نے گورنمنٹ کو اور ہم کو مجبور کر دیا کہ آپس میں سمجھوتہ کر کے یونیورسٹی جاری کر دیں۔چنانچہ یونیورسٹی قائم ہوگئی۔جب یونیورسٹی بن گئی تو علی برادران بن بلائے آ کر جلسوں میں شریک ہونے لگے کیونکہ وہ کالج کے ٹرسٹی تھے اور کالج کے

سب ٹرسٹی کورٹ کے ممبر ہو گئے تھے۔اس لیے وہ بھی آکر شریک ہو جاتے تھے۔

یہ سنا کہ یہاں سے واپس جاتے وقت گاندھی جی اور علی برادران نے بنارس یونیورسٹی میں بھی فتنہ برپا کرنا چاہا لیکن مالویہ جی نے کہلا بھیجا کہ میرا آپ لوگوں کو دور ہی سے سلام ہے آپ یونیورسٹی کے احاطے میں تشریف نہ لائیے۔

میں نے اوپر اشارہ کیا تھا کہ علی برادران کو کالج سے کوئی محبت نہ تھی جو واقعات اوپر بیان کیے گئے ہیں ان سے میرے خیال کی پورے طور سے تصدیق ہوتی ہے کہ سرسید کے بنائے ہوئے کالج کو برباد کرنے میں ان دونوں بھائیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ یہ کسی طور سے برباد ہو جائے لیکن خوبی یہ تھی کہ اس واقعہ کے بعد جب یونیورسٹی بن گئی تو ان لوگوں کو مطلق کوئی احساس نہیں تھا کہ انھوں نے کالج کے برباد کرنے میں جو کوشش کی تھی اس میں ان کی غلطی تھی۔

ہم تو اس خلافت کی تحریک کی وجہ سے ایک بڑا صدمہ اٹھائے ہوئے ہیں اس لیے جو جو واقعات پیش آئے ان کو نہایت اختصار اور صفائی و سچائی کے ساتھ آئندہ نسلوں کے لیے قلم بند کر دیا ہے۔ ہم گاندھی جی کو اس معاملے میں کوئی الزام نہیں دے سکتے کیونکہ ان کا ایک خاص مقصد تھا کہ جس طور پر بھی ہو سکے انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ کیا جائے۔علی برادران نے گاندھی جی کی مدد کرنے میں پیش قدمی کی اور خلافت کی جمعیت کو کانگریس سے ملحق کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے سامنے بیان کیا کہ گاندھی جی کی حیثیت ایک پیغمبر وقت کی ہے ہم کو ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ ٹرکی کے معاملے میں گاندھی جی ہمارا ساتھ دیں گے۔مسلمان اس زمانے میں بڑے ضعیف الاعتقاد ہو گئے تھے اس لیے ٹرکی کے فائدے کی جو بات ان سے کوئی کہتا تھا اس کو فوراً مان لیتے تھے۔ہندو تماشا دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں خلافت کی شرکت کی وجہ سے انگریزوں کی سلطنت میں کوئی تزلزل آتا ہے یا نہیں۔بعض ہندو عقل مندی سے خلافت کے ارباب حل و عقد کو بے وقوف بنا رہے تھے اور مسلمان اپنی حماقت سے کانگریس کے سہارے کی توقع پر بھروسہ کر رہے تھے۔لیکن جھوٹ آخر کو جھوٹ ہی ہوتا ہے۔بہت جلد وہ طلسم جو گاندھی جی کی امداد سے خلافت کے ارباب حل و عقد نے کھڑا کیا تھا ٹوٹ گیا۔خود مولانا شوکت علی اور گاندھی جی میں مخالفت ہو گئی اور مولانا شوکت علی گالی گلوچ پر اتر آئے اور گاندھی جی کو اپنی تقریروں اور

اپنے اخبارات میں بہت بُرا بھلا کہا اور ان کو جھوٹا اور دغاباز ثابت کرنے کی کوشش کی اور مولانا شوکت علی نے فرمایا کہ گاندھی جیسے سیکڑوں میری جیب میں پڑے رہتے ہیں ۔ یہ سنا کہ جب خلافت کے چندوں میں کمی ہوئی تو علی برادران نے گاندھی جی سے روپیہ مانگا کہ تلک سوراج فنڈ میں سے ہم کو روپیہ دیجیے کہ ہم خلافت کے ذریعہ سے کانگریس کی تحریک مسلمانوں میں جاری کریں لیکن گاندھی جی نے روپیہ دینے سے انکار کیا اور اسی پر جھگڑا ہو گیا۔

خلافت کی تحریک سے جو برا اثر مسلمانوں کے اخلاق پر پڑا اس کی مثال مسلمانوں کی قوم میں یا مذہب میں کہیں نہیں ملتی ۔ خلافت کے لیے ہزاروں مسلمان نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے اور مردوں نے چندے جمع کیے ۔ چندے جمع کرنے والوں سے حساب لینے کا کوئی معقول طریقہ نہیں تھا۔ جس قدر روپیہ لا کر کسی نے علی برادران کو یا دوسرے اکابر لیڈر کو دیا انھوں نے غنیمت سمجھا کہ ہمارے پاس رقم آ گئی، جو رقم چندہ جمع کرنے والوں کی جیب میں رہ گئی انھوں نے غنیمت سمجھا کہ ہم سے حساب لینے والا کوئی نہیں ہے ۔ غرض کہ جو رقم جس کے قبضے میں آ گئی اس نے اس کو شیر مادر سمجھ کر نگل لیا اور پھر اس کا پتہ کہاں تھا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس خلافت کی تحریک نے ہمارے قومی اخلاق پر بہت برا اثر ڈالا ۔ اس تحریک کے بانی اور کارکن جو دنیا سے اٹھ گئے ہیں ان کے لیے میری دعا ہے کہ خدا ان کی لغزشوں کا ان سے مواخذہ نہ کرے اور اپنی عزیز قوم سے التجا ہے کہ جہاں تک ان سے ہو سکے وہ خلافت کی تحریک کے برے اثرات سے اپنے کو بچانے کی کوشش کریں اور آئندہ نسلوں کے لیے اور اپنی اولاد کو اپنی زندگی کی ایک اچھی مثال چھوڑ دیں ۔

اس خلافت کی تحریک کی جو کچھ برائیاں تھیں وہ تو ظاہر ہیں لیکن نہ اس وقت اس کی کوئی خوبی بیان کی گئی اور نہ اب کسی کی ہمت ہو سکتی ہے کہ اس کی خوبیاں بیان کرے ۔ ایک خود مختار بادشاہ کی یعنی سلطان ٹرکی کی مدد کے لیے لوگوں کو چندے دینے کی ترغیب دی گئی اور چندہ لینے والوں کا مقصد اس بادشاہ کی امداد نہیں تھا بلکہ اپنی جیب گرم کرنا تھا اور جب چندے کا روپیہ آنکھوں کے سامنے برباد ہوتا دکھائی دیتا تھا تو بھی لوگوں کو عبرت نہ ہوئی ۔ مسٹر نریمان کا یہ کہنا کہ مسلمان بڑی غافل اور غیر منتظم قوم ہے اس کی صداقت کا پورا ثبوت مل گیا ہے کہ مسلمان ایسی ہی

قوم ہے۔ ایک زندہ ہوشیار اور منتظم قوم کی شناخت یہ ہے کہ وہ کسی اچھے کام کو عمل میں لانے کی بھی قدرت رکھتی ہو اور بُرے کاموں سے بچنے کی بھی۔ اس میں استعداد اور طاقت ہو۔ اس زندہ قوم کے افعال پر چند آدمی اپنی غرض کے لیے کھڑے ہو کر وہ اثر نہیں ڈال سکتے جو خلافت کے بانی اور کارکنوں نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے دل میں ڈالا۔ لوگ جانتے تو تھے کہ اس تحریک میں نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ کوئی جان ہے اور نہ ملک کو اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، لیکن کارکنوں کے ہاتھ میں اخبارات کی تلوار تھی جس سے وہ ہر شخص کا گلا کاٹنے کو تیار تھے اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک کی پگڑی اچھالنے میں ان کو کوئی تامل نہیں تھا۔ ادھر وقارالملک پر زور ڈالا جارہا تھا کہ یونیورسٹی کے لیے جو چندہ جمع ہوا ہے وہ ہمیں دے دو کہ ہم ترکوں کو دے دیں اور ادھر جب یونیورسٹی کی طرف سے مایوسی ہوئی تو گاندھی جی کے سر ہو گئے کہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنا ہی مقصود ہے تو تلک سوراج فنڈ کا روپیہ ہم کو دے دیجیے تاکہ ہم ترکوں کو دیں تاکہ وہ انگریزوں کی قوت توڑنے پر قادر ہو جائیں۔ اور جب وہاں سے بھی مایوسی ہوئی تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔ نواب وقارالملک کے لیے کہا کہ یہ تو مردہ ہے اس لیے قبر میں اتار نا ہی بہتر ہے اور گاندھی جی کے لیے کہا کہ یہ تو بہروپیہ اور دغاباز شخص ہے مسلمانوں کو دھوکے دے کر اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے اور مسلمانوں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ مسلمانوں کی قوم جو سخت مرعوب ہو چکی تھی کہ کہیں ہماری بھی پگڑی نہ اچھالیں اور ہم پر بھی حملہ نہ کریں۔ اگر وقارالملک اور گاندھی جی جیسی ہستیاں ان کی زبان اور قلم کی زد سے نہ بچ سکیں تو ہم کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ اس لیے ہر بات جو خلافت کی موافقت میں اخباروں میں چھپتی تھی اس کو مسلمان دل سے قبول کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں لیکن اس کے خلاف اپنی زبان یا قلم سے کچھ بھی نہیں نکالتے تھے۔ میری اس تحریر کی تصدیق اس زمانے کے اخبار ہمدرد اور کامریڈ سے ہو سکتی ہے جو مولانا محمد علی کی ایڈیٹری میں شائع ہوئے تھے میں نے اپنی یہ تحریر خلافت کے بارے میں بعض دوستوں کو دکھائی جنھوں نے ان واقعات کی تصدیق کی ہے۔

میں نے مفصل طور پر شروع سے آخر تک خلافت کی ابتدا خلافت کے کام اور خلافت کے انجام پر روشنی ڈال دی ہے، اور مجھے امید ہے کہ مسلمان اس سے عبرت حاصل کریں گے اور

آئندہ اس قسم کے واقعات اس قوم میں کبھی بھی نہ ہونے دیں گے۔ جب اس خلیفہ کو جس کے لیے چندے جمع ہو رہے تھے اور جو اسلامی دنیا کی چالیس کروڑ آبادی کا محافظ بتایا جاتا تھا اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا عرش آشیانی نے اس کو گدی سے اُتار کر کان سے پکڑ کر اپنے ملک سے دیس نکالا دیا تو پھر کچھ دنوں کے لیے یہ خلافت کا کارکن مصطفےٰ کمال پاشا کے حق میں اپنی صلواتوں کے وار کرتے رہے کہ انھوں نے ہمارے خلیفہ کو کیوں اپنی سلطنت سے نکال دیا۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ نہ ترکی قوم کی بہبودی کا کوئی خیال تھا اور نہ اسلامی دنیا کی بہتری ان کے مدنظر تھی بلکہ مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر ان سے چندہ لینے کے لیے ایک شخص واحد کو جو سلطان ٹرکی کہلاتا تھا اس کو ٹیسو راجہ بنا کر اپنی غرض کے لیے مسلمانوں کو دکھایا جارہا تھا اور ان کی جیبیں خالی کرائی جارہی تھیں۔

مسلمانو! عبرت کا مقام ہے ایسی غفلت اور عدم تنظیم جس سے خلافت کے کارکنوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس کا سدباب کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ لوگ یہ مان لیں کہ نہ خلافت رہی اور نہ خلافت کے کارکن اور بانی رہے۔ اب اس قصے کو اٹھانے سے کیا نفع ہے لیکن یہ قصہ اٹھانا ضروری تھا اور میں نے اٹھایا۔ مسلمان اخلاقاً کمزوریاں دکھاتے رہے ہیں اور اس واقعہ میں تو سخت کمزوری دکھائی۔ اس لیے یہ عبرت خیز واقعہ ان کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کریں۔ مقصد قوم کی بہبودی اور ہمدردی ہے اور اگر اس واقعہ کی تاریخ لکھنے سے لوگ متفق نہ ہوں تو خدا ان پر رحم کرے اور مجھ کو اپنے نیک ارادے کا اجر عطا کرے۔

اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا مرحوم

اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا بھی علی برادران کی زبان اور قلم سے نہ بچے اور جس ٹیسو راجہ کی وجہ سے ان کو بُرا بھلا کہا گیا اسی ٹیسو راجہ کے کرتب تھے جن کی وجہ سے ترکی قوم دنیا کی نگاہ میں ایک سب سے حقیر اور کمزور قوم تمام یورپ میں سمجھی گئی تھی۔ یہ سلطان ٹرکی کے ہی کام تھے کہ انھوں نے یورپ کی قوموں کو اپنی سلطنت میں مداخلت کرنے کے موقعے دیے۔ اور انھیں مداخلت کی باتوں نے انگریزوں اور یورپ کی دوسری قوموں کی ہمت یہاں تک بڑھائی کہ اب وہ ترکی قوم کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اگر یہ علی برادرس کا ٹیسو راجہ (خلیفہ) رہتا تو کچھ تعجب نہیں تھا کہ یورپ کی قومیں اناطولیہ کے حصے بخرے کر کے ٹرکی سلطنت اور ٹرکی قوم کا نام و

نشان دنیا سے مٹا دیتیں۔ وہ وقت مجھے یاد ہے کہ جب لائڈ جارج نے اور دوسرے انگلستان، فرانس اور جرمنی کے وزرا نے یونانیوں کو شہ دی تھی کہ وہ ڈوبتی ہوئی ٹرکی قوم کو ایک دھکّہ دے دیں کہ وہ بالکل ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ اور وہ وقت بھی مجھے یاد ہے کہ اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا جو اس وقت اتحادیوں کے مددگار کٹ پتلی بادشاہ یعنی سلطان ٹرکی کے ایک نو افسر تھے اور مظلوم ترکی قوم پر جو مظالم ہو رہے تھے اور جس کی وجہ سے ملک میں شورش پیدا ہوگئی اس کے فرو کرنے کے لیے اتحادیوں کے کہنے سے مصطفےٰ کمال پاشا اپنے اہل ملک کے خلاف ایک فوج کا بڑا دستہ لے کر پہنچے تھے اور وہاں جا کر جب انھوں نے دیکھا کہ ترکی نوجوان اس ترکی سلطنت کی بجھتی ہوئی شمع پر پروانے کی طرح اپنی جانیں دے دے کر فدا ہو رہے ہیں تو ان کی قومی ہمدردی اور حمیت جوش میں آئی تو انھوں نے وہی فوج جس کو ساتھ لے کر اہل ملک پر ظلم کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے اس فوج کو لے کر وہ مظلوم شورش برپا کرنے والوں کے ساتھ ہو گئے اور چند روز میں ترکوں کے معزز قوم کے افراد کو ایک ترتیب کی لڑی میں پرو کر یونانیوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا اور یونانیوں کی فوج کا سیلاب جو عورت مرد اور بچوں کو تلوار کے گھاٹ اتار رہے تھے ان کے رستہ میں جا کر کھڑے ہو گئے کہ بس اب آگے مت بڑھو اور پھر چند روز میں یونانیوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا یہاں تک کہ سمندر میں جا کر ان کو دھکیل دیا اور اپنے عزیز ملک کو ان ظالموں کے ہاتھ سے بچا لیا۔ ہندوستانی مسلمان جو سلطان ترکی کی خیالی عظمت کے نشے میں مبتلا ہو گئے تھے ان کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں کہ یہ کیا ہوا کہ ہمارے محبوب سلطان تو اپنی جگہ پر دھرے رہ گئے اور ان کے ایک فوجی افسر نے ان کی مرضی کے خلاف ایک بڑے سے بڑا فوجی کارنامہ کر کے دکھا دیا۔ مسلمانوں کو یہاں احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ ہاں سلطان کی عظمت کا نبوہ صرف ہم کو بے وقوف بنانے کے لیے ہمارے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ ترکی قوم کو اس سے کچھ تعلق نہیں تھا تھوڑے دنوں میں اس ٹیسو راجہ کو جب ملک سے دیس نکالا ملا تو اوّل تو ناواقف ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر خوش نہ ہوئے کہ ہمارے خلیفہ کو اپنے ملک سے نکال دیا لیکن رفتہ رفتہ ان کی رائے میں تبدیلی شروع ہوگئی کہ یہ خلیفہ اور خلافت کا ڈھونگ ترکوں کی کمزوری کا باعث تھا لیکن واہ رے علی برادران اور کارکنان خلافت کہ وہ کسی طرح قائل نہیں ہوئے کہ اس خلیفہ کا وجود ہی ترکی قوم کی کمزوری کا باعث تھا اور اچھا ہوا کہ وہ نکال دیے گئے اور ایک

طلسم جو ہماری آنکھوں کے سامنے کارکنان خلافت نے پھیلا رکھا تھا وہ خدا خدا کر کے ٹوٹ گیا۔ لیکن علی برادران اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا اور دوسرے ترکوں کو برابر بُرا بھلا کہے گئے کہ انھوں نے بُرا کیا کہ ہمارے خلیفہ کو ملک سے باہر نکال دیا اور اسلامی دنیا کا کوئی خلیفہ نہیں رہا۔ میں نے بھی یہ شہرتیں سنیں کہ علی برادران اور دوسرے لوگ ایسا کہتے ہیں۔ ہر مرتبہ جب میں یہ سنتا تھا تو انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ دیتا تھا یہ میری دعا خلافت کی ابتدا اور انتہا کے لیے ہوتی تھی اور میں نے سنا کہ علی برادران نے کہا کہ یہ دغاباز آدمی ہمارے خلیفہ کے لیے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ رہا ہے لیکن اس کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے یہ خلیفہ پھر لوٹ کر اپنی حالت پر آئیں گے اور اسلامی دنیا کے روحانی بادشاہ ہوں گے۔ میں نے سُن کر کہا کہ جن لوگوں کو بےوقوف بنا چکے ہیں ان کو چندروز کے لیے اور بےوقوف بنائے رکھنے میں شاید کامیاب ہو جاویں لیکن میں تو ان کے بناوٹی خلیفہ کو گہری سے گہری قبر میں دفن ہوتا ہوا اپنی دانست میں دیکھ رہا ہوں۔

اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کی عظمت خلافت کے کارکنوں کے دل میں کیسے جاں گزیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے تو اس جال کو توڑ کر تار تار کر دیا جو خلافت کے کارکنوں نے مسلمانوں کو پھانسنے کے لیے پھیلا رکھا تھا۔ لیکن میں تو اپنے نزدیک بڑے سے بڑے مدبّرین اسلام میں مصطفےٰ کمال پاشا کا نام شامل کرنا چاہتا ہوں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے وہ کمال کیا جو دنیا کے کسی شخص واحد نے نہیں کیا۔ ایک قوم کو جو مر رہی تھی اور جس قوم کی گزشتہ تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے کیے تھے اور جو کارکنان خلافت کے خیال میں بلا ان کے خلیفہ کے زندہ نہیں رہ سکتی تھی مصطفےٰ کمال پاشا نے سمجھ لیا کہ جب تک یہ خلیفہ موجود ہے اس وقت تک ترک قوم زندہ نہیں رہے گی تو سب سے پہلے اس بڑے مدبّر اور زیرک انسان نے اس علت ہی کو ختم کیا جو تمام خرابیوں کی جڑ تھی اور خلیفہ کو قوم کی رضامندی سے نکال دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترکوں کی قوم ہمارے ملک کے کارکنان خلافت کے خیالات کے موافق نہیں تھی۔ خلیفہ کے الگ ہو جانے کے بعد ترکی قوم نے ایک سنبھالا لیا اور جس کو یورپ کی عیسائی قومیں مرد بیمار کے نام سے موسوم کیا کرتی تھیں وہ پھر رفتہ رفتہ تندرستی حاصل کرنے لگی اور اس کی تندرستی و بحالی میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی اور چند ہی سال میں وہ یورپ کی قوموں کی نگاہ میں مرد بیمار سے مرد میدان سمجھی جانے لگی۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ علی برادران اور کارکنان خلافت پھر بھی قائل

ہوئے یا نہیں کہ وہ غلطی پر تھے لیکن عام مسلمانوں میں سے ایک فرد واحد کو بھی ایسا نہ دیکھا کہ جو ترکوں کی دوبارہ ترقی اور بحالی سے خوش اور مطمئن نہ دکھائی دیا ہو۔ سب خوش تھے اور مصطفےٰ کمال پاشا کے حق میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا مانگا کرتے تھے کہ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ ان ہی کی وجہ سے مسلمانوں کی عزت رہ گئی۔ میرے ہم قوم معزز مسلمانوں اب آئندہ کے لیے ہوشیار رہنا اور کسی کے بہکاوے میں آ کر اس قسم کی بے معنی حرکات نہ کرنا جو تم نے خلافت کی تحریک کے زمانے میں کیں۔

تقسیم ملک اور مسلمانوں کی تباہی

آخر میں ملک میں وہ حالات پیش آ گئے جس کو ہندو پرلے کہتے ہیں اور مسلمان قیامت صغریٰ کہتے ہیں۔ یعنی 15 راگست 1947 کو برٹش گورنمنٹ نے اپنے اختیارات حکومت ہندوستان کے ہاتھ میں دے دیے یعنی پنجاب، سندھ، سرحد، بنگال اور سلہٹ پاکستان کے نام مسلمان لیڈروں کے سپرد کر دی اور باقی کل ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر دی۔ اس تقسیم اور سپردگی سے قبل سکھوں کے لیڈروں خصوصاً ماسٹر تارا سنگھ کا یہ مطالبہ تھا کہ سکھوں کی آبادی کے لیے ایک مخصوص جداگانہ حصہ مخصوص کر دیا جائے اور ان کو پاکستان کے زیر حکومت نہ رہنے دیا جائے۔ لیکن جب مذکورہ بالا تجویز اور تقسیم عمل میں آئی تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند نے اعلان کرتے وقت افسوس ظاہر کیا کہ سکھوں کو ہم یکجائی کوئی حصہ الگ نہ دے سکے۔ ان کی قوم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ آدھے سکھ پاکستان میں رہ گئے اور آدھے ہندوستان میں آ گئے۔

سکھوں میں اس کا ردعمل اچھا نہیں ہوا۔ ماسٹر تارا سنگھ اور دوسرے لیڈروں نے بڑے احتجاج کیے کہ جب تک ہماری قوم کو یکجائی ملک کا کوئی حصہ نہ دیا جائے گا ہم چین سے نہ بیٹھیں گے۔ اس کے بعد ہی مشرقی اور مغربی پنجاب میں فسادات اور جوابی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ اگست، ستمبر اور اکتوبر 1947 میں ملک کے اندر ایک حشر برپا ہو گیا۔ امرت سر اور اس کے نواح میں مسلمانوں کو سکھوں کے جتھے دیہات سے آ آ کر قتل کرنے اور ان کی عورتوں کو اغوا کرنے کے واقعات شروع ہو گئے۔ لوٹ مار عام ہو گئی۔ جب یہ خبریں لاہور میں اور وہاں کے دیہات میں پہنچیں تو مسلمان بھی دیہات سے نکل نکل کر شہروں میں آئے اور سکھوں سے تصادم شروع ہو گیا اور لاتعداد انسان ہندوستان میں اور اسی طرح اُدھر پاکستان میں قتل ہوئے۔ اس کے

بعد مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے اور مغربی پنجاب میں مسلمانوں نے ایک قیامت خیز قتل و غارت گری کا ہنگامہ برپا کیا اور لاکھوں بندگان خدا ان کی عداوت و جہالت اور وحشیانہ جو روستم کے دونوں طرف شکار ہوئے۔

مشرقی پنجاب میں پٹیالہ وغیرہ اور دوسری ریاستوں راجپوتانہ، مالوہ، گجرات، کاٹھیاواڑ، وغیرہ سے خبریں آنے لگیں کہ وہاں کے دیسی حکمرانوں کی پولیس مسلمانوں کی حفاظت نہیں کر رہی ہے اور مسلمانوں پر تباہی و بربادی آئی ہوئی ہے۔ مسلمان عام مظالم کا شکار ہو رہے ہیں۔ بھرت پور، الور، پٹیالہ وغیرہ مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں مسلمان بہت زیادہ متاثر و تباہ ہوئے۔ یہ صورت حال بظاہر اس لیے پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی تھی کہ اس طرح یہ علاقے مسلمانوں سے خالی ہوں تو پاکستان سے آئے ہوئے ہندو، سکھ، ان کی جگہ آباد ہوسکیں تا کہ وہ منصوبہ بروئے کار آجائے جس کا مطالبہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعلان تقسیم کے وقت سے شدت کے ساتھ ابھر رہا تھا۔ آخر کار جب اس تباہی و بربادی نے جو ملک کے دونوں حصوں میں آئی ہوئی تھی، بڑی بھیانک صورت اختیار کر لی اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی اور مغربی پنجاب میں وہاں کے ہندو اور سکھوں کی حفاظت کا مناسب بندوبست نہ ہو سکا اور مجبور ہو کر وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لعل نہرو اور وزیر اعظم پاکستان مسٹر لیاقت علی خاں نے تبادلۂ آبادی کا وہ مشہور معاہدہ کیا جس کی رو سے مشرقی و مغربی پنجاب کے مسلمان اور ہندو ادھر سے ادھر فوج کی نگرانی میں منتقل ہوئے۔ اس اتھل پتھل میں بے حد و حساب جانیں ضائع ہوئیں۔

کاش کوئی مورخ اس انسانی تباہی کی داستان کو اگلی نسل کی لیے مرتب کر سکتا۔

دہلی کے مسلمانوں کی تباہی

مغربی پنجاب (پاکستان) سے آئے ہوئے ہندو سکھ قافلے جب دہلی آنا شروع ہوئے تو یہاں کے حالات بھی خراب سے خراب تر ہونے لگے اور مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ حکومت نے یہ انتظام نہ کیا کہ ان لوگوں کو الگ الگ کیمپ بنا کر وہاں رکھا جاتا اور بتدریج ان کی آباد کاری کا نظم ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مصیبت زدگان تقسیم نے از خود اپنے لیے جگہ بنانی شروع کر دی۔ اس طرح دہلی اور اس کے قرب وجوار کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ

وقت کے ہاتھوں میں چلا گیا کہ وہ مسلمانوں کی موت اور زیست کا فیصلہ کرے۔ اس طرح دہلی بھی فساد کی لپیٹ میں آ گئی۔ بلوائی مسلمانوں کے گھروں اور محلوں پر یورش کرتے رہے اور انتظامیہ حفاظت کرنے سے قاصر رہی۔

یہ تلاطم کئی ہفتے تک برپا رہا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے چند مخصوص محلوں کو چھوڑ کر قریب قریب تمام شہر دہلی خالی ہو گیا۔ اصلی واقعات تو جن لوگوں کے چشم دید ہیں، ان لوگوں سے اگر کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعات اخبارات میں بہت کم شائع ہوئے اور ظلم کی دہکتی ہوئی آگ پر چاروں طرف سے پردہ پڑا رہا۔ باہر کے لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ دہلی میں مسلمانوں، ان کی بیوی اور بچوں پر کیا بیت رہی ہے؟ قریب ڈیڑھ لاکھ کے مسلمان ہمایوں کے مقبرے اور پرانے قلعے اور جمنا کے کھادر کے جنگل میں مہینوں مصیبت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ کیونکہ خیال یہی تھا کہ حکومت شہر دہلی میں مسلمانوں کی حفاظت نہیں کر پا رہی ہے، اس لیے سب مسلمانوں کو پرانے قلعے میں جمنا کے کنارے ایک جگہ جمع ہو جانا چاہیے جہاں بعد کو رضا کارانہ طور پر حفاظت کا ایک حد تک بندوبست کیا گیا۔

اس درمیان میں اس قدر سخت بارش ہوئی کہ جمنا میں غیر معمولی سخت طغیانی آ گئی اور جمنا اپنے کناروں سے نکل نکل کر چاروں طرف پھیل گئی اور اس قدر زبردست سیلاب آیا کہ ایک وقت میں سطح زمین پر آٹھ فیٹ اونچا پانی کا ریلہ ہر چیز کو بہائے لیے جا رہا تھا۔ اسی سیلاب میں ہزارہا مسلمان بہہ گئے اور جو زندہ رہے ان کے پاس جو کچھ تھوڑا بہت اثاثہ یا کھانے پینے کا سامان تھا وہ بھی قیامت خیز دریا کی لہروں کی نذر ہو گیا۔ ان واقعات کی داستان مہاجرین میں سے کوئی اگر اہل قلم ہو تو وہ بہت اچھی طرح سے آئندہ نسلوں کی عبرت کے لیے چھوڑ سکتا ہے۔

نئی دہلی میں اور قرول باغ میں، پہاڑ گنج اور سبزی منڈی، گندہ نالہ (کشمیری گیٹ) میں جس قدر مسلمان آباد تھے، بحیثیت مجموعی اپنے گھر بار چھوڑ کر اور جان بچا کر پرانے قلعے یا جہاں پناہ میسر آئی چلے گئے۔ ان کے سب گھر بار لٹ گئے۔ پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں نے ان پر قبضہ کر لیا۔ صدر بازار، کھاری باؤلی، پھاٹک حبش خاں، دریا گنج (فیض بازار) چاندنی چوک وغیرہ جہاں جہاں مسلمانوں کے تجارتی مرکز تھے وہ سب اسی طرح برباد ہو گئے۔

نئی دہلی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ کناٹ پلیس میں اختر مرزا خلف خان بہادر مرزا عاشق حسین کی ریڈیو کی ایک بڑی دوکان تھی۔ وہ بہت بڑے ملنسار آدمی تھے اور ہندو، سکھوں سے ان کی بہت دوستی تھی۔ کناٹ پلیس اور نئی دہلی کے اکثر مسلمان مارے گئے یا بھاگ گئے لیکن اختر مرزا اپنے فلیٹ اور دوکان پر جمے بیٹھے رہے کیوں کہ ان کو اطمینان تھا کہ وہ ہندو اور سکھوں کے دوست ہیں ان پر کوئی حملہ نہیں کرے گا لیکن ایک روز ان کے چھوٹے بھائی کا ایک ہم درس سکھ لڑکا ان کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ کل صبح تمھارے مکان اور دوکان پر حملہ ہوگا۔ اختر مرزا نے اس لڑکے کے بیان پر اعتبار نہیں کیا اور کہا کہ تم مجھے پریشان کرنا چاہتے ہو۔ مجھ پر کوئی حملہ نہیں کرے گا ۔ میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔ وہ لڑکا اس وقت تو چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اختر مرزا کے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لے کر آیا اور اختر مرزا سے آکر کہا کہ آپ میری بات نہیں مانتے ہیں، آپ پر کل صبح 8 بجے ضرور حملہ ہوگا۔ میں ایک ایسی جگہ سے آرہا ہوں جہاں پر بہت سے سکھ جمع تھے اور ان میں یہ بات طے ہوگئی ہے کہ وہ کل 8 بجے آپ کے مکان پر حملہ کریں گے۔ آپ میرا کہنا مانیے اور دکان و مکان چھوڑ دیجیے اور کسی دوسری جگہ چلے جایئے۔ اس لڑکے کے اصرار سے اختر مرزا نے اپنا مکان اور دوکان ایک ہندو دوست کے سپرد کیا اور کہا کہ اوپر کے فلیٹ میں تم اپنی بیوی بچوں کو لاکر رکھو اور نیچے دوکان پر خود بیٹھ جاؤ اگر کوئی حملہ کرنے والا آئے گا تو وہ کسی ہندو کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میں اور میری بیوی بچے اگر یہاں رہیں گے تو وہ ہم لوگوں کو قتل کر کے ہمارا مال لوٹ لے جائیں گے۔ یہ کہہ کر اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر کسی بڑے سرکاری عہدہ دار ہندو دوست کے یہاں چلے گئے۔

دوسرے دن صبح کو ٹھیک اسی وقت جس کی اطلاع سکھ لڑکے نے ان کو دی تھی اس وقت ہتھیار بند سکھ اور ہندو آس پاس کے ہندوؤں کے کوٹھوں سے کود کود کر اختر مرزا کے فلیٹ میں آئے اور وہاں دیکھا کہ ایک ہندو عورت بچوں کو لیے بیٹھی ہے۔ ان لوگوں نے عورت سے پوچھا کہ تم کون ہو اور وہ لوگ جو یہاں رہتے تھے وہ کہاں ہیں؟ عورت نے جواب دیا کہ وہ تو بھاگ کر چلے گئے اور یہ مکان اور دوکان ہمارے ہاتھ فروخت کر گئے۔ وہ وہاں سے نیچے دوکان میں آئے اور وہاں پر ہندو کان دار کو بیٹھے دیکھا۔ اس نے بھی یہی بیان کیا کہ اصلی دکاندار اختر مرزا میرے ہاتھ

اس دوکان کا مال بیچ گئے اور یہاں سے معہ بیوی بچوں کے کہیں چلے گئے ہیں۔قرول باغ میں بہت سے مسلمان رہتے تھے ان کو بہت برے طریقے سے مظالم کر کے برباد کیا گیا اور ان پر اس قدر تشدد کیا کہ وہ اپنے مکانات چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

طبیہ کالج جو حکیم اجمل خاں صاحب کا قائم کیا ہوا تھا اور جس میں یونانی طب کی تعلیم ہوتی تھی اور اساتذہ وطلبا کی ایک بڑی تعداد سالہا سال سے بورڈنگوں اور کواٹروں میں رہتی تھی، ان سب کو وہاں سے نکال دیا اور بہت سوں کو برباد کر دیا گیا۔پہاڑ گنج میں بہت زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ایک لڑکا جو علی گڑھ میں تانگہ چلانے کی نوکری کرتا ہے اس کا بیان ہے کہ میں پہاڑ گنج کا رہنے والا ہوں، میرے ماں باپ، بھائی بہن، سب گیارہ بارہ آدمی تھے سب بلوائیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔میں ایک کھڑکی سے نکل کر بھاگا اور دہلی کے اندر کے ایک محلے میں چلا گیا اور وہاں سے علی گڑھ چلا آیا جہاں میرے رشتہ دار ہیں۔

سبزی منڈی میں مسلمانوں کی خاصی آبادی تھی اور وہاں پر میوہ فروشی کی بہت بڑی تجارت تھی۔مسلمانوں کا اس میں بہت بڑا حصہ تھا لیکن مسلمان آبادی جب وہاں سے قریب قریب ختم ہوگئی تو تجارت میں ایک مسلمان بھی نہ رہا۔اب سنا ہے کہ چند آدمی لوٹ کر آئے ہیں باقی کل منڈی سکھوں اور ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔

صدر بازار مسلمانوں کا بازار تھا۔پنجابی مسلمان جن کو بساطی کہتے ہیں جو عرصۂ دراز سے دہلی میں آکر آباد ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھ میں جو کچھ تجارت دہلی میں تھی وہ اسی قوم کے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔دوسرے مسلمانوں کا تجارت میں بہت کم حصہ تھا۔صدر بازار اس قوم کے مسلمانوں کی تجارت کا مرکز تھا۔یہ لوگ زیادہ تر تھوک فروش تھے اور باہر کے ممالک سے تھوک فروشی کے لیے ہر سال کروڑوں روپے کا سامان منگواتے تھے ان کی حالت کو دیکھ کر ہندو بھی کہا کرتے تھے کہ مسلمان اپنے کو مفلس کہتے ہیں لیکن صدر بازار کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان مفلس ہیں۔لیکن اب اس بازار سے مسلمانوں کی تجارت کو دیس نکالا مل گیا اور مسلمانوں کی آبادی میں جو لوگ یو۔پی کے تھے وہ تو مرتے کھپتے اپنے گھروں کو چلے گئے۔اب اس وقت ان کی بڑی بڑی دکانیں اور عالی شان مکانات حکومت نے شرنارتھیوں کو الاٹ کر دیے ہیں۔

اسی طور پر کھاری باؤلی کی دونوں جانب بہت سی بڑی بڑی دکانیں مسلمانوں کی تھیں وہ بھی اسی طرح شرنارتھیوں کے قبضے میں ہیں۔ مسلمانوں کا کہیں پتہ اور نشان نہیں ہے۔ دریا گنج میں گو مسلمانوں کی آبادی کم تھی لیکن اس کے مقابل قدیم شہر کی جانب جو آبادی ہے اور جس میں نیفس بازار بھی ہے اور مکانات بھی ہیں وہ قریب قریب مسلمانوں کا تھا۔ مسلمانوں کا لطیفی پریس کے نام سے ایک بہت بڑا مطبع بھی اسی بازار میں تھا۔ وہ مکانات کسی ہندو کے تھے لیکن لاکھوں روپے کا کام مسلمان، مالک مطبع جنھوں نے مکان کرائے پر لے رکھا تھا، کیا کرتے تھے۔ اس پریس کے ملحق مسلمانوں کے سب سے بڑے اخبار ڈان کا دفتر تھا۔ ڈان چھپتا تو لطیفی پریس میں تھا لیکن اس کا سب کاروبار علاحدہ ڈان کے دفتر میں ہوتا تھا۔ اس لطیفی پریس کو لوٹ کر برباد کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ڈان کا دفتر بھی لوٹ کر برباد کر ڈالا اور ڈان اسی وجہ سے بند ہو گیا اور پھر ہندوستان کے علاقے میں جاری کرنے کی اجازت نہیں ملی اور تقسیم کے بعد جب پاکستان بالکل علاحدہ ہو گیا تو ڈان نے کراچی جا کر وہاں اپنا دفتر کھولا اور وہیں سے اپنا اخبار جاری کیا لیکن ہندوستان میں ڈان کے آنے کی ممانعت تھی۔

یہ مارچ 1947 کا مہینہ ہے۔ ستمبر 1947 سے دہلی کے مسلمانوں پر یورش شروع ہوئی تھی؟ اس وقت تک مسلمانوں کے لیے امن کی کوئی صورت نہیں ہے۔ دہلی میں مسلمان اکیلا صبح و شام باہر جانے سے ڈرتا ہے۔ عورتیں تو غریب سہمی ہوئی اپنے گھروں میں مقید رہیں۔ مسلمانوں کے بچے بھی اسکولوں میں جانے سے ڈرتے ہیں۔ معلوم نہیں کس طرح یہ مشہور ہو گیا تھا کہ اسکولوں میں مسلمان بچوں کو مارا جاتا ہے اور مظالم کیے جاتے ہیں۔ کسی اسکول کے بارے میں تو یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ وہاں بہت سے بچے مار دیے گئے ہیں۔ اب ان افواہوں کی موجودگی میں مسلمان بچوں کی کیسے ہمت پڑ سکتی تھی کہ وہ پڑھنے کے لیے مدارس میں جاتے۔ اب سنا ہے کہ کچھ بچے اسکولوں میں جانے لگے ہیں۔ لیکن زیادہ تر تعلیم سے محروم ہیں۔ دلّی کی تباہی کو دیکھ کر ہمیں بغداد کی تباہی اور قتل عام کے واقعات یاد آتے ہیں۔

شہر بغداد ایک زمانے میں تمام دنیا کے شہروں میں ایک عدیم المثال شہر تھا۔ اس شہر میں اٹھارہ لاکھ مسلمان بستے تھے۔ یہ لوگ عرب نسل کے تھے لیکن ان میں ایرانی نسل کے اور دوسری

نسلوں کے بھی بہت سے لوگ آباد تھے۔ مسلمان خلفا کے زمانے میں سب لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ مسلمانوں کی حکومت اور شہروں میں رہیں اور تجارت وکاروبار کریں۔ آخری خلیفہ کے زمانے میں ہلاکو خان تاتاری نے جو چنگیز خاں مشہور فاتح کا بیٹا تھا، بغداد پر حملہ کیا۔ تاتاریوں نے ایک مسلمان غدار کو جو کہ خلیفہ کے وزرا میں سے تھا، اپنے ساتھ ملالیا اور بغداد شہر کو گھیر کر تباہ و برباد کر دیا۔

کہا جاتا ہے کہ اٹھارہ لاکھ مسلمانوں میں سے ایک آدمی بھی نہیں بچا تھا اور مسلمانوں کے کتب خانے تاتاریوں نے دریائے دجلہ میں پھینک دیے اور قلمی کتابوں کی تعداد اس قدر کثیر تھی کہ ان کی سیاہی دھل دھل کر دجلہ میں بہنے لگی اور چھ مہینے تک دجلہ کا پانی سیاہ رہا۔

اس عالمگیر تباہی کا مرثیہ شیخ سعدی شیرازیؒ نے فارسی میں لکھا ہے۔ جس کے پہلے شعر ہی سے اس بڑے ماتم کی اہمیت دل پر اثر پیدا کرتی ہے جس سے یہ مرثیہ شروع ہوتا ہے وہ پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمین　　بر زوال ملک مستعصم امیر المؤمنین

اگر شیخ سعدی جیسا کوئی شاعر، مصنف مسلمانانِ دہلی کی تباہی کے وقت ان کی بربادی پر کوئی مرثیہ لکھتا تو بغداد کی تباہی پر جو مرثیہ لکھا گیا تھا، اس سے کم مؤثر نہ ہوتا، وہ بھی صدیوں تک مسلمانوں اور ان کی نسلوں کو رلانے کے لیے کافی ہوتا۔

مجھے اس وقت مسلمانوں کی اخلاقی کمزوری کے متعلق چند الفاظ لکھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ سب سے پہلی کمزوری مسلمانوں میں یہ رہی کہ انھوں نے کسی موقع پر بھی مل کر ان سفاک حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کیا اور اپنے کو بھیڑ بکری سے بھی زیادہ بزدل ثابت کیا۔ ان کی اس بزدلی کا قصہ سن کر ایک بڑے لیڈر نے جو جنگ کے زمانے میں سبھاش چندر بوس کے ساتھی تھے کسی سے کہا کہ اگر ایسے وقت یہ مسلمان پلٹ کر اپنے قاتل کے منہ پر ایک تھپڑ ہی مار دیتے تو ہم کو اطمینان ہوتا کہ ان میں مردانہ جوہر کی کوئی رمق باقی تھی۔

علاوہ دہلی کے مشرقی پنجاب اور دہلی کے نواح کے قصبات کے مسلمانوں پر دہلی سے بھی زیادہ آفت نازل ہوئی۔ جالندھر کا شہر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا ایک مرکزی شہر تھا اور ان کی سوسائٹی تعلیم اور تہذیب میں بہت ممتاز سمجھی جاتی تھی۔ جالندھر کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی

مسلمانوں کی آبادیاں تھیں جن کو بستیاں کہتے تھے۔ان میں کوئی بستی شیخوں کے نام سے اور کوئی بستی سیدان کے نام سے مشہور تھی۔ یہ سب بستیاں قطعی طور پر برباد کردی گئیں اور وہاں کے باشندے بے دردی اور نہایت تشدد سے بستیوں سے باہر نکال دیے گئے۔

مشرقی پنجاب کے دیہات، قصبات اور شہروں میں اب ایک بھی مسلمان دکھائی نہیں دیتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اضلاع امرت سر، گورداسپور، ہوشیار پور، جالندھر، لدھیانہ، کانگڑہ، انبالہ، کرنال، رہتک، حصار، گڑگاؤں وفیروز پور سے ستر لاکھ مسلمانوں میں سے 65 لاکھ پاکستان کی طرف دھکیل دیے گئے اور اسی طور پر سکھوں کی ریاستوں میں پٹیالہ، نابھہ، جیند، کپورتھلہ، فریدکوٹ سے منجملہ 20 لاکھ مسلمان آبادی کے کچھ مسلمان پاکستان چلے گئے اور باقی ماندہ مسلمانوں کا بیشتر حصہ برباد ہوا اور کچھ اپنے متعلقین کے پاس ملک کے دوسرے حصے میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

ان اعداد وشمار میں ہندو اور مسلمانوں میں کچھ اختلاف ہے۔مسلمان تو بہت زیادہ تعداد بتاتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کی گئی ہے اور ہندو کچھ کم تعداد بتاتے ہیں لیکن ہندو اور سکھوں کو اس سے انکار نہیں ہے کہ مشرقی پنجاب اور سکھوں کے ریاستوں میں اور اکثر راجپوتانہ کی ہندو ریاستوں میں اب کوئی مسلمان باقی نہ رہا۔اب اگر خال خال کوئی آباد ہو گیا ہو تو نہیں کہا جاسکتا۔

بعض لوگوں کا یہ مطالبہ کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کے علاقے سے کل مسلمان آبادی کو نکال دیا جائے تاکہ ہندوستان خالص ہندوؤں کا ملک ہو جائے اور بعض یہ بھی چاہتے ہیں کہ مشرقی پنجاب اور یو۔پی کے شمال مغربی اضلاع مسلمانوں سے خالی ہو جائیں اور اس علاقے میں شرنارتھی آباد کردیے جائیں اور اس طرح پنجاب کے ساتھ مسلسل ایک علاقہ ایسا ہو جائے گا جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے افسوس کے مداوے کی صورت اختیار کرے گا۔

مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو بے دخل کرانے میں ایک حد تک کامیابی ہوگئی لیکن یو۔پی کے شمال مغربی اضلاع سے اب تک مسلمانوں کو نکال باہر کرنے کا پورا موقع ابھی نہیں ملا۔ آہستہ آہستہ ان اضلاع میں بھی وہی عمل شروع ہو گیا تھا جو مشرقی پنجاب میں ہو چکا تھا لیکن یو۔پی گورنمنٹ نے اس کی اجازت نہیں دی۔تاہم مسوری، دہرادون اور کچھ حصہ سہارنپور سے ان فرقہ

پرستوں نے مسلمانوں کو زبردستی بے دخل کر کے ان کے گھروں پر قبضہ کرلیا ہے۔ مسوری میں شفیع احمد قدوائی برادر رفیع احمد قدوائی ممبر مرکزی کیبینٹ کو قتل کردیا کیونکہ وہ گورنمنٹ کے عہدیدار تھے اس لیے ان کی موجودگی کی وجہ سے فرقہ پرست مسلمانوں پر سختی نہ کر سکتے ہوں گے۔ اس لیے راستہ چلتے دن دہاڑے ان کو قتل کردیا گیا اور قاتل کا اس وقت تک کہیں پتہ نہیں چلا۔

بحیثیت مجموعی فرقہ پرستوں کا مذکورہ بالا مطالبہ ہنوز قائم ہے کہ مسلمان یو۔ پی سے بھی نکل جائے۔ اگر یو پی گورنمنٹ اجازت دے دیتی تو مسلمانوں کا یو۔ پی میں بھی وہی حال ہوتا جو مشرقی پنجاب میں ہو چکا تھا۔

راجپوتانہ، مالوہ کی ریاستوں نے جو انڈین یونین میں شریک ہیں انھوں نے جب مسلمانوں کو اپنی ریاستوں سے نکال کر بھگادیا تو ان میں سے کچھ مسلمان پاکستان کی طرف چلے گئے کچھ پراگندہ حال اور پریشان ہو کر حیدرآباد ریاست کی طرف چلے گئے۔ ان میں سے تھوڑے سے ریاست کے اندر جانے پائے تھے کہ حالات نے ان کے لیے حیدرآباد کی طرف جانا ناممکن بنادیا اور وجہ ظاہر ہے کہ ریاست حیدرآباد میں مسلمانوں کی بہت قلت ہے۔ اگر باہر کے مسلمان وہاں چلے جاتے تو ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا اور حیدرآباد کی ریاست چونکہ ہندو اکثریت کی ریاست ہے دشواریاں پیش آتیں۔

یہ امر کوئی قیاسات پر مبنی نہیں ہے بلکہ بالاعلان گورنمنٹ آف انڈیا نے حیدرآباد میں مسلمانوں کے جانے کے متعلق اپنی پالیسی کا اظہار کیا تھا۔ ہندو والیان ریاست نہ تو کسی مسلمان کو ریاست میں امن سے رہنے کی اجازت دیتے تھے اور نہ کسی دوسری جگہ جاکر پناہ لینے کی موافقت میں تھے۔

غرض یہ کہ کسی جگہ بھی مسلمان کو چین نصیب نہیں ہو پارہا تھا۔ ریاست کشمیر کے ہندو راجہ نے پہلے ہی یہ اعلان کردیا تھا کہ مجھے مرنا پسند ہے لیکن پاکستان میں شرکت منظور نہیں ہے اور اس کے بعد ڈوگرا فوج نے مسلمانوں پر ظلم کر کے ان کو ریاست سے نکلنے پر مجبور کردیا۔ کوئی ایک لاکھ کے قریب مسلمان وہاں سے نکل کر پاکستان میں چلے گئے اور ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی ڈوگرا فوج کے ہاتھوں سے برباد ہوئی۔ ریاست کے ہندو راجہ کا یہ ظلم دیکھ کر شمالی مغربی سرحد کے مسلمان قبائل

ہندو راجہ سے جہاد کرنے کے لیے ریاست میں آنا شروع ہوئے۔ ریاست کی بعض حدوں سے سرحدی قبائل کا ملک ملتا ہے۔

یہ قبائل یا تو براہ راست اپنے ملک سے نکل کر کشمیر میں پہنچ گئے یا پاکستان کے راستے سے چلے گئے اور وہاں جا کر انھوں نے حسب عادت لوٹ مار شروع کر دی جو ان کا قدیمی اور آبائی پیشہ ہے۔ مہاراجہ ان کی یورش کا مقابلہ نہ کر سکا اور فوراً ہندوستان میں شرکت کی درخواست دے دی اور ہندوستان کی گورنمنٹ سے قبائلی حملہ آوروں کے مقابلہ کے لیے فوج مانگی۔

کشمیر کے معاملے میں شیخ عبداللہ (سیاسی لیڈر) جو وہاں کے تعلیم یافتہ گروہ کے سرغنہ ہیں اور جن کو مہاراجہ نے قید کر رکھا تھا ان کو قید سے نکال کر وزیر بنایا گیا۔ جنھوں نے ایک بڑے حصہ کشمیر میں تنظیم کر کے جمہوریت کا عنصر داخل کر دیا ہے۔ انتخاب سے ہندو مسلمانوں کے نمائندوں کی ایک انتظامی کونسل بنائی ہے جو اپنا کام شیخ عبداللہ کی منشا کے مطابق کر رہی ہے لیکن ہندوستان کی بعض جماعتیں اس کے بالکل مخالف تھیں، اور کہتی تھیں کہ کشمیر میں الگ کوئی کونسل نہیں بنی چاہیے بلکہ اس کا انتظامی اور سیاسی الحاق ہندوستان کی گورنمنٹ سے کر دیا جائے اور ہندوستان اس پر اسی طور پر قابض ہو جائے جیسے اور صوبہ جات پر قابض ہے۔ ہندوستان کی جانب سے مجلس اقوام متحدہ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تھا کہ کشمیر کی ریاست مہاراجہ نے ہندوستان کے سپرد کر دی تھی اس لیے پاکستان کو اس میں دخل دینے سے روک دیا جائے۔ یہ معاملہ اس وقت تک مجلس اقوام متحدہ کے سامنے لٹک رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی مجلس اس معاملے کا تصفیہ کرنے سے قاصر دکھائی دیتی ہے اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس تنازعہ کا کیا نتیجہ ہوگا۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنا قرین انصاف ہے کہ شیخ عبداللہ کی اعلیٰ تدابیر اور قابلیت سے اندرونی ملک میں امن پیدا ہو گیا تھا۔ اب دیکھا جائے کہ ہندوستان اور پاکستان میں کیا سمجھوتہ ہوتا ہے اور آئندہ کشمیر کے نظام حکومت کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ کسی وقت میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان میں کوئی خطرناک ہنگامہ نہ برپا کر دے۔

کاٹھیاوار کا واقعہ

جونا گڑھ مسلمانوں کی ایک قدیم ریاست ہے۔ اس کے ساتھ مانگرول اور ماناودر اور

چھوٹی ریاستیں مسلمانوں کی ہیں ۔ جونا گڑھ نے پاکستان سے اپنی ریاست کا الحاق کر کے اس کا اعلان کردیا ۔ ہندوستان کی گورنمنٹ نے اس اعلان کے بعد اپنی فوجیں ریاست میں بھیج دیں جنھوں نے جا کر ریاست پر قبضہ کرلیا اور نواب وہاں سے بھاگ گیا اور کراچی چلا گیا۔ان ریاستوں کا معاملہ بھی سیکیورٹی کونسل یا مجلس اقوام متحدہ کے سامنے پیش ہے۔

ریاست حیدرآباد کا واقعہ

حیدرآباد ہندوستان میں سب سے بڑی ریاست تھی۔اس کے مقابل کی کوئی دوسری ہندو یا مسلمانوں کی ریاست نہیں تھی ۔ یہ ریاست مغلیہ زمانے کے بڑے بادشاہ اورنگ زیبؒ کے زمانے میں قائم ہوئی اور اس کے تاریخی واقعات یہ ہیں کہ ان کا بانی آصف جاہ قلیج خاں تھا۔وہ ترکی النسل تھا اور قلیج خاں اس کا نام تھا۔آصف جاہ کا خطاب اس کو مغل بادشاہ کی طرف سے ملا تھا اور دکن میں وہ مغلوں کی طرف سے گورنر تھا۔جب نادرشاہ کا حملہ دلی پر ہوا تو وہ خود بھی دلی میں موجود تھا۔

نادرشاہ جب افغانستان سے ہندوستان کی طرف یورش کرتا ہوا چلا آرہا تھا تو اس کے آنے کی خبریں صوبہ داروں نے سرحد سے اور پنجاب سے محمد شاہ رنگیلے کے پاس بھیجیں کہ نادرشاہ دلی پر حملہ کرنے کو آرہا ہے۔محمد شاہ رنگیلا ایک نہایت عیاش وشراب خور اور کمزور بادشاہ تھا۔اس کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہو ہو کر مسمار ہونے کے قریب آ گئی تھیں لیکن نادرشاہ کے حملے نے اس کل عمارت کو اتنا کمزور کردیا تھا کہ اس کی دوبارہ بحالی اور درستی کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔جب نادرشاہ دلی پر قابض ہوا اور کسی غلط افواہ کے پھیل جانے سے دلی والوں نے نادرشاہ کے سپاہیوں کو مارنا شروع کیا تو نادرشاہ نے ناراض ہو کر قتل عام کا حکم دیا۔

جب اس نے یہ حکم دیا تو وہ چاندنی چوک کی سنہری مسجد میں جا کر بیٹھ گیا اور یہ حکم دے کر کہ ''بزن'' یعنی مارو، ننگی تلوار کر کے اپنے منہ میں لے لی تھی اور ملک الموت کی تصویر بن کر خشم ناک چہرہ بنا کر مسجد میں اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک کہ قتل عام ہوتا رہا اور ایسی حالت میں کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس ظالم کے سامنے جائے اور کوئی عرض ومعروض کرے ۔لیکن قلیج خاں آصف جاہ گورنر دکن ہی تھا کہ ہمت کر کے دو ایک اور عمائدین دربار مغلیہ کو ہمراہ لے کر

اس خوں خوار حملہ آور کے سامنے مسجد میں گیا اور جا کر اس ظالم کے سامنے کھڑا ہو کر حسب ذیل شعر پڑھا۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی! مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی!

یعنی تمام مخلوق تہہ تیغ ہوگئی، اگر کوئی بھی باقی نہ رہے گا تو پھر کسے قتل کیجئے گا؟

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آصف جاہ کی عمر اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ اس کی داڑھی سب سفید ہوگئی تھی۔ نادر شاہ نے تلوار اپنے منہ سے نکال لی اور آصف جاہ سے کہا کہ:۔

"بریشِ سپید تو بخشیدم"

یعنی تمھاری سفید داڑھی کی وجہ سے معاف کرتا ہوں، اور اسی کے ساتھ امان کا حکم دیا۔ نادر شاہ اپنی افواج پر بڑا زبردست تحکمانہ اثر رکھتا تھا یعنی اس کے حکم سے اگر کوئی ایک بال کے برابر ادھر یا ادھر ہٹ جاتا تھا تو وہ فوراً اس کی گردن مار دیتا تھا۔ جب امان امان کے نعرے بلند ہوئے تو اس کی سپاہ نے اپنی تلواریں میان میں ڈال لیں اور جس قدر مال لوٹ لیا تھا وہ تو اپنے قبضے میں کر لیا یا جیب میں ڈال لیا۔ اور اگر کسی چیز پر ہاتھ ڈالا تھا اور آدھی اس کے ہاتھ میں آ چکی تھی تو آدھی ہی کو لوٹ کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور باقی جو ہاتھ میں نہیں آئی تھی اسے چھوڑ دیا۔

یہ بھی ایک قصہ مشہور ہے کہ کسی عورت کے کانوں سے سونے کی بالیاں ایک سپاہی نکال رہا تھا کہ امان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو جتنی بالیاں وہ نکال چکا تھا ان کو تو جیب میں ڈال لیا لیکن ایک بالی ابھی پوری کان سے نہیں نکالی تھی اور بالی کا ایک سرا ابھی عورت کے کان ہی میں تھا اور دوسرا سرا اس سپاہی کے ہاتھ میں تھا۔ سپاہی نے وہ بالی آدھی کاٹ کر اپنی جیب میں ڈالی اور جو حصہ کان میں باقی رہ گیا تھا اسے کان ہی میں چھوڑ دیا۔

اس قسم کے سیکڑوں قصے دلی کے پرانے لوگوں کے زبان سے سنے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ قتل عام کی وجہ یہ ہوئی کہ بھنگڑ خانوں میں بھنگڑوں نے بیٹھ کر ہنس ہنس کر کہنا شروع کیا کہ محمد شاہ رنگیلے نے نادر شاہ کو جو محل میں رہتا تھا قتل کرا دیا اور دوسرے بھنگڑوں نے قہقہے لگائے کہ ہاں تیمور کی نسل سے تھا، کھیل گیا بازی۔ یہ خبر جب بھنگڑ خانوں سے باہر کے لوگوں کو ہوئی کہ نادر

شاہ کو قتل کرادیا تو لوگوں نے نادر شاہ کے سپاہیوں کو مارنا شروع کیا۔ اس کی خبر جب نادر شاہ کو ہوئی کہ دلی کے آدمی میرے سپاہیوں کو مار رہے ہیں تو اس نے قتل عام کا حکم دیا۔

یہ روایت بھی سننے میں آئی ہے کہ جب آصف جاہ نادر شاہ کے سامنے پہنچا تو اس سے قبل دلی کے گلی کوچوں اور بازاروں میں سات ہزار انسان مرد، عورت اور بچے تلوار کے گھاٹ اتر چکے تھے اور جس شہر میں کئی لاکھ آدمی رہتے تھے اور وہ بالکل بے بس تھے۔ اگر آصف جاہ اپنی جان پر کھیل کر اس ظالم کے سامنے جا کر عرض و معروض نہ کرتے تو نہ معلوم یہ ظالم اور کتنے انسانوں کو قتل کرا دیتا۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ دلی کی باقی آبادی کی جان و مال کو بچانے والے آصف جاہ ہی تھے۔ یہ واقعہ نادر شاہ کے حملہ کا اور آصف جاہ کے عرض و معروض کرنے کا بطور جملہ معترضہ کے یہاں پر لکھ دیا ہے، یہی آصف جاہ تھے جو گورنر سے خود مختار بادشاہ بن گئے۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک ان کی نسل میں سات پشتیں حکمراں رہیں۔

نادر شاہ کے جانے کے بعد محمد شاہ کے درباریوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ گو نادر شاہ تو چلا گیا لیکن آصف جاہ تو موجود ہے۔ وہ کل ریاست کے اوپر حاوی ہو جائے گا اور ہم کو نکال باہر کرے گا۔ اس لیے انھوں نے محمد شاہ کو یہ سبق پڑھایا کہ آصف جاہ کا دربار میں رہنا کسی طرح سے مناسب نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نادر شاہ کو رخصت کرنے کے بعد یہ خود بادشاہ بن جائے اور بادشاہ سلامت کو تخت سے اتار دے۔ محمد شاہ نے جب پوچھا کہ پھر کیا علاج کیا جائے؟ مشورہ دیا گیا کہ روہیل کھنڈ کے لوگ اس وقت سرکشی کر رہے ہیں ان کی سرکوبی کے لیے آصف جاہ کو سنبھل بھیج دیا جائے۔ محمد شاہ نے آصف جاہ کے نام فرمان جاری کر دیا کہ آپ کو روہیل کھنڈ کا گورنر بنایا۔

آصف جاہ نے حکم کی تعمیل کی اور سنبھل پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا نہ کسی کی سرکشی تھی اور نہ کچھ تھا بلکہ یہ صرف درباریوں کی شرارت تھی۔ اس حالت کو دیکھنے کے بعد اب ان کے سامنے فقط دو راستے کھلے دکھائی دیے۔ ایک تو یہ تھا کہ واپس جا کر درباریوں میں شامل ہو جائیں اور اپنے اثر سے محمد شاہ کی حالت کو درست کریں اور مغلیہ سلطنت کی دیواریں قبل اس کے کہ بالکل منہدم ہو جائیں، ان کو گرنے سے روکیں۔ اور دوسرا یہ تھا کہ دکن میں پھر اپنے گورنری کے کام پر جا کر اس

بڑے صوبے کی ریاست کا کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور جہاں تک ہو سکے وہاں کی مخلوق کو باہم خونریزی کے ہنگاموں اور خلفشار سے بچائیں۔ انھوں نے یہ دوسرا راستہ اختیار کیا اور اپنے ہمراہیوں کی ایک چھوٹی سے جمعیت لے کر دکن کی طرف روانہ ہوگئے۔

محمد شاہ کے درباریوں نے کسی صوبہ دار کو جو دریائے نربدا کے اس جانب ابھی کام کر رہا تھا لکھا کہ قلیچ خاں آصف جاہ بلا اجازت سرکار عالی جاہ یعنی محمد شاہ دکن کی طرف جا رہے ہیں ان کو نربدا سے پار مت جانے دو اور روک لو۔

وہ صوبے دار اپنے فوج کا دستہ لے کر آصف جاہ کا رستہ روکنے کے لیے نربدا کے گھاٹ پر پہنچ گیا جہاں سے آصف جاہ کو جانا تھا۔ اس صوبے دار کے فوجی دستے سے آصف جاہ کے پہنچنے پر مڈبھیڑ ہوگئی اور گو آصف جاہ کے پاس جمیعت بہت کم تھی لیکن وہ خود ایک دستہ فوج کے برابر کام کر سکتا تھا۔ اس نے محمد شاہ کی خستہ فوج اور بودے صوبے دار کو مار بھگایا۔ اور آپ نربدا کو پار کر کے دکن میں داخل ہوگیا۔ اور وہاں جا کر فوج کی ایک تنظیم شروع کی اور جلد سے جلد اپنی قوت اتنی بڑھا دی کہ اس علاقے پر جس کے وہ گورنر تھے خود ہی اس کے مالک اور بادشاہ تسلیم ہونے لگے۔

اس کے بعد انگریز کمپنی کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ان کو کمپنی کی فوجوں سے اور مرہٹوں سے اور ٹیپو سلطان سے مارکہ پیش آیا لیکن وہ اپنی قابلیت اور حکمت عملی سے تمام آفات کا مقابلہ کر کے آخر کو کامیاب ہوگیا اور اب انگریزوں نے اس کو ایک قابل فوجی لیڈر سمجھ کر اس سے اتحاد اور معاہدۂ باہمی کی طرح ڈالی اور کمپنی کے ساتھ مل کر ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے مقابلے کیے اور خود کو ایک بااثر زبردست حکمراں دوسروں سے تسلیم کرانے میں کامیاب ہوگئے۔

اس کے بعد کمپنی سے ان کا معاہدہ ان ہی شرائط سے ہوگیا جن شرائط سے دوسری ہندوستان کی مسلمان، مرہٹہ اور راجپوت ریاستوں سے ہوا تھا یعنی اس معاہدے کی وجہ سے وہ اپنی خودمختاری کھو بیٹھے اور یہ مجبوری کی وجہ سے ہوا۔ کیوں کہ انگریز نہایت متفق قوم تھی۔ اور اس کے پاس دولت بھی بہت تھی اور آلات حرب بھی رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ہندوستان کی ریاستوں کو جو ان سے اتحاد نہیں کرتی تھیں ہر وقت شکست دینے کے لیے دوسری ریاستوں کو آمادہ کرتے رہتے تھے۔

ایسی حالت میں آصف جاہ اور ان کے وارثوں کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان ہی کی شرطوں پر انگریزوں سے معاہدات کرلیں جن شرطوں پر دوسری ریاستوں نے کیے تھے اور ان معاہدات کی وجہ سے ملک میں امن پیدا ہو گیا تھا اور رعایا خوش حال ہو گئی تھی اور زراعت واندرونی تجارت کو ملک میں بہت فروغ ہوا۔ گو اس میں کوئی بڑا دریا نہیں تھا جس سے ملک میں آب پاشی کے لیے نہریں نکالی جائیں لیکن ملک کے مختلف حصوں میں بند باندھ باندھ کر برساتی پانی بہت سے مقامات پر روک دیا گیا اور بڑے بڑے تالاب آب پاشی کے لیے بنادیے جن سے زراعت میں افزائش ہوئی، گو ملک کے دوسرے حصوں میں اکثر قحط سالی کی آفت وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہتی تھی، لیکن اس وقت تک حیدرآباد ان آفات سے محفوظ رہا اور رعایا ان مصائب کا شکار کبھی نہ ہوئی جو کمپنی کے دوسرے علاقے میں نازل ہوتے تھے۔

علاوہ بریں اس ریاست کے حکمرانوں نے علاوہ ملک کے خوش حال کرنے کے تعلیم کا بھی اس قدر انتظام کیا کہ کسی دوسری ریاست میں نہیں تھا البتہ میسور کی ریاست بھی اسی کی ہم پلہ تھی اور تعلیم وحرفت وصنعت میں برابر ترقی کرتی جاتی تھی۔ موجودہ حکمراں کے زمانے میں حیدرآباد میں ایک بڑی یونیورسٹی قائم ہوئی جس کا نام عثمانیہ یونیورسٹی ہے اور لڑکے ولڑکیوں کی تعلیم کے لیے ریاست کے ہر حصے میں اسکول وکالج قائم ہوئے۔

موجودہ حکمراں ہز اگزالٹڈ ہائی نس نواب میر عثمان علی خاں کے والد ماجد نواب محبوب علی خاں بہت بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اور ان کے مرنے کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں ان کی قبر کی پرستش کرنے لگے کیونکہ وہ بڑے رعایا پرور اور فقیر منش بادشاہ تھے اور لوگ ان کو ولی سمجھتے تھے لیکن موجودہ حکمراں نے ولی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، اور نہ اپنے روحانی اثرات سے اپنے میں کشش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن رعایا کی تعلیم میں جتنی کوشش انھوں نے کی اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی۔ حیدرآباد سے باہر کی تعلیمی درس گاہوں کے لیے حیدرآباد کی ریاست کے سوتے کھول دیے جس سے مالی امداد کی نہریں نکل نکل کر ان درس گاہوں کی زندگی بحال و برقرار رکھنے میں حیدرآباد نا موری کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور ویمنس کالج یعنی لڑکیوں کی اعلیٰ درس گاہ کو اسی ریاست سے امدادیں ملتی تھیں اور بنارس ہندو یونیورسٹی کو بھی ایک بڑی امداد ملتی

تھی اور اس کے علاوہ شانتی نکیتن کی درس گاہ کو جو بنگال میں ہے اور جو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے قائم کی تھی، اس کو بھی ایک بڑی امداد ملتی تھی اور ریاست کی آبادی میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد تھی، ان سب کو نہایت فیاضی اور سیر چشمی سے تعلیم کے لیے اور مندروں و دھرم شالاؤں اور گوردواروں کے لیے بیش بہا امدادیں ملتی تھیں جو ہندوستان کی کسی دوسری ریاست کی رعایا کو نصیب نہیں تھیں۔

اب یہ سب کچھ تھا جو اوپر بیان ہوا ہے لیکن انگریزوں نے اس ریاست کے استحکام کا اپنے زمانے میں کوئی انتظام نہ کیا۔ انگریز ان سے روپیہ تو اس قدر اینٹھتے رہے کہ اور کسی سے کبھی وصول نہیں ہوا۔ عالم گیر جنگ اوّل اور دوئم میں کرڑوں روپیہ مصارف جنگ کے لیے لیتے رہے۔ علاوہ اس کے فوج کی ضرورتوں اور خوراک کے لیے بہ کثرت غلّہ اور دیگر اشیاء وصول کرتے رہے۔

اور ریاستوں کے اوپر جو جمہوری گورنمنٹ جس کا نام انڈین یونین گورنمنٹ ہے، قبضہ کیا۔ اس میں کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں پیش آئی بلکہ ریاست کے سابق حکمرانوں نے خود اپنے انتظام ملکی مالی و فوجی انڈین یونین کی گورنمنٹ کے ہاتھ میں دے دیے لیکن حیدر آباد پر جو قبضہ کیا اس کی ایک خاص شکل اختیار کی، کہ اس کے خلاف کوئی اعلان جنگ نہیں کیا بلکہ پولیس کی کارروائی کے نام سے ایک دو رجمنٹ فوج کی حیدر آباد کی طرف روانہ کر دیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں پر کم عقل غنڈے قسم کے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا جتھا تھا جنھوں نے تقسیم ملک سے کچھ عرصہ قبل سے بکواس کرنا شروع کی تھی کہ ہم حیدر آباد پر کسی کا قبضہ نہیں ہونے دیں گے اور اگر ہم کو چھیڑا جائے گا تو ہم دلّی کے لال قلعے کے اوپر جا کر اپنا جھنڈا گاڑیں گے۔ اس جتھے کا نام رضا کاروں کا جتھا تھا اور قاسم رضوی کی تقریروں سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ یہی شخص اس جتھے کا سرغنہ ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان کی یونین گورنمنٹ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کچھ فوج حیدر آباد کی ریاست پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجنی ضروری ہے۔ مبادا رضا کاروں کا جتھا کوئی مزاحمت کر کے ریاست پر ہمارا قبضہ نہ ہونے دے۔ یہ بات بالکل صاف ہے اور مانی ہوئی ہے اور بالخصوص ولبھ بھائی پٹیل نے مانی تھی کہ ریاست کے مالک ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام کی طرف سے مزاحمت کا کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن رضا کاروں کے جتھے کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ کوئی

مزاحمت کریں۔ ہندوستان گورنمنٹ کی یہ تھوڑی سی فوج، توپیں، بندوقیں، ہوائی جہاز، اور ٹینک وغیرہ دیگر سامان لڑائی لے کر منزل بہ منزل حیدرآباد میں پہنچ گئی اور ان کی مزاحمت کے لیے انسان تو در کنار ایک کتا بھی نہ بھونکا۔ ریاست پر ہندوستان کی گورنمنٹ کا قبضہ ہو گیا۔

رضوی وغیرہ اور اس جتھے کے لوگ گرفتار ہو گئے اور ان پر مقدمات قائم ہوئے۔ مقدمات کچھ سچے تھے اور کچھ جھوٹے تھے۔ اوروں کی نسبت تو مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا مگر قاسم رضوی کے لیے جو سب سے زیادہ بڑھ کر بولا تھا عدالت ماتحت سے کسی قتل کے جرم کی سازش کے تحت پھانسی کی سزا تجویز ہوئی تھی، لیکن عدالت اپیل سے پھانسی کی سزا تو قائم نہیں رہی لیکن اور جرائم کے لیے ہنوز اس کے مقدمات عدالتوں میں چل رہے ہیں۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کی پولیس کی کارروائی کی کسی مزاحمت کے لیے نظام یا ان کی گورنمنٹ پر نہ کوئی الزام لگایا گیا اور نہ ہی مزاحمت ثابت ہوئی۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندوستان کی جمہوری گورنمنٹ نے نظام کو گدی سے اتارنے اور ان کی ریاست پر قبضہ کرنے میں کوئی خاص عمل کیا بلکہ یہ عمل کل ریاستوں کے ساتھ تھا جو انگریزوں کے زیر اثر اور ماتحت تھیں۔ اس لیے ہندوستان کی جمہوری یونین گورنمنٹ کو ہم کوئی الزام نہیں دے سکتے کہ اس نے نظام ہی کو گدی سے اتارا۔ عام طور پر ہم اپنے اس خیال کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ اس طور پر دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو گدیوں سے اتارنے کا عمل کوئی قابل ستائش نہیں تھا۔ گدیوں سے تو ان کو اتارا جاتا اور یہ ٹھیک تھا لیکن کچھ عرصہ کے لیے ان کو اسی حالت میں رکھا جاتا جیسے کہ انگریزوں نے رکھا اور ان سے جدید معاہدات کیے جاتے کہ انتظام تو جمہوری گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہی رہے گا لیکن سابق حکمرانوں کی وہ حیثیت رہے گی جو انگلستان کے بادشاہ کی ہے۔ ہر ریاست کا حکمراں ریاست سے کچھ پنشن پاتا رہے گا لیکن ریاست کے انتظام میں کوئی دخل نہیں دے گا اور کچھ عرصہ کے لیے یہ حالت قائم رہے گی اور پھر وہ حالت جو اب روا رکھی گئی ہے وہی حالت ہو جاتی۔

یہ خیال ہم نے بطور کسی مخالفت کے ظاہر نہیں کیا کہ یونین گورنمنٹ نے دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو گدی سے اتارنے اور ان کی ریاستوں پر قبضہ کرنے میں غلطی کی بلکہ ایک اپنے ذاتی خیال کے طور پر کیا ہے۔ اگر اس قسم کا انتظام ہوتا جیسا کہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے تو جو لوگ پشت ہا

پشت سے حکومت کرتے چلے آئے تھے ان کی اس درجہ بے قدری اور بیکی نہ ہوتی۔آخر یہ بھی تو اسی جمہوریت کے شہری ہیں۔اب جب ان کے ہاتھ سے حکومتیں چلی گئیں تو ان سے ہمدردی کرنے کو دل چاہتا ہے،لیکن انصاف نہیں چھوڑنا چاہتے۔انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جیسا ہوا وہ ٹھیک ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے دنیا کے مسلمانوں سے تعلقات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی کم وبیش پانچ کروڑ کی آبادی ہے اور جو قدرتی اسباب کی وجہ سے بڑھتی چلی جارہی ہے۔اور علاوہ ہندوستان کے اندازہ کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد دوسرے ملکوں میں چالیس کروڑ ہے۔مسلمان تو بہت امید افزا خیال رکھتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد پچاس کروڑ سے کم نہ نکلے گے۔مسلمانوں کی آبادی زیادہ تر ایشیا میں ہے اور دوسرے نمبر پر شمالی افریقہ میں ہے۔ایشیا کے ممالک میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی آبادی انڈونیشیا میں معلوم ہوتی ہے۔انڈونیشیا میں مشہور جزیرہ جاوا کا ہے۔اس کے بعد سوماترا،اور بورنیو بڑے جزیرے ہیں۔علاوہ ان کے اور چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جیسے بالی کا جزیرہ جس میں ہندو آباد ہیں جن کی مجموعی تعداد اس وقت معلوم نہیں ہے ان کی تعداد درجنوں ہے۔اسلامی حکومت کا جو ملک ہے وہ جزائر پر منقسم ہے۔جاوا سب سے بڑا جزیرہ ہے جس کا اوپر ذکر آیا ہے لیکن کل انڈونیشیا کے متعلق خیال ہے کہ اس میں آٹھ یا نو کروڑ مسلمان آباد ہیں۔اس تخمینے کے لحاظ سے انڈونیشیا کے جزائر میں مسلمانوں کی آبادی ایشیا کے جملہ ممالک کی نسبت زیادہ ہے اور انڈونیشیا کے بعد پاکستان کی مسلم آبادی ہے۔جو کم سے کم چار کروڑ اور زیادہ سے زیادہ پانچ کروڑ سے کم نہیں ہے۔اور پاکستان کے بعد پھر ہندوستان ہے جس کی مسلم آبادی پانچ کرورڑ یا اس سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا تخمینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ایشیا کے ممالک میں تیسرے نمبر پر ہے۔مسلمان اگر باہمی اتفاق کر کے زمانہ کی رفتار اختیار کرلیں تو ہندوستان میں جو ان کی آبادی ہے وہ آئندہ ان کی خوش حالی اور بہبودی کے لیے ایک قابل اطمینان قومی صورت کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔لیکن دقّت یہ ہے کہ مسلمانوں میں آپس میں اتفاق نہیں ہے۔اسلام کے نام پر تو وہ اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوا کرتے ہیں لیکن ان کے

پاس نہ علم ہے اور نہ احساس ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کس آبادی کو وہ اسلامی آبادی سمجھتے ہیں۔ آیا سنّی مسلمان جو تعداد میں زیادہ ہیں وہ اپنے گروہ میں شیعہ فرقہ کو شامل نہیں کرنے کا خیال اپنے دل میں رکھتے ہیں یا نہیں رکھتے۔ سنّی مسلمان گو تعداد میں زیادہ ہیں لیکن درمیانی چھوٹے چھوٹے اختلافات کی وجہ سے ہر جگہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو الگ سمجھتا ہے۔ اس کے خلاف کفر کے فتوے آئے دن دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ سب لوگ آپس میں مل جائیں اور اسلام کے اصل اصول کو ملحوظ رکھیں کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمانوں کی کل تعداد دنیا میں ایک بھائی چارہ کی حیثیت رکھتی ہے، اگر ایک فرقہ پر کوئی مصیبت عائد ہو تو دوسرے فرقے کے لوگ تن من دھن سے اس کی مدد کے لیے تیار ہو جائیں"۔

ہندوستان کے مسلمان دوسرے ملکوں کے مسلمان سے مکمل طور پر دلی الحاق رکھتے ہیں جس کا ایک ثبوت تو ہندوستانیوں کا ترکی خلافت کے لیے باون لاکھ روپیہ چندہ جمع کرنا تھا۔ یہ خیال تو بلاشبہ ایک ہمت افزا خیال تھا۔ لیکن اس کے بعد جو نتیجہ اس باون لاکھ روپیہ کے صرف کا ہوا وہ قابل خوشی کے نہیں ہے، بلکہ قابل ماتم کہیے۔ چندہ ترکی کے بادشاہ اور وہاں کے مسلمانوں کی مدد کے لیے کیا گیا تھا لیکن نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سب کا سب روپیہ جمع کرنے والوں نے خورد بُرد کر دیا۔ اس کی صحت اس اخبار سے ہو سکے گی جو علی برادران کی صحافت میں کئی سال تک دہلی سے جاری رہا جس کا نام "ہمدرد" تھا اور اس میں کل چندوں کی تعداد بھی چھپی تھی۔ اور آخر ان چندوں کا جو کچھ حشر ہوا اس کا بھی پتہ اسی اخبار سے چل سکتا ہے۔

ترکوں کی قوم غازی کمال پاشا کی ہمدردی سے ایک بڑی نامور قوم بن گئی۔ اور یورپ کی ظالمانہ مخالفت کے صدمے سے بچ گئی لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے جو نقشہ دنیا کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا وہ ہمیشہ قابل رنج اپنی آئندہ نسلوں کے سامنے پیش ہوا کرے گا۔

ایک قدیم مثل پڑھے لکھے آدمیوں میں بات چیت میں مہذب یا نیم مہذب آدمیوں میں بولی جاتی ہے۔ وہ مثل یہ ہے کہ ہر چیز جو دنیا میں آتی ہے وہ بہتری کے لیے آتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے اول تو باہر سے مسلمان آئے۔ مسلمانوں کے آنے سے قبل یہاں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کوئی اچھی حکومت کسی حصہ ملک میں نہیں تھی۔ مختلف صوبوں کے قبائلی

جتھے اپنی اپنی حکومت قائم کر لیتے تھے۔ ہندوستان سے کروڑوں بدھسٹ فنا کیے گئے اور اسی قدر لوگ ہندوستان کی سرحدوں سے نکال دیے گئے۔ جو جا کر چین میں سنٹرل ایشیا میں، افغانستان اور عراق میں اور دوسرے ممالک میں آباد ہوئے۔ ہمارے زمانے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سے مذہب کے لوگ دوسروں سے زیادہ ہیں اس وقت چین میں اور کوریا میں اور انڈوچین میں، برما میں اور سیلون میں اور تبت میں بدھ مذہب کے لوگوں کی کثرت تھی اور عام طور پر یہ خیال تھا کہ ایشیا میں بدھ مذہب تعداد میں سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ایک زمانے میں ذرا مضبوط حکومت قائم ہوگئی تھی اور وہ بدھ مذہب کے پیرودں کی حکومت تھی۔ وہ حکومت چندر گپت نے قائم کی تھی یا چندر گپت کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔ اشوک کی نسبت یہ عام خیال ہے کہ وہ چندر گپت موریہ کا پوتا تھا۔ اس کی اولاد میں ایک بڑا بادشاہ گزرا ہے جس کا نام اشوک تھا اور شمالی ہندوستان میں اس کا بڑا دبدبہ تھا۔ بنگال، بہار، اتر پردیش، موجودہ مدھیہ پردیش اور میسور اس کی حکومت کے علاقے تھے۔ اس نے مختلف مقامات پر پہاڑوں کی سلوں پر کتبے لکھوائے تھے، جو اب بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتے ہیں۔ دہرہ دون مسوری وغیرہ پہاڑوں کے درمیان دریائے جمنا بہتی ہے۔ جمنا کے کنارے پر ایک بہت بڑی سل کے اوپر کتبے کھدے ہوئے ہیں جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ ان کتبوں کے پڑھنے کے لیے خاص لوگوں کی ضرورت ہے کہ وہ ان کو پڑھیں کہ کیا لکھا ہوا ہے۔ عام طور سے کوئی نہیں پڑھ سکتا ہے۔ جن لوگوں نے ان کو پڑھا ہے اور سمجھا ہے کہتے ہیں کہ ان کتبوں میں عوام کے لیے کچھ ہدایات ہیں۔ اور کچھ قانونی اصول کھدوا دیے گئے ہیں۔ اس زمانے میں اس قسم کے اور بہت سے کتبے مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ جہاں تک مجھے خیال ہے کسی نے یہ کوشش نہیں کی کہ ان سب کتبوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان کا ترجمہ موجودہ زبانوں میں کر دے۔

ہمیں مسلمانوں کی آمد سے قبل فقط ایک راجہ کی حکومت دکھائی دیتی ہے اور وہ راجہ پرتھوی راج تھا۔ شمال سے حملہ آوروں کے مقابلوں کے لیے ہندوستان میں کہیں کوئی فوجی اتحاد کا سامان نہیں تھا۔ محمد غوری نے یہ دیکھا کہ ہندوستان میں لوگ بہت آسانی سے مفتوح ہو سکتے ہیں تو اس نے حملہ کیا اور پرتھوی راج نے اس کو شکست دی۔ لیکن ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں نے

اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا بلکہ پرتھوی راج کے خلاف جہاں تک پتہ چلتا ہے حسد کے غبار پیدا ہو گئے اور دوسری مرتبہ جب محمد غوری ایک بڑی فوج لے کر آیا تو پرتھوی راج اس کی روک تھام کے لیے آگے بڑھا اور راجپوتانہ کے یا دوسرے ممالک کے راجاؤں نے پرتھوی راج کی کوئی مدد نہیں کی اس وجہ سے پرتھوی راج ہار گیا۔ یہ ہار ہندوستان کے لیے بہت بری ثابت ہوئی۔ اس کے بعد لگاتار سات آٹھ صدیوں تک ہندوؤں کی حکومت قائم نہ ہو سکی اور رفتہ رفتہ مسلمان ہی کل ملک کے مالک ہو گئے۔ مسلمانوں کی حکومت کا سلسلہ اس طور قائم ہوا کہ محمد غوری جب پرتھوی راج کو شکست دے کر واپس اپنے ملک کو گیا تو یہاں پر اپنے ایک بڑے فوجی افسر قطب الدین ایبک کو چھوڑ گیا کہ وہ حکومت قائم کرے۔ قطب الدین بہت بڑا لائق و منتظم اور تنومند حکمراں ثابت ہوا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا آنا اور قریب سات سو سال تک حکومت کرنا ہندوؤں کی کمزوری اور باہم تنازعات کا ایک بڑا ثبوت ہے۔ مسلمانوں کو یہاں پر آنے اور حکومت کرنے کا واقعہ اس لیے مفید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں جو قبائلی حکومتیں تھیں ان کا خاتمہ ہو گیا اور مرکزی خود مختار بادشاہ حکومت کرنے لگے۔ اگر مسلمان نہ آتے تو انگریز ہندوستان میں کوئی ایسا بادشاہ نہ دیکھتے جیسا کہ انھوں نے مدراس اور بنگال میں مغلوں کی سلطنت کے گورنر یا وائسرائے برسر حکومت اپنی آنکھ سے دیکھے۔ مدراس وغیرہ میں ٹیپو سلطان سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی جو بادشاہ دہلی کے وائسرائے کی اولاد میں تھا اور اس کو انگریزوں نے شکست دے کر اس علاقہ پر قبضہ کر لیا جو مدراس و میسور کے علاوہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے نام سے اس زمانے میں قائم تھے۔ بنگال میں ایک وائسرائے علی وردی خاں کے بیٹے سراج الدولہ سے انگریزوں کا مقابلہ ہوا اور سراج الدولہ کے سپہ سالار و پرائم منسٹر سے انگریزوں نے ساز باز کر کے سراج الدولہ کی حکومت ختم کر دی۔

کلائیو نامی ایک انگریز نے انگریزوں کی حکومت قائم کر دی اور بنگال میں انگریزوں کی حکومت کا قائم ہونا اس قدر زبردست ثابت ہوا کہ وہی حکومت رفتہ رفتہ دہلی تک پہنچ گئی اور اورنگ زیب کے وارث کو جو مغلیہ سلطنت کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا اس کو ایک مطیع حکمراں کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لے لیا اور اس زمانے کے انتظام کی صورت یہ تھی کہ ملک تو اب تک بادشاہ ہی کا تسلیم کیا جاتا تھا اور انتظام کمپنی کے ہاتھ میں آ گیا اور حکومت کا خلاصہ یہ قرار دیا کہ "ملک بادشاہ کا

اور حکم کمپنی بہادر کا' اور اس قسم کی حکومت کم وبیش سو سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد غدر 1857 میں آخری صورت بھی ختم ہوگئی اور انگریز پورے طور پر پورے ملک پر قابض ہو کر حکمراں بن گئے۔

مہاتما گاندھی کا قتل

انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد کے واقعات میں سب سے بڑا اور صدیوں تک یاد رہنے والا واقعہ موہن داس کرم چند عرف مہاتما گاندی کا قتل ہے۔ مہاتما گاندھی کو فقط ہندوستان کے رہنے والے ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے رہنے والے جانتے تھے۔ ان کے قتل کے بعد دنیا کے قریب قریب ہر ملک میں ماتم منایا گیا اور ان کے قتل پر افسوس ظاہر کیا گیا۔

مسلمانوں کے لیے مہاتما گاندھی کا قتل بہت ہی رنج دہ واقعہ ہو گزرا ہے۔ مہاتما گاندھی کی ملکی معاملات میں جو کچھ بھی رائے تھی وہ سب جانتے ہیں لیکن ہمیشہ سے وہ ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے حامی رہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا اعلان کرتے رہے کہ جب تک ہندو مسلمانوں میں اتفاق نہیں ہوگا اس وقت تک نہ ہندوستان کو آزادی ملے گی اور نہ ہی امن قائم رہے گا۔ 15 راگست 1947 کے بعد جو حالات پیش آئے ان کے متعلق مختصر سا بیان اوپر قلم بند ہو چکا ہے۔

مہاتما گاندھی اس کشت وخون سے بہت ناراض تھے جو ان کی آنکھوں کے سامنے دہلی میں ہو رہا تھا۔ مشرقی بنگال میں بھی ہندو مسلمانوں میں لڑائی شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ مہاتما گاندھی بنگال میں پہنچے اور مسٹر سہروردی کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ دونوں نے مل کر وہاں کے جھگڑے تنازعے سب طے کر دیے اور امن قائم ہو گیا۔ لیکن دہلی میں وہ امن قائم نہ کر سکے کیوں کہ دہلی پر سکھوں کی یورش ایک بڑی سازش اور گہری تجویزوں کا نتیجہ تھی۔

جب گورنمنٹ کی پولیس اور فوج اور افسران پولیس وفوج اور حکومت کے اعلیٰ وزرا سب مسلمانوں کو مار کر شہر سے نکال دینے کے حامی ہوں تو پھر مہاتما گاندھی کے وعظ اور پند ونصائح کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ مہاتما گاندھی کی تلقین اور اصول بعض بااثر حلقوں کی رائے کے بالکل خلاف تھے اس لیے انھوں نے مہاتما گاندھی کے بارے میں غالباً اپنے دل میں یہ طے کر لیا ہوگا کہ اگر کسی طریقے سے ان کا خاتمہ ہو جائے تو بہتر ہے۔

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی جماعت کے ارادوں، منصوبوں، اور کارناموں سے ہندوستان

کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس جماعت نے مہاراشٹر کے علاقے میں جنم لیا۔ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا بانی ایک شخص گول والکر نامی مرہٹہ ہے۔ یہ جماعت ہندوستان سے مسلمانوں کے خاتمہ کے لیے قائم کی گئی تھی اور بہت جلد ہندوستان بھر میں اس نے اپنا اثر پیدا کر لیا اور ہر صوبہ میں لاکھوں آدمی اس میں شریک ہو گئے۔

مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی ماتمی تقریر میں بیان کیا کہ اس جماعت کی تعداد قریب آٹھ لاکھ کے ہے اور ہر طبقہ کے لوگ اس میں شریک ہیں۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ کے وزرا اور سویلین اور دیگر بڑے بڑے مقتدر اشخاص اس میں شریک ہیں۔ اس جماعت کے لیڈروں نے ناتھورام ونائک گوڈ سے کو تیار کیا کہ وہ جا کر مہاتما گاندھی کو قتل کر دے، کیونکہ وہ مسلمانوں کو بجائے ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کے ان کی حمایت کر رہا ہے اور ہندو مسلمانوں کے اتفاق پر زور دے رہا ہے۔ جس روز مہاتما گاندھی کے قتل کا واقعہ ہوا اس سے دس روز قبل کوئی شخص اسی ظالم جماعت کی طرف سے مہاتما گاندھی کی دعا کے جلسے میں آیا اور اس نے ایک بم پھینکا جو مہاتما گاندھی تک نہیں پہنچا، کمرے کے باہر ہی پھٹ گیا اور حاضرین میں سے دوسرے لوگوں کو کچھ بھی کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اس موقع پر مہاتما گاندھی بچ گئے۔ اس واقعہ کے دس روز کے بعد ناتھورام گوڈ سے مہاتما گاندھی کے دعا کے جلسے میں پہنچا جو برلا ہاؤس دہلی میں ہوا کرتا تھا۔ وہ دعا کے جلسے میں اس وقت پہنچا جبکہ مہاتما جی دعا کے کمرے میں دو چھوٹی چھوٹی بچیوں کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے پہنچے تو ناتھورام گوڈ سے نے سامنے آ کر جھک کر بڑی عقیدت سے ان کی تعظیم کی اور دونوں لڑکیوں کو جن کے سر پر گاندھی جی ہاتھ رکھے ہوئے تھے ان کو سامنے سے ہٹا دیا اور مہاتما جی پر پستول کے وار کرنے شروع کیے۔ پے در پے تین گولیاں مہاتما جی کے سینے پر لگیں اور ان کی روح آن کی آن میں پرواز کر گئی۔

مہاتما جی قتل ہو گئے لیکن کس گناہ میں؟ فقط ان کا قصور یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی تلقین کرتے تھے۔ اور مسلمان کے کشت و خون کی مخالفت کرتے تھے اور برملا اپنے جلسوں میں اس مخالفت کا اظہار کرتے تھے۔ اس واقعے سے مسلمانوں کی آنکھیں کھلنی چاہیے تھیں کہ ہم کو اپنی حفاظت خود اختیاری کا بھی کچھ انتظام کرنا چاہیے۔ لیکن گذشتہ دو تین صدیوں کے انحطاط اور پستی

نے ان کو اس قدر بے کار کر دیا کہ ان کو اپنی جان بچانے کی بھی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی۔

مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد مسلمان بھی ان کے ماتم میں شریک ہوئے اور اکثر مقامات پر انھوں نے جداگانہ ماتمی جلسے کیے اور عام طور پر ہندوؤں کے ماتمی جلسوں میں شریک ہوئے۔ لیکن مہاتما گاندھی کے ماتم کا حق محض رونے دھونے سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اگر سب مسلمان مل کر قیامت تک بھی روئے جائیں تو ان کو مہاتما گاندھی جیسا دوست نہیں مل سکتا۔ لیکن اگر ان میں کچھ بھی بیداری ہو جائے تو وہ مہاتما گاندھی کے اصولوں پر کاربند ہو کر اپنے جان و مال کی حفاظت کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اور مہاتما گاندھی کی تعلیم پر عمل کر کے ہندو مسلمان میں اتحاد بھی کرا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کا انکشاف اس وجہ سے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو سر سید مرحوم و مغفور کی ملکی پالیسی کی قدر کرنے کا موقع ملے۔ سر سید ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز مسلمانوں کو بے دست و پا ایسی جماعتوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر یہاں سے رخصت ہوں جیسے کہ مہا سبھا، اکالی دل، اور سیوک سنگھ کی جماعتیں ہیں۔ وہ آزادی کے حامی تھے لیکن اس قسم کی آزادی جس کا مطالبہ کانگریس کر رہی تھی اس کے حامی نہیں تھے۔ کانگریس کی آزادی میں مسلمانوں کی آزادی کا کوئی لحاظ نہیں تھا۔ کانگریس قطعاً یہ نہیں چاہتی تھی کہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کو علاحدہ علاحدہ اپنے تحفظ کا موقع دیا جائے۔ اس کا تو نصب العین یہ تھا کہ ہندوستان کے سب باشندے انگلستان کی طرح اپنی ایک پارلیمنٹ قائم کریں اور اس پارلیمنٹ میں سے وزرا منتخب ہوں جو ہندوستان پر حکومت کریں۔

سر سید کی دوربیں آنکھ نے یہ دیکھ لیا تھا متذکرہ بالا قسم کی حکومت مسلمانوں کو غلام بنا دے گی اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کا ہندوستان سے خاتمہ ہو جائے گا جیسا کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔ ہسپانیہ کی مثال بعض جماعتوں کے سامنے ہے اور وہ اس بات کو امکان کے دائرے کے اندر خیال کرتی ہیں۔ اگر کسی وقت ہمیں موقع مل گیا تو ہم ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی طور پر ختم کر کے ان کا نام و نشان مٹا دیں گے جیسا کہ اسپین میں مسلمانوں کے ساتھ ہوا تھا یا جیسا کہ ہندوستان میں بدھوں کے ساتھ ہوا تھا۔

سر سید نے مسلمانوں کو ان واقعات کی طرف توجہ دلانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ لیکن

غفلت کا نشہ اس قوم پر صدیوں سے اس درجہ غالب رہا کہ کسی دوست اور مصلح کی نصیحت کا کبھی ان پر اثر نہیں ہوا۔

1947 کے کشت وخون کے جو کچھ واقعات میں نے لکھے ہیں، وہ ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان میں جو کچھ ہوا اس کا مجھ کو ذاتی علم نہیں ہے۔ لیکن ہندو اور سکھ مہاجرین جو پاکستان کو چھوڑ چھوڑ کر ہندوستان میں آئے ہیں ان کے بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پنجاب میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہاں پر مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر بہت مظالم کیے ہیں۔ اس لیے میں نے جو کچھ مشرقی پنجاب میں اور دہلی کے متعلق لکھا ہے وہ ہندوؤں پر الزام تھوپنے کے لیے نہیں لکھا، اور اس کا اظہار ضروری تھا کہ مسلمانوں نے بھی جہاں ان کی اکثریت تھی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ وہی سلوک کیے جو ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیے تھے۔ اب خواہ ہندو مسلمانوں پر ظلم کرنے کے مرتکب قرار دیے جائیں یا مسلمان ہندوؤں پر، لیکن سرسید کی دور اندیشی اور اصول کی ہر حالت میں تصدیق ہوتی ہے کہ جس قسم کی حکومت کانگریس قائم کرنا چاہتی ہے یعنی آبادی کی اکثریت کو سیاہ وسفید کا اختیار دینا چاہتی ہے، وہ اصول ہندوستان کے لیے کسی حالت میں مناسب نہیں تھا اور نہ موزوں ثابت ہوا۔

میں اس وقت اپنے پنج سالہ تجربہ کی بناء پر جو 1947 کے بعد سے اس وقت تک ہوا، اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ اور پنڈت جواہرلعل نہرو کے اس بیان کی تائید کرتا ہوں کہ ہندوستان میں ان اقوام کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے جو اقلیت میں ہیں، اور امید ہوتی ہے کہ اگر پنڈت جواہرلعل نہرو جیسے پرائم منسٹر اور پریذیڈنٹ کانگریس ان کے بعد چند نسلوں تک ان کی تقلید اور پیروی کرتے رہیں گے تو شاید رفتہ رفتہ حالات بدل جائیں اور آبادی کی اکثریت کی حکومت اقلیت کے حق میں پرستم نہ رہے گی۔

ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ لیکن سب ہندو سیاسی معاملات میں ایک خیال کے نہیں اور بعض فرقے محض مسلمانوں کی عداوت کی وجہ سے ملک میں قائم ہوگئے ہیں۔ ان فرقوں میں آر۔ ایس۔ ایس۔ ہندو مہا سبھا، جن سنگھ اپنی عداوت نہایت کھلے طور پر ملک کے

سامنے پیش کرر ہے ہیں۔آر۔ایس۔ایس کے فرقے کے بانی اور بھی لوگ ہوں گے لیکن ایک شخص گولوالکر اس فرقے کے گرو مانے جاتے ہیں۔ یہ صاحب آئے دن اخبارات میں اپنی عداوت کا اعلان کرتے رہتے ہیں اوران کی عداوت اس غرض کے لیے ہے کہ مسلمان ہندوستان چھوڑکران ملکوں میں چلے جائیں جہاں سے وہ آئے ہیں۔

ابھی حال میں انھوں نے ایک اعلان شائع کیا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر بودوباش تو اختیار کی لیکن ہندو کلچر یا طرز معاشرت قبول نہیں کیا۔اور نہ ہندی زبان قبول کی، اور نہ ہندوؤں کا مذہب قبول کیا۔ ہندوستان میں وہ ویسے کے ویسے ہی اجنبی ہیں جیسے کہ آئے تھے۔اس لیے ہم ان کو اپنا ملکی بھائی سمجھنے سے قاصر ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان چھوڑکر یہاں سے چلے جائیں۔اسی فرقے کے بعض لوگوں نے مل کر سازش کی اور گاندھی جی مہاراج کو 30رجنوری1948 کو دہلی میں برلا ہاؤس میں جاکر ریوالور کی گولیوں سے قتل کردیا۔ان میں سے دوآدمیوں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور باقیوں کو قید کی سزا ہوئی۔

جس شخص نے گولیاں چلائیں اور قتل کیا، اس کا نام ناتھورام ونائک گوڈسے تھا۔ ناتھورام گوڈسے سے پوچھا گیا کہ تم نے ملک کے ایسے ہمدرد جیسے کے گاندھی جی تھے کیوں قتل کیا؟ اس نے کہا کہ ہمارے فرقے کا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو مار کر ہندوستان سے ختم کردیں۔لیکن گاندھی جی مسلمانوں کو گلے لگارہے تھے اور ملک کی آبادی میں ان کی جڑیں مضبوط کرر ہے تھے جو ہمارے فرقے کے اصولوں کے بالکل خلاف تھا اس لیے ہم نے ان کو قتل کردیا۔اور اگر موقع ملتا تو پنڈت جواہر لال نہرو کو جو گاندھی جی کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرر ہے ہیں اور جناح کو اور لیاقت علی کو اور سہروردی کو، ان سب کو بھی قتل کردیتے۔

اب یہ معاملہ بالکل صاف ہے کہ اگر آر۔ایس۔ایس والوں کو موقع ملے تو وہ ایک مسلمان کو بھی ہندوستان میں زندہ نہ رہنے دیں گے۔ پنڈت جواہر لال جی خود تو آر۔ایس۔ ایس اور جن سنگھ کے بالکل مخالف ہیں، لیکن مسلمانوں کی مخالفت کے لیے جو فرقے کھڑے ہوگئے ہیں ان کی تعداد زیادہ ہے اس لیے پنڈت جواہر لال کی کوئی پیش نہیں جاتی۔ جواہر لعل جی نے گاندھی جی کے قتل ہونے کے بعد ایک تقریر کی تھی جس میں انھوں نے آر۔ایس۔ایس کے

ممبروں کی تعداد آٹھ لاکھ سے زیادہ بتائی تھی اور کہا تھا کہ اس فرقے کے لوگ سوسائٹی کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔

سیٹھ برلا کے مکان میں جونئی دہلی میں واقع ہے، گاندھی جی ہر روز اپنے اعلیٰ اصولوں کی تعلیم ان لوگوں کو دیا کرتے تھے جو ان کے پند ونصائح سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ اور اس میں کسی مذہب و ملت و قومیت کی کوئی شرط نہیں تھی کہ کون آئے اور ان کے نصائح سنے۔ وہ اپنے عمل سے اس بات کو پورے طور پر ثابت کر کے دکھانا چاہتے تھے کہ میرے نزدیک مذہب کے اختلاف کی وجہ سے بحیثیت ایک قوم ہونے کے ہندوستانیوں میں کوئی اختلاف باہمی نہیں ہے بلکہ قومی یگانگت جملہ دوسری اختلافات پر حاوی رہنی چاہیے۔

وہ جہاں ہندو شاستروں اور ویدوں اور اسمرتیوں کے اشلوک اپنے جلسوں میں پڑھ کر ان کے متعلق بھی گفتگو فرمایا کرتے تھے، وہاں توریت، انجیل اور قرآن پاک کی آیات بھی پڑھ کر ان کے متعلق بھی گفتگو کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ جنھیں صرف مسلمانوں کے قرآن سے کد تھی اور وہ ہمیشہ جلسوں میں مخالفت کیا کرتے تھے کہ قرآن نہ پڑھا جائے اور توریت، انجیل پڑھنے یا پڑھانے میں وہ کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن گاندھی جی کسی کی نہیں سنتے تھے۔ وہ قرآن شریف کی آیات ضرور پڑھواتے تھے اور قرآن کے مسائل تعلیمی پر بعض وقت بڑی گرم جوشی سے تقریریں فرمایا کرتے تھے۔

ان کے قتل سے قبل ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک مکان کے دریچے سے جہاں سے گاندھی جی کی نشست کی جگہ دکھائی دیتی تھی کسی نے ایک بم پھینکا جس سے بڑے زور کا دھماکا ہوا لیکن پولیس نے نہ کسی کو گرفتار کیا اور نہ بم چلانے والے کا سراغ لگایا کہ کون تھا۔ حالاں کہ پولیس اور خفیہ پولیس سب کی قوت سردار ولبھ بھائی پٹیل کی مٹھی میں تھی۔ وہ چاہتے تو بم چلانے والا فوراً گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ بم بھی دن دہاڑے چلایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کے قتل سے قریب آٹھ روز قبل جب ولبھ بھائی پٹیل صوبہ گجرات کے شہر احمد آباد میں دورہ کر رہے تھے تو ممبئی کی کیبنٹ کے ایک ممبر جن کا نام مرار جی ڈیسائی تھا، وہ سردار پٹیل کے پاس خاص طور پر ان کو اطلاع دینے کے لیے پہنچے اور ان سے کہا کہ لوگ گاندھی جی کی جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور معلوم

ہوا ہے کہ ایک سازش کی گئی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ آپ کو میں خبردار کرنے کے لیے ممبئی سے آیا ہوں کہ آپ اس کا انتظام کیجیے کہ کوئی واردات نہ ہونے پائے۔ اس کی مجھے خبر نہیں ملی کہ پٹیل صاحب نے کیا خبرداری کی اور گاندھی جی کی جان کی حفاظت کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔ جس روز گاندھی جی کا قتل ہوا، اس روز سردار پٹیل دہلی میں موجود تھے، اور قتل سے کچھ دیر پہلے گاندھی جی کے کمرے میں دیکھے گئے تھے۔

گاندھی جی ایک بہت بڑے پائے کے انسان گزرے ہیں۔ گذشتہ چند صدیوں میں ان کی قابلیت اور ملکی و قومی ہمدردی رکھنے والا کوئی دوسرا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہندوستان میں مسلمان صوفیا مثل حضرت خواجہ اجمیریؒ و بابا فریدؒ و حضرت نظام الدین اولیاؒ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنی زندگی میں ہمیشہ مختلف فرقوں اور اقوام کی آپس میں ملانے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن ہندوؤں میں سولہویں صدی میں جناب گرونانک یا بابا نانک جیسے بزرگ پیدا ہوئے جو صوفیا مذکورہ بالا کی طرح ہندو مسلمانوں میں اتفاق کرانے میں عمر بھر ہمہ تن مشغول رہے۔ ان کے بعد کبیر جی ہوئے لیکن وہ شاعر تھے واعظ نہیں تھے لیکن صوفی منش تھے۔ اب ادھر انگریزوں کے زمانے میں بجز گاندھی جی کے دوسرا دکھائی نہیں دیتا جس نے مختلف مذاہب و اقوام کے لوگوں کو آپس میں شیر و شکر کرنے کی کوشش کی ہو۔ گاندھی جی کو جیل خانہ ہو گیا اور ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ ہوا۔ لیکن جیل خانوں میں جب جب وہ گئے کبھی انھوں نے اردو سیکھی اور اردو زبان میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کی اور کبھی قرآن پاک کے کچھ حصص پڑھنا سیکھے۔

ایسا شخص ہندوستان سے اس طریقے سے ختم کر دیا گیا۔ اس کا رنج مجھ کو معلوم نہیں کہ سب ہندوؤں کو ہوا یا نہیں ہوا لیکن مسلمانوں کی نسبت میں اپنی عینی شہادت سے کہنا چاہتا ہوں کہ ان کو سخت رنج ہوا۔ میں اس روز کانپور میں تھا۔ مجھے وہاں معلوم ہوا کہ گاندھی جی قتل ہو گئے۔ میں ایک ایک مسلمان دوست شیخ حافظ محمد صدیق صاحب کے مکان پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں پر اس قتل کے واقعے کے سننے کے بعد بہت سے مسلمان جمع ہو گئے۔ اور جو جو وہاں پر آئے ان سب کو میں نے سخت رنج کی حالت میں پایا۔ بعض ان میں سے آنسو بہا بہا کر کہتے تھے کہ ہمارا ایک بڑا دوست آج دنیا سے کسی ظالم نے ختم کر دیا۔ وہاں پر صرف قتل کی خبر ریڈیو کے ذریعہ پہنچ گئی تھی لیکن مفصل

حالات معلوم نہیں ہوئے تھے۔

بعض لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ کسی مسلمان ہی نے یہ واردات کی ہے۔ مسلمان کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں ہندو مسلمانوں میں کشت و خون کا بازار گرم نہ ہو جائے۔ لیکن پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس موقع پر جس دوراندیشی سے کام لیا وہ بھی بہت قابل داد ہے۔ انھوں نے ریڈیو کے ذریعے سے کل ملک میں خبر پہنچا دی کہ گاندھی جی قتل تو ہو گئے ہیں لیکن کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہیں بلکہ ایک ہندو کے ہاتھ سے قتل ہوئے ہیں جس کا نام ناتھورام گوڈسے ہے۔ اس خبر کو سن کر ہندوؤں کا غصہ جو محض شبہ کی بنا پر بھڑک اٹھا تھا وہ ٹھنڈا ہو گیا اور ہندو مسلمان دونوں مل کر گاندھی جی کا ماتم کرنے لگے۔

یہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ سرسید کی دوربین نظر نے جو واقعات دیکھے تھے وہ ظہور میں آئے۔ لیکن سرسید کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی تھی کہ ملک تقسیم ہوگا اور تقسیم کا ایک صریح نتیجہ ابتدائی زمانے میں یہ ہوگا کہ ہندو مسلمان دونوں ایک دوسروں پر پل پڑیں اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیں گے۔ سرسید کو اس بات کا یقین تھا کہ انگریز کبھی ہندوستان کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے اور ہم کو صرف اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ انگریز ہندوستانیوں کو حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل کر لیں اور دونوں مل کر ملک کا انتظام کریں۔

سرسید نے اپنے رسالے ''اسباب بغاوت ہند'' میں اس معاملے کی پوری صراحت کر دی تھی کہ انگریز استبدانہ طور پر بلا کسی روک ٹوک کے اور بلا ہندوستانیوں کے مشورے کے حکومت کر رہے ہیں، اس لیے غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اگر وہ ہندوستانیوں سے مل کر حکومت کرتے تو یہ ہنگامہ کبھی وقوع میں نہ آتا۔ گو غدر کے بعد ابتدائی دنوں میں سرسید کے یہ خیالات وقعت سے دیکھے گئے ہوں لیکن حالات جو اس وقت تک پیش آئے اور آرہے ہیں ان سے سرسید کے اس خیال کی تائید تو نہیں ہو سکتی کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر کبھی یہاں سے نہیں جاسکتے لیکن اس بات کی پوری تائید ہوتی ہے کہ اس قسم کی جمہوریت جو یورپ میں رائج ہے وہ اگر ہندوستان میں بھی جاری ہو جائے تو اقلیتیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سخت نقصان اٹھائیں گی۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک نہیں ہے، اور مسلمانوں کو اس

ملک میں رہنے کا حق اسی قدر ہے جتنا کہ ہندوؤں کو ہے۔اوّل تو انسانی نسل کے عالموں کا خیال جو افراد کے خط و خال سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ یہ افراد کس نسل سے ہیں۔ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمان بہت زیادہ تعداد میں اسی نسل سے ہیں جس نسل کے ہندو ہیں اور ہندو مسلمانوں دونوں کی شکلوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ اگر ہندو دھوتی نہ باندھیں اور ٹیکا نہ لگائیں، ہندو اور مسلمان دونوں معمولی لباس پہنیں اور ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں تو کوئی شخص نہیں پہچان سکتا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان ہے؟ لباس کی تبدیلی سے البتہ بعض وقت ہندو اور مسلمان الگ الگ پہچانے جاتے ہیں لیکن دونوں فرقوں کے رنگ شکل وشباہت سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان ہے؟ دوسرے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مسلمان کو ہندوستان میں آئے ہوئے قریب ایک ہزار سال کے ہوا اور یہاں آ کر مذہب اسلام ہندوؤں میں پھیلایا اور اور جو باہر سے آئے ہوئے تھے، ان میں اور یہاں کی ہندو عورتوں میں شادیاں ہوئیں اور رفتہ رفتہ شکل وشباہت بول چال اور طرز زندگی میں باہر کے آنے والوں میں اور یہاں کے رہنے والوں میں کوئی تفریق باقی نہیں رہی۔

آر۔ایس۔ایس اور ہندو مہا سبھا کا یہ کہنا کہ موجودہ مسلمان اجنبی ہیں، قطعاً خلاف واقعہ اور جھوٹ ہے۔ مسلمانوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے کہ یقین سے کہہ سکے کہ میرے باپ دادا کہاں سے آئے تھے۔ بعض لوگ دوسروں پر اپنی فضیلت ثابت کرنے کے لیے کوشش کیا کرتے ہیں کہ اپنے نام کے ساتھ کسی غیر ملک کے کسی فرقہ کا پچھلا لگائیں جیسے بعض لوگ کوشش کر کے شجرے بنوا کر سید بن جاتے ہیں اور بعض آدمی کسی دوسرے ملک کے مشہور شہر سے اپنی نسبت کرنے لگتے ہیں جیسے کہ شیرازی، بخاری، وغیرہ وغیرہ ایران اور عراق وغیرہ شہروں سے اپنی نسبت ظاہر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا بیان خود ان ہی کے ہم عصر اور ہم قوم تسلیم نہیں کرتے اور انھیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ ہم کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے، ہم تو ان کو ہندوستانی سمجھتے ہیں، انھیں اگر اپنے کو ہندوستانی تسلیم کرنے میں عار معلوم ہو تو پھر آر۔ایس۔ایس، اور ہندو مہا سبھا کی آسانی کے لیے اعلان کر دیں کہ ہم ہندوستانی نہیں ہیں اور ہندوستان چھوڑ کر جہاں چاہیں چلے جائیں۔ لیکن آر۔ایس۔ایس، اور مہا سبھائی اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے

کہ وہ کسی ایک مسلمان کو بھی بدیسی یا اجنبی ثابت کر سکیں یا اس کو ہندوستان سے دیس نکالا دے سکیں یا دلوا سکیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے اس وقت تین ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ ایک بڑا ٹکڑا تو انڈین یونین میں ہے جن کی تعداد چار کروڑ سے زیادہ ہے۔ دوسرا ٹکڑا مغربی پاکستان میں ہے جس کی تعداد ڈھائی کروڑ افراد کی ہے، اور تیسرا ٹکڑا مشرقی پاکستان کا ہے جس کی تعداد ساڑھے تین کروڑ ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی وقت آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو مہا سبھا کے اغوا سے خانہ جنگی شروع ہو گئی تو ملک میں فقط بدامنی ہی نہیں ہو جائے گی بلکہ خون کی ندیاں بھی شروع ہو جاویں گی۔ ہم کو موجودہ صورت میں گاندھی جی کے خیالات کی پوری تقلید کرنی چاہیے خواہ ہندو ہو یا مسلمان ہو، دونوں کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر خانہ جنگی کی نوبت آئی تو دونوں قومیں برباد ہو جائیں گی۔

اب اس وقت پنڈت جواہر لعل نہرو جو گاندھی جی کے اصولوں کے ماننے والے ہیں ان ہی کی وجہ سے ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان ذرا اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر آر۔ ایس۔ ایس یا ہندو مہا سبھا یا جن سنگھ کبھی اس قابل ہو جائیں کہ وہ مسلمانوں پر حملہ کر بیٹھیں، اور ان کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تو یاد رکھیں کہ وہ خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت

واقعات جو آئندہ نسلوں کے لیے عبرت کا باعث ہوں گے وہ یہ ہیں کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت قطعی برباد ہو گئی ہے۔ بہت سے مقامات سے وہ شہروں سے نکل گئے ہیں اور ان کے مکانات پر پنجاب سے آئے ہوئے دوسرے لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ مسلمان انگریزوں کے عہد میں تجارت کیا کرتے تھے اور ان کی تجارت معقول تھی اور ملک کی صنعت و حرفت میں ان کا ایک معقول حصہ تھا۔ کپڑا سوتی یا ریشمی یا اونی جو تیار ہوتا تھا اس میں مسلمانوں کی صنعت و حرفت قابل ستائش سمجھی جاتی تھی۔ بنارس کے ریشمی کپڑے، ساڑیاں وغیرہ اور لکھنؤ کی چکن مئو وغیرہ مقامات میں ریشم کے کپڑے، یہ مسلمانوں کا خاص حصہ تھا، اب یہ تجارت بہت کچھ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ لوگ بھاگ گئے ہیں اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی خوفزدہ ہیں کہ کس وقت

ہم کو اپنے گھر سے نکال دیا جائے گا۔ مسلمان دکاندار جو ابھی تک ملک میں باقی رہ گئے ہیں وہ نالاں ہیں کہ آبادی کی اکثریت نے ہم سے لین دین کا تعلق کم کر دیا ہے۔ اب تجارت بڑی ہو یا چھوٹی گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ جو چیزیں دکاندار خریدتے ہیں وہ پرمٹ سے خریدتے ہیں اور پرمٹ گورنمنٹ کے افسر دیتے ہیں۔

مسلمان ایڑیاں رگڑتے رہ جاتے ہیں کہ ہم کو بھی پرمٹ دو لیکن پرمٹ دینے والے زیادہ تر فرقہ پرست ہندو ہیں۔ وہ مسلمانوں کو پرمٹ نہیں دیتے۔ باہر سے مال کی برآمد کرنے کے لیے گورنمنٹ تاجروں کو لائسنس دیتی ہے تب مال آسکتا ہے یا جا سکتا ہے۔ لیکن ممبئی کے مسلمان تجار کہتے ہیں کہ ہم کو گورنمنٹ کے افسر لائسنس دینے میں بہت کمی کر رہے ہیں تاکہ ہم بھی باہر سے مال نہ منگا سکیں اور نہ مال باہر بھیج سکیں۔ شہر میں جو موقع کی دکانیں ہیں جہاں پر گاہک زیادہ آتے ہیں وہ زیادہ تر ہندوؤں کی ملکیت ہیں۔ ہندو مسلمانوں کو ان موقعوں کی دکانیں نہیں دیتے جہاں گاہک زیادہ آتے ہیں۔

1947 کے حشر خیز زمانے میں دہلی میں مسلمانوں کے بازار کے بازار ختم ہو گئے اور مسلمان دکاندار یا تو سکھوں اور پنجابی ہندوؤں کے ہاتھوں سے قتل ہو گئے یا بھاگ گئے۔ اور ان کی دکانیں گورنمنٹ نے ہندوؤں کو دے دیں۔ دہلی میں جا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سابق میں جن بازاروں میں مسلمانوں کی سو دکانیں تھیں اب دس بھی باقی نہیں رہی ہیں۔ ان پر پنجاب کے سکھ یا کھتری قابض ہو گئے ہیں۔ مسلمان مویشی کی تجارت بہت کیا کرتے تھے۔ میلوں سے گائے، بیل، بھینس خرید لاتے تھے، اور دیہات میں آکر کسانوں کو فروخت کر دیتے تھے۔ لیکن اب جب کسی میلے میں مسلمان خریداری کے لیے جاتا ہے تو سب سے پہلے اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو کون ہے؟ اگر وہ کہے کہ میں مسلمان ہوں تو پھر اس کو ایک مویشی بھی نہیں ملتا۔ ان کا کام قریب قریب برباد ہو گیا ہے اور نسلوں سے وہ یہی کام کرتے چلے آئے تھے۔ اب کوئی دوسرا کام ان کو نہیں ملتا اور نہ وہ دوسرا کام جانتے ہیں۔ اس لیے سوائے اس کے کہ وہ اور ان کے بال بچے بھوکوں مر جائیں اور کوئی طریقہ ان کو دکھائی نہیں دیتا۔

مسلمانوں کی روزی کا ایک بہت بڑا ذریعہ سرکاری ملازمت تھی۔ گورنمنٹ انگلشیہ ان

کو محکمہ مال اور دیوانی عدالتوں میں اور پولیس وریلوے میں فوج اور دیگر صیغوں میں کم از کم 25 فیصدی ملازمتیں دیا کرتی تھی۔ اب جس قدر مال ودیوانی عدالتوں میں ان کا حصہ تھا وہ قریب قریب سب چھن گیا اور پولیس میں ان کی تعداد پچیس فی صدی سے بھی زیادہ ہوا کرتی تھی مگر وہاں بھی ہر ضلع میں مسلمانوں کی تعداد سابق کی نسبت قریب ایک تہائی کے رہ گئی ہے۔

ریلوے میں مسلمانوں کی بہت کھپت تھی۔ ہندوستانی ڈرائیوروں میں جس قدر لوگ ملازم تھے ان میں سے کثرت سے مسلمان ہوا کرتے تھے۔ جب یہ ہنگامہ ہوا تو مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم پاکستان چلے جاؤ۔ مسلمانوں نے سوچا کہ ہمارے حقوق کا بالکل کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ترقی کے مستحق ہوتے ہیں تو ہمیں ترقی نہیں ملتی اور جدید تقرارات کا دروازہ تو ہم پر بند ہی کر دیا گیا ہے۔ جب مسلمانوں کو کوئی امید نہ رہی تو وہ پاکستان چلے گئے۔ جب وہ یہاں سے پاکستان کی طرف چلے، راستے میں سکھوں اور پنجابی ہندوؤں نے بالخصوص ریاست پٹیالہ کے باشندوں نے ان کی ریلوں پر حملے کرنے شروع کیے۔ اور ہزارہا آدمیوں کو قتل کر دیا، کچھ لوگ کسی طرح سے جان بچا کر پاکستان پہنچے۔ لیکن وہاں نوکریاں کہاں رکھی تھیں۔ بھوکے مرنے لگے تو پھر ہندوستان کی ریلوں کے منتظمین کے سامنے اپنی درخواستیں پیش کیں کہ ہم واپس آنے کو تیار ہیں، ہماری پہلی نوکریاں ہم کو مل جانی چاہئیں۔

ان سے کہا گیا کہ تمھارے ہوش کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے تو تم نے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہم جائیں گے، اور اب جب کہ نوکری نہیں ملی تو واپس آنے کو تیار ہو۔ وہ لوگ ہر طریقے سے تباہ و برباد ہو گئے۔ پاکستان میں اتنی نوکریاں نہیں کہ ان کی کھپت ہو۔ ہندوستان میں ان کو مسلمان سمجھ کر نوکر نہیں رکھا جاتا۔ ان غریبوں کی حالت قابل رحم اور ہمدردی ہے۔ اس جور وستم کا اثر ملازمت کے ہر صیغے پر پڑا ہے۔ عدالت کے چپراسی تک نکال دیے گئے ہیں۔ فوج اور پولیس میں تو کوئی مسلمان بھرتی کیا ہی نہیں جاتا۔ مقابلے کے امتحان میں ان کو اوّل تو شریک ہونے کا موقع نہیں ملتا اور اگر شریک بھی ہوئے تو بہت کم کامیاب ہوتے ہیں۔ اس میں سے بھی طبی معائنہ کے وقت ایک دو ہی رہ جاتے ہیں۔ باقیوں کو ڈاکٹر نا قابل ملازمت تجویز کر دیتا ہے۔

صوبہ یو۔ پی میں مسلمانوں کی زمین داریاں قریب بائیس فیصدی کے بتائی جاتی تھیں

اوران کی وجہ سے لکھوکھا انسان پرورش پاتے تھے۔ زمین دار کے کارندے اور سپاہی اور ضلع دار اپنا گزارہ پاتے تھے اور بیوی بچوں کو پالتے تھے۔ اب زمین داریوں کو ختم کرنے کا منصوبہ مکمل کر لیا گیا۔ ان زمین داریوں کے خاتمہ پر زیادہ تر مسلمان بھیک مانگنے کے درجہ کو پہنچ جائیں گے۔ ان کے پاس روزی کمانے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور نہ ان کو کوئی موقع دیا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ ہم کسی کو روزی کمانے سے نہیں روکتے ہیں، جس کا دل چاہے وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی مدد سے اپنی روزی کمائے لیکن روزی کمانے کے کل ذرائع کے اوپر گورنمنٹ قابض ہے۔ مسلمانوں کو بالکل موقع نہیں ملتا۔ پھر مسلمان کیسے اپنی قوت بازو سے روزی پیدا کر سکتے ہیں۔

یو۔ پی۔ میں موٹر ڈرائیوری کا کام زیادہ تر مسلمان ہی کرتے تھے۔ لاریاں اس نواح میں بہت چلا کرتی تھیں۔ علی گڑھ اور آگرہ کے درمیان، علی گڑھ اور ایٹہ کے درمیان، بلند شہر اور علی گڑھ کے درمیان۔ علی گڑھ اور انوپ شہر کے درمیان لاریاں بہت چلتی تھیں۔ اور بہت بڑی تعداد کے مالک مسلمان ہوتے تھے اور اکثر ہندوؤں کی موٹروں کے ڈرائیور بھی مسلمان ہوتے تھے۔ لیکن اب لاریوں کا چلانا گورنمنٹ کے رحم وکرم پر منی ہوگیا ہے۔ اگر کسی کو لائسنس مل گیا تو اس نے لاری چلائی ورنہ اپنی لاری لیے بے کار بیٹھا ہوا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اور فسادات کے بعد اب مسلمانوں کو لاریاں چلانے کا لائسنس بہت کم دیا جاتا ہے۔ اگر پہلے پچاس لاریوں میں پچیس تیس کا لائسنس دیا جاتا تھا تو اب دو چار کے سوا اور کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے ارادہ کر لیا ہے کہ یہ مسلمان جو ہماری حکومت میں رہ گئے ہیں ان کو پیٹ کی مار دینی چاہیے تا کہ یا تو وہ بھاگ جائیں یا مر جائیں۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت اس وقت اس قدر ابتر ہوگئی ہے کہ الفاظ میں ان شدید تکالیف کا بیان ہونا دشوار ہے جو مسلمانوں پر عائد ہو رہی ہیں۔

ہندوستان میں آنے کے بعد مسلمانوں نے اقتصادی میدان میں کوئی بہت نمایاں حصہ نہیں لیا۔ بادشاہی زمانے میں وہ خوش حال ضرور رہے لیکن ان کی خوش حالی کا دارومدار زیادہ تر گورنمنٹ کی ملازمت یا صنعت وحرفت پر تھا اور ہندو سود پر مسلمانوں کو روپے دیتے تھے اور ملکی تجارت کی بڑی بڑی شاخوں میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا۔ مثلاً کپڑے کی تجارت اور غلہ وگھی کی تجارت۔ شکر اور تلواس کی تجارت، سونے اور چاندی کی تجارت اور دوسری کارآمد دھاتوں کی

تجارت جیسے تانبہ، لوہا وغیرہ میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ تھا۔ لیکن ہنڈی پرچہ کا کاروبار یہ سب ہندوستان کے بنیوں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمانوں کو اپنی ملازمت کی کمائی سے یا صنعت وحرفت کی وجہ سے جو روپیہ ملتا تھا اس میں سے بہت سا حصہ سودخوار بنیوں کے پیٹ میں جاتا تھا اور خود ان کے پاس سرمایہ جمع نہیں رہتا تھا۔ مسلمان ہندوستان میں کبھی ہندوؤں کے برابر سرمایہ دار نہیں رہے۔ سرمایہ داری قریب قریب سب ہندو بنیوں کے ہاتھ میں رہی۔ حتیٰ کہ مسلمان جاگیردار، زمین دار، عہدیدار سب اُنہی بنیوں کے دست نگر رہے اور انہی سے سودی روپیہ لے کر اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہے۔ تاہم مسلمانوں میں ایک بہت معقول تعداد پیشہ ور تھی اور صنعت وحرفت سے وہ روپیہ کماتے تھے اور خوش حالی سے اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے ہاتھ میں باہر کے ملکوں سے مال کی درآمد برآمد کا بھی کام رہتا تھا اور ان کے پاس تجارتی جہاز بھی ہندوستان اور عربستان، ایران اور مصر سے تجارتی مال لانے اور لے جانے کا کام کیا کرتے تھے۔ اس کام میں گجرات کاٹھیاواڑ اور کچھ کے مسلمان سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی اقتصادی ابتری کا کبھی کوئی سوال نہ اٹھا کیونکہ تجارت پیشہ اور مزدور پیشہ اور ملازمت پیشہ لوگ عام طور پر خوش حال تھے۔ گو وہ سرمایہ دار نہیں تھے لیکن سرمایہ داری کی ان کو ضرورت بھی نہیں تھی۔ اگر حالات وہی رہتے جو مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں تھے تو مسلمان سرمایہ دار نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی ضرورت کے مطابق ان کی آمدنی کافی تھی، گو ان کے پڑوس میں بنیوں کی قوم روپیہ جمع کر کر کے لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئی تھی اور جب زیادہ روپے کی کسی مسلمان کو ضرورت ہوتی تھی تو وہ ان ہی بنیوں سے سود پر روپیہ قرض لیتا تھا۔

لیکن اسلامی سلطنت کے انحطاط اور یورپ کی تجارت پیشہ قوموں کی آمد نے حالات بالکل بدل دیے۔ اب مسلمانوں کی بحری تجارت پرتگالیوں اور فرانسیسیوں اور انگریزوں نے بالکل ختم کر دی۔ وہ اپنی بڑی بڑی توپیں بڑے بڑے جہازوں پر اپنے ساتھ لائے اور مسلمانوں کے بادبانی جہازوں کو انھوں نے لڑلڑ کے بالکل ختم کر دیا اور باہر کے ملکوں سے مال لانے اور لے جانے کا کل کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ صورت ہو گئی کہ جو مال یورپ کی قومیں باہر

سے لاتی تھیں وہ لا کر تھوک فروشی میں یہاں تجاروں کے ہاتھ فروخت کر دیتی تھیں اور یہیں کے تجار خوردہ فروشی کے ذریعہ سے اس مال کو فروخت کرتے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے پاس تھوک مال خریدنے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ وہ کلکتہ مدراس اور بمبئی وسورت وغیرہ علاقوں کے لکھ پتی بنیے اس مال کو خریدا اور فروخت کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھ میں خوردہ فروشی کے لیے بھی مال بہت کم آتا تھا کیونکہ اندرونی تجارت میں بھی مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ نہیں رہا اس لیے جو لوگ اندرونی تجارت کی دکانداری کرتے تھے ان ہی کے ہاتھ میں باہر سے آیا ہوا مال پہنچتا تھا وہی فروخت کرتے تھے اور وہی روپیہ کماتے تھے اور یہ کمائی کا سلسلہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک بدستور قائم رہا۔ مسلمانوں کے لیے باہر سے آئے ہوئے مال کی تجارت کی وجہ سے روپیہ پیدا کرنے کا یا جمع کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ان میں لکھ پتی اور کروڑ پتی اشخاص پیدا نہ ہوئے اور سرمایہ بنیوں ہی کے ہاتھ میں رہا اور ان ہی کے ہاتھ میں بڑھتا رہا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر زمانے تک ہندوستان کی کل تجارت کا دارومدار باہر کے آئے ہوئے مال پر تھا۔ کپڑا انگلستان کے بڑے شہر لنکا شائر میں بنتا تھا اور لوہے کا مال کیونٹری وغیرہ شہروں میں تیار ہوتا تھا اور دیگر کل اشیا ضروری انگلستان ہی میں تیار ہوتی تھی اور وہیں کے تجار اپنے جہازوں میں مال بھر بھر کے لاتے تھے اور یہاں آکر بنیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر زمانے میں خود ہندوستان نے بھی مال تیار کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے بمبئی کے پارسیوں نے اپنے مل قائم کیے۔ جمشید جی ٹاٹا ان سب لوگوں میں نامور شخص گزرے ہیں۔ انھوں نے بمبئی میں کپڑے کی ملیں لگائیں اور ہندوستان میں کپڑا بننے لگا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں مغربی طرز کی صنعت وحرفت اور تیاری مال کے خلاف بہت کچھ جدو جہد کیا۔ وہ کسی طرح سے اس کو روا نہیں رکھتے تھے کہ جو مال انگلستان سے آکر ہندوستان میں بکتا ہے اس کے مقابل میں انگلستان کا تیار شدہ مال بھی بکے کیونکہ اگر انگلستان سے آیا ہوا مال ایک روپے میں بکے گا، اس کے مقابل میں ہندوستان کا تیار شدہ مال دس آنہ میں بک سکتا تھا۔ اور اگر ہندوستان میں زیادہ تعداد میں مال تیار ہونے لگتا تو پھر انگلستان سے مال آنا بند ہو جاتا۔ اس کی ترکیب انگریزی گورنمنٹ نے یہ نکالی کہ ہندوستان کے تیار کردہ مال پر پانچ فیصدی بطور چنگی

کے ٹیکس لگا دیے، تا کہ انگلستان سے آئے ہوئے مال کے مقابل میں ہندوستان کا مال سستا نہ بک سکے۔ یہ بہت بڑا ظلم تھا جو انگریزوں نے ہندوستان کے ساتھ کیا اور اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی لیکن باوجود اس ظلم کے بھی ہندوستانیوں نے مال بنانے میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اس میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی گئی۔

آخر کو ہندوستان میں اس قدر مال زیادہ بننے لگا اور باوجود ٹیکس مذکورہ بالا کے بھی انگلستان سے آئے ہوے مال سے سستا بکنے لگا تو عالمگیر جنگ نمبر ایک کے دوران میں انگریز مجبور ہو گئے اور انھوں نے کپڑے کی آمد پر جو ٹیکس لگایا تھا اسے بند کر دیا۔ پارسیوں اور بنیوں اور مارواڑیوں نے کپڑے کی تجارت اور تیل کی وجہ سے بہت دولت کمائی اور وہ اس قدر لکھ پتی اور کروڑ پتی ہو گئے کہ انگلستان کے لکھ پتیوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ اس ذریعہ سے جو جو دولت کمائی گئی اس میں مسلمانوں کا غالباً پانچ فیصدی بھی حصہ نہیں تھا۔ ہندو بنیے اب اتنے متمول ہو گئے کہ انھوں نے سب تجارتیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور مسلمان بہت ہی پس ماندہ اور پست حالت میں دکھائی دینے لگے۔ ممبئی کے مسلمان کسی زمانے میں شکر کا کام بہت کیا کرتے تھے۔ شکر جاوا اور ماریشس (مشرقی افریقہ کا ایک جزیرہ) سے قریب پچاس کروڑ روپے کی قیمت کی سالانہ ہندوستان میں آتی تھی اور وہاں کے تجار شکر لا کے ہندوستان کی شکر سے سستی فروخت کرتے تھے۔ انگریزوں نے اس کی طرف کبھی توجہ نہ کی اور قریب سو سال کے ہندوستان کا روپیہ شکر کی تجارت میں ملک سے باہر جاتا رہا۔ آخر کو بیس پچیس سال کا عرصہ ہوا کہ انگریزوں نے آنکھ کھولی کہ ہندوستان کو یہ جو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے جس سے انگریزوں کا کچھ فائدہ نہیں ہے تو انھوں نے جاوا کی شکر کے اوپر سو فیصدی ٹیکس کا اضافہ کر دیا یعنی پہلے اگر سو روپیہ ٹیکس لیا جاتا تھا تو اس کو دو چند کر دیا۔ جب مالدار بنیوں نے دیکھا کہ روپیہ کمانے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں ہے تو انھوں نے یو۔ پی۔ اور بہار اور دیگر علاقوں میں شکر کے کارخانے لگا دیے اور یورپ و امریکہ سے مشینیں منگا کر شکر تیار کرنی شروع کر دی۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس میں بھی کوئی حصہ نہ لیا۔ میں نے ابتدا ہی میں زمین داروں کو اس کی طرف توجہ دلائی تھی لیکن زمین داروں نے کہا کہ یہ کام تو بنیوں کا ہے ہمارا نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے شکر کے کارخانے جاری نہیں کیے۔ اس خاص وقت سے قبل دو تین

کارخانے یو۔ پی اور بہار میں مسلمانوں کے تھے اس وقت تک وہی رہے اور ہندوجیوں نے تخمینی ایک سو چون کارخانے ملک میں جاری کر دیے۔ ان کارخانوں سے ایک ارب روپیہ سالانہ سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ ایک کارخانہ دار سر گوکل چند نیرنگ بھی تھے۔ انھوں نے تین چار کارخانہ مختلف مقامات پر یو۔ پی میں جاری کیے۔ تین چار سال کام کرنے کے بعد انھوں نے بیان کیا کہ میری لاگت واپس آ گئی ہے اب جو کچھ ہے وہ نفع ہی نفع ہے۔ اگر مسلمان بھی شکر کے کارخانوں میں حصہ لیتے تو آج ان کی حالت اس قدر خستہ اور تباہ نہ ہوتی۔ ملک میں اس صدی کے آغاز سے اس وقت تک سیکڑوں تیل کے کارخانے کھلے ہیں اور سیکڑوں ہی دیگر اشیا کی تیاری کے کارخانے کھلے ہیں لیکن مسلمان اس قدر غافل رہے کہ انھوں نے یورپ اور امریکہ کی تقلید سے اور ہندوؤں کی ریت سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ بے حس پڑے رہے۔ غفلت کا پردہ ان کی آنکھوں پر پڑا رہا اور اس کا نتیجہ آج معلوم ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے پاس زمین داریاں تو ان کی تعداد کی نسبت سے کچھ کم نہیں تھیں۔ یو۔ پی میں ان کی تعداد آبادی میں پندرہ فیصدی کے قریب تھی لیکن زمین داری ان کے پاس اس صدی کے شروع میں بیس فیصد کے قریب تھی۔ کاشت کاری میں وہ مالیوں، جاٹوں اور دیگر کاشت پیشہ ہندوؤں سے بہت ہی پیچھے رہے کیونکہ وہ محنت و مشقت سے ہمیشہ جی چراتے رہے اور کاشت کاری میں سوائے محنت و مشقت کے اور کوئی کشش کی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ اب ہم کو گذشتہ زمانے کی غفلت کے مقابل میں دیکھنا یہ ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے مسلمانوں کو ایک پورا پروگرام اپنی آئندہ اقتصادی زندگی میں جدو جہد کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ زمانۂ حال کی اقتصادی کوشش گذشتہ صدیوں کی نسبت بہت مختلف ہے۔ اب اقتصادیات میں فقط جسمانی محنت ہی نہیں ہے بلکہ دماغی قوتوں کو ہاتھ پاؤں کی محنت میں مدد دینے کے لیے کام میں لانا ہے۔ ہاتھ پاؤں کی محنت تو شاید بہت پس ماندہ قومیں بھی کر لیتی ہوں گی لیکن دماغی قوتوں کی مدد سے ہاتھ پاؤں کی محنت زیادہ سودمند ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک لوہار ہے، لوہے کی بنائی نہائی زمین میں گاڑ کر اس پر چھوٹے یا بڑے ہتھوڑے سے لوہے کو گرم کر کے کوٹتا ہے اور اس سے ہتھیار اور آلات تیار کرتا ہے۔ اگر اس کی اس محنت کا ثمرہ سو میں دو حاصل ہو سکتا ہے تو زمانۂ حال کے جدید طریقوں سے سو

میں پچاس، ساٹھ، ستر تک کام کی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔ فارسی شاعر نے کہا ہے ''ایں سعادت بزور بازو نیست'' یعنی بڑے کام محض ہاتھ پاؤں کی محنت سے نہیں ہوتے بلکہ اس میں دماغ بھی لگانا پڑتا ہے۔

مغربی ممالک میں انگلستان، جرمنی اور امریکہ یہ تین ملک لوہے سے فولاد بنا کر بہ کثرت مشینیں اور جہاز و انجن تیار کرنے کے لیے بہت ممتاز ہیں۔ یہ تینوں مل کر جتنی چیزیں تیار کر سکتے ہیں کل دنیا کی دوسری قومیں مل کر اتنی چیزیں تیار نہیں کر سکتیں اور گو اس وقت جرمنی نہایت مجبوری کی حالت میں ہے۔ انگلینڈ، فرانس روس اور امریکہ نے اس بڑے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے اور وہاں کے لوگوں کو بے دست و پا کر رکھا ہے لیکن وہاں کے باشندے بالکل آمادہ ہیں کہ جس وقت بھی ان کو صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملے گا تو ان کو اپنی حالت کے درست کرنے میں کچھ بہت تاخیر نہ کرنی پڑے گی کیونکہ جرمنی کے لوگ صنعت و حرفت میں بہت زیادہ مشاق ہیں اور اگر ان کو موقع ملے گا تو چند سال میں وہ اپنی حالت کو درست کر لیں گے۔ جرمن کس قدر مستعد لائق اور ہنر مند قوم ہے۔ مسلمانوں کو کسی نے مجبور بے دست و پا نہ کیا اور نہ اب وہ مجبور ہیں البتہ وہ زمانہ حال کی صنعت و حرفت سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کو ہنر مندی کے میدان میں دوسری قوموں کا مقابلہ کرنے کے لیے صنعت و حرفت کا سیکھنا ضروری ہے۔ اس وقت تقسیم ملک کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت میں بہت سخت تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس ملک کے چار کروڑ پچاس لاکھ مسلمانوں کو اپنی حالت کے درست کرنے کا کب موقع ملے گا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بحیثیت قوم کے ہندوستانی ہیں۔ اس ملک کی اقتصادی ترقی میں ان کو حصہ لینا چاہیے اور ہندوؤں و پارسیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے اور اگر وہ بیٹھے دیکھتے رہیں گے کہ ہم کو کسی وقت میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے کام اور ترقی کرنے کے مواقع ملیں گے تب ہم کام کریں گے تو بجائے ترقی کرنے کے وہ تنزلی کریں گے اور پست ہوتے چلے جائیں گے۔ ان کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ فوراً کوشش کر کے جیسے بھی ان سے ہو سکے ہندوؤں کے قائم کیے ہوئے کارخانوں میں بطور مزدوروں کے یا بطور کاریگروں کے شریک ہو جائیں اور کام سیکھیں اور ہندوؤں کو اس بات کا یقین دلا دیں کہ ہم

تمھارے ساتھ مل کر ایمان داری سے کام کرنے کے لیے تیار ہیں ۔ جب ہندوؤں کو یقین ہو جائے گا تو پھر ہندوستان کے مسلمان کسی دوسرے شخص سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ لیکن اس مشورے پر عمل کرنے کے لیے مسلمانوں کو اخلاقی ہمت اور جرأت کی بھی ضرورت ہے۔ جو بچے اس قابل ہوں ان کو ٹیکنیکل صیغوں میں کام کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ صنعت وحرفت کے بہت سے مدارس گورنمنٹ نے قائم کیے ہیں اور ان پر اضافہ کرنے کی تجویز در پیش ہے۔ چند سال میں مسلمان کو ان مدارس میں داخل ہونے کی دقت نہ رہے گی۔ لیکن بچوں کے والدین کو چاہیے کہ وہ ابتدا ہی سے بچوں کے دل میں یہ بات بٹھادیں کہ تم بڑے اور خوش حال انسان بن سکتے ہو لیکن یہ بڑائی اور خوش حالی تمھارے اپنے ہی انجینیئر بن جاؤ گے یا بجلی کے کام کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لو گے یا عمارات اور پل بنانے کی تم میں قابلیت کے جوہر پیدا ہو جائیں گے تو تم کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچانے میں کوئی مانع نہیں ہو سکے گا۔

اگر طالب علم مذکورہ بالا صیغوں میں مہارت حاصل کرنا چاہے اور ابتدا سے ایمان داری سے کام کرنا شروع کرے تو وہ اپنے لیے بھی بہت مفید ثابت ہوگا اور اپنے ہم جنسوں کو بھی بہت فائدہ پہنچا سکے گا۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو تو میرا مشورہ یہی ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کریں اور گورنمنٹ کے قائم کیے ہوئے مدرسوں اور کالجوں سے فائدہ اٹھائیں۔

اب ہم کو اس بات کے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا پاکستان کے مسلمانوں کے رستے میں کوئی چیز حائل ہے جس کی وجہ سے وہ آگے بڑھنے سے رک جائیں اور دنیا کی دوسری قوموں کے برابر ترقی نہ کر سکیں۔ ہم اپنے یقین اور تجربے سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمانوں کے ترقی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ اگر حائل ہے تو ان کی نا قابلیت۔ اگر پاکستان کے مسلمان اپنی جداگانہ اور آزاد حکومت حاصل کرنے کے بعد بھی اسی غفلت اور نا قابلیت اور کاہلی میں مبتلا رہیں جس طرح انگریزوں کے زمانے میں رہے ہیں تو پھر ان کا خدا ہی حافظ ہے۔ پھر وہ دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکیں گے۔ اور نہ آزاد حکومت کے لیے کسی طریقے سے مفید ثابت ہوں گے۔ آخر آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت کے حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں سے لڑائی اور جھگڑے کرنے کی کوئی وجہ ضرور تھی اور وہ وجہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم کو دنیا میں ترقی

کرنے کے لیے آزادی سے آگے بڑھنے کے موقعے ملیں گے۔ اب اگر مسلمان اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں اور ان کی حالت جو اس سے قبل رہی ہے وہ بدستور قائم رہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ مسلمان دنیا میں ان قوموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں جن کو ہم درماندہ اور پسماندہ قومیں کہتے ہیں جیسے کہ افریقہ کے سیاہ فام لوگ اور آسٹریلیا وغیرہ کے نیم وحشی اقوام جو اپنے ملک کی دولت سے فائدہ اٹھانے سے قاصر رہے اور دوسرے ملکوں کے قابل لوگوں نے جا کر انھی کے ملک میں جو دولت زمین کے تلے مدفون تھی اسے نکالا اور متمول قومیں بن گئیں۔

ہمارے ملک میں اسلامی سلطنت کے زمانے میں دولت پیدا کرنے کے وسائل موجود تھے لیکن ان سے کوئی زیادہ نفع دولت کی افزائش کو نہیں پہنچا۔ اسی ہندوستان میں کوئلہ، سونا، سیمنٹ، تیل اور دوسری بہت سی دھاتوں کی کانیں موجود تھیں۔ ہمالیہ پہاڑ سے نکل کر دریا ہزار ہا سال سے ہماری زمین سے نکلتے ہوئے اور بہتے ہوئے سمندر میں پہنچ جاتے تھے اور ملک اکثر قحط سالی کی آفات میں مبتلا رہتا تھا۔ اور ان بہتے ہوئے دریاؤں سے نہریں کھود کر ہم آب پاشی کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ انگریز ہندوستان میں آئے، انھوں نے کل دریاؤں سے نہریں نکالیں اور غیر آباد علاقے آباد کیے اور زراعت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ جس کھیت میں نہروں سے آب پاشی کا انتظام ہونے سے قبل ایک من غلہ مشکل سے پیدا ہوتا تھا۔ اس میں اب نہروں کے بعد دس من غلے سے کم پیدا نہیں ہوتا یعنی زراعت میں دہ چند ترقی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں کوئلہ موجود تھا لیکن اس کو کھود کر نکالا نہیں جاتا تھا۔ جب سے کوئلہ جھریا وغیرہ کی کانوں سے نکالنا شروع ہوا ہے اس زمانے سے ایک بڑا انقلاب ہر صنعت و حرفت کے کام میں اور کارخانوں کی ترقی میں پیدا ہو گیا ہے۔ اب تک اندازہ کیا جاتا ہے کہ قریب دس ارب کی قیمت کا کوئلہ موجود ہے۔ اسی طور پر اور بہت سی دھاتوں کی کانیں کھود کر قیمتی اشیاء زمین سے نکالی گئی ہیں۔ زمین سے صرف غلہ ہی افراط سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ انواع و اقسام کی دوسری چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں جن سے ملک میں دولت مندی بھی بڑھتی ہے اور محنت مزدوری کرنے والے بھی خوش حال ہوتے ہیں۔

پس مسلمانوں کا یہ کہنا کہ ہم غریب ہیں اور ہمارے پاس روپیہ نہیں کہ ہم کارخانہ جاری

کریں، ایک نہایت ہی ذلیل اور نا قابل یقین بیان ہے جس کے لیے ہم اپنی حالت پر جس قدر افسوس کریں کم ہے۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے ہندو بڑی سرعت کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سے دریاؤں سے جدید نہریں نکالنے کی تجویزیں در پیش ہیں اور جب یہ نہریں نکل جائیں گی تو ملک قحط سالیوں کے اندیشہ سے بچ جائے گا اور دولت مندی کا دریا موجیں مارنے لگے گا۔

ہندوستان کے علاقے میں بہت سی جدید معدنیات دریافت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور جب یہ ہاتھ آ جائیں گی تو یہ ملک دنیا کے کسی دوسرے ملک سے دولت مندی میں پیچھے نہیں رہے گا۔ ہندوستان کی ہندو قوم تعداد میں مسلمانوں سے اب کوئی آٹھ گنا زیادہ ہے مسلمانوں کی تھوڑی سی تعداد ان کو کسی کام کی ترقی سے روک نہیں سکتی لیکن اگر کوئی چیز ان کو روک سکتی ہے تو یہ ان کی نا قابلیت ہوگی۔ لیکن وہ خوب بیدار ہو گئے ہیں اور قوم کے مرد و عورت نوجوانوں کو مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اور ترقی کے میدان میں قدم آگے بڑھانے کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اس علاقے میں دولت مندی میں جو ترقی ہوگی اس میں مسلمانوں کا بھی حصہ رہے گا بشرطیکہ وہ بھی ہندو ہم وطنوں کی طرح مستعدی سے آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

مسلمانوں میں ایک بری بات یہ دیکھی گئی ہے کہ وہ دن رات بیٹھے جھینکتے رہتے ہیں کہ ہندو ہم کو کوئی کام نہیں کرنے کا موقع دیتے۔ مجھے مسلمانوں سے اس معاملہ میں ہمدردی ہے کیونکہ انگریزوں کے زمانے میں ہندوؤں نے جو بری عادتیں خود غرضی کی سیکھ لی ہیں ان سے وہ مسلمانوں کو مضرت پہنچا رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم پیدا کریں وہی ہندوستان کی دولت ہے اور مسلمان جو کچھ پیدا کریں گے وہ ہندوستان کی دولت نہیں ہے بلکہ ایک غیر قوم کی دولت ہے۔

یہ خیال نہایت ہی قابل نفرت خیال ہے اور مسلمانوں کو اس میں دشواریوں کا سامنا ہے۔ ہندو ملازمت کے صیغے میں مسلمان عہدے داروں کو کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کے اوپر اور ان کے نیچے جتنے اہل کار ہوتے ہیں وہ سب ان کو اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں مانع آتے ہیں۔ چھوٹے اہل کار اپنے مسلمان افسروں کی برائی دن رات کرتے رہتے ہیں اور جو اعلیٰ افسر ہوتا ہے اس کے کانوں تک بھی اپنے مسلمان افسر کی شکایت پہنچاتے رہتے ہیں۔ جب

متواتر متعدد ذریعوں سے ہندو اعلیٰ افسر کے کانوں تک مسلمان افسر کی شکایتیں پہنچ جاتی ہیں تو پھر اس ناکردہ گناہ مسلمان افسر کی ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

زیادہ تر اسی خیال میں مسلمان افسران پولیس و فوج اور مال و صیغہ ہائے عدالت وغیرہ مجبور ہو گئے کہ وہ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کی نوکریوں سے علاحدگی اختیار کریں اور پاکستان میں جا کر اپنی ملازمت کے لیے امیدواری کریں یا جانے سے قبل کسی دوسرے ذریعے سے اپنے لیے پہلے ہی کسی جگہ کا انتظام کر لیں تب یہاں کی نوکری چھوڑ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 100 میں 90 مسلمان افسر نوکریاں چھوڑ کر یہاں سے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد صوبائی اور مرکزی حکومت میں مسلمانوں کو بہت کم بڑے عہدے ملے۔ چنانچہ اس دو سال کے عرصے میں کم و بیش ایک ہزار آدمی بڑے عہدوں کے لیے منتخب کیے گئے۔ جن میں اندازہ کیا گیا ہے کہ دو فیصدی بھی مسلمان نہیں لیے گئے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی نشانی یہی ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔ مقابلے کے امتحانوں میں جو پاس ہو اس کو لیا جاوے۔ مقابلے کے امتحانوں کی یہ حالت ہے کہ وہاں مسلمان امیدواروں کو موقع نہیں ملتا کہ وہ اپنی کامیابی دکھا سکیں۔ چند صیغوں کے ناکامیاب امیدواروں نے بیان کیا کہ مختلف وجوہات سے ہم کو کامیابی سے روک دیا گیا۔ ایک کا بیان تھا کہ جب اشتہار جاری ہوا کہ فلاں ملازمت کے لیے مقابلے کا امتحان ہوگا، جو اس امتحان میں شریک ہونا چاہے درخواست دے۔ درخواستیں دفتر میں پہنچ گئیں جن میں پندرہ بیس فی صدی کے قریب مسلمان بھی تھے اور میں بھی انھیں درخواست دینے والوں میں تھا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ میرے پاس تاریخ کی اطلاع آئے تو میں بھی پہنچ جاؤں لیکن میرے پاس اطلاع نہیں پہنچی۔ جب امتحان ہو گیا اور مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ میرا نام بھی امتحان کے لیے منتخب کیا گیا تھا تو میں نے دفتر سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ جب امتحان دینے والوں کے زمرے میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا تو پھر میرے پاس اطلاع کیوں نہیں پہنچی؟ معلوم ہوا کہ دفتر میں اطلاع کی کارروائی مکمل کر دی گئی تھی یعنی رجسٹر میں یہ لکھا گیا تھا کہ فلاں فلاں شخصوں کو خطوط بھیجے گئے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی خط نہیں پہنچا اور اس طور پر کسی دوسرے مسلمان امیدوار کے پاس بھی کوئی خط نہیں پہنچا۔ تو جواب ملا کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے ہم نے تو خط بھیج دیا۔ جس سے صاف یہ نتیجہ

نکلا کہ دفاتر میں سپرنٹنڈنٹ اور کلرکوں نے آپس میں یہ بات طے کر لی ہے کہ دفتر کی کارروائی تو مکمل رکھی جائے لیکن کسی مسلمان امیدوار کے پاس خط نہیں پہنچنا چاہیے۔

ریلوے کے سفر میں یہ معلوم ہوا کہ یو۔پی گورنمنٹ نے ارادہ کرلیا ہے کہ مسلمانوں کو پولیس میں بھرتی نہ کیا جاوے۔ یہ اطلاع مجھ کو خود ایک بڑے پولیس افسر کی زبانی ملی جو ریلوے کے کمپارٹمنٹ میں میرے ساتھ سفر کر رہا تھا اس کمپارٹمنٹ میں ایک پنشن یافتہ سول سرجن بھی تھے۔ سول سرجن نے پولیس آفیسر سے پوچھا کہ تمھارا محکمہ مسلمانوں سے کب خالی ہو جائے گا؟ اس نے کہا کہ مسلمان اب ملازمت میں تو بھرتی نہیں کیے جائیں گے لیکن پرانے لوگوں سے دس سال میں قطعی نجات مل جائے گی۔ سول سرجن نے پوچھا کہ تمھارے محکمے میں کتنے مسلمان تھے؟ پولیس کے افسر نے جواب دیا کہ کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل قریب پچاسی فی صدی تھے اور سب انسپکٹر کم وبیش ستر فی صدی تھے اور انسپکٹر پچاس اور پینتالیس فی صدی کے درمیان تھے اور سپرنٹنڈنٹ ہندوؤں کے برابر تھے۔ اب رفتہ رفتہ وہ ملازمت سے علاحدہ ہوتے جارہے ہیں یا موت ان کو گھسیٹے لیے جاتی ہے، ان کی جگہیں خالی ہو رہی ہیں۔ سول سرجن نے پوچھا کہ ڈپٹی کلکٹر کتنے تھے اور کتنے رہ گئے ہیں؟ اور آئندہ بھرتی ہو رہے ہیں یا نہیں؟ پولیس کے افسر نے جواب دیا کہ اس کے متعلق مجھے اعداد وشمار تو معلوم نہیں ہیں، لیکن یہ بات معلوم ہے کہ اب ڈپٹی کلکٹری کے امتحان کے لیے مسلمان پاس نہیں ہوتے لیکن جو پاس بھی ہو جاتے ہیں وہ ڈاکٹری معائنہ میں نکال دیے جاتے ہیں اور اگر کسی نہ کسی طرح دو چار فیصدی ملازمت میں لے لیے جاتے ہیں تو ان کو بھی ملازمت کرنے کا زیادہ دنوں تک موقع نہیں دیا جاتا۔ یہ گفتگو الہ آباد اور کانپور کے درمیان کی مسافت میں میرے سامنے ہوئی۔ مجھے سن کر سخت رنج ہوا کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے اس قدر دلدادہ ہیں ان کا اہل ملک کے کمزور عناصر کے ساتھ یہ سلوک ہے!

ریلوے کے کمپارٹمنٹ میں جو گفتگو میں نے سنی وہ محض اتفاقی واقعہ تھا۔ پینشن یافتہ سول سرجن اور پولیس افسر نے یہ جانا ہوگا کہ یہ شخص بھی ہندو یا عیسائی ہے اس لیے وہ بلا کسی روک ٹوک یا حجاب کے اپنی دلی باتیں ایک دوسرے سے بیان کرتے گئے۔ ان واقعات کے علاوہ سیکڑوں اور واقعات سننے میں آتے ہیں کہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمت میں نہ لیا جاتا ہے اور نہ کام

کرنے دیا جاتا ہے۔ مجبور کیا جاتا ہے کہ ملازمت چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

مسلمان اپنی ایک نہایت سخت غلطی کا اب خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ جماعت کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ملازمت ہی ایک ذریعہ روزی ہے۔ ان کے دماغ میں یہ کبھی نہیں آیا کہ روزی کمانے کے سیکڑوں رستے کھلے ہوئے ہیں۔ اور دنیا میں سو میں پچانوے آدمی ان دوسرے ذرائع سے روزی کماتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان ذرائع میں بڑے بڑے ذریعے یہ ہیں۔

کاشت کاری، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ وغیرہ۔ تجارت کی سیکڑوں اقسام ہیں۔ جانور پالنا اور ان کو بیچ کر منافع اٹھانا۔ یہ منجملہ بڑے بڑے ذرائع کے ایک ذریعہ ہے۔ جانوروں کا دودھ بیچنا اور مکھن نکال کر گھی بنانا اور باہر کے ملکوں کو بھیجنا۔ جنگل کھڑے مول لینا اور لکڑی کاٹ کر ہندوستان کے شہروں میں فروخت کے لیے بھیجنا، یہ بہت ہی بڑا ذریعہ ہے لیکن مسلمان اب تک ان تمام ذرائع کو ذلیل پیشہ سمجھتے رہے۔ بڑی ملازمت میں انسان کو ایک حیثیت مل جاتی ہے اور حکومت کے اثر سے ہر ملازم اپنے کو حاکم ہی سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن ملازمت کا میدان بہت تنگ ہے۔ اس میں آبادی کے پانچ فیصدی آدمیوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں ہر قسم کی ملازمت خواہ فوجی ملازمت ہو یا پولیس کی یا دیوانی کی اور فوجداری کی اور خواہ افسری اور کلرکی وغیرہ کی، یہ سب ملازمتیں شامل ہیں لیکن عادت لوگوں میں کچھ ایسی پڑی ہوئی ہے کہ وہ بڑی ملازمت ہی کو اپنی زندگی کا انتہائی مقصد قرار دیے ہوئے ہیں اور اگر ملازمت نہیں ملتی ہے تو کوئی دوسرا کام ان کو نہیں ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو اچھی طرح اس کو کر نہیں سکتے۔ بچوں کا اس میں کچھ زیادہ قصور نہیں ہے۔ اگر قصور ہے تو ماں باپ یا سوسائٹی کا ہے۔

درمیانی طبقے کے مسلمان تو اپنے بچوں کو تعلیم بھی نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ جو قسمت میں ہوگا وہ مل جائے گا۔ فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا چند روپے جوان کو ہر مہینے فیس کے دینے پڑتے ہیں وہ ان کو سخت ناگوار گزرتے ہیں۔ لیکن خیال سب کا یہی ہوتا ہے کہ کسی طرح سے کوئی بڑی ملازمت مل جائے تو ہم اپنے بیٹے کو اس میں لگا دیں۔ پرائمری کی شُد بُد کو وہ کافی سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔ خود اپنی اور اپنے باپ دادا کی مثال دیتے ہیں۔ کہ ہم لوگوں نے کہاں بی۔ اے۔، ایم۔ اے پاس کیا تھا صرف اردو ہی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ خدا کی

مہربانی سے اچھی ملازمت ملی اور خوش حالی سے زندگی بسر ہوئی۔ اگر خدا چاہے گا تو ہمارے بیٹوں کو بھی کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ اگر کوئی ان سے کہے کہ اپنے بیٹے کو لوہار یا بڑھئی کا کام سکھاؤ یا معماری کا کام سکھاؤ اور کوئی صنعت و حرفت سکھاؤ تو سخت ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ہمارے بیٹے لوہار بڑھئی یا جولاہے بن جائیں گے اور باپ دادا کا نام ڈبوئیں گے۔ نصیحت کرنے والے کو الٹا ملزم قرار دیتے ہیں کہ تم لوگ تو انگریزی پڑھ کے خدا کو بھی بھول گئے اور یہ نہیں سمجھتے کہ خدا میں بڑی قدرت ہے اگر وہ چاہے تو بلا انگریزی پڑھے ہوئے کسی کو اپنے فضل سے مالا مال کردے۔

اب اس وقت جبکہ مسلمانوں پر ملازمت کا دروازہ بالکل تنگ ہو گیا ہے اور بند ہونے والا ہے، یہ امید ہوسکتی تھی کہ ان کی آنکھیں کھلیں گی، اور وہ اپنے بچوں کو روزی کمانے کا کوئی اچھا طریقہ بتانے اور سکھانے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ لیکن بری عادت آسانی سے نہیں چھوٹا کرتی۔ اب تک مسلمانوں کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ''وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔'' مسلمان جب تک اپنا خیال اور مقصد زندگی بالکل تبدیل نہیں کریں گے ان کی حالت کبھی نہیں سدھرنے کی۔ مسلمان کسی زمانے میں بہت بڑے صناع تھے۔ ان کی وہ صناعی ان کی غلط روی اور غلط بینی کی نذر ہوئی۔ اب ان کو از سر نو اپنی اقتصادی زندگی کی بنیاد ڈالنی پڑے گی۔ اور غلط روی کے جملہ طریقے یک قلم اپنی زندگی سے الگ کرنے پڑیں گے ورنہ بھیک کا ٹھیکرہ ان کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور ہندو ہم وطنوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے جو ان کو گھڑکیاں اور طعنے دے دے کر اپنے پاس سے دور بھگانے کی کوشش کریں گے اور بھک منگے گڑگڑا کر ان کے سامنے ہاتھ پھیلایا کریں گے۔ ایک قصہ مجھ کو یاد ہے کہ ایک بہت مشٹنڈ مسلمان فقیر بنیے کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ لالہ جی میں کل سے بھوکا ہوں کچھ دو۔ لالہ جی نے جواب دیا کہ اگر عمر بھر بھی بھوکے رہو گے تو میں کچھ نہیں دینے کا۔ ایک وقت تھا کہ زبردستی ہندوؤں کی دولت چھینا کرتے تھے۔ اب جب اس قابل نہیں رہے تو ہاتھ پھیلانے لگے۔ میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ تم لوگوں کو دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے۔ وہ لالہ مجھ سے واقف نہیں تھے۔ میں ہندو دوستوں کے ساتھ ایک کام کی وجہ سے ان کے مکان پر پہنچا تھا جہاں پر فقیر صاحب کو ہاتھ پھیلاتے ہوئے اور لالہ جی کو اسے گھڑکیاں دیتے ہوئے سنا۔

مسلمانوں میں گداگری کا پیشہ

مسلمانوں کے گداگری کے متعلق کہیں کہیں ضمناً ذکر آچکا ہے لیکن اس مسئلے پر ذرا زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی قوم میں کئی صدیوں سے بھیک مانگنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے وجوہات متعدد ہیں لیکن بڑی وجہ جس سے کاہل الوجود مسلمانوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا وہ قرآن پاک کی مقدس تعلیم کی غلط تعبیر تھی جس میں خیرات کے متعلق بہت تاکید کی گئی تھی اور اس پر بار بار زور دیا گیا تھا۔ سب سے اول تو اسلام نے زکوٰۃ کا دینا لازمی قرار دے دیا تھا۔ اور زکوٰۃ ان بڑے پانچ ارکان اسلام میں سے ہے جن کے انکار کرنے سے کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا اور نہ دوسرے لوگ اس کو مسلمان سمجھ سکتے ہیں۔ وہ ارکان حسب ذیل ہیں:۔

(1) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں اعتقاد یعنی دل سے اس کا یقین اور زبان سے اس کا اعلان

(2) نماز (3) روزہ (4) حج (5) زکوٰۃ۔

اسلامی سلطنت کے زمانے میں کہیں کہیں تو زکوٰۃ بطور لازمی ٹیکس کے وصول کی جاتی تھی اور بیت المال میں جمع ہوتی تھی اور غربا کو تقسیم ہوتی تھی۔ غرباء کو زکوٰۃ سے مدد ملے اور کن کو نہ ملے۔ زکوٰۃ کے علاوہ خیرات اور صدقات کا دینا نہایت ضروری سمجھا گیا تھا اور ان میں نادار یا محتاجوں کی تفصیل بیان کی گئی تھی کہ کن کو خیرات دینی ضروری ہے اور قرآن پاک کا بہت بڑا حصہ اس تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ اور جن لوگوں کو خیرات دینا ضروری بتایا گیا تھا ان میں ذوی القربا سب سے اول رکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد یتیم آتے ہیں اور پھر مساکین کا درجہ ہے اور پھر راہ گیر مسافر اور سائل مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ اب ان کل جماعتوں میں ظاہری امتیاز کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ذوی القربا تو ہم آسانی سے پہچان سکتے ہیں کہ یہ ہمارا رشتہ دار ہے۔ یتیموں کو بھی ہم جان سکتے ہیں کہ ان کے ماں باپ مر گئے ہیں اور یہ محتاج ہیں۔ ان دو جماعتوں میں دھوکے یا مغالطہ سے کسی سے روپیہ وصول کرنے کا احتمال بہت کم ہے۔ گو اس زمانے میں لوگوں نے بچوں کو پکڑ کر (جن کے ماں باپ حیات ہوتے ہیں) ان کو یتیم قرار دے کر مسلمانوں سے روپیہ وصول کرنا شروع کر دیا ہے جس کا مجھ کو ذاتی تجربہ ہے۔

حمایت الاسلام لاہور نے ایک یتیم خانہ قائم کیا تھا اور اس کا چندہ کل ہندوستان سے

وصول کیا جاتا تھا۔ میں نے خود بھی اس کے لیے چندہ دیا اور اکثر دوستوں سے چندہ وصول کر کے بھی بھیجا۔ جب اس کے چندے زیادہ افراط سے ہونے لگے تو بدمعاشوں نے یہ دیکھ کر کہ مسلمانوں کا ان یتیم خانوں کی طرف ایک رجحان ہو گیا ہے، اب کوئی ترکیب ایسی کرنی چاہیے کہ کچھ لڑکوں کو ساتھ لے کر ملک میں دورے کرنے چاہییں اور اپنے لڑکوں کو یتیم قرار دے کر مسلمانوں سے روپیہ وصول کرنا چاہیے۔ اس دھوکہ بازی کا آغاز بھی جہاں تک مجھے خیال ہے لاہور ہی سے ہوا۔ اس بات کو کوئی عرصہ چالیس سال کا ہوا۔ مجھے اس میں شبہ ہوا کہ یہ لوگ جو بچوں کو ساتھ لیے پھرتے ہیں، اس میں دھوکہ بازی کی بو آتی ہے، میں نے حمایت الاسلام لاہور کے سکریٹری کو لکھا کہ بہت سے لوگ چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لے کر دورے کر رہے ہیں اور ان کو یتیم قرار دے کر روپیہ وصول کر رہے ہیں اور آپ ہی کے یتیم خانے کا نام لیتے ہیں کہ یہ بچے یتیم خانہ حمایت الاسلام لاہور کے ہیں، اس کی میں آپ سے تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں جو بچوں کو اس طور پر ساتھ لیے پھرتے ہیں۔

لاہور سے اس کا جواب آیا کہ لوگوں نے یہ آج کل پیشہ اختیار کر لیا ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بچوں کو جمع کر کے دوسرے علاقوں میں لے جاتے ہیں اور ان کو یتیم قرار دے کر لوگوں سے چندے وصول کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے ایجنٹوں اور سب دوستوں کو لکھ دیا ہے کہ جب تک کسی کے پاس ہماری مہری دستخطی سند نہ ہو اس کو حمایت الاسلام کے یتیم خانے کا آدمی نہ سمجھا جاوے۔ اس کے بعد گو میں نے تو اس کی احتیاط کرنی شروع کی کہ اگر کوئی شخص بچوں کو لے کر آتا تھا تو میں ان سے سند طلب کرتا تھا۔ لیکن سب مسلمانوں کے پاس تو کوئی اطلاع نہیں تھی کہ بعض لوگ حمایت الاسلام کے یتیموں کو لے کر نہیں آتے بلکہ اپنے بچوں کو فرضی طور پر یتیم ظاہر کر کے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ اس لیے اس دھوکے بازی کا سلسلہ بدستور جاری رہا اور بدمعاش لوگ حمایت الاسلام کے یتیم خانے کے نام سے روپیہ وصول کرتے رہے۔

مجھے اس بارے میں ایک واقعے کی وجہ سے پوری تصدیق ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ جو لوگ بچوں کو ساتھ لے کر یوں بھیک مانگتے پھرتے ہیں وہ سراسر دھوکہ بازی سے کام لے رہے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے عزیزوں کے بچوں کو ہمراہ لے کر ملک میں پھرتے ہیں اور روپیہ وصول کرتے ہیں اور بعض لوگ جو بچوں کے والد بھی بچوں کو یتیم ظاہر کر کے روپیہ وصول کرتے ہیں، بہت چھوٹی عمر

کے بچوں کو گھروں میں پردہ نشین بی بیوں کے پاس سبق پڑھا کر بھیجتے تھے کہ جا کر جس بی بی کو دیکھو
کہ یہ گھر کی مالکہ ہے اس کو چمٹ جاؤ اور روپیہ مانگو کہ ہم یتیم ہیں اور لاوارث ہیں۔

ایک مرتبہ میں لوٹ کر کچہری سے اپنے گھر آیا تو اپنے احاطے کے پھاٹک پر جو
شاہراہ کے اوپر کھلتا تھا، ایک آدمی کو کھڑا دیکھا۔ میں جب گھر میں آیا تو ایک عجیب تماشہ دیکھا کہ
ایک سات آٹھ سال کا بچہ عبداللہ بیگم مرحومہ کی گود میں جا کر بیٹھ گیا تھا اور ان سے چمٹ گیا تھا اور
باقی بچے ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، عبداللہ بیگم نے مجھ سے کہا کہ دیکھو بچے مجھ
کو دق کر رہے ہیں۔ نہ معلوم کون ہیں؟ کہتے ہیں کہ ہم یتیم ہیں، ہمیں روپیہ دو۔ میں نے ان
بچوں کو عبداللہ بیگم کے پاس سے ہٹا دیا اور چھوٹے بچے کو جوان کی گود میں بیٹھ گیا تھا ہاتھ سے
پکڑ کر اٹھایا اور اس سے پوچھا کہ وہ آدمی جو باہر پھاٹک پر کھڑا ہے وہ تمھارا باپ ہے؟ باپ کا لفظ
میں نے اس لیے استعمال کیا کہ اس بچے اور اس آدمی دونوں کی شکل کچھ ملتی تھی۔ بچے نے جواب
دیا ہاں وہ میرا باپ ہے۔ میں نے اس بچے سے پوچھا کہ تم کو کس نے بتایا کہ تم یتیم ہو۔ تو بچے
نے کہا کہ ابا ہی نے بتایا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا کہ
لاہور کے ضلع میں رہتے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ یہ جو دوسرے بچے ہیں تمھارے کیا لگتے ہیں؟
اس بچے نے ایک ایک سے اپنی رشتہ داری بتائی۔ کسی کو اپنے چچا کا بیٹا اور کسی کو پھوپی کا بیٹا اور
کسی کو خالہ کا بیٹا بتایا۔

میں ان بچوں کو لے کر اس آدمی کے پاس پہنچا۔ وہ بھی سمجھ گیا کہ کسی بچے نے بھانڈا پھوڑ
دیا۔ اور ان بچوں کے یتیم ہونے کا واقعہ کی قلعی کھل گئی تو اس نے فوراً ہی کہنا شروع کر دیا کہ صاحب
نیت کا پھل ملتا ہے خواہ یہ یتیم ہوں یا نہ ہوں لیکن آپ تو ان کو یتیم سمجھ کر ان کی پرورش کریں گے تو خدا
آپ کو اس کا نیک اجر دے گا۔ میں نے کہا کہ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ تم کو پولیس کے سپرد کردوں۔ تم
یہاں سے فوراً چلے جاؤ میں تمھارا منہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ نالائق آدمی بچوں کو جو اس کی زندگی ہی میں
یتیم قرار دیے گئے تھے ساتھ لے کر چلا گیا اور پھر کبھی میرے دروازے پر نہیں آیا۔

یتیمی کے متعلق یہ خاص واقعہ اس لیے بیان کیا کہ نالائق بدافعال لوگوں نے اللہ تعالیٰ
کے حکم سے کس قدر ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا ہے۔ اب یتیموں کے علاوہ جو دوسری جماعتیں ہیں

ان میں کوئی تخصیص کر ہی نہیں سکتا کہ کون مسکین ہے اور کون راہ گیر ہے اور کون سائل ہے؟ اس گروہ میں تو کل دنیا آجاتی ہے۔ ہر شخص اپنے کو سائل بھی کہہ سکتا ہے اور راہ گیر بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن ان تمام جماعتوں کے علاوہ ہندوستان میں اور تمام اسلامی ممالک میں ایک اور جماعت بھی پیدا ہوگئی ہے جو اپنے لیے تو بھیک نہیں مانگتے لیکن مساجد کی تعمیر کے لیے یا کوئی کنواں بنوانے کے لیے یا مسافر خانہ بنوانے کے لیے آئے دن بھیک مانگنے کو آجاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو نہ مسکین کہتے ہیں نہ راہ گیر کہتے ہیں بلکہ مساجد، مسافر خانوں، کنواں کے بانی ظاہر کرتے ہیں۔

ایک جماعت خانقاہوں کے مجاوروں اور فقرا کی بھی ہے جو در بدر بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ یہ لوگ دھوکے باز سائلین یا مساکین میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دھوکے باز آدمی مساکین ہوں یا سائل ہوں یا راہ گیر ہوں، ان کو خیرات دینا قرآن پاک کے حکم کی تعمیل ہوسکتی ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کا ہرگز یہ منشا نہیں ہوسکتا تھا کہ دھوکے باز، جھوٹے آدمی بھی خیرات کے مستحق ہوں۔ دھوکے باز اور جھوٹوں پر خدا نے لعنت کا طوق پہلے ہی سے قائم کر رکھا ہے۔ علاوہ ہندوستانی جھوٹے دھوکے باز بھک منگوں کے، باہر کے اسلامی ممالک سے بھی بہت لوگ بھیک مانگنے کے لیے ہندوستان آجاتے ہیں، بعض لوگ اپنے کو عرب ظاہر کرتے ہیں کہ ہم عرب سے آئے ہیں اور عربی میں، ہی ہندوستانیوں سے باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب یہ شناخت نہیں ہوسکتی کہ کون عرب ہے کون ہندوستانی ہے۔؟ ہر شخص جو ایک چوغا اوپر ڈال لیتا ہے اور ایک خاص قسم کی پگڑی باندھ لیتا ہے وہ دیکھنے سے ظاہرہ عرب معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ جب عربی میں بات چیت کرنا شروع کر دیتا ہے تو واقعی یہ یقین ہوجاتا ہے کہ یہ عرب ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً دوسرے شہروں اور دوسرے صوبوں کے مسلمانوں سے ملاقات کا موقع ملتا رہتا ہے اور ان سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض مقامات پر ہندوستانی لڑکوں یا نوجوانوں کو عرب بنایا جاتا ہے اور وہاں با قاعدہ لڑکوں کو درس دیا جاتا ہے۔ اور نہایت غلط اور ٹوٹی پھوٹی عربی ان کو سکھائی جاتی ہے اور ہر طریقے سے عربی لباس اور عربی حلیہ سے ان کو مزین کیا جاتا ہے اور وہی لوگ عرب بن بن کر شہر بہ شہر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی مساکین نہیں کہے جاسکتے بلکہ دھوکے باز لوگ ہوتے ہیں اور فریب سے جھوٹ بول کر لوگوں سے روپیہ وصول کرتے ہیں۔ بعض وقت عراق کے

مقدس شہروں مثلاً کربلا معلیٰ وغیرہ کے فقرا عربی بولتے ہوئے آتے ہیں اور وہ آکر ہر شہر میں اس کی تفتیش کرتے ہیں کہ اہل تشیع متمول اشخاص کہاں کہاں رہتے ہیں؟ اور وہ زیادہ تر شیعہ صاحبان کے سامنے ہی جا کر ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ ان کو کچھ ملتا ہے یا نہیں ملتا لیکن وہ سنیوں کو اس قدر ردق نہیں کرتے جس قدر شیعہ صاحبان کو کرتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جناب خواجہ الطاف حسین حالی اس گداگری کی حالت سے خوب واقف تھے اور اپنی مسدس کے تین بندوں میں ان کی تعریف فرمائی ہے جو حسب ذیل ہے:

یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے — کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے — جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

نہیں مانگنے کا طریق ایک ہی یاں — گدائی کی ہیں صورتیں نت نئی یاں
نہیں حصر کنگلوں پہ گدیاگری یاں — کوئی دے تو منگتوں کی ہے کیا کمی یاں
بہت ہاتھ پھیلائے زیر ردا ہیں
چھپے اجلے کپڑوں میں اکثر گدا ہیں

بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی — بہت بن کے خود سیّد خاندانی
بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی — بہت مدح میں کر کے رنگین بیانی
بہت آستانوں کے خدام بن کر
پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں دردر

اوپر جس قسم کے لوگ بیان کیے گئے ہیں وہ تو بھیک مانگنے والے ٹھہرے۔ ان کے اخلاق اس قدر گرے ہوئے ہیں کہ ان کو جھوٹ بولنے میں، مختلف قسم کے لباس اختیار کرنے میں کوئی عار یا تکلف نہیں ہے لیکن بھیک دینے والے بھی عجیب لوگ ہیں۔ اول تو ان کے سامنے جب کوئی سوال کرتا ہے تو وہ بھیک مانگنے والے سے کچھ خوفزدہ ہو کر اس سے التجا کرتے ہیں کہ اس وقت معاف کیجیے پھر کسی اور وقت آیئے گا۔ اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ یہ

بھیک مانگنے والے لوگ کچھ اثر رکھتے ہیں۔ کہیں ہم کو دل میں نہ کوسیں اور نقصان نہ پہنچائیں۔
بعض لوگ بہت ٹھاٹ سے بھیک مانگنے نکلتے ہیں۔ گیروے لباس اور چغا پہن کر ایک پورے تھان کی پگڑی سر پر لپیٹ کر ہاتھ میں کبڑی (لاٹھی) لے کر اور دو ایک کرائے کے آدمیوں کو ساتھ لے کر بھیک مانگنے کے لیے اکثر نمودار ہوتے ہیں اور آنکھیں چڑھا لیتے ہیں اور منہ ہی منہ میں کچھ کلمے گنگنایا کرتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہیں اور مسلمانوں کے پاس بڑی مہربانی کر کے آئے ہیں اور اپنی برکات سے روپیہ دینے والوں کی مرادیں پوری کر دیں گے۔

کمزور دل کے لوگ ایسے آدمیوں کے بہروپ کے شکار ہو جاتے ہیں اور ان کو روپیہ دیتے ہیں۔ اور ان کی خوشامدیں کرتے ہیں کہ آپ ہمارے حق میں دعا کیجیے کہ ہمارا فلاں کام پورا ہو جائے۔ یہ مخلوق بڑی خطرناک مخلوق ہے۔ اور اس کی وجہ سے بھیک مانگنے والوں کو بہت ہمت اور جرأت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بہروپ کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں اور کمزور دل کے مسلمانوں پر اپنا اثر ڈال لیں۔ ان کے علاوہ بڑے شہروں میں کاہل الوجود، ہٹے کٹے مسلمانوں کا ہر محلے میں ایک ایک گروہ ٹھیرا ہے اور جن کو لوگ مستحق کے نام سے پکارتے ہیں اور گھر میں اگر کوئی بچہ یا بڑا آدمی بیمار ہوتا ہے تو منت مانی جاتی ہے اور زیادہ تر عورتیں منت مانتی ہیں کہ اگر میرا بیٹا یا شوہر اچھا ہو جائے تو میں پانچ یا دس مستحقوں کو کھانا کھلاؤں گی اور اگر اتفاق سے وہ اچھا ہو گیا تو پھر ہٹے کٹے مسٹنڈے زیادہ تر جوان العمر لوگ جو اپنے کو مستحق کہتے ہیں وہ بلائے جاتے ہیں اور اچھے سے اچھا کھانا ان کو کھلایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی کل عمر اسی طرح سے کٹتی ہے۔ نہ یہ کام کرتے ہیں اور نہ بیوی بچوں کی خبر لیتے ہیں اور یہ سنا ہے کہ ان مستحق لوگوں کے بیویاں اور اولاد بھی ہوتی ہیں کچھ مانگ تانگ کر ان کو دے دیتے ہیں باقی خود اکثر جاہل عورتوں کے مہمان ہوتے ہیں اور خوب مرغن کھانے اڑاتے ہیں۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان گداگری کے پیشے کے لیے صرف گداگر ہی ملزم قرار نہیں دیے جا سکتے بلکہ جو لوگ مستحق لوگوں کو کھانا کھلانا اپنی غلط خیالی سے اپنی ضرورتوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی ملزم قرار دیے جانے کے قابل ہیں۔

اپاہجوں کے لیے بھیک مانگنا اُس وقت تک ضروری ہے جب تک کہ کسی ملک کی گورنمنٹ یا پبلک (اندھوں۔ لنگڑوں۔ لولوں۔ بیماروں) کام نہ کرنے کے قابل لوگوں کی گزر

اوقات کا انتظام نہیں کریں گے۔ لیکن جو لوگ باوجود خدا کے دیے ہوئے ہاتھ پاؤں آنکھ اور کان سے کام نہیں لیتے اور کام کر کے اپنی روزی نہیں کماتے ان کو بھیک دینا قرآن پاک کی تعلیم کی تعمیل نہیں ہے بلکہ اس کی مخالفت ہے۔ یہ بھیک مانگنے والے لوگ اکثر نہایت سخت بداخلاق ہوتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ شراب پیتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں اور عیاشی کرتے ہیں۔ بھیک مانگنے والے لوگوں میں سے کچھ آدمی اکثر دولت بھی جمع کر لیتے ہیں یہ اخباروں کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگوں نے بھیک مانگنے میں عمر صرف کر دی اور لوگ ہمیشہ اس خیال میں رہے کہ یہ بہت ہی غریب ہیں لیکن جب وہ مرے تو ان کی گدڑی میں یا کسی کونے میں سے ہزار ہا روپیہ برآمد ہوا جو انھوں نے اپنے اوپر بھی صرف نہیں کیا۔ وہ عمر بھر جوڑا ہی کیے اور آخر کو وہ جوڑا ہوا روپیہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اگر بھیک دینے والے انسانوں میں اخلاقی جرأت ہو تو ایک بڑا گروہ انسانوں کا گداگری کی ذلت سے نجات پا کر کام کے انسانوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ بھیک مانگنے سے زیادہ کوئی ذلیل کام دنیا میں نہیں ہے۔ ہندی میں ایک پرانی مثل چلی آتی ہے اور اکثر لوگ اس کو دہرایا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے ''اُتم کھیتی مدھم بیوپار نکھت چاکری بھیک نہ دان''، یعنی کھیتی سب سے زیادہ شریف پیشہ اور تجارت اس سے گھٹیا درجہ کا پیشہ ہے اور چاکری (نوکری) ایک بے حرمتی کا پیشہ ہے لیکن بھیک نہایت بے غیرتی اور ذلت کا پیشہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اصول کی سب باتوں کو جانتے تھے اور ہر کام اور ہر پیشہ کی قدر اور قیمت ان کے دلوں میں تھی لیکن اس ملک میں ہمیشہ عمل میں سستی رہی۔ وہ اصول اپنی جگہ پر رکھے رہے اور دنیا اپنے قدیم راستہ پر چلتی رہی۔ کبھی کوئی گروہ اپنی حالت میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ بھیک مانگنے والے دو طریقوں سے ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ سب سے بڑے نقصان کا باعث یہ ہے کہ جو لوگ ہاتھ پاؤں کی محنت سے ملک کی دولت میں افزائش کر سکتے تھے وہ دوسروں کے اوپر بار ڈالے ہوئے ہیں اور دوسروں کی کمائی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ کمانے والوں کی آسائش و آرام میں ان کی وجہ سے بہت فرق آتا ہے۔ بھیک مانگنے والے ذلت مجسم بن کر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا کسی طریقہ سے دنیا سے خاتمہ ہو جائے تو قوم کو بڑی تقویت اور کامیابی کی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔ یورپ میں بھی کسی زمانے

میں بھیک منگے کمائی کرنے والوں کے اوپر اپنی گزر اوقات کا بار ڈالے ہوئے تھے لیکن یورپ کے لوگوں میں دوراندیشی، جرأت و ہمت اور روشن خیالی ہندوستانیوں سے بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ بھیک مانگنے کا دروازہ بند کر دیا۔ جا بجا محتاج خانے بنائے جو لوگ کام کرنے کے قابل تھے ان کو کام سے لگایا تاکہ وہ اپنی روزی خود پیدا کرسکیں اور کمائی کرنے والوں کی آمدنی میں ان کی شرکت نہ ہو اور نیز وہ خود بھیک مانگنے کی ذلت سے نکل کر قابل عزت انسان ہو جائیں۔ اب اس وقت یورپ کے شہروں میں اور دیہات میں بھک منگے بہت کم دکھائی دیتے ہیں اور محتاج خانوں میں ان کو کام ملتا ہے جہاں وہ اپنی محنت سے اپنی روزی کماتے ہیں اور در بدر بھیک مانگنے کی ان کو محتاجی نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے اور بہتر لاکھ بھک منگوں کو ذلت کے گڑھے سے نکال کر خودداری کی منزل پر پہنچایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں تو یہ حالت ہے کہ ہمارے موجودہ زمانے کے پیشوایان دین اور مبلغین مذہب کوئی صورت اصلاح کی نکلنے ہی نہیں دیتے۔ جب کوئی بھیک کا دروازہ بند کرنے کی رائے دے تو فوراً کسی مذہبی کتاب یا آیات یا اقوال کا حوالہ دینا شروع کر دیتے ہیں اور اصلاح کرنے والے کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

یورپ میں ایک بڑا ظالم اور جابر شخص ہو گزرا ہے جس کا نام ہٹلر تھا۔ اس نے ایک سپاہی کی حیثیت سے ترقی کر کے بہت اونچا درجہ پایا اور کل جرمنی کو ہمسایہ قوموں سے لڑنے کے لیے تیار کر دیا۔ 1939 سے 1945 تک کل دنیا میں ایک حشر برپا کر دیا۔ اس شخص نے بعض کام بڑی ہمت اور اصلاح کے بھی کیے۔ ان میں ایک کام یہ تھا کہ بے کار اور کاہل الوجود لوگوں کو جو دوسروں کی کمائی پر جیتے تھے ان کو جمع کر کے اولاد پیدا کرنے کے ناقابل کرا دیا اور جراحی و برقی عمل سے ان کے اعصاب کمزور کر دیے جن سے توالد اور تناسل کا آغاز ہوتا ہے اور اس کی غرض یہ تھی کہ یہ کاہل الوجود لوگ خود تو قوم کے اوپر ایک بار ہیں۔ یہ اگر اولاد پیدا کرنے کے قابل چھوڑ دیے جائیں تو یہ ایسی اولاد پیدا کریں گے جو آئندہ نسلوں کے اوپر بھی بار رہے گی۔ میرے خیال میں ہٹلر اس معاملے میں حق بجانب تھا اور دوسری قوموں کو بھی اگر ممکن ہو تو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ بھیک کے درخت کی جڑیں ہی کٹ جائیں اور بھیک کا دروازہ قطعی بند ہو جائے گا۔

ہمارے موجودہ زمانے کے مذہبی پیشوا کسی شخص کو اصلاح کے راستے پر آنے ہی نہیں

دیتے۔ ہندو اور مسلمان میں اس بھیک مانگنے کی ذلت کی ذمہ داری زیادہ تر مذہبی پیشواؤں ہی پر ہے۔ یہ مذہبی پیشوا خود زیادہ تر بھیک کے ٹکروں ہی پر بڑی شان سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں گو یہ بھیک کا کاسہ لے کر در بدر تو نہیں پھرتے لیکن ان کے طریقے ایسے ہیں کہ بھیک کا ٹکڑا کھینچ کر خود ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ کم عقل ضعیف الاعتقاد لوگوں پر یہ اثر ڈال کر ان کی ذہنی حالت ایسی متنذل کر دیتے ہیں جو اپنی دنیاوی ترقی اور آخرت کی بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کہ کسی مولوی، کسی پیر کسی مہنت، کسی گوسائیں یا کسی سادھو کی خدمت کریں اور اس کا پیٹ بھریں۔ وہ خود اپنے اعمالوں کے بھروسے پر اپنی بہبودی حاصل کرنے کا خیال نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی خدمت پر اپنی بہبودی کا دارومدار سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں میں تو زیادہ تر لوگ پیر بن کر کم سمجھ مسلمانوں کو اپنی مریدی کی زنجیروں سے کس کر ان کی قسمت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا ظاہر کرتے ہیں اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتے ہیں کہ تمھاری روزی تمھاری تندرستی اور تمھاری نجات اور تمھارے کل کاموں کی درستی، غرض کہ ہر بات کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ تم اگر ہمارا کہا مانو گے ہماری خدمت کرو گے ہم کو اپنا پیشوا اور رہنما سمجھو گے تو تمھاری سب مشکلات حل ہو جائیں گے اور تمھارے سب کام درست ہو جائیں گے۔

مجھے ایک مرتبہ ملتان کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ لاہور سے بیس میل کے فاصلے پر رائے چنڈ ا ایک جنکشن ہے۔ وہاں پر جا کر جنوبی پنجاب کی ریل لاہور اور کراچی ریل سے مل جاتی ہے۔ میں جنوبی پنجاب کی ریل سے پہنچا اور وہاں پر میں نے ہندو اور مسلمان دونوں کو انڈے بیچتا دیکھا۔ مجھے کراچی کے میل سے ملتان جانا تھا جو میرے وہاں پہنچنے سے چند گھنٹے بعد میں آنے والی تھی۔ میں ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا تو وہاں پر ایک پیر صاحب بھی آگئے۔ وہ پیر صاحب ایک آنکھ سے کانے تھے اور ان کی گردن ایسی پتلی تھی کہ میں اپنی مٹھی میں پکڑ سکتا تھا۔ وہ نہ ضعیف تھے نہ بیمار تھے لیکن ان کی کاٹھی ہی ایسی تھی کہ بہت دبلے تھے لیکن ان کے سر پر ایک تھان کا پگڑ بندھا ہوا تھا ،ان کے ساتھ آٹھ دس آدمی تھے اور ایک جوان اٹھارہ بیس برس کا لڑکا بھی تھا اور کچھ اہل معاملہ بھی تھے۔ وہ لڑکا بھی ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا اور دیگر اہل معاملہ بھی کھڑے تھے۔ لڑکا تو اپنے باپ کی طرف سے معذرت کر رہا تھا کہ وہ اپنے کسی ضروری کام کی وجہ سے آج حاضر نہیں ہو سکے گا

اور پیر جی فرمارہے تھے کہ اب وہ کیوں میرے پاس آنے لگے اب ان کا کام ہوگیا۔ جب تک کام نہیں ہوا تھا تو سوائے ہمارے دربار کی حاضری کے ان کو اور کوئی کام نہیں ہوتا تھا اب سب دوسرے کام ان کے لیے ضروری ہوگئے اور ہمارے پاس آنا غیر ضروری ہوگیا۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ وہ کیا کام تھا جو ان پیر صاحب کی وجہ سے انجام پایا تھا۔ دوسرا شخص جو اہل معاملہ تھا اس نے بہت شرمندہ ہو ہو کر معافی مانگی کہ ہم آپ کے پاس نہیں آئے اس لیے کہ ہمارا معاملہ خراب ہوگیا اب ہمارا معاملہ ہائی کورٹ میں پہنچا ہے دعا فرمایئے پیر صاحب نے فرمایا کہ تم نہیں آئے اور تمھارا دوسرا فریق آیا ہم نے اس کے لیے دعا کی تو اُس کا معاملہ ٹھیک ہوگیا۔ تم ہمارے پاس اب آئے ہو جب تمھارا معاملہ خراب ہوگیا۔ ہم دوسرے کے حق میں دعا کر چکے اب تمھارے حق میں کیسے دعا کریں۔ اس کے علاوہ ایک اور اہل معاملہ تھے انھوں نے کہا کہ میرا مقدمہ اس وقت عدالت میں ہے دعا کیجیے کہ کامیاب ہوجاؤں۔ پیر صاحب نے کہا کہ تم میرے یہاں آنا میں تمھارے لیے دعا کروں گا۔ اتنے میں لاہور کی میل گاڑی جو کراچی جاتی تھی وہ آگئی۔ میرا سامان قلی نے جا کر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا اتنے میں پیر صاحب مذکورہ بالا بھی وہاں آگئے انھوں نے اپنی بھینگی آنکھ سے مجھے دیکھ لیا اور جو لوگ ان کے پاس تھے ان سے کہا کہ کیا کوئی اور کمپارٹمنٹ نہیں ہے۔ ایک نے کہا کہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ تو ہے انھوں نے فرمایا کہ اچھا چلو میرا سامان اسی سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں لے چلو۔ میں سمجھا کہ یہ بڑے مردم شناس بھی ہیں اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں جب ہم بیٹھے تھے تو اس نے جس قدر باتیں کیں وہ بار بار میری طرف بھی دیکھتے تھے کہ مجھ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ان پر یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ میں ان کو نفرت سے دیکھ رہا ہوں اس لیے وہ میرے کمپارٹمنٹ سے دوسرے کمپارٹمنٹ میں چلے گئے کیونکہ جو لوگ ان کے پاس تھے وہ سب کوئی ہاتھ جوڑتا تھا کوئی ان کے پاؤں کو چھوتا تھا وہ میرے کمپارٹمنٹ میں بیٹھنا کیسے پسند کر سکتے تھے جب میں ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں گاڑی چلی تو کوئی تین چار گھنٹہ میں ملتان پہنچ گئی وہاں میں گاڑی سے اتر کر ڈاک بنگلہ میں چلا گیا لیکن رستے میں دیکھتا گیا کہ کسی شاعر کے قول کی یہاں تصدیق ہوتی ہے یا نہیں۔ اس شاعر کا قول حسب ذیل ہے۔

چہار چیز است تحفۂ ملتان   گرد گرما و گدا و گورستان

اس شعر کی بہت کچھ تصدیق ہوئی کہ گرد بھی گرمی بھی فقیر بھی بہت بھیک مانگ رہے تھے اور رستہ کے دونوں طرف قبریں بھی تھیں۔

اس زمانے کے مسلمانوں کی حالت جو کچھ ملتان میں تھی وہ غالباً کل اس علاقے کا نمونہ تھا۔ میں نے رستے میں کئی پیر بھی دیکھے جو اپنی داڑھیوں پر مہندی کا خضاب کیے ہوئے اپنے مریدوں کی ٹولیوں میں چوکیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور مرید زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈاک بنگلے میں پہنچا، وہاں کسی پیر کو میں نے نہیں دیکھا مگر بھیک مانگنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ میں ملتان میں دو دن ٹھہرا کیونکہ میرا مقدمہ جو عدالت میں تھا وہ ملتوی ہو گیا اور مجھے اپنے کام کی وجہ سے وہاں سے جلد واپس آنا پڑا۔ میں ملتان کے شہر میں نہ جا سکا۔ لیکن علی گڑھ شہر اور یو۔ پی و پنجاب کے قصبات اور بستیوں میں ایک بھی جگہ ایسی نہ ملے گی جہاں پر گداگری کے مظاہرے دیکھنے میں نہ آئیں۔ مجھے اپنے گھر بیٹھے بٹھائے ملتان کی تصویر دکھائی دیا کرتی ہے۔ یہاں صبح سے شام تک گداگروں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ یہ بھیک مانگنے والے جتنے ہیں سب آس پاس کے شہروں ہی کے رہنے والے ہیں لیکن اپنے کو کالے کوسوں سے آیا ہوا بیان کرتے ہیں۔ کشمیر سے اور پاکستان سے آنے والوں کی کثرت رہتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ جب دوبارہ آتے ہیں تو اپنے وطن کا نام سابق سے بدل کر دوسرا بتاتے ہیں اور یہ بھی مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص اس سے قبل کئی بار آ چکا ہے اور علاوہ اپنا وطن دوسرا بتانے کے اغراض آنے کے بھی بدل کر بتاتا ہے۔

ہندوستان میں غالباً مسلمانوں کی گداگری کا روکنا دشوار ہوگا۔ کیونکہ یہاں کی جمہوری حکومت کوئی قانون ایسا وضع کرنا پسند نہ کرے گی جس کا اطلاق صرف مسلمان پر ہو لیکن پاکستان میں وہاں کے اصلاح پسند مسلمانوں کو گداگری کے خلاف قانون وضع کرانے میں کوئی زیادہ دقت نہ ہوگی۔ میں نے اُڑتی اُڑتی یہ خبر سنی کہ پاکستان میں گداگری کو روکنے کے لیے تدابیر اختیار کی گئی ہیں خدا کرے ایسا ہی ہو۔

مسلمانوں میں تجارت کا پیشہ

مسلمانوں میں جب کوئی شخص افلاس میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے خیال میں کوئی کام اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے ذریعہ سے روٹی کمانا نہیں آتا بلکہ بھیک مانگنے کی طرف زیادہ خیال

جاتا ہے اس لیے بھک منگوں کی قوم میں کثرت ہے اور کاریگری کے کام اور تجارت کرنے والوں کی قلت ہے۔ سر سیدؒ نے اور مولانا نذیر احمد مرحوم نے بار بار مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اپنے بچوں کو بجائے اس کے کہ میاں جی کے اسکول میں کریما اور ماتقیماں پڑھنے کے لیے بھیجا کریں ان کو کاروبار میں لگانا چاہیے تاکہ بڑے ہو کر اپنی روٹی کمایا کریں۔ مجھے معلوم نہیں اب مسلمانوں میں کوئی احساس پیدا ہوا یا نہیں لیکن ظاہرہ کہیں سے آواز نہیں اٹھتی ہے کہ فلاں مقام پر مسلمان بچوں کو کوئی تجارتی کاروبار سکھایا جاتا ہے اور ان علوم وفنون میں سے کوئی فن سکھایا جاتا ہے جو ان کو کاروبار میں کامیاب ہونے کے قابل بنا سکے۔

میرے پاس ان دنوں ایک بچہ کام کرتا ہے جس نے شروع سے ہندو مدرسوں میں تعلیم پائی اور اردو نہیں پڑھی۔ اس نے بیان کیا کہ قصبہ ہردوئی میں کوئی مسلمان صاحب رہتے ہیں انھوں نے ہردوئی اور دیگر قصبات میں اردو اور عربی کے پچاس مدارس جاری کر رکھے ہیں۔ ان مدرسوں کو گورنمنٹ سے کوئی مدد نہیں ملتی کیونکہ وہ گورنمنٹ کے تعلیمی قوانین کی پابندی نہیں کرتے نہ بچوں کو ہندی پڑھاتے ہیں اور نہ کوئی فن سکھاتے ہیں۔ ان اسکولوں کے پاس شدہ طلبا کو گورنمنٹ میں کوئی نوکری نہیں ملتی۔ جن صاحب نے یہ مدرسے جاری کر رکھے ہیں ان کی تعریف تو ضرور کرنی چاہیے لیکن ان کی فیاضی میں عقل کا عنصر بہت کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ صرف اپنے مدارس میں اردو اور عربی پڑھانے کی طرف ہی محدود ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے مدارس میں پڑھے ہوئے بچے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے ایک کارآمد انسان بن سکیں گے یا نہیں۔ ان کے یہ مدارس میاں جی کے مدرسوں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اگر وہ اردو اور عربی کے ساتھ ہندی بھی پڑھانا شروع کریں تو اس میں کسی اسلامی اُصول کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ وہ بچوں کو صرف ایک طوطا بنا کر کیا فائدہ حاصل کریں گے جو سوائے اردو اور عربی کے کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے ان عزیز مسلمانوں کو جن کے پاس چار پیسے ہیں اور جو مسلمانوں کے لیے کوئی مفید کام کرنے کے متمنی بھی ہیں ان کو اپنے منصوبوں میں عقل کا عنصر ضرور داخل کرنا چاہیے اور دور اندیشی سے کام لینا چاہیے کہ جن لوگوں پر وہ احسان کریں اور ان کو تعلیم دلائیں وہ اپنی زندگی میں کوئی مفید کام بھی کر سکیں۔ اگر تعلیم کا ابتدائی مرحلہ ٹھیک ہو جائے تو پھر وہ ان بچوں کو جنھوں نے ان کی مہربانی سے

چار حرف سیکھے ہیں ان کو کام میں لگانے کی کوشش کریں تا کہ وہ اپنے لیے اور اپنے ماں باپ کے لیے روزی پیدا کرنے کے قابل ہو جاویں۔

مسلمانوں میں بعض فرقے ایسے بھی ہیں جو قطعی تجارت کا کام کرنے میں ہی عمر بھر مشغول رہتے ہیں اور وہ ظاہرہ خوش حال بھی سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ خوجوں، بوہروں اور میمنوں اور پنجابی بساطیوں کے فرقے محض تجارت پر اپنی کامیابی سمجھتے ہیں لیکن چونکہ وہ تعلیم یافتہ کم ہوتے ہیں اس لیے قوم کے لیے کوئی مفید کام نہیں کر سکتے۔ اگر ان سے چندے مانگو تو دے دیتے ہیں لیکن خود ان کی یہ ہمت اور وسعت خیالی نہیں ہوتی کہ سب مل کر کارخانے اور تجارت کی منڈیاں قائم کریں جیسے کہ امریکہ اور یورپ میں لوگ کرتے ہیں۔ ان چار پانچ فرقوں کے علاوہ مسلمانوں میں اگر کسی کے پاس چار پیسے ہوتے ہیں تو وہ اپنے شہر قصبے یا گاؤں میں اپنی ذات پر تو بہت کچھ صرف کرتے ہیں لیکن کسی قومی کام میں نہ روپیہ خرچ کرتے ہیں اور نہ کارخانے و فیکٹریاں قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

سرسید نے تاکیداً مسلمانوں کو یہ ہدایت کی تھی کہ سب سے زیادہ توجہ تجارت کی طرف کرو اور تجارت بھی اس قسم کی کرو کہ جیسے یورپ اور امریکہ میں کرتے ہیں کہ بہت سے آسودہ حال لوگ مل کر اپنے مشترکہ سرمایہ سے فیکٹریاں کھولتے ہیں اور غیر ملکوں سے تجارت کے تعلقات پیدا کرتے ہیں اور ہمارے ملک میں بھی ہمارے ہندو بھائی یورپ اور امریکہ کی دیکھا دیکھی بہت کچھ تجارت میں حصہ لے رہے ہیں لیکن مسلمانوں میں مشترکہ کام کرنے کی نہ عقل ہے اور نہ اہلیت ہے۔

جب آزادی کی بات چیت شروع ہوئی تو میں نے اپنے بعض زمین دار اور موکل دوستوں سے کہا کہ تمھارے پاس زمین داریاں ہیں ان سے بہت کام ہو سکتا ہے اگر تم سب مل کر کوئی کام کرنا چاہو تو تم بھی دوسروں کی طرح دولت مند اور خوشحال ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تک انگریزوں کے زمانے میں شکر جاوا اور افریقہ سے آتی ہے اور کروڑوں روپیہ ہندوستان کو اس کے لیے دینا پڑتا ہے۔ تم اگر شکر کے کارخانے مل کر جاری کرو تو تمھارے لیے بہت بڑی آمدنی کا ذریعہ ہو جائیں گے۔ مجھے جواب ملا کہ صاحب! یہ کام تو بنیوں کا ہے ہم کیسے اپنا وقت اس میں دیں۔ اسی زمانے میں بنیوں نے شکر کے کارخانے جاری کرنے شروع کیے اور غازی آباد سے لے

کر سہارنپور تک اور مراد آباد سے لے کر سہارنپور تک ریل کی لائن کے آس پاس انھوں نے کار خانے تیار کیے۔ مسلمانوں کے پاس زمین داریاں تھیں، وہ اپنی زمینوں میں ایکھ بہت پیدا کرتے تھے۔ بنیوں کی فیکٹری میں جا کر ان کے پیدا کیے ہوئے گنے کی شکر بنتی تھی۔ لیکن اس پر بھی مسلمانوں کے دل میں کوئی ترغیب پیدا نہ ہوئی کہ ہم بھی کوئی فیکٹری قائم کریں۔ فیکٹری والوں میں سے ایک فیکٹری والے جو غازی آباد سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر کام کر رہے ہیں اس کا مالک پہلے تو لکھ پتی سمجھا جاتا تھا اور اب وہ کروڑ پتی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ اور جو زمین داران کے لیے ایکھ پیدا کرتے تھے اور اس سے اپنی گزر اوقات کیا کرتے تھے اب ان کی زمین داری بھی نہ رہی اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور تمام فیکٹریوں کے مالک بنیے کروڑ پتی ہو گئے۔ یہ بات اگر مسلمانوں کے سامنے بیان کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب ہم سے بڑی غلطی ہوئی کہ ہم نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔

مجھے نہایت خوشی ہے کہ میرے ہم وطن ہندو صاحبان بالخصوص ویش ہندوؤں نے آزادی کی نعمت کو اپنے لیے باعث رحمت بنالیا اور مسلمان جن کو اپنی زمین داریوں پر بہت ناز تھا ان کے بچوں کو فیکٹریوں میں کام کرنے کے لیے بھی ملازم نہیں رکھا جاتا ہے۔ بنگال کے علاقے میں جوسن پیدا ہوتی ہے جس کو جوٹ کہتے ہیں وہاں بھی مسلمانوں نے اپنی زمین داری میں جوٹ تو پیدا کیا اور ہندو مارواڑیوں کی فیکٹریوں میں اس کو فروخت کرتے رہے لیکن بیسیوں فیکٹریوں میں سے صرف ایک فیکٹری جو آدم جی پیر بھائی کے نام سے مشہور ہے وہ مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ اب سنا ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں نے اپنی کچھ فیکٹریاں بنائی ہیں اگر ایسا ہوا ہے تو غنیمت ہے۔

مسلمان بعض مقامات پر دکانداری کرتے ہیں لیکن نہ تو سب مل کر مشترکہ کام کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ کسی ایک دکاندار کے پاس کبھی اتنا سرمایہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تجارت سے اپنے آپ کو مالا مال کرے اور اپنی قوم کو بھی فائدہ پہنچے۔ ہندوستان کے مسلمان بجز ممبئی اور گجرات اور مدراس کے بعض شہروں کے باقی ملک کے کسی حصے میں اب تک مشترکہ کام نہیں کرتے اور نہ ان کے دلوں میں مشترکہ کام کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ مولانا حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں ہندو قوم کی

تجارت کے بارے میں جو لکھا ہے وہ مسلمانوں کے سامنے ایک ہمت افزا اور عبرت خیز نقشہ ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اس سے بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

یہاں اور ہیں قومیں گرامی   خود اقبال ہے آج ان کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی   زمانے کی ساتھی ترقی کی حامی
نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے
دکان ان کی ہے اور بازار ان کا   بنج ان کا ہے اور بیوپار ان کا
زمانے میں پھیلا ہے بیوپار ان کا   ہے پیر و جواں بر سر کار ان کا
مدار اہل کاری کا ہے اب انھیں پر
انھیں کے ہیں آفس انھیں کے ہیں دفتر
معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ   گرامی ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادت میں اطوار میں وہ   نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ
نہ پیشے سے حرفے سے انکار ان کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار ان کو
جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ   پڑے زد تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچے میں جا کے ڈھل جاتے ہیں وہ   جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضیٰ جانتے ہیں
زمانے کے تیور وہ پہچانتے ہیں

ہمارے قومی شاعر نے اس اپنی نظم میں کہیں محض اپنی شاعری کی اعلیٰ مثال قائم کرنے کا کبھی کوئی خیال نہیں کیا۔ ان کی توکل توجہ ہمہ وجوہ قوم کی اقتصادی خستہ حالی کی طرف مبذول رہی ہے اور مسدس حالی جو ان کی تصنیف کردہ کتاب ہے، مسلمان کاروباری لوگوں اور نوجوانوں کو اس کو پڑھ کر اپنے لیے تقویت کا کوئی ذریعہ نکالنا چاہیے۔ خاموش یا مشاعرے خانوں میں بیٹھ کر صرف اپنی شاعری کا جوہر دکھانا کسی کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ شاعری سے مولانا حالی نے

ٹھیک وہ کام لیا ہے جس کی اسلامی سلطنت کے ختم ہونے کے بعد ضرورت تھی ۔ لیکن مسلمان میرے علم میں اس کتاب کو نہ اپنے لیے ایک ضرورت کی تعلیم سمجھ کر پڑھتے ہیں اور نہ اس ضرورت کی طرف توجہ کرتے ہیں، جو ضرورت ان کے دل اور خیالات میں بٹھانے کی اس میں کوشش کی گئی تھی ۔ مسلمانوں کو شاعری میں تجارت اور صنعت و حرفت کے کاموں کی طرف مبذول نہیں کر سکتے تھے کہ تجارت اور صنعت و حرفت کے کاموں کے سیکھنے کے لیے ان ان باتوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ان باتوں کے سیکھنے کے لیے تجارت کی منڈیاں اور صنعت و حرفت کے مدارس کھلے ہوئے ہیں ۔ اگر کوئی ان سے سبق حاصل نہ کرے تو اس میں سراسر خود مسلمانوں کی کوتاہی ہے ۔

بعض فرقے مسلمانوں کے تجارت اور صنعت و حرفت کی طرف اس زمانے میں توجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کوئی خامی کارخانہ داروں کی توجہ میں اور کام سیکھنے والوں کی دلچسپی میں موجود ہے کہ بچے ان مدارس سے پوری تعلیم حاصل نہیں کرتے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر کسی چھوٹے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں کہ روپیہ پیدا کریں ۔ مگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتے کیونکہ چھوٹے کاموں میں منافع کچھ زیادہ نہیں ہوتا ۔ مجھے امید ہے کہ خوجے صاحبان، میمن صاحبان، بوہرے صاحبان اور بساطی صاحبان ہر مقام پر جہاں انھیں موقع ملے بچوں کو مکمل طور پر مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے موقع بھی دیں اور مجبور بھی کریں ۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو مسلمانوں کی موجودہ تعلیم ان کے لیے کچھ مفید ثابت نہیں ہوگی ۔ میری تو یہ حالت ہے جیسا کہ شیخ سعدیؒ نے کہا تھا کہ ۔

مراد ما نصیحت بود کردیم　　حوالت با خدا کردیم و رفتیم

یعنی میرا مقصد نصیحت کرنے کا تھا وہ میں نے کردی اور اب آپ کو خدا کے حوالے کر کے میں جا رہا ہوں ۔

تحریکِ تعلیمِ نسواں

عورتوں میں زمانہ حال کی طرز کی تعلیم کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ سرسید احمد خاں جیسے قوم کے رہنما نے بھی جدید تعلیم نسواں کی مخالفت کی اور اخیر تک مخالفت کرتے رہے۔ سرسید سے قبل مسلمانوں میں لڑکوں کے لیے بھی جدید تعلیم ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ کسی صوبہ کے مسلمانوں نے اس طرف توجہ کی۔ حالانکہ مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے ہمارے ہندو ہم وطن انگریزی مدارس قائم کرنے میں مستعدی دکھا رہے تھے۔ اور اپنے لڑکوں کو ان کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو سرکار انگریزی نے قائم کیے تھے افراط سے تعلیم دلا رہے تھے۔ سرسیدؒ مسلمانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مسلمان لڑکوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے میں توجہ کی اور یوپی کے ہر ضلع میں جہاں وہ ملازمت کے سلسلہ میں گئے وہاں کے باشندوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ مراد آباد میں گئے تو وہاں ایک فارسی کا مدرسہ قائم کیا جو بعد میں گورنمنٹ کے تحصیلی مدرسہ میں شامل ہوگیا۔ غازی پور میں گئے تو وہاں پر ایک مدرسہ قائم کرنے کی تحریک رؤسا کے سامنے پیش کی۔ 1864 میں وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد پڑی۔ یہ مدرسہ ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مدرسہ تھا اور اس میں سب سے اول انگریزی کی تعلیم بھی شامل کی گئی تھی۔ سرسید نے ضلع غازی پور میں ایک بہت بڑے ہندو رئیس کو اس مدرسہ کا سرپرست قرار دیا اور انگریزی، فارسی، سنسکرت، عربی، اور اردو کی تعلیم اس میں جاری ہوگئی۔ لیکن سرسید اسی سال تبدیل ہو کر علی گڑھ آ گئے اور

غازی پور کا مدرسہ ابتدائی تعلیم کا کچھ کام کرتا رہا بعد میں وہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں تبدیل ہو گیا اور اب تک بدستور قائم ہے۔

سرسید نے انگریزی تعلیم کی یہاں تک حمایت کی کہ دیسی زبانوں کی مخالفت بھی کی اور 1887 میں الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ایک عرض داشت بھی پیش کی۔ اس میں انگریزی تعلیم کی وسیع اشاعت پر بہت زور دیا۔ اور 1872 کو علی گڑھ میں انگریزی تعلیم کے لیے مدرسۃ العلوم قائم کیا اور 1874 میں گورنمنٹ کی امداد سے تعمیر مکانات کا سلسلہ جاری کیا اور سرجان اسٹریچی لیفٹیننٹ گورنر یو۔ پی کے ہاتھ سے اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھوایا گیا۔ اس کے بعد اپنی آخر زندگی تک تمام تر کوشش انگریزی تعلیم کے لیے کرتے رہے۔ ادھر تو لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے لیے یہ کوشش تھی اُدھر لڑکیوں کے لیے ان کے سامنے انگریزی تعلیم کا نام لینا بھی دشوار تھا ۔ میں نے جب اور جس موقع پر بھی سرسید کی زبان سے تعلیم کے بارے میں آواز سنی اس میں لڑکیوں کے لیے انگریزی تعلیم کی مخالفت ہی سنی۔ جیسے کہ ہمارے مولوی صاحبان لڑکیوں کے لیے بھی انگریزی کی تعلیم کو کفر سمجھتے تھے ویسے ہی سرسیدؒ انگریزی تعلیم کو لڑکیوں کے لیے ان کی اخلاقی حالت کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ سب سے زیادہ انھوں نے جمہور اہل اسلام کے سامنے اپنی ایک تقریر میں جو 1884 میں خواتین پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں کی اس میں لڑکیوں کے لیے جدید تعلیم کی مخالفت کی۔ خواتین پنجاب نے اپنے ایڈریس میں سرسید سے تو اپنے فرقے کی تعلیم کے لیے کسی قدم کی استدعا کرنے کی جرأت نہ کی بلکہ آخر میں انھوں نے خدا سے ایک دعا کی اور یہ خواہش کی کہ یا اللہ ہم کو وہ دن دکھا کہ جس طرح ہندوستان کے مردوں کی بہتری کے واسطے سید صاحب کو تو نے اپنے فضل و کرم سے ایک ذریعہ بنا دیا ہے، ایسے ہی ہماری موجودہ حالت پر رحم کر کے ہمارے عاجز فرقے کی بھی سن اور ہمارے قوم کے مردوں کو وہ عزم اور استقلال عطا کر جو وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے صرف کر رہے ہیں تا کہ ہم بھی تعلیم کے زیور سے مزین ہو جائیں۔

عورتوں کی یہ بے بسی اور عجز دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں وہ مایوس ہو چکی تھیں کہ ہم کو جدید تعلیم سے روشناس کرایا جائے گا۔ لیکن ان کے دلوں میں امنگ ضرور تھی کہ خدا کوئی سامان پیدا کرے کہ جس طور پر سرسید لڑکوں کی تعلیم کے لیے کوشش کر رہے

ہیں، اسی طرح کوئی ہماری جدید تعلیم کے لیے بھی کوشش کرے۔ عورتوں کی التجا کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ جو بات ان کے دل میں تھی وہ اپنی زبان پر نہیں لا سکیں اور نہ یہ کہہ سکیں کہ ہم کو بھی مردوں کی طرح جدید تعلیم دلائی جائے لیکن مطلب ان کا بالکل ظاہر ہے کہ وہ جدید تعلیم کی خواہش مند تھیں، اور اس زمانہ میں اگر وہ جدید تعلیم کا نام بھی لیتیں تو مرد ان کی زبان ہی کاٹ لیتے۔ خدا نے ان کی دعا سنی اور ان کے لیے جدید زمانہ کی تعلیم کا بھی انتظام ہوگیا۔ سرسیدؒ نے خواتین پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر کی وہ ہم من وعن یہاں پر نقل کیے دیتے ہیں۔ تا کہ معلوم ہو جائے کہ لڑکیوں کی جدید تعلیم کے متعلق سرسیدؒ کے کیا خیالات تھے۔

جواب ایڈریس بخدمت خواتین پنجاب

''میری بہنوں.......... آج کی رات میرے لیے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں۔

جو ایڈریس تمھاری طرف سے مجھ کو دیا گیا ہے وہ میرے لیے ایک ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمھاری اس شفقت کا دل سے شکر گزار ہوں۔

اے میری بہنوں۔ میں اپنی قوم کی مستورات کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل وکرم سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگی کے نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلیؒ وجنیدؒ موجود نہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔ تمھاری نیکی، تمھاری بردباری، تمھاری محبت ہر قسم کے مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر بار کا انتظام ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم دنیا میں اپنے تئیں کسی قسم کا فخر کر سکتی ہے تو ہم اپنی مستورات پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فخر تمھارے ہی سبب سے ہے۔

اے میری بہنوں! میں اپنی قوم کی خواتین کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے ہے، جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمھیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے کی کوشش کرو۔ وہی تمھارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔

اے میری بہنوں! جس قدر کہ تم اس وقت موجود ہو شاید میں تم سب سے بلکہ ان سے بھی جو اس ایڈریس میں شامل ہیں اور اس وقت جلسے میں موجود نہیں ہیں ان سب سے بھی عمر میں بہت بڑا ہوں۔ میں نے تم سب سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے۔ تمھاری دادیوں تمھاری نانیوں کے حالات تم سے زیادہ مجھ کو معلوم ہیں۔ تم غور کرو کہ تمھارے خاندانوں میں مستورات کی تعلیم کا کیا قاعدہ تھا کہ ہماری قوم میں ہماری رشتہ داری میں ہمارے محلوں میں جو معزز اور باوقار گھر ہوتا تھا، جس گھر کی مستورات عمدہ فضیلت عمدہ اخلاق میں فائق ہوتی تھیں اپنی قوم کی اپنے رشتہ داروں کی اپنے محلے والوں کی لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ان کے سپرد ہوتا تھا۔ ان کا گھر ان لڑکیوں کا ہی گھر ہوتا تھا اور تعلیم کا مکتب بھی ہوتا تھا۔ اسی گھر میں قوم کی بزرگ مستورات ان پر نگاہ شفقت رکھنے والی ہوتی تھیں۔ کوئی شریف خاندان کی معلمہ آداب تعلیم پر مؤثر ہوتی تھی اور اس گھر کی بزرگ مستورات درحقیقت ان کی تعلیم دینے والی اور اپنے اخلاق و نیکی کے مجسم نمونے سے ان کو نیکی و اخلاق سکھانے والی ہوتی تھیں۔ شامت اعمال سے وہ سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ خاندان تباہ ہو گئے۔ ہمارے بزرگ جو اس تعلیم کی قدر کرتے تھے دنیا سے جاتے رہے۔ وہ مقتدر خواتین جو اس کام کو انجام دیتی تھیں دنیا سے اٹھ گئیں۔ تمام خاندان کے مرد جاہل و نادان رہ گئے۔ جو ذلت کہ تمھارے خاندانوں کے مردوں پر خدا کی مرضی سے آئی ضروری تھا کہ اس کا حصہ تم کو بھی ملے۔ بس وہی بدبختی تمھارے خاندانوں کے مردوں کی ہے جس کا حصہ تم کو بھی ملا ہے۔ اور جس کا ذکر تم نے پردے سے اس ایڈریس میں کیا ہے۔

اے میری بہنوں! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہو گئی ہو۔ ان سچے واقعات نے میرے دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے۔ میں نے تمھارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اسے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔

پس جو خدمت میں تمھارے لڑکوں کے لیے کرتا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی ہے۔ میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمھاری دادیاں

نانیاں پڑھتی آئی ہیں اس زمانہ کی مروجہ نا مبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمھارے لیے روٹی کما کر لانے والے ہیں زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ بھی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

تمھارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو۔ اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو۔ اخلاق کی نیکی اور نیک دلی رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو اپنے برتاؤ میں لاؤ۔ گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو۔ اپنے گھر کی مالک رہو اس پر مثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیرزادی کے منتظم رہو۔ اپنی اولاد کی پرورش کرو۔ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا سا بناؤ۔ خدا پرستی اور خدا ترسی اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو۔ یہ تمام سچی تعلیم نہایت عمدگی سے ان کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں جیسے کہ وہ اس زمانے میں مفید تھیں ایسے ہی اس زمانے میں مفید ہیں۔ پس اس زمانے کی نا مفید نا مبارک کتابوں کی تم کو کیا ضرورت ہے۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ تمھارے خاندان کے مردوں کی نالائقی اور جہالت سے تمھارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے تم کو ملے ہیں اور جن کا انسانیت کے رو سے تمھارا حق ہے برباد ہو گئے ہیں۔ وہ حق پھر تمھیں واپس دلانے کی یہی تدبیر ہے کہ تمھارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کی جاوے۔

جب وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو وہ غصب شدہ حقوق از خود بے مانگے تم کو واپس ملیں گے۔ اب میں تم کو دوبارہ یقین دلاتا ہوں کہ جو خدمت میں اس وقت کر رہا ہوں نہ صرف تمھارے لڑکوں ہی کی ہے بلکہ تمھاری لڑکیوں کی بھی ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اس سے دونوں برابر فائدہ اٹھائیں گے۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں علم کی روشنی سے روشن ضمیر ہوں گے۔ اس وقت تمھارا ان غریب بچوں کی پرورش کے لیے جو مدرسۃ العلوم میں پڑھتے ہیں امداد دینا تمھاری اس ذاتی خصلت اور مادرانہ محبت کا نمونہ ہے جو خدا نے تم میں رکھی ہے۔ یہ تمھاری امداد ان غریب بچوں کے لیے مثل شیر مادر کے اثر رکھے گی اور ان کو اور مجھ کو اور مدرسۃ العلوم کو اس امداد سے جس طریقے پر دی گئی ہے قومی غیرت اور قومی افتخار حاصل ہوا ہے۔ میں سب کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں

کہ خدا تم کو دین دنیا میں برکت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا علیہا السلام خوش وخرم رکھے۔ اور جیسی کہ تم اس وقت باعث افتخار قوم ہو اس وقت جب کہ ہماری قوم کامل عروج پر ترقی کرے ہمارے قوم کی باعث افتخار ہو۔ آمین۔

اے میری ہندو اور عیسائی بہنوں! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرسۃ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے شرکت کی، وہ ایک نمونہ تمھاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اس کے لیے تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا تعالیٰ کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین۔''

سرسید کی جوابی تقریر سے یہ بخوبی ثابت ہے کہ سرسید مرحوم ومغفور جدید تعلیم لڑکیوں کے لیے قطعی طور پر مناسب نہیں سمجھتے تھے بلکہ سختی سے ہمیشہ اس کی مخالفت کرتے رہے۔ نیز یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمانوں کی عام پالیسی تعلیم نسواں کے متعلق کیا تھی۔ میری طالب علمی کے زمانے میں 1896 یا اس کے قریب تعلیم نسواں کا کچھ چرچہ شروع ہوا۔ خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے کانفرنس کا سالانہ جلسے میں ایک ریزولیوشن پاس کیا کہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف اب توجہ کرنی چاہیے اور خواجہ صاحب مرحوم نے ایک بہت اچھی اور بہت مدلل تقریر کی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور مولوی ممتاز علی صاحب نے اس کی تائید کی۔ اور بھی چند اولڈ بوائز نوجوانوں نے اس مسئلہ پر تقریر کی۔ لیکن پرانی تعلیم کے مسلمان کچھ اس طرف متوجہ نہ ہوئے لیکن نواب محسن الملک مرحوم اس تحریک کے موافق تھے۔ سرسیدؒ اور ان کے دیگر احباب اس کے مخالف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب خواجہ صاحب سرسید سے ملنے گئے تو سرسید نے ان کی تعلیم نسواں کی حمایت کا مضحکہ اڑایا اور ابھی وہ کمرے میں گھسنے بھی نہ پائے تھے، کہا کہ کیا تم پردے سے باہر نکل آئے ہو۔ مجھے یاد ہے کہ کسی موقع پر اس زمانے میں میں نے بھی سرسید نے عرض کیا کہ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ضروری ہے۔ سرسید نے فرمایا کہ موجودہ طرز کے مدارس میں پڑھ کر لڑکیاں بداخلاق ہو جائیں گی اور ان کے دوست شمس العلماء حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی جو اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے انھوں نے کہا کہ میاں کیا تم لڑکیوں کے لیے مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہو۔

انگریزی مدارس میں پڑھ کر ہرزہ نگیاں ہو جائیں گی۔ لیکن میرے دل میں ابتدائی طالب علمی کے زمانے سے ہی احساس موجود تھا کہ لڑکیوں کو جاہل رکھنا ہمارے گھروں کی زندگی کے لیے دھوپ اور چھاؤں کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لڑکے تعلیم پاکر روشن خیال ہو جاتے ہیں اور روشنی پھیلاتے ہیں اور جاہل لڑکیاں اُسی ایک گھر میں تاریکی کا نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مردوں کے ہاتھ سے شادی شدہ عورتوں کے اوپر جو ظلم ہوتے رہتے تھے اور جواب بھی ہوتے ہیں ان کے قصے سن کر مجھ کو اس تمدنی زندگی کی اصلاح کا اور کوئی طریقہ نہیں سوجھتا تھا۔ بجز اس کے کہ عورتوں میں تعلیم پھیلے اور وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ 1896 میں نواب محسن الملک مرحوم کی تحریک سے کانفرنس کے ساتھ ایک شعبہ تعلیم نسواں قائم ہوا اور اس کے سکریٹری شمس العلما مولوی ممتاز علی صاحب ایڈیٹر تہذیب نسواں لاہور کے مقرر ہوئے۔ مگر مولانا موصوف نے بحیثیت سکریٹری کے کوئی کام نہیں کیا اور سکریٹری شپ بھی چھوڑ دی۔ ان کی جگہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب سکریٹری مقرر ہوئے لیکن 1902 تک انھوں نے بھی اس تحریک کے متعلق کوئی عملی کام نہیں کیا، نہ کبھی کوئی جلسہ کیا۔ نہ کانفرنس میں کبھی کوئی ریزولیوشن پیش کیا اور نہ اخبارات کے ذریعہ سے اس تحریک کی کوئی اشاعت کی۔

یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ سرسید لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدارس کے جاری کرنے یا کسی جداگانہ انتظام کے مخالف تھے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑکیاں مدارس میں پڑھ کر لڑکوں کی طرح آزاد ہو جائیں۔ سرسید کے پاس اس اصولی امر کی تائید کے لیے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں تھی جہاں تک میں نے غور کیا ہے اور سرسید کی زندگی کے عام حالات سے ذاتی واقفیت کی بنا پر اس معاملے میں سرسید کی رائے مجھے نہ مصلحانہ معلوم ہوئی اور نہ مدبّرانہ۔ میری اپنی رائے یہ قائم ہوئی تھی اور ہے کہ سرسید کے دل پر اس معاملے میں رسم و رواج کا بہت گہرا اور خاص اثر تھا۔ وہ خاص اس معاملے میں رسم و رواج کے دل دادہ تھے۔ وہ پردے کے معاملے میں سخت سے سخت قدامت پرست لوگوں کے خیالات کے حامی تھے اور ان کو یہی زیادہ اندیشہ تھا کہ تعلیم پاکر لڑکیاں پردہ چھوڑ کر نکل آئیں گی۔ پردے کی ان کو یہاں تک پاس داری تھی کہ جب پلیگ پھیلا اور گورنمنٹ نے بیماروں کو تندرست لوگوں سے علاحدہ کر کے خاص قسم کے چھپروں کے مکانات

میں علاج کے لیے رہنے پر مجبور کرنا چاہا تو مسلمانوں میں سخت برانگیختگی پیدا ہوئی کہ ہماری عورتوں کو بھی الگ کر کے پردے سے باہر نکالا جائے گا تو کانپور کے مسلمانوں نے اس کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کیا۔ بلوائیوں کے خلاف پولیس نے گولیاں چلائیں اور بہت سے آدمی مارے گئے، تو سرسید نے بلوائیوں کی حمایت میں مضامین لکھے اور کہا کہ ہماری عورتیں خواہ بیمار ہوں یا تندرست ان کو پلیگ کی بیماری کے شبہ میں یا بہانے سے اگر اپنے پردوں کے گھروں سے کسی دوسری جگہ پر جانے کے لیے مجبور کیا جائے گا تو میں خود کانپور کے بلوائیوں کی طرح لڑنے کے لیے اور جان دینے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔ اسی طور پر سرسید نے ہر موقع پر پردے کی پاس داری میں تقریریں کیں اور ان کے اس قسم کے خیالات سے بلا کسی گہری جستجو کے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سرسید کی مخالفت جو لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں تھی وہ کسی مذہبی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں تھی۔ اس کی جڑ میں سرسید کی قدامت پرستی یا پردہ پرستی تھی۔ ادھر تو انھوں نے فقط لڑکوں کی انگریزی تعلیم پر زور دیا اور علما کے نزدیک نیچری اور ملحد قرار پائے۔ ادھر قدامت پرستی اور رواج پرستی کا ان کے دل پر اتنا زبردست غلبہ تھا کہ وہ لڑکیوں کو تعلیم بھی نہیں دلانا چاہتے تھے۔ یہ کہنا تو بہت آسان تھا جو انھوں نے اپنے لاہور کے عورتوں کے ایڈریس کے جواب میں فرمایا تھا کہ ہم لڑکوں کی تعلیم میں لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کر رہے ہیں اور اگر عورتیں چاہتی ہیں کہ ہم کو لڑکوں کی تعلیم سے قبل بھی کوئی تعلیم ملے تو وہ اسی قسم کی تعلیم ہو سکتی ہے کہ جو ہمارے بزرگوں کے زمانے میں تھی کہ معزز اور متمول خاندان کی بڑی بوڑھی عورتیں محلہ کی لڑکیوں کو بلا کر اپنے گھر میں تعلیم دیا کرتی تھیں اور اسی کے ساتھ اس کا بھی اقرار کیا کہ وہ پرانا طریقہ برباد اور معدوم ہو گیا۔ اب اس سے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہے۔ ان کی تقریر کے لب لباب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لڑکیوں کی کسی جداگانہ تعلیم کا کسی طرح کوئی انتظام ہو۔ مجھے سرسید سے اس معاملے میں اور یہی ایک معاملہ تھا اختلاف رہا اور اب بھی ہے۔ اور اس کے علاوہ کسی معاملے میں سرسید سے اختلاف نہیں ہوا کیوں کہ وہ بہت ہی معقول پسند اور روشن خیال مصلح تھے اور جو بات وہ کرتے تھے وہ قوم انسانیت اور مذہب کے فائدہ ہی کی بات ہوتی تھی اس لیے ان سے اختلاف کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں تھی۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ سرسید نے رواج پرستی اور قدامت پرستی کے غلبہ کی وجہ سے

جوان کے خیالات پر تھا لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں مذہبی احکام کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا ۔وہ مجھ سے بدرجہا زیادہ مذہبی احکام سے واقف تھے۔انھوں نے بھی پڑھا ہوگا جیسا کہ میں نے پڑھا ہے کہ ہمارے پاک مذہب کا یہ حکم تھا کہ ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت کے لیے علم کا سیکھنا فرض کیا گیا ہے۔اور علم کے حاصل کرنے کے لیے جس قدر مذہب اسلام نے تاکید کی ہے اس قدر کسی دوسرے مذہب نے نہیں کی اور اصلیت یہ ہے کہ کسی دوسرے مذہب نے بجائے تاکید کرنے کے ممانعت اور مخالفت ہی کی کہ عورتیں تعلیم نہ پائیں۔توریت وانجیل میں عورتوں کی ہستی کو اس قدر غیر ضروری سمجھا گیا کہ عورتوں کی تعلیم اور بہبودی کا کوئی ذکر واذکار نہیں ہے۔مصر کی اور یونان کی یا روم کی یا ایران کی تہذیب وتمدن میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں دکھائی دیتا۔ہندوستان میں بجائے اس کے کہ عورتوں کی ہستی اپنی حالت پر رہنے دی جاتی عورتوں کو منوجی نے اس قدر ذلیل ہستی قرار دیا کہ ان کی تعلیم کا کیا ذکر بلکہ ان کی معمولی انسانی آزادی پر بھی سخت قیود لگادیں اور کہا کہ عورت کبھی آزاد نہیں رہنی چاہیے۔شادی سے قبل باپ کے قبضۂ اختیار میں رہنی چاہیے۔ شادی ہونے پر اس کا شوہر کلیتاً اس کی آزادی پر حاوی ہوجائے اور خود اس کو اپنی مرضی سے کسی کام میں دخل دینے کی اجازت نہ دے۔اور اگر شوہر مرجائے اور اس کا بیٹا جوان ہو تو اپنی ماں پر حکومت کرے۔غرضیکہ وہ کسی حالت میں بھی آزاد رہنے کے لائق نہیں ہے اور نہ آزاد رکھی جائے۔اس کو جائداد میں کوئی حصہ نہ دیا جائے اور جس قدر جلد ہوسکے ابتدائی عمر میں اس کی شادی کردی جائے اور اگر شوہر مرجائے تو پھر اس کی دوسری شادی نہ کی جائے۔اس اصول کا بعد کے رشیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ عورت کو اپنے شوہر کے مرنے کے بعد زندہ ہی نہ چھوڑا جائے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظالمانہ احکامات تراشے گئے اور عورت کے لیے ستی ہونا سب سے اعلیٰ اور ثواب کا کام سمجھا گیا کہ وہ اپنے مرے شوہر کی چتا پر سوار ہوکر اپنے آپ کو بھسم کردے۔انگریزوں نے ستی کی رسم تو بند کی لیکن ہندو بیواؤں کی حالت ستی ہونے سے بدرجہا بدتر ہوتی ہے۔اس کا سر منڈوا دیتے ہیں۔ زمین پر سلاتے ہیں۔اچھا کھانے کو نہیں دیتے۔پھٹا پرانا کپڑا پہناتے ہیں۔سہاگن عورتیں اس کو منحوس سمجھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس نے اپنے شوہر کو تو کھالیا اس کی نحوست ہم کو بھی نہ لگ جائے کہیں ہمارا بھی شوہر نہ مرجائے۔اچھوتوں کی سی حالت اس غریب کی کردیتے ہیں اس لیے ستی

ہونے کے زمانے میں اگر کوئی عورت آگ کی لپیٹ سے تکلیف نہ برداشت کر سکتی تھی اور چتا سے کو د پڑتی تھی تو اس کے رشتہ دار اور برادرننگی تلواریں لیے کھڑے رہتے تھے اور اس کے ٹکڑے کر کے پھر چتا میں ڈال دیتے تھے۔ اسی لیے کسی نے اردو شعر میں اس کو ظاہر کیا ہے۔

ستی ہونے کو چڑھ جائے چتا پر گر کوئی ناری ہوس جینے کی پھر بھی ہو جیے بن کے وہ چنڈالی
اچھوتوں میں ملے جا کر رہے زندہ تو ذلت ہے اسی سے جانہ سکتی تھی کبھی زندہ وہ مرگھٹ سے

اس کو جائداد کا دینا تو درکنار جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے وہ بھی شوہر کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ اب اس زمانے میں اصلاح پسند ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ عورت کو جائداد میں اور وراثت میں حصہ ملنا چاہیے۔ ہندو کوڈ بل کے نام سے ایک مسودہ قانون دس سال ہوئے کہ قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ میں پاس ہوا تھا۔ قدامت پسند ہندو اس کو پاس نہیں ہونے دیتے اور جب کبھی اس بل کے پیش ہونے کا وقت آتا ہے تو سیکڑوں رکاوٹیں اس کے رستہ میں حائل کرتے ہیں اور پیش نہیں ہونے دیتے۔ پس تمام گذشتہ تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام کا مذہب جو خدا کی رحمت کی شکل میں تمام مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا تھا، اس نے عورتوں کے ساتھ نہایت ہی دریادلی کا سلوک کیا کہ مردوں سے کسی بات میں ان کو پیچھے نہیں چھوڑا بلکہ ہر بات میں مساوات برتی اور سب سے بڑی نعمت جو عطا کی وہ علم کا حاصل کرنا تھا۔ اس نعمت سے عورتوں کو محروم کرنا خدا اور رسول کے حکم کی نافرمانی پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے مجھے سرسید کے خیالات سے اس معاملے میں اختلاف ہے اور میں چاہتا ہوں کہ عورتیں تعلیم کے میدان میں کسی طرح نہ روکی جائیں۔ لیکن اسے میں صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سرسید کو میں سچا مسلمان اور قوم کا ہمدرد سمجھتا ہوں اور صرف ایک معاملے میں ان سے اختلاف ہے اور صاف گوئی اور راست گوئی کا یہ تقاضا تھا کہ اس معاملہ میں ان سے اختلاف کروں اور میں نے اختلاف کیا ہے۔

شعبۂ تعلیم نسواں اور میرا سکریٹری ہونا

1902 کے دسمبر میں دہلی میں شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کا جشن ہوا اور اسی موقع پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ ہونا بھی قرار پایا اور اس جلسے کی صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں کرنے والے تھے۔ تاریخ مقررہ پر کانفرنس کے اجلاس ہوئے اور ایک جلسے میں علیا حضرت

نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال مرحومہ مغفورہ بھی تشریف لائیں۔ کانفرنس کے اجلاس کے پروگرام میں شعبۂ تعلیم نسواں کے جلسے کے لیے کوئی وقت نہیں دیا گیا تھا۔ علیا حضرت آنجہانی کی بارگاہ میں اس سے قبل میں حاضر نہیں ہوا تھا اور نہ مجھے اس بات کا خیال تھا کہ آئندہ جا کر ان ہی کی توجہ سے تعلیم نسواں کی تحریک کو تقویت پہنچے گی۔ اگر مجھ کو یہ خیال ہوتا کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کی اس قدر حامی ہیں تو اس موقع پر ان کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی کوشش کرتا۔

ایک روز شام کے وقت میں نے اپنے دوستوں کو ایک جگہ جمع کیا جن میں جہاں تک مجھے یاد ہے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم، نواب سلطان احمد خاں مرحوم، سید سجاد حیدر صاحب اور بہت سے ایم اے او کالج کے اولڈ بوائز اور نیز دیگر مقامات کے میرے ملنے والے احباب موجود تھے۔ ان کے سامنے میں نے شعبۂ تعلیم نسواں کے زندہ کرنے کی ضرورت بیان کی اور کہا کہ میں اس میں کام کرنا چاہتا ہوں اور میں آپ صاحبان سے خواہش کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس کا سکریٹری مقرر کر دیجیے۔ چونکہ یہ شعبہ برائے نام تھا اور کسی دوسرے صاحب کو اس فضول کام کے خلجان میں پڑنے کا شوق نہیں تھا اس لیے سب نے بالاتفاق مجھے سکریٹری مقرر کر دیا۔

جس روز میں سکریٹری مقرر ہوا اُسی روز سے میں نے اپنا دماغ اس شعبے کے کام کی طرف لگانا شروع کر دیا اور تدبیریں سوچنے لگا کہ کس طرح اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی توجہ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف مبذول کی جائے۔ چنانچہ انھی دنوں میں میں نے عبداللہ بیگم مرحومہ سے کہا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں تم اپنی ملنے والی نوعمر تعلیم یافتہ لڑکیوں سے مشورہ کرو کہ لڑکیوں کی تعلیم و ترقی کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ عبداللہ بیگم مرحومہ نے اپنے گھر پر ایک جلسہ کیا اور اس میں محلے کی بہت سی اور اپنے ملنے والی خواندہ عورتوں کو جمع کیا جن میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ مسز رضاءاللہ نے اور سعید احمد بیگم نے لیا۔

مسز رضاءاللہ مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی کے صاحبزادے کی بیوی ہیں اور سعید احمد بیگم کا سرسید کے خاندان سے کوئی رشتہ تھا جس کی تفصیل مجھ کو یاد نہیں رہی۔ دو ایک ریزولیشن میں نے تیار کر دیے تھے۔ وہ ریزولیشن جلسے کے سامنے عبداللہ بیگم مرحومہ نے پیش کیے اور اکثر حاضرین نے تعلیم نسواں کی حمایت میں تقریریں کیں۔ میں نے یہ تقریریں اور ریزولیشن اور کل

کارروائی ایک الگ رسالے کی شکل میں چھپوا دیے۔ اس کے چھپنے کے بعد محلّہ میں کچھ چرچا ہوا کہ اب تو فرنگیوں کے طریقے اختیار کرنے کی تجویز ہو رہی ہے لڑکیوں کے مدرسے کھلیں گے۔ اور لڑکیاں کھلے منہ مدرسوں میں جایا کریں گی۔

اب اتنا زمانہ گزرنے کے بعد ہر شخص اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ 1902 کے دسمبر کے مہینہ میں جس کو اب قریب نصف صدی ہو چکی ہے، اس وقت لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے کیا خیالات ہوں گے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس جلسے کی وجہ سے عبداللہ بیگم مرحومہ کو تعلیم نسواں میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور مجھ کو زندگی بھر کے لیے ایک بہت ہمدرد مددگار مل گیا۔

1903 کا سارا سال بحث و مباحثہ میں گزر گیا۔ اُس زمانے میں معمولی اسکول کا خیال بھی کسی کے سامنے میں نے ظاہر نہیں کیا۔ سب کہتے تھے کہ ایک نارمل اسکول استانیاں تیار کرنے کے لیے قائم کیا جائے جو استانیاں مسلمانوں کے شریف گھروں میں جا کر مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دیں۔ میں بھی دوسروں کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا، اس لیے اس زمانے کی تمام کارروائیاں اور خط و کتابت اور اخباری مضامین ایک نارمل اسکول ہی کی تائید میں ملیں گے۔ نارمل اسکول کی تحریک 1907 تک جاری رہی لیکن میں اپنے دل میں طے کر چکا تھا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔ نارمل اسکول میں جو لڑکیاں آ کر داخل ہوں گی وہ آخر مڈل تک کی تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہیں اور جب تک ابتدائی اسکول قائم نہ ہوں مڈل تک کی تعلیم کیسے ہوگی۔ میں خاموشی سے کام کیے گیا اور لوگوں کو اطمینان دلاتا رہا کہ موقع آنے دو نارمل اسکول جاری کیا جائے گا۔ اس زمانے میں بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے لیکن زیادہ تر مخالفت ہی میں تھے۔ بحث یہ ہو رہی تھی کہ آج تک اسلامی حکومتوں میں لڑکیوں کے لیے مدارس قائم نہیں کیے گئے لہٰذا ایسے مدارس کا قائم کرنا اسلامی روایات کے بالکل خلاف ہوگا اور ہماری شرافت اس بات کو گوارا نہیں کرے گی کہ لڑکیوں کو مدارس میں بھیجیں۔ ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ مدارس میں ادنیٰ اور اعلیٰ سب خاندانوں کی لڑکیاں پڑھیں گی اور شرفا کی لڑکیوں کو عوام کی لڑکیوں سے ملنا پڑے گا جس کو شرفا پسند نہیں کریں گے۔ سب سے زیادہ رونا پردے کا تھا اور اس پردے کی بحث میں عورتیں بھی حصہ لے رہی تھیں اور کہتی تھیں کہ ہماری شرافت پردے ہی کی وجہ سے قائم تھی۔ اب پردہ اُٹھ جانے کے بعد وہ بھی خاک میں مل

جائے گی۔ ان اعتراضات کا جواب کبھی کبھی میں بھی اخبارات میں دیتا رہا اور نہایت احتیاط سے بحث کرتا رہا تا کہ اشتعال پیدا نہ ہو۔

1903 کے دسمبر میں ممبئی میں کانفرنس کا جلسہ ہوا اور اوّل ہی مرتبہ اس جلسے میں عورتوں کی چلمن کے پیچھے سے کانفرنس کی کارروائی سننے یا دیکھنے کا موقع ملا۔ اس جلسے میں میں نے بہت سے لوگوں سے مشورہ کیا کہ تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے کوئی عملی کام کرنا چاہیے۔ احباب نے یہ مشورہ دیا کہ معمولی کوئی مدرسہ کھولنے کا تو کوئی نام بھی نہ لو بلکہ استانیاں تیار کرنے کے لیے ایک نارمل اسکول قائم کرنے کے لیے ایک ریزولیوشن پیش کرواور یہ جلسہ کو بتاؤ کہ جب تک استانیاں نہیں ہوں گی اس وقت تک لڑکیوں کو تعلیم کون دے گا۔ چنانچہ نارمل اسکول قائم کرنے کا ریزولیوشن پاس ہو گیا، لیکن یہ کہہ دیا گیا کہ یہ نارمل اسکول علی گڑھ میں قائم نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہاں لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ میں نے یہ تو کہہ دیا کہ جہاں اور جس شہر میں بھی اسکول قائم کرو گے وہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں لڑکے پڑھتے ہوں گے پھر علی گڑھ ہی کے لڑکوں میں کون سی خصوصیت ہے کہ اگر وہ کہیں پڑھتے ہوں تو اس ملک یا شہر میں لڑکیوں کو تعلیم نہ دی جائے۔ بہر حال میں نے مان لیا کہ اچھا بھئی اگر علی گڑھ میں مدرسہ جاری نہیں کرنا چاہتے تو کسی دوسری جگہ کرو۔ تعلیم نسواں کے مقاصد کی اشاعت کے لیے اس جلسے میں کچھ تھوڑا سا چندہ بھی جمع ہوا جو 1905 کی زنانہ مصنوعات کی نمائش میں خرچ ہوا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ مدرسہ کس شہر میں قائم کیا جائے۔ مولوی ممتاز علی صاحب اور محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور اور دیگر احباب سے مشورے ہوئے اور میں نے یہ رائے دی کہ یہ مدرسہ اس جگہ قائم ہونا چاہیے جہاں پر اس کے قائم کرنے کی ذمہ داری ایک صاحب لے لیں۔ میں بحیثیت سکریٹری شعبہ تعلیم نسواں مدد دینے کو تیار ہوں۔ مولوی ممتاز علی صاحب ایڈیٹر ''تہذیب نسواں'' اور مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ اس لیے سب حاضرین مجلس شوریٰ نے یہ رائے دی کہ لاہور میں یہ مدرسہ قائم ہونا چاہیے۔ مولوی ممتاز علی صاحب اور محبوب عالم صاحب نے کہا کہ شیخ صاحب علی گڑھ جا کر لکھیں تو ہم اس معاملے پر غور کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ہم کو مالی امداد اس مدرسے کے لیے

کافی مل جائے گی یا نہیں۔ بمبئی میں فیضی خاندان اور جسٹس بدرالدین خاندان کی خواتین نے اپنی ہمدردی اور مدد کا پورا وعدہ کیا تھا اور اس بات کا بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر علی گڑھ میں یا کسی اور مقام پر عورتوں کا کوئی جلسہ ہوگا تو ہم اس میں شرکت کریں گے۔

(عورتوں کا جلسہ 1905 کے دسمبر میں علی گڑھ میں ہوا جس کا مفصل حال اس سے قبل لکھا جا چکا ہے)۔

اب سال 1904 شروع ہوا۔ یہ سال تعلیم نسواں کی تحریک کے لیے نہایت مبارک سال تھا۔ اس سال میں تین بہت ہی اہم کام ہوئے۔ سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ ایک ماہانہ رسالہ ''خاتون'' میں نے علی گڑھ میں اپنی ایڈیٹری میں جاری کیا۔ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت وسیع تھا اور میرے ہاتھ میں کوئی اخبار نہیں تھا جس سے میں اس کی اشاعت کر سکوں اور اس سال کے شروع ہی سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ لاہور میں کوئی مدرسہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ میں نے علی گڑھ آ کر محبوب عالم صاحب اور مولوی ممتاز علی صاحب کو لکھا کہ آپ ایک مدرسہ جاری کرنے کا اہتمام کیجیے میں آپ کو مدد دوں گا۔ دونوں صاحبوں نے اول تو کچھ جواب نہیں دیا اور جب تقاضا کیا تو دونوں ناراض ہو گئے اور لکھا کہ یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے۔ کسی دوسرے مقام پر اگر کوئی صاحب تیار ہوں تو وہاں مدرسہ جاری کر دو لاہور میں نہیں ہو سکتا۔ میں نے عبداللہ بیگم مرحومہ سے مشورہ کیا کہ اگر علی گڑھ میں کوئی مدرسہ قائم کیا جائے تو کچھ کامیابی ہو سکتی ہے یا نہیں، انھوں نے کہا کہ سب سے اول تو دوسری جگہ کوشش کرنی چاہیے کہ لڑکیوں کا مدرسہ علی گڑھ سے باہر کسی مقام پر قائم ہو کیونکہ لوگ مخالفت کریں گے کہ جہاں لڑکوں کی ایک بڑی تعداد بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہو ان کے قرب و جوار میں کوئی لڑکیوں کا مدرسہ بھی قائم کیا جائے اور اگر دوسری جگہ کا کوئی آدمی ہاتھ نہیں دھرے گا تو پھر آپ کہیں گے تو مدرسہ جاری ہو جائے گا میں اور میری بہنیں جو ہم سے ہو سکے گا کریں گے۔

رسالہ ''خاتون'' کا ذکر

بہت غور کے بعد میں نے یہ طے کر لیا کہ مدرسہ لڑکیوں کا علی گڑھ ہی میں جاری کرنا چاہیے۔ لیکن اس مدرسے کے جاری کرنے کے خیال کی پوری اشاعت ہونی چاہیے اور اس کے لیے ایک اخبار کے جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک ماہانہ رسالے کی جاری کرنے کی

تیاری شروع کر دی اور جولائی 1904 میں رسالہ "خاتون" جاری کر دیا۔ اس رسالے کی تمہید عرض حال کے عنوان سے شائع کی گئی تھی جو اس وقت ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

عرض حال

"خیالات اور اعتقادات۔ معاشرت اور سوسائٹی کی حالت میں انقلاب جس شدت اور سرعت کے ساتھ آج کل ہندوستان میں ہو رہا ہے اس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ ہندوستان میں تمدنی انقلابات ہوئے، بہت سے ہوئے مگر آج کل کی سی حالت کبھی نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قدر انقلابات ہوئے وہ بیشتر ہندوستان کے اندرونی پولیٹکل انقلابات یا کسی قوم کے عارضی یا مستقل دست برد اور فتوحات کی بدولت ہوئے۔ آج ہندوؤں کا راج ہے مگر ساعت بہ ساعت حالت میں اختلاف ہے۔ برہموں کا عروج اور زوال، بدھ کی تعلیم و اشاعت وغیرہ ملک میں اپنی اپنی باری قدم جماتے ہیں اور جب وہ وقت آجاتا ہے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔ کل مسلمانوں کا دل بادل ملک کے قریب و بعید حصوں میں پھیلتا جاتا ہے۔ مگر مسلمانوں میں مختلف خاندان حالت اور قوت کے ساتھ برسر حکومت ہیں۔ کبھی خاندان غلامان کا دور دورہ ہے کہیں خلجی اور تغلق پٹھان، کبھی سادات کا بول بالا ہے پھر خاندان مغلیہ کا پرچم ایک مدت تک اڑتا رہتا ہے مگر کس طرح کہ آج بنگال اور کل دکن اور پرسوں گجرات قبضے میں آجاتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔ یکا یک نادر شاہ پہاڑوں میں گرجتا آتا ہے مرہٹوں اور سکھوں کا ستارا چمکتا ہے۔ غرض یہ کہ ان پے در پے واقعات اور مختلف حالتوں کا اثر ہندوستان کی سوسائٹی پر برابر بڑھتا رہا اور وقتاً فوقتاً انقلاب ہوتے رہے مگر ایک تو یہ وجہ کہ اندرونی پولیٹکل انقلابات چونکہ ملکی اقوام کے ہاتھوں ہوئے جو مذہب اور مزاج میں مختلف ہوں مگر عادات اور رسومات میں زیادہ بین فرق نہ تھا اس لیے وہ انقلابات اس قدر اہم نہ تھے جس قدر آج کل ہو رہے ہیں۔ دوسرے بیرونی پولیٹکل اثر جس قدر ہوئے وہ ایشیائی تھے۔ اور عادت و خصائل اور تمدن میں چونکہ قدرتی تقارب اور مشابہت تھی اس لیے بھی انقلابات کا اثر محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان ہندوستان رہتا نہیں معلوم ہوتا۔ اقوام مغربی کے ساتھ تعلقات جو تہذیب کی افتاد اور ترقی کے لحاظ سے ہم لوگوں سے بہت غیر اور ان تعلقات کے ساتھ ان تمام قوتوں کا عمل جو مہذب ملکوں میں ہو رہا تھا مگر جن سے

ہندوستان محفوظ تھا۔ ریل اور تار اور چھاپے کی اشاعت اور کثرت جنھوں نے ہندوستان میں کیا تمام دنیا میں ایسا زبردست اور اس سرعت کے ساتھ انقلاب پیدا کرنے والی تھیں جن کا ہمیں آج تجربہ ہو رہا ہے۔ اس انقلاب کے عمل اور انقلاب کے اثر کے شور وغل سے تھوڑی دیر علاحدہ ہو کر انقلاب کی حالت دیکھنی نہ صرف دلچسپ مطالعہ بلکہ مفید مطلب بات ہے۔ ذرا سی توجہ دکھائی دیتی ہے کہ ہم مسلمان چونکہ دیر کر کے اپنی ضرورتوں اور اپنی حالت سمجھنے کے لیے بیدار ہوئے ہیں ابھی تک انقلاب کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ نہیں لے سکے ہیں اور کافی تجربہ حاصل نہیں کیا ہے۔ اس لیے ہماری حالت بہت مخدوش ہے۔ خدا جانے دوران انقلاب ہم پر کیا اثر ہو، انقلاب کی موجیں ہمیں تھپیڑے مار کر کہاں لے جائیں، دریائے شور ناپیدا کنار میں یا سکون وعافیت کے کنارے خدا جانے ہم پر کیا گزرے، شعر:

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غرض یہ کہ بڑی مشکل کا سامنا ہے اور بڑی ہوشیاری سے کام کرنے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے وقت ہماری بدقسمتی ایک معنی میں خوش قسمتی بھی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ہندوستان کی ترقی میں دیر کر کے حصہ لینا ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہندوستان کی اور قوموں کے تجربے سے جو ہم سے پہلے سے ترقی میں حصہ لے رہی ہیں ہم فائدہ اٹھائیں۔ جن باتوں نے ان کو نقصان پہنچایا ہے اور جن کے اختیار کرنے سے ہمیں بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے ان سے احتراز کریں اور جن باتوں نے ان کو فائدہ پہنچایا ہے اور جو ہمارے لیے بھی مفید بن سکتی ہیں ان کو اختیار کریں۔ اس وقت مسلمان مردوں کی اصلاح، فلاح اور ترقی کے لیے تھوڑا بہت سامان موجود ہے مگر مسلمان عورتوں کے لیے کوئی مستقل اور قابل وقعت انتظام نہیں ہے۔ بحیثیت انسان وہ ہماری توجہ اور غور کی مستحق ہیں۔ بحیثیت مسلمان وہ ہماری ہمدردی کی حق دار ہیں اور بحیثیت عورتوں کے یعنی ہماری شریک حال اور چولی دامن کا ساتھ ہونے کی حیثیت میں ان کا اور ہمارا معاملہ ایک ہے کچھ جدا نہیں۔ جس قدر مردوں کی حالت پر توجہ کی ضرورت ہے اسی قدر عورتوں کی حالت پر ہم نے اس ضرورت کا لحاظ کرنا اپنا فرض سمجھا ہے اور ہم نے اپنا فرض ادا کرنے کی صورت میں رسالہ 'خاتون' کا جاری کرنا قرار دیا ہے۔ 'خاتون' ایک ماہانہ رسالہ ہوگا جس

میں صرف عورتوں کے متعلق مضامین ہوں گے۔

تعلیم نسواں کی ضرورت مختلف پیرایوں سے ثابت کرنے کے علاوہ ہماری بڑی کوشش یہ بھی ہوگی کہ ہم عورتوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کی جوان کی ذات ا ن کی حالت کے مناسب ہوں گے اشاعت کریں۔ان میں صحیح مذاق پیدا کریں۔ان میں ان ں اور اعلیٰ قوتوں کو ترقی دیں جوان سے مخصوص اور دنیا کے لیے نعمت اور ہماری قومی ترقی کے لیے ی ضروری ہیں۔ ہم اپنے مقاصد میں کامیابی کا وعدہ نہیں کر سکتے مگر اتنا وعدہ ضرور کر سکتے ہیں کہ کامیابی کے لیے جس قسم کی اور جس قدر کوشش درکار ہوگی اس میں ہم کبھی غافل نہیں رہیں گے۔کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب ہماری کوشش کے ساتھ پبلک کی ہمدردی ہو،محض زبانی ہمدردی نہیں بلکہ ہمدردی کی خلوص کے ساتھ نیت اور اس کا عملی ثبوت میسر ہو۔ہم نے نظر برحال موجودہ 'خاتون' کا سالانہ چندہ تین روپے قرار دیا ہے۔عمدہ کاغذ اور چھپائی کا انتظام کیا ہے اور رسالہ کا حجم بالفعل 84 رصفحہ رکھا ہے۔جس وقت تین سو خریدار ہو جائیں گے اس وقت ہم حجم بھی بڑھادیں گے۔

انشاءاللہ المستعان وعلیہ التکلان

ایڈیٹر ماہ ربیع الثانی 1332 ہجری مطابق جولائی 1904"

رسالہ 'خاتون' جاری ہونے کے بعد ہمعصر اخبارات کی طرف سے اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ہم نے ایک رسالے میں کسی کتاب سے ایک مضمون نقل کیا۔مولوی ممتاز علی صاحب ایڈیٹر "تہذیب نسواں" نے ایک اعتراض اٹھایا کہ ایڈیٹر صاحب کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے اور اس میں سے کچھ عبارتوں کے حوالے دیے جس میں مصنف نے عامیانہ زبان میں اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں تھی۔لیکن کیونکہ مولوی صاحب موصوف کے خیال میں آ گیا ہوگا کہ ہم اس رسالے پر اعتراض کریں اس لیے انھوں نے اعتراضات کی بھرمار کردی اور اخبارات نے بھی مخالفانہ مضمون لکھے۔نواب محسن الملک کو لکھا کہ اس رسالے کو بند کرادیجیے،اس کی وجہ سے کالج کو نقصان پہنچے گا۔نواب صاحب نے مجھے وہ خط دکھایا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اب تک جتنے رسالے نکل چکے ہیں ان کو خود ملاحظہ فرمالیجیے اور اگر ان میں کوئی قابل اعتراض بات ہو تو آئندہ احتیاط کی جائے گی کہ ایسی باتیں رسالے میں نہ آئیں۔

نواب صاحب نے ماہواری رسالوں میں سے جستہ جستہ مضامین کو ملاحظہ فرمایا اور کہا کہ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے کالج کو نقصان پہنچے۔ میں نے عرض کیا کہ لوگوں کا منہ اس وقت تک بند نہ ہوگا جب تک آپ کا کوئی مضمون رسالے میں نہ چھپ جائے۔ چنانچہ نواب صاحب مرحوم نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ دیا جو رسالے میں چھپ گیا جس سے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ رسالہ آنریری سکریٹری کالج کی رائے کے خلاف جاری نہیں ہوا بلکہ وہ بھی اس کے جاری کرنے سے متفق ہیں اور اس میں اپنے مضامین بھی چھپواتے ہیں۔ نواب صاحب کا مضمون شائع ہونے کے بعد معترضین کا منہ بند ہو گیا اور رسالہ جاری ہی نہیں رہا بلکہ اس کو بہت فروغ ہوا۔ اس کے ذریعے سے جس قدر اچھا لٹریچر عورتوں کے پڑھنے کے لیے جمع ہو گیا اس قدر لٹریچر اس سے قبل کبھی یکجا نہیں ہوا تھا۔ علاوہ اچھا لٹریچر بہم پہنچانے کے اس رسالے نے تعلیم نسواں کے مقصد کی اس قدر اشاعت کی کہ چاروں طرف سے تعلیم نسواں کی ضرورت کے متعلق آواز بلند ہونے لگی۔ یہ رسالہ 1914 تک جاری رہا۔ اس کے بعد نہ مجھ کو فرصت تھی اور نہ تعلیم نسواں کی اشاعت کی ضرورت رہی۔ جس غرض سے یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا وہ غرض ایک بڑی حد تک پوری ہو گئی تھی۔

ہم نے اوپر لکھا تھا کہ 1904 میں تین اہم واقعات قابل ذکر پیش آئے جن میں ہر ایک تعلیم نسواں کی تحریک کے قدم آگے بڑھانے میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایک قدم کی نسبت ذکر ہو چکا ہے اور وہ قدم رسالہ خاتون کا جاری کرنا تھا۔

بیگم صاحبہ بھوپال

دوسرا قدم بڑا ہی مبارک قدم تھا اور وہ یہ تھا کہ میں نے قریب ماہ نومبر 1904 کے ایک درخواست علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ مغفورہ والی بھوپال کے یہاں بھیجی کہ ہم علی گڑھ میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں آپ ہماری دستگیری فرمایئے اور یہ بھی لکھا کہ ہندوستان کی عورتیں جہالت کی تاریکی میں پڑی ہوئی ہیں اور اپنے جائز حقوق بھی حاصل نہیں کر سکتی ہیں۔ اس زمانے میں آپ کل دنیا کی عورتوں میں تنہا ایک ریاست کی حکمراں ہیں اور کوئی دوسری عورت اس وقت اس قدر اعلیٰ مرتبے کی مالک دکھائی نہیں دے رہی ہے جیسی کہ آپ ہیں۔ اگر آپ کے زمانے میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ ہوئی تو پھر ان کی کبھی بھی پرسش نہیں

ہوگی۔ اتفاق وقت سے اور تعلیم نسواں کی خوش قسمتی سے جس وقت میری یہ درخواست علیا حضرت کے دربار میں پہنچی اس وقت مولوی نظام الدین حسن صاحب سابق جج حیدرآباد ہائی کورٹ اور حال وزیر کونسل بھوپال وہاں پر موجود تھے۔ ان سے علیا حضرت نے اس معاملے میں مشورہ کیا تو انھوں نے بڑے زور سے میری درخواست کی تائید کی۔ اس پر علیا حضرت نے سو روپیہ مہینہ کی امداد ایک مدرسے کے لیے جو آئندہ کھلنے والا تھا منظور فرمائی۔ جب اس گرانٹ کی منظوری کی اطلاع یہاں پہنچی تو میں نے کچہری میں جہاں پر مجھے لفافہ ملا اپنے دوستوں سے ذکر کیا۔ ان دوستوں میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم سب سے زیادہ عورتوں کی تعلیم کے موافق تھے۔ لیکن علی گڑھ میں اسکول قائم کرنے کا خیال انھوں نے بھی پسند نہیں کیا۔ میں نے ان سے وہیں کہہ دیا کہ کوئی پسند کرے یا نہ کرے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ علی گڑھ ہی میں قائم ہوگا۔ آج اس کا سنگ بنیاد پڑ گیا ہے کہ چھوٹا سا مدرسہ کھولنے کے لیے ایک مستقل ماہانہ امداد مل گئی ہے۔ یہ اطلاع بھوپال سے مجھے ایسے وقت میں ملی تھی کہ دوسرے روز میں لکھنؤ کانفرنس کی شرکت کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جہاں تک مجھے خیال ہے 12 یا 22 دسمبر 1904 کو یہ خط مجھے ملا تھا۔ ممکن ہے کہ تاریخوں میں غلطی کرتا ہوں لیکن یہ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس کے اجلاس سے کچھ دن قبل ہی مجھے یہ خط ملا تھا۔ میں نے گھر جا کر عبداللہ بیگم کو وہ خط دکھایا۔ عبداللہ بیگم نے خط لے کر پڑھا اور اپنی جیب میں رکھ لیا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور وضو کر کے شکرانے کے دو نفل ادا کیے۔ لوٹ کر آئیں تو ہنس کر کہا کہ اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے کیونکہ آپ کی کوشش کا پھل ابھی سے آپ کو مل رہا ہے۔

اس کے بعد میں لکھنؤ گیا اور وہاں جا کر راجہ صاحب جہانگیرآباد کی کوٹھی پر نواب محسن الملک سے ملاقات ہوئی۔ میں نے نواب صاحب موصوف سے بھوپال کی امداد کا ذکر کیا اور بھوپال کا خط ان کو دکھایا۔ مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ نواب صاحب بھی علی گڑھ میں کسی مدرسے کے قائم ہونے کے موافق ہوں گے لیکن نواب صاحب نے اس وقت ایک ایسا کام کیا جس سے حاضرین جلسے کے اوپر یہ اثر ہوا کہ میں نواب صاحب کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر رہا ہوں۔ انھوں نے اپنے غصے کے اظہار کی یہ صورت نکالی کہ اپنی ترکی ٹوپی اتار کر صحن میں پھینک

دی اور فرمایا کہ پہلے ہی لوگ کالج کے مخالف تھے اب جب سنیں گے کہ علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ بھی جاری ہو رہا ہے تو ان کی مخالفت کی آگ اور بھی مشتعل ہو جائے گی۔ میں بیٹھا ہوا ان کی باتیں سنتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد جب ان کے غصے میں کچھ کمی ہوئی تو اٹھ کر گیا اور ان کی ٹوپی جا کر اٹھالایا اور لا کر ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ گاڑی میں سوار ہوئے اور میں بھی جا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے رستے میں ان سے کہا کہ نواب صاحب اگر آپ اس کی مخالفت کریں گے تو جدید نسل کے لوگ آپ کے بہت خلاف ہو جائیں گے۔ سب لوگ چاہتے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دلائی جائے۔ آپ نے پہلے تو کبھی مخالفت نہیں کی تھی لیکن آج آپ نے بہت مخالفت کی ہے۔ مجھ سے یہ سن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا کہ تم اپنا کام کیے جاؤ، میں نے اپنا کام کیا ہے تمھارا کام تو نہیں کیا اس کی بہت ضرورت تھی کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں کسی مدرسے کے قائم کرنے کا حامی نہیں ہوں۔ تین روز تک برابر کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے۔ میں تعلیم نسواں کا جلسہ کرنا چاہتا تھا لیکن کہیں جگہ نہیں ملتی تھی۔ قیصر باغ کی بارہ دری کے قریب ایک چھوٹی سی عمارت لائبریری کے نام سے مشہور تھی میں نے منتظمین سے درخواست کر کے وہ عمارت اپنے جلسے کے لیے لے لی۔ سر تھیوڈر ماریسن بھی ابھی ہندوستان ہی میں تھے۔ مسٹر شاہ دین جو لاہور کے بڑے بیرسٹروں میں سے تھے انھوں نے جلسے کی صدارت فرمائی اور میں نے ڈیڑھ دو سو آدمیوں کو جمع کر لیا اور شام کے وقت تعلیم نسواں کا جلسہ کرا دیا اور اس جلسے میں ایک ریزولیوشن پیش کیا کہ علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ قائم ہو۔ کچھ لوگ مخالفت کے لیے آئے لیکن مسٹر شاہ دین اور سر تھیوڈور ماریسن اور دوسرے مقتدر اشخاص کو دیکھ کر کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ مخالفت کرے۔ اور جو ریزولیوشن میں نے پیش کیا تھا وہ بلا کسی اختلاف کے پاس ہو گیا۔ تعلیم نسواں کی تحریک کے سلسلہ میں 1904 میں یہ تیسرا اہم واقعہ تھا جو عمل میں آیا اور اب آگے بڑھنے کی امیدیں اور مضبوط ہو گئیں۔

1905 میں رسالہ خاتون کی اشاعت بہت بڑھ گئی اور عورتوں کے نہایت اچھے اچھے مضامین سب جگہ سے آنے لگے۔ اس زمانے میں کچھ ہمارے طالب علم جیسے عبدالرحمان بجنوری مرحوم، ڈاکٹر سید محمود اور عبدالرحمان صدیقی مرحوم، خان بہادر سید بنیاد حسین مرحوم چندہ جمع کرنے کی غرض سے باہر جانے لگے اور روپیہ بھی آنے لگا۔ کتابوں میں ملے گا کہ جب چندہ جمع کرنے کا

ارادہ ہوا تو سب سے اوّل میں نے اپنی ایک چھوٹی سی رقم پچاس روپے کے چندے میں دے دی اس کے بعد جو چندے کی رقمیں آتی گئیں وہ نواب محسن الملک مرحوم کے مشورے سے ایم اے او کالج کے اکاؤنٹ آفس میں جمع کرنے لگا۔ میرے پاس نہ اس وقت کوئی خزانچی تھا اور نہ مددگار تھا۔ اور روپے کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے اس لیے روپیہ اپنے قبضے میں رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ جب روپیہ آنے لگا اور بھوپال سے بھی ایک سال کی گرانٹ بارہ سو روپے آگئے تو پھر اسکول کے لیے کوئی جگہ تجویز کرنے کا خیال دامن گیر ہوگیا۔ شہر کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور خود بھی جا جا کر دیکھا لیکن کوئی مناسب جگہ نظر نہ آئی۔

اسی سال کا واقعہ ہے کہ میں شام کو کچہری کے بعد حسب عادت ہوا خوری کے لیے نکل گیا اور چلتے چلتے اس مقام پر پہنچا جہاں اب گرلس ہائی اسکول اور گرلس کالج کی عمارات قائم ہوگئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اسی مقام پر ایک نہایت گنجان باغ تھا جس میں آم، کھرنی، نیم، پیپل، برگد، شیشم وغیرہ کے بڑے بڑے پرانے درخت تھے۔ اس وقت اس باغ تک آنے کا چاروں طرف سے کوئی رستہ نہیں تھا۔ قریب سے قریب حاجی مصطفیٰ خاں صاحب رئیس بوڑہ گاؤں کی کنکر والی کوٹھی تھی اور اس کے ملحق حاجی موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاولی نے یا تو اپنی کوٹھی بنانے کے لیے زمین خرید لی تھی یا ان کی کوٹھی زیر تعمیر تھی اس کا صحیح خیال حافظہ میں نہیں ہے۔

جب میں اس باغ کے اندر گھسا تو ایک درخت میں نے دیکھا جو بہت ہی گھنا اور شاداب تھا اور اس کے پتوں میں سے چھن کر دھوپ زمین تک نہیں پہنچتی تھی ایسے درخت کو صحیح معنوں میں سایہ دار درخت کہہ سکتے ہیں۔ اس درخت کا نام نہ مجھے اس وقت معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے لیکن درخت بہت اچھا معلوم ہوا اور میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر اس باغ کا کوئی ٹکڑا یا کل باغ مل جائے تو اس میں اپنی کوٹھی بنالوں اور اس درخت کے نیچے ہم لوگ بیٹھا کریں۔ اس کی شادابی اور گھنے سایہ کا لطف اٹھائیں۔ میں اس باغ سے ہوتا ہوا کھیتوں کھیتوں ہردوا گنج کی سڑک پر پہنچا جو بہت ہی بری حالت میں تھی۔ بڑے بڑے گڑھے اس میں پڑے ہوئے تھے۔ یکّے اور گاڑیوں کا اس پر چلنا دشوار تھا اور اب قریب نصف صدی گزرنے کے بعد مجھ کو اس کی شہادت دینی پڑتی ہے کہ اس بدنصیب سڑک کو دوسری سڑکوں کے مقابلے میں کوئی اچھی

سڑک نہیں کہہ سکتے ۔علی گڑھ کی میونسپلٹی کیا اور یو۔پی کے دوسرے شہروں کی میونسپلٹی کیا سب کی ایک ہی حالت ہے۔

شام کے وقت میں گھر پہنچا۔دوسرے روز صبح کو جب میں دفتر میں گیا تو سب سے پہلے لالہ للتا پرشاد کایستھ جن کا ایک مقدمہ ان دنوں میری وکالت میں لڑ رہا تھا دفتر میں آئے۔ باتوں باتوں میں میں نے اپنی کوٹھی کے لیے زمین کا مسئلہ چھیڑا۔ان سے کہا کہ آپ کہاں کے زمین دار ہیں۔مجھے کہیں کوئی زمین کا ٹکڑا دلوا دیجیے تا کہ میں اس میں اپنا مکان بنواؤں۔انھوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ ہمارا ایک بہت پرانا باغ میٹھی کھڑکی کی طرف کنکر والی کوٹھی کے آگے واقع ہے جس کو نانک رائے کا باغ کہتے ہیں اگر آپ اس کو خریدنا چاہیں تو ہم اس کو آپ کے ہاتھ بیچ دیں۔اتا پتہ اچھی طرح دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہی باغ ہے جس کو کل میں نے دیکھا تھا۔اس کی خریداری کی بات چیت ہوتی رہی اور آخر کار ساڑھے انیس سو روپے میں تیرہ بیگہ زمین کا معاملہ مع باغ کے طے ہو گیا۔ان دنوں زمین بہت سستی تھی تاہم اس قیمت پر نہ اتنا رقبہ مل سکتا تھا اور نہ اس کے ساتھ باغ مل سکتا تھا۔میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ مجھے تو کوئی اور زمین بھی شہر کے قریب مل جائے گی اس وقت مدرسہ قائم کرنے کے لیے ایک زمین کی بہت ضرورت ہے اور یہ زمین بھی سستی مل رہی ہے اس لیے اس کو لڑکیوں کے مدرسے کے لیے خرید لیا جائے۔لوگوں نے منع کیا کہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔یہ ایک بڑے فائدے کی چیز آپ کو ملی تھی اس میں ہزاروں روپے کی تو لکڑی ہوگی۔پھر آپ اپنے نام بیع کیوں نہیں کراتے۔لیکن میں نے جو ارادہ کر لیا تھا اُسے پورا کیا اور گرلس اسکول کے لیے سکریٹری شعبہ تعلیم نسواں کے نام سے اپنے حق میں بیع کرا لیا۔یہ زمین بڑی بھاگوان نکلی۔اس کی لکڑی جب بعد میں نیلام کی گئی تو پانچ ہزار ایک سو روپے کو فروخت ہوئی۔بہت دنوں تک بہت سے لوگ لکڑی خریدتے رہے اور آخر کو جو رقم بہ رقعات وصول ہوئی اس کی تعداد دفتر کے کلرک نے مجھے پانچ ہزار ایک سو روپے بتائی۔اس سال یعنی 1950 میں اور بھی ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے تحریک تعلیم نسواں میں روز بروز جان پڑتی گئی اور زیادہ قوت حاصل ہوتی رہی۔

اس سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ علی گڑھ میں ہونا قرار پایا اور میں نے

ایک لیڈیز کانفرنس کا جلسہ منعقد کرنا طے کر لیا اور اس کے ساتھ زنانہ مصنوعات کی نمائش کا بھی ایک بڑے پیمانے پر انتظام کیا۔ تعطیل کلاں میں میں ممبئی گیا تو جسٹس بدرالدین صاحب اور فیضی خاندان کی خواتین سے وعدہ لے کر آیا کہ وہ لیڈیز کانفرنس میں ضرور شریک ہوں گی۔ اس لیڈیز کانفرنس کا مفصل طور پر ذکر اوپر آ چکا ہے اس لیے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سال کانفرنس کا جلسہ تعلیم نسواں کے حق میں بہت ہمت افزا اور مفید ثابت ہوا اور اس کانفرنس میں مولانا شوکت علی صاحب مرحوم نے جو حملہ مجھ پر کیا اس واقعہ کی تمام ملک میں بہت زیادہ شہرت ہو گئی اور میرے لیے لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ تو تعلیم نسواں پر اپنی جان دینے کو بھی تیار ہے اس لیے اس کی بات سننا ہمارا فرض ہے۔

1906 کا ایک اہم واقعہ یعنی لیفٹیننٹ گورنر یو۔ پی کی خدمت میں تعلیم نسواں کا پہلا ڈیپوٹیشن

اب 1906 کا سال شروع ہوا اور تعلیم نسواں کی شاہراہ میں اگر اور واقعات نشان راہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو اس سال کا واقعہ جو اب بیان کیا جاتا ہے ایک مینار کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیشہ اسی حیثیت سے یاد رہے گا۔ اس سال میں نے نہایت ہی ہمت اور جرأت سے کام لیا اور لیفٹیننٹ گورنر بہادر یو پی کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجی کہ ہماری قوم میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے اس قدر غفلت کی جا رہی ہے کہ ملک کے کسی حصے میں کہیں بھی ایک مدرسہ بھی نہیں ہے۔ ہم علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن بلا گورنمنٹ کی دستگیری کے کامیابی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ ہم گورنمنٹ سے مدرسے کے لیے امداد حاصل کرنے کے لیے ایک عرضداشت ایک ڈیپوٹیشن کے ذریعہ سے حضور کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ہم ڈیپوٹیشن لے کر حاضر ہوں۔ وہاں سے اجازت آ گئی کہ ڈیپوٹیشن لے کر ضرور آ سکتے ہو اور یہ بتاؤ کہ ڈیپوٹیشن میں کون کون صاحب آئیں گے۔ میں نے سب دوستوں سے اور بزرگوں سے خواہش کی کہ وہ میرے ساتھ ڈیپوٹیشن میں چلیں اور عرضداشت پیش کریں۔ میرے خطوط کے جواب میں مندرجہ ذیل معززین نے ڈیپوٹیشن میں اپنی شرکت کی منظوری دے دی کہ ہم ضرور شریک ہوں گے:

(1) نواب محسن الملک مرحوم آنریری سکریٹری ایم اے او کالج علی گڑھ

(2) نواب سر فیاض علی خاں صاحب مرحوم پریذیڈنٹ بورڈ آف ٹرسٹیان ایم اے او کالج علی گڑھ

(3) نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب رئیس اعظم بھیکم پور

(4) نواب راجہ سر تصدق رسول خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد

(5) مہاراجہ سر علی محمد خاں صاحب آف محمود آباد

(6) صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب علی گڑھ

(7) راجہ نوشاد علی خاں صاحب جہانگیر آباد

(8) مولوی محمد وسیم صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ

(9) خواجہ غلام الثقلین صاحب وکیل لکھنؤ

ان صاحبان کی منظوری آتے ہی میں نے لفٹیننٹ گورنر سر جیمس لاٹوش کو لکھ دیا کہ جن صاحبان نے ڈیپوٹیشن میں آنے کی منظوری دی ہے ان کے نام یہ ہیں اور جو تاریخ حضور مقرر فرمائیں گے ڈیپوٹیشن حاضر ہوگا۔ چنانچہ وہاں سے 6 راگست 1906 کی تاریخ مقرر ہوگئی اور میں نے تاریخ مقررہ سے مذکورہ بالا صاحبان کو اطلاع دے دی۔

جب ڈیپوٹیشن کے جانے کا وقت قریب آیا تو میں نے سب صاحبان کو یاد دہانی کے لیے خطوط روانہ کیے کہ تاریخ مقررہ پر آپ صاحبان لکھنؤ پہنچ جایئے۔ ڈیپوٹیشن کی تاریخ 6 راگست 1906 مقرر ہوئی ہے۔ اس کے جواب میں ہر ایک نے کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ کر کے جانے سے انکار کر دیا۔ کسی نے تو بیماری کا بہانہ کر دیا اور کسی نے دوسرے کاموں کا بہانہ کر کے جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے سب کو لکھ دیا کہ آپ کے فرمانے سے میں نے لاٹ صاحب کو لکھ دیا تھا کہ آپ تشریف لائیں گے۔ آپ کے خطوط میرے پاس موجود ہیں میں نے کوئی بات اپنے پاس سے لاٹ صاحب کو نہیں لکھی تھی۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ آپ وعدے کے موافق تشریف لے چلیں لیکن آپ نہ چلیں تو میرا آپ پر کوئی زور نہیں ہے کہ میں زبردستی آپ کو لے چلوں۔ مجھ کو تاریخ مقررہ پر حاضر ہونا تھا خواہ کوئی جاتا یا نہ جاتا اس لیے دو روز قبل میں لکھنؤ پہنچ گیا۔ وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ نواب سر فیاض علی خاں صاحب لکھنؤ آ گئے ہیں لیکن وہ ڈیپوٹیشن میں شریک ہونا نہیں چاہتے اور راجہ سر تصدق رسول خاں صاحب جہانگیر آباد کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ نواب سر فیاض علی خاں صاحب اس

وجہ سے تامل کر رہے ہیں کہ اگر لاٹ صاحب ہم سے پوچھیں گے کہ تم نے خود لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کیا کیا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ کیونکہ ہم نے تو اس وقت تک کچھ نہیں کیا ہے۔

راجہ صاحب جہانگیر آباد کی زبان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کے وفد کے ساتھ یہ شرط لازمی ہوتی ہے کہ کوئی معتبر لیڈر اس کو لے جائے اور لاٹ صاحب کے سامنے لے جا کر سب کو پیش کرے۔ میں نے راجہ صاحب جہانگیر آباد سے عرض کیا کہ سر فیاض علی خاں صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں ضرور آئیں گے آپ کو تو ضرور آنا ہی چاہیے کیونکہ آپ کے وعدے کا یہ خط موجود ہے انھوں نے جواب دیا کہ میں گورنمنٹ ہاؤس میں ضرور آؤں گا لیکن اگر نواب سر فیاض علی خاں صاحب نہ ہوئے تو میں ڈیپوٹیشن میں شریک نہیں ہوں گا۔ وہاں سے اٹھ کر میں نواب سر فیاض علی خاں صاحب کی تلاش میں ہوٹل میں گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ابھی کہیں چلے گئے ہیں کیونکہ ڈیپوٹیشن کا وقت قریب آ گیا تھا اس لیے میں واپس چلا آیا اور مولوی محمد وسیم صاحب راجہ نوشاد علی صاحب اور خواجہ غلام الثقلین صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر مقررہ وقت پر گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچ گیا وہاں جا کر معلوم کیا کہ نواب سر فیاض علی خاں صاحب اور راجہ صاحب جہانگیر آباد آئے یا نہیں آئے معلوم ہوا کہ نہیں آئے۔ میں نے لاٹ صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری سے پندرہ منٹ کی مہلت مانگی لاٹ صاحب نے منظور کر لی کہ پندرہ منٹ تک انتظار کیا جائے۔ اس وقت لکھنؤ میں موسلا دھار مینھ برس رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد راجہ صاحب جہانگیر آباد اپنی فٹن میں بیٹھ کر آئے اور دریافت کیا کہ نواب سر فیاض علی خاں صاحب آئے یا نہیں یہ معلوم کر کے نواب سر فیاض علی خاں ابھی نہیں آئے انھوں نے کوچوان کو حکم دیا کہ چلو، راجہ صاحب کی فٹن ادھر سے آئی اور اُدھر نکل گئی اور اب پندرہ منٹ کا بھی وقت ختم ہو گیا۔

راجہ نوشاد علی خاں صاحب نے کہا کہ چلو چل کر ان لوگوں کے خطوط دکھا دو کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا اور وعدہ خلافی کی ہے۔ میں نے کہا کہ چلیے کوئی بات تو کہیں گے۔ جب ہم لوگ لیفٹیننٹ گورنر صاحب کی خدمت میں پہنچے تو پہلا سوال جو گورنر صاحب نے کیا وہ یہ تھا کہ اتنے بڑے بڑے لوگ جنھوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا وہ کیوں نہیں آئے۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک کے اس زمانے کے لوگوں کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ جس بات میں گورنمنٹ کی توجہ ہوتی ہے تو وہ

اس میں دلچسپی لیتے ہیں اور اگر گورنمنٹ کی توجہ نہیں ہوتی تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام اس قابل نہیں ہے کہ اس میں ہم کچھ حصہ لیں۔

سرسید احمد خاں نے جب ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی اور اس کا کام شروع کیا تو اول اول مسلمان رؤسا اور عوام ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے تھے لیکن جب سر جان اسٹریچی اور سر آکلینڈ کولون وغیرہ نے سرسید کے کام کی طرف توجہ کی تو مسلمان رؤسا ان کے ساتھ ہو لیے۔ یہی حالت مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی ہے۔ اگر حضور اعلیٰ تھوڑی سی توجہ مبذول فرمائیں گے تو ہمارے رؤسا جو آج ڈیپوٹیشن میں بھی شریک نہیں ہوئے وہ دوڑ دوڑ کر آئیں گے اور آ کر حضور سے عرض کریں گے کہ ہم تو دل سے اس تحریک کے ساتھ ہیں۔

میری یہ گفتگو لفٹیننٹ گورنر سن کر ہنس پڑے اور کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ ہمارا ہی قصور ہے کہ اب تک ہم نے کوئی توجہ نہیں کی اس لیے مسلمان بھی اس سے لاپرواہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے عرض کیا یہ ایک عرض داشت تیار کی گئی تھی اور اس پر گیارہ آدمیوں کے نام تھے۔ اب وہ لوگ نہیں آئے تو میں یہ عرض داشت حضور کے سامنے رکھتا ہوں اور جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے زبانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے جدید تعلیم کی ابتدا اور انتہا اور ترقی پر چند باتیں بطور تمہید کے عرض کیں اور پھر یہ عرض کیا کہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے لاپرواہی کر رہے ہیں اور ان کے مولوی صاحبان مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اور ان کے ساتھ حضور اعلیٰ اور ہمارے جملہ انگریزی حکام اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمان اس بارے میں غلطی کر رہے ہیں جیسے کہ محکمۂ تعلیمات کی رپورٹوں سے ثابت ہے۔ اب ہم نے علی گڑھ میں ایک کام شروع کیا ہے۔ علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والئی بھوپال ہمارے ساتھ ہیں اور بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اب فقط اس کی کمی ہے کہ گورنمنٹ نے اب تک اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ اب ہم حضور والا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہماری دستگیری فرمائیے تا کہ ہم لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام کر سکیں۔

میری گفتگو سن کر سر جیمس لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر نے فرمایا کہ کیا تمھارے پاس کوئی مدرسہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ افسوس ہے اس وقت کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ مدرسہ ہم جاری کرنا

چاہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ بلا مدرسے کے تو کوئی گرانٹ ملنے کا قاعدہ نہیں ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ جا کر کوئی مدرسہ قائم کیجیے اور پھر اس کی رپورٹ ہم کو کیجیے۔ میں کسی انسپکٹریس کو بھیج دوں گا۔ اس کے بعد اس کی رپورٹ کے مطابق گورنمنٹ جو کر سکے گی کرے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے کہ آپ ایک اچھا کام کرنا چاہتے ہیں لیکن لوگ آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔

اس کے بعد وہاں سے رخصت ہو کر میں مع مولوی احتشام الدین صاحب اور مسٹر عظمت علی صاحب جو علی گڑھ سے میرے ہمراہ گئے تھے شہر میں کسی استانی کی تلاش میں نکلے۔ مینہ بہت زور کا برس رہا تھا۔ درباری کپڑے پہن کر گورنمنٹ ہاؤس سے سیدھا چلا آیا۔ وہاں پر پانی اس قدر جمع تھا کہ کپڑے اور پتلون سب بھیگ گئے۔ ہم ایک استانی کی تلاش میں شہر پہنچے جن سے پہلے کچھ خط و کتابت ہوئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ اگر نام کو بھی کوئی استانی مل جائے اور کچھ بھی نہ کرے بیٹھی رہے تب بھی عبداللہ بیگم اور ان کی ہمشیرگان ایک ابتدائی مدرسہ قائم کر سکیں گی۔ ہم اس پتے پر پہنچے جو خط و کتابت سے ہم کو معلوم تھا۔ وہاں ایک حکیم صاحب رہتے تھے۔ اس گلی میں پہنچے تو ایک بڈھے میاں برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہم نے حکیم صاحب کی نسبت پوچھا کہ کہاں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ میں ہی ہوں۔ ہم نے پوچھا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر رقیہ بیگم رہتی ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ڈاکٹر وغیرہ کو تو میں نہیں جانتا ایک عورت وہاں سامنے رہتی ہے۔ ہم اس سامنے والے مکان پر گئے اور وہاں برآمدے کی دیوار پر ایک ڈھولک لٹکی ہوئی دیکھی۔ مولوی احتشام الدین علی صاحب نے فرمایا کہ یہ تو کوئی نیک فال نہیں ہے۔ جب اس سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ ایک معمولی شُد بُد جاننے والی عورت ہے۔ اور ادھر اُدھر آیا جایا کرتی ہے اور کسی ایک جگہ استقلال سے نہیں رہتی اور نہ اسے ایک جگہ رہنا نصیب ہوا۔ اس لیے ہم وہاں سے چلے آئے اور پھر لکھنؤ میں ٹھہرنے کا کوئی کام نہیں تھا۔ گاڑی میں سوار ہو کر علی گڑھ پہنچ گئے۔ یہاں آکر استانی کی تلاش میں عبداللہ بیگم کو لے کر میں دہلی گیا۔ لیکن وہاں بھی کوئی تعلیم یافتہ خدا کی بندی نہیں ملی جو علی گڑھ آنے کے لیے تیار ہو۔

اس میں دلچسپی لیتے ہیں اور اگر گورنمنٹ کی توجہ نہیں ہوتی تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام اس قابل نہیں ہے کہ اس میں ہم کچھ حصہ لیں۔

سر سید احمد خاں نے جب ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی اور اس کا کام شروع کیا تو اول اول مسلمان رؤسا اور عوام ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے تھے لیکن جب سر جان اسٹریچی اور سر آکلینڈ کولون وغیرہ نے سر سید کے کام کی طرف توجہ کی تو مسلمان رؤسا ان کے ساتھ ہو لیے۔ یہی حالت مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی ہے۔ اگر حضور اعلیٰ تھوڑی سی توجہ مبذول فرمائیں گے تو ہمارے رؤسا جو آج ڈیپوٹیشن میں بھی شریک نہیں ہوئے وہ دوڑ دوڑ کر آئیں گے اور آکر حضور سے عرض کریں گے کہ ہم تو دل سے اس تحریک کے ساتھ ہیں۔

میری یہ گفتگو لفٹیننٹ گورنر سن کر ہنس پڑے اور کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ ہمارا ہی قصور ہے کہ اب تک ہم نے کوئی توجہ نہیں کی اس لیے مسلمان بھی اس سے لاپرواہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے عرض کیا یہ ایک عرض داشت تیار کی گئی تھی اور اس پر گیارہ آدمیوں کے نام تھے۔ اب وہ لوگ نہیں آئے تو میں یہ عرض داشت حضور کے سامنے رکھتا ہوں اور جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے زبانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے جدید تعلیم کی ابتدا اور انتہا اور ترقی پر چند باتیں بطور تمہید کے عرض کیں اور پھر یہ عرض کیا کہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے لاپرواہی کر رہے ہیں اور ان کے مولوی صاحبان مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اور ان کے ساتھ حضور اعلیٰ اور ہمارے جملہ انگریزی حکام اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمان اس بارے میں غلطی کر رہے ہیں جیسے کہ محکمۂ تعلیمات کی رپورٹوں سے ثابت ہے۔ اب ہم نے علی گڑھ میں ایک کام شروع کیا ہے۔ علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والئی بھوپال ہمارے ساتھ ہیں اور بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اب فقط اس کی کمی ہے کہ گورنمنٹ نے اب تک اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ اب ہم حضور والا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہماری دستگیری فرمایئے تاکہ ہم لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام کر سکیں۔

میری گفتگو سن کر سر جیمس لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر نے فرمایا کہ کیا تمھارے پاس کوئی مدرسہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ افسوس ہے اس وقت کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ مدرسہ ہم جاری کرنا

چاہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ بلا مدرسے کے تو کوئی گرانٹ ملنے کا قاعدہ نہیں ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ جا کر کوئی مدرسہ قائم کیجیے اور پھر اس کی رپورٹ ہم کو کیجیے۔ میں کسی انسپکٹریس کو بھیج دوں گا۔ اس کے بعد اس کی رپورٹ کے مطابق گورنمنٹ جو کر سکے گی کرے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے کہ آپ ایک اچھا کام کرنا چاہتے ہیں لیکن لوگ آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔

اس کے بعد وہاں سے رخصت ہو کر میں مع مولوی احتشام الدین صاحب اور مسٹر عظمت علی صاحب جو علی گڑھ سے میرے ہمراہ گئے تھے شہر میں کسی استانی کی تلاش میں نکلے۔ مینہ بہت زور کا برس رہا تھا۔ درباری کپڑے پہن کر گورنمنٹ ہاؤس سے سیدھا چلا آیا۔ وہاں پر پانی اس قدر جمع تھا کہ کپڑے اور پتلون سب بھیگ گئے۔ ہم ایک استانی کی تلاش میں شہر پہنچے جن سے پہلے کچھ خط و کتابت ہوئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ اگر نام کو بھی کوئی استانی مل جائے اور کچھ بھی نہ کرے بیٹھی رہے تب بھی عبداللہ بیگم اور ان کی ہمشیرگان ایک ابتدائی مدرسہ قائم کر سکیں گی۔ ہم اس پتے پر پہنچے جو خط و کتابت سے ہم کو معلوم تھا۔ وہاں ایک حکیم صاحب رہتے تھے۔ اس گلی میں پہنچے تو ایک گبرو سے میاں برآمدے میں کھڑے تھے۔ ہم نے حکیم صاحب کی نسبت پوچھا کہ کہاں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ میں ہی ہوں۔ ہم نے پوچھا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر رقیہ بیگم رہتی ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ڈاکٹر وغیرہ کو تو میں نہیں جانتا ایک عورت وہاں سامنے رہتی ہے۔ ہم اس سامنے والے مکان پر گئے اور وہاں برآمدے کی دیوار پر ایک ڈھولک لٹکی ہوئی دیکھی۔ مولوی احتشام الدین علی صاحب نے فرمایا کہ یہ تو کوئی نیک فال نہیں ہے۔ جب اس سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ وہ ایک معمولی شُد بُد جاننے والی عورت ہے۔ اور ادھر اُدھر آیا جایا کرتی ہے اور کسی ایک جگہ استقلال سے نہیں رہتی اور نہ اسے ایک جگہ رہنا نصیب ہوا۔ اس لیے ہم وہاں سے چلے آئے اور پھر لکھنؤ میں ٹھہرنے کا کوئی کام نہیں تھا۔ گاڑی میں سوار ہو کر علی گڑھ پہنچ گئے۔ یہاں آ کر استانی کی تلاش میں عبداللہ بیگم کو لے کر میں دہلی گیا۔ لیکن دہاں بھی کوئی تعلیم یافتہ خدا کی بندی نہیں ملی جو علی گڑھ آنے کے لیے تیار ہو۔

سب سے اول مدرسہ کی ابتدا اور اختری نامی استانی

ایک استانی کا پتہ چلا کہ وہ قرآن شریف پڑھا سکتی ہے اور اردو بھی جانتی ہے لیکن وہ کہیں جائے گی نہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے مکان پر پہنچے۔ اس نے اول تو دہلی سے باہر جانے سے انکار کیا اور پھر کہا کہ اگر میں جاؤں گی تو میرا سب خاندان میرے ساتھ جائے گا اور جو صاحب لے جائیں گے سب کے کفیل ہوں گے۔ پوچھا کہ تمھارے خاندان میں کون کون ہے جو تمھارے ساتھ جائے گا۔ جواب دیا کہ میرا شوہر ہے، میری لڑکی ہے اور میری ماں ہے میں ان کو دہلی میں چھوڑنا نہیں چاہتی جہاں میں ہوں گی وہاں وہ بھی ہوں گے۔ عبداللہ بیگم نے کہا کہ یہ تو بڑا جھگڑا ہے کہ کنبہ کے کنبہ کو لے جا کر پالیں جب استانی صاحبہ چلیں۔ لیکن میں نے کہا کہ ان استانی کی یہ شرط منظور کرتا ہوں اور میں ان سب کا کفیل ہوں گا۔ جب سر اوکھلی میں دیا ہے تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا۔ میں ان سب کو لے جانے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ اختری نامی استانی اور ان کے تمام کنبے کو لے کر دہلی سے چلے اور علی گڑھ شہر کے محلہ بالائے قلعہ پر ایک مکان کرایہ پر لے کر اس میں ان کو ٹھہرایا۔ یہ استانی اختری اور ان کا تمام کنبہ 1906 کے آخر میں علی گڑھ آ گئے۔ محلہ کی قرب و جوار کی لڑکیاں استانی سے آ کر قرآن شریف پڑھنے لگیں لیکن با قاعدہ طور پر مدرسہ 1907 میں جاری ہوا یعنی ڈولیاں لڑکیوں کے لانے کے لیے مقرر کی گئیں۔ جن پر چھ کہار ملازم رکھے گئے اور اختری استانی کے شوہر کو چوکیداری اور نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا اور ان کو تنخواہ دینا تجویز ہوا اور استانی کی لڑکی کا وظیفہ مقرر ہوا اور ان کی ماں کو تختیاں دھونے کے لیے مقرر کیا اور کام کا معاوضہ پانے لگیں۔ گویا اختری استانی کے کل کنبے کا انتظام ہو گیا۔

اب لڑکیاں با قاعدہ آنا شروع ہوئیں۔ عبداللہ بیگم اور ان کی ہمشیرگان سکندر جہاں بیگم مرحومہ اور سعید جہاں بیگم مرحومہ روزانہ خود جا کر لڑکیوں کو پڑھانا لکھانا سکھاتی تھیں۔ عبداللہ بیگم کی قابلیت اردو میں بہت اچھی تھی اور وہ ابتدائی درجوں کی فارسی کی ریڈریں بھی اپنے والد سے پڑھ چکی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ نہایت خوش خط تھیں۔ اس زمانے میں جن لڑکیوں نے ان سے پڑھنا لکھنا سیکھا تھا وہ اب تک یاد کرتی ہیں کہ ہم نے اعلیٰ بی بی (عبداللہ بیگم) سے پڑھنا سیکھا۔ ادھر لڑکیاں مدرسے میں آنا شروع ہوئیں اور اُدھر میں نے لفٹیننٹ گورنر کو اطلاع

دی کہ ہم نے مدرسہ جاری کر دیا ہے۔ صاحب موصوف نے گنجا نامی ایک انسپکٹریس کو یہاں بھیجا کہ جا کر دیکھ آؤ کہ مدرسہ جاری ہو گیا ہے۔ انسپکٹریس نے مجھ سے کہا کہ میں ایک اچھی رپورٹ دوں تاکہ گورنمنٹ گرانٹ دے سکے۔ اس نے یہاں آ کر جو کچھ دیکھا اس کے دل پر بہت اثر ہوا کہ میں اور میری بیوی اور ان کی بہنیں سب مدرسے میں لگے ہوئے ہیں اور حالات بہت امید افزا ہیں کہ یہ مدرسہ بہت ترقی کرے گا۔ انھیں الفاظ میں اس نے رپورٹ پیش کی اور اس کے ڈیڑھ ماہ بعد ہم کو گرانٹ مل گئی یعنی سترہ ہزار روپے یک مشت اور ڈھائی سو روپیہ ماہوار کی گرانٹ منظور ہوئی۔ اب حالات کچھ دوسرے ہو گئے اور عبداللہ بیگم کی ہمت بہت کچھ بڑھ گئی اور لڑکیاں بھی تعداد میں زیادہ ہو گئیں۔ ڈولیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی اور ایک مکان میں کچھ لڑکیاں بطور بورڈرس کے ٹھہرادی گئیں اور استانی اختری کی والدہ ان کی نگرانی کرنے لگیں۔ ادھر لڑکیوں کی تعداد بڑھی اور ادھر شہر کے شہدوں کی مخالفت اور شرارت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ شہر کے لونڈے لاروں کو بھیج دیتے تھے کہ وہ رستہ میں کھڑے ہو جائیں اور جب ڈولیاں ان کے پاس سے گزریں تو ان کا پردہ اُچھال دیں اور اس کے بعد قہقہے لگائیں اور کہیں کہ ہم نے بے پردہ کر دیا۔ متعدد مرتبہ مجھے ان کی شکایت پہنچی۔ ایک روز ٹھیک اس وقت جب ڈولیوں کے آنے کا وقت ہوتا تھا میں بھی موقع پر پہنچا اور ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور شریر لڑکوں کی حرکات دیکھتا رہا۔ جب ڈولیاں ان لڑکوں کے پاس سے گزریں تو انھوں نے ڈولیوں کے پردے اچھال دیے۔ میں جھٹ دیوار کے پیچھے سے نکلا اور قمچیوں سے مارنا شروع کیا۔ بجائے قہقہے لگانے کے ان لڑکوں میں چیخم دہاڑ مچ گئی، لونڈے بھاگے اور ڈولیاں نکل گئیں۔ اس کے بعد کسی لونڈے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ ڈولیوں کے پردے اچھالے۔ بعد کو کہاروں نے بیان کیا کہ جب ڈولیاں پاس آتی ہیں لڑکے کہتے ہیں کہ یہ شیخ عبداللہ کی ڈولی ہے اس کو ہاتھ نہ لگانا۔

حامد حسن تحصیل دار

اس طور پر ان شریر لڑکوں کی حرکت کا تو انسداد ہو گیا۔ لیکن لوگوں کا منہ بند کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ وہ طرح طرح کی غلط شہرتیں اڑاتے تھے تاکہ لڑکیوں کے والدین اپنی لڑکیوں کو مدرسے میں نہ بھیجیں۔ ان نالائق لوگوں میں ایک تحصیل دار صاحب بھی تھے جن کا نام جہاں

تک مجھے یاد ہے حامد حسن تھا اور اپنے آپ کو سید کہتے تھے۔ مجھ سے بھی ملاقات تھی اور جب ملتے تھے تو بڑے تپاک سے ملتے تھے۔ ایک روز شہر کے دو معزز مسلمانوں نے مجھ سے کہا کہ تحصیل دار صاحب آپ کے مدرسے کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور انھوں نے ایک افسانہ گھڑ کے لوگوں میں پھیلانا شروع کیا ہے اور ہم سے بھی بیان کیا۔ افسانہ یہ تھا کہ ایک یکہ والا ایک لڑکی کو اپنے پردے کے یکہ میں لایا اور دن دہاڑے یکہ لا کر میرے صحن کے سامنے کھڑا کر دیا اور آپ پردے کے اندر گھس گیا اور دیر کے بعد وہاں سے نکلا اور لڑکی کو مدرسے پہنچا دیا۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ تحصیل دار صاحب نے ایسا کہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہم ضرور تصدیق کریں گے۔ سچی بات کہنے میں ہم کو کچھ دریغ نہیں ہے۔

چنانچہ ایک دن میں ان دونوں صاحبوں کو ساتھ لے کر تحصیل دار صاحب کے مکان پر پہنچا۔ تحصیل دار صاحب نے یوں تو میرے آنے کا خیر مقدم کیا لیکن ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ میرے دونوں دوستوں کا آنا انھیں پسند نہیں آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا کہ تحصیل دار صاحب آپ نے جو واقعہ یکہ والے کا پردے کے اندر گھسنے اور پھر لڑکی کو مدرسے پہنچانے کا لوگوں سے بیان کیا ہے یہ آپ کا چشم دید واقعہ ہے یا آپ نے کسی سے سنا ہے۔ تحصیل دار صاحب صاف انکار کر گئے کہ میں نے نہ اس قسم کا کوئی واقعہ دیکھا نہ کسی سے بیان کیا۔ یہ بات میرے کسی مخالف نے اڑائی ہوگی اور دل سے گھڑ کر آپ سے کہا گیا ہے۔ میں نے ان دوستوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں دوست تحصیل دار صاحب کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور ان سے کہا کہ آپ تسلیم کیجیے یا نہ کیجیے آپ نے ہم سے بیان ضرور کیا تھا اور تحصیل دار صاحب نے قسم کھائی کہ میں نے ہرگز یہ نہیں کہا، حاشا وکلا، میرے فرشتوں کا بھی ایسی بات کا علم نہیں ہوا اور نہ میں نے کبھی کسی سے بیان کیا۔ میں نے جواب دیا کہ تحصیل دار صاحب آپ نے کہا یا نہیں کہا لیکن آپ کے اس انکار نے مجھے ایک بڑی زحمت سے بچالیا۔ میں کلکٹر صاحب سے اس بات کی رپورٹ کرنے کو تھا کہ تحصیل دار صاحب نے ایسا کہا ہے۔ اب مجھے کہنے کی ضرورت نہیں جب آپ انکار کرتے ہیں۔ کلکٹر صاحب کا نام سنتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے اور بے اختیار بار بار قسمیں کھائیں کہ میں نے کبھی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالے ہیں۔

اس ابتدائی زمانے میں ملا مولویوں نے بہت جھوٹی خبریں اُڑائیں۔اور مجھے بہت دق کیا۔اب سال ڈیڑھ سال مدرسہ چلنے کے بعد لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔مکان میں گنجائش نہ رہی اس لیے محلہ بنی اسرائیلان میں ایک زیادہ کشادہ مکان کرایہ پر لے لیا۔اُسی دوران میں کچھ چندے بھی باہر سے آتے رہے اور گورنمنٹ کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ سے بھی بعض وقت گرانٹ کے متعلق جھگڑے رہے اس زمانے میں ڈائریکٹر تعلیم بہت ہی تنگ خیال آدمی تھا۔وہ کہتا تھا کہ ہم پرائمری اسکول پر کہیں اتنا روپیہ خرچ نہیں کرتے۔تم کیوں اتنا روپیہ خرچ کرتے ہو۔لیکن لفٹیننٹ گورنر تک جب میری بات پہنچی تھی تو وہ خود اپنی رائے سے گرانٹ کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے تھے۔
اس زمانے میں میں نے کچھ زمینیں خرید لیں اور ایک بڑے رقبے کے حاصل کرنے کے لیے قانون حصول آراضیات کے تحت میں نے درخواست دی۔یہ درخواست ایم اے او کالج کے بہت بڑے رقبے کی درخواست کے ساتھ دی تھی۔کیونکہ ایم اے او کالج کی طرف سے حصول آراضی کے لیے مقدمہ میں خود لڑ رہا تھا اور مجھے اس میں آسانی تھی۔میں نے کل مقدمات حصول آراضیات خواہ وہ کالج کے ہوں یا گرلس اسکول کے کلکٹری کچہری سے لے کر ہائی کورٹ تک خود ہی لڑائے تھے تاکہ کالج کو اور ہائی اسکول کو زیادہ زیر بار نہ ہونا پڑے۔اس زمانے میں آراضیات بہت سستی ملتی تھی اس لیے بہت کم قیمت میں بڑے بڑے رقبے حاصل ہوگئے۔

مسٹر پورٹر گورنر کا ذکر

1911 میں یہ ارادہ کرلیا کہ اب شہر کے باہر مدرسے کے مکانات تیار ہونا چاہییں۔
اس زمانے میں مسٹر پورٹر قائم مقام لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ان سے بھی میری ملاقات ہوگئی تھی اور وہ بہت مہربانی کرتے تھے۔میں نے ایک درخواست لیڈی پورٹر کے پاس بھیجی تھی کہ آپ علی گڑھ میں آکر ہمارے مدرسے کا سنگ بنیاد رکھ دیجیے۔چنانچہ بتاریخ 7 رنومبر 1911 مسز پورٹر نے علی گڑھ آکر مدرسے کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔وہ سنگ مرمر کی سل جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے نصب کی تھی وہ وحیدیہ بورڈنگ ہاؤس کے ڈائننگ ہال کے مغربی دیوار میں لگوادی جو ابھی تک لگی ہوئی ہے اور جس کو دیکھ کر مجھے پرانی باتیں یاد آجاتی ہیں۔سب کام میرے ہی کندھے پر تھا اور یونیورسٹی کے صاحبان میں سے سوائے نواب وقار الملک کے اور کوئی ہاتھ بھی نہیں رکھتا تھا۔لیکن

مسز پورٹر کی آمد کے وقت کچھ رؤسا اور کچھ یونیورسٹی اسٹاف کے ممبر جمع ہو گئے تھے۔ عورتوں کا ایک خاصہ مجمع ہو گیا تھا۔ مسز پورٹر کے آنے کے بعد سے معاملے کی صورت ذرا اور بھی بہتر ہو گئی اور یہ اعتراض کہ عام طور پر مسلمان اس تحریک کے موافق نہیں ہیں اور میں تنہا اپنی ضد پوری کر رہا ہوں۔ قوم کی اس میں شرکت نہیں ہے بہت کچھ اس میں دفع ہو گیا۔ اب تو زبانوں پر آنے لگا کہ جس معاملے میں گورنمنٹ دلچسپی لے رہی ہے وہ کسی وقت کامیابی حاصل کرے گا۔ اس سنگ بنیاد کے بعد یہ خیال ہوا کہ سب سے اول اسکول کی عمارت بنے یا بورڈنگ ہاؤس کی، اگر اسکول تعمیر کر لیتے تو باہر سے آنے والی لڑکیوں کے لیے رہنے کی جگہ کوئی نہیں تھی اور توقعات یہ تھیں کہ کل ملک سے لڑکیاں یہاں آ کر تعلیم پائیں گی۔ ان جملہ واقعات کو ملحوظ رکھ کر یہ ارادہ کر لیا کہ سب سے اوّل ایک بڑا بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرایا جائے تاکہ اس کے کمروں میں لڑکیاں بھی ایک طرف رہ سکیں اور دوسری طرف لڑکیاں اپنی استانیوں سے تعلیم حاصل کریں۔ لوگوں نے اس پر بہت سے اعتراضات کیے اور کہا کہ آپ کو گھوڑا خریدنا چاہیے۔ لیکن آپ اس کا چابک خرید رہے ہیں۔ ہر جگہ سب سے اوّل مدرسہ تعمیر ہوتا ہے اور پھر بورڈنگ ہاؤس۔ لیکن آپ پہلے بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرا رہے ہیں اس کے بعد مدرسہ تعمیر کرائیں گے۔

بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر لالہ ٹیکارام

میں نے کہا کہ آپ تماشا دیکھیے خدا کیا کرتا ہے۔ قبل از وقت اعتراض کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ اشتہار دیا گیا اور بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لیے ٹینڈر مانگے گئے اور ٹینڈر فقط دو ٹھیکیداروں نے دیے۔ ایک ٹینڈر ایک انگریز کمپنی فورڈ میکڈ لنلڈ نے دیا اور دوسرا لالہ ٹیکارام ساکن علی گڑھ نے دیا۔ مسلمان ایک بھی نہ ملا کہ ٹینڈر دیتا۔ فورڈ میکڈ لنلڈ کا ٹینڈر اور لالہ ٹیکارام کے ٹینڈر قریب قریب برابر تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ٹھیکہ کسی ہندوستانی کو دوں خواہ ہندو ہو یا مسلمان اس لیے میں نے لالہ ٹیکارام سے کہا کہ اگر تم ڈیڑھ روپیہ سیکڑہ کم کر دو تو میں عمارت کی تیاری کا ٹھیکہ تم کو دے دوں۔ میں نے فورڈ میکڈ لنلڈ کے آدمی سے بھی کہا کہ دوسرا ٹھیکیدار تم سے دو روپیہ سیکڑہ کم پر کام کرنے کو تیار ہے اگر تم بھی کچھ کمی کر دو تو تمھارے ٹینڈر پر بھی غور کیا جائے۔ فورڈ میکڈ لنلڈ نے کمی کرنا منظور نہ کیا اس لیے لالہ ٹیکارام کے نام ٹھیکہ ختم ہو گیا اور کام شروع ہو گیا۔ لالہ ٹیکارام نے وقت

مقررہ کے اندر بورڈنگ ہاؤس تعمیر کر دیا۔ اس بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے بعد اب ہماری بہت سی دقتیں حل ہو گئیں۔ بڑی دقت تو یہ تھی کہ باہر سے آنے والی لڑکیوں کو ہم بغیر کسی پردے کے بورڈنگ ہاؤس کے رکھ نہیں سکتے تھے۔ اب اس بورڈنگ ہاؤس کی تیاری سے یہ دقت رفع ہو گئی۔

بورڈنگ ہاؤس کا افتتاح

فروری 1914 میں یہ بورڈنگ ہاؤس مکمل ہو گیا اور علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم والیٔ بھوپال عرش آشیانی سے درخواست کی گئی کہ وہ علی گڑھ میں تشریف لا کر اپنے دست مبارک سے اس بورڈنگ ہاؤس کا افتتاح فرمائیں۔ چنانچہ مرحومہ مغفورہ علیا حضرت نے درخواست قبول فرمالی اور 14 رفروری 1911 تاریخ افتتاح مقرر ہو گئی۔ مختلف شہروں اور مقامات سے مستورات میری دعوت پر علی گڑھ تاریخ مقررہ پر تشریف لائیں اور ایک بڑے جلسے میں جو اندر اور باہر دو حصوں میں منقسم تھا یعنی اندر عورتیں تھیں اور باہر مرد تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد علیا حضرت مرحومہ مغفورہ نے رسم افتتاح ادا کی اور اول ہی روز نو لڑکیاں بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ اسی موقع پر میری تحریک پر ایک لیڈیز کانفرنس بھی قائم ہوئی اور جس کی صدر علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال مرحومہ مغفورہ مقرر ہوئیں۔ یہ کانفرنس بہت دنوں تک کچھ کام کرتی رہی لیکن رفتہ رفتہ ختم ہو گئی جس کا مجھے سخت افسوس ہوا۔

نیا تجربہ

بورڈنگ ہاؤس کا انتظام ایک جدید تجربہ تھا اور ہم نے جب اس کام کو شروع کیا تو کچھ دنوں تک ہم کو اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ ہم لڑکیوں کا بورڈنگ ہاؤس چلانے میں کامیاب ہو بھی سکیں گے یا نہیں۔ ہماری دقتیں مختلف قسم کی تھیں۔ لڑکیوں کے والدین یا سرپرست جب لڑکیوں کو یہاں لاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ عورتوں اور مردوں کی ایک بارات آ رہی ہے۔ دو دو چار چار مرد اور دو دو چار چار عورتیں لڑکی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ لڑکی کے بڑے بوڑھے مرد اور عورتیں سب ہی اپنا اطمینان کرنے آ جاتے تھے کہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ مدرسے کے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کیسا ہے اور کھانے پینے کا معقول انتظام ہے یا نہیں اور سب سے بڑی بات جس کی طرف توجہ کی جاتی تھی وہ پردے کی تھی۔ آیا پردے کا انتظام کیسا ہے؟ آیا مرد تو کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا لیکن کام

کرنے والے سقہ، بھنگی بہ مجبوری اندر آتے جاتے تھے بعض پرانے زمانے کی عورتیں اس کو بھی پسند نہیں کرتی تھیں کہ بورڈنگ ہاؤس کے احاطے میں کوئی بہشتی یا بھنگی آئے اور ان لوگوں کو دیکھ کر کہہ دیا جاتا تھا کہ ہم اپنی لڑکیوں کو یہاں نہیں چھوڑیں گے کیونکہ اس احاطے میں مرد آتے ہیں۔ ایسی مثالیں دو چار سے زیادہ میرے تجربے میں نہیں آئیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے فقط دو لڑکیوں کے والدین احاطے میں بھنگی اور بہشتی کے آنے کی وجہ سے واپس لے گئے۔ عبداللہ بیگم اور ان کی ہمشیرگان نے اس مدرسے کی کامیابی میں جو کوششیں کیں ان کی بابت میں نے عبداللہ بیگم کی سوانح عمری میں اختصار کے ساتھ لکھ دیا ہے جو صفحہ 76 سے 93 تک سوانح عمری میں ملیں گے لیکن میں دوبارہ انھیں واقعات کو یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

بورڈنگ ہاؤس کے داخلے اور کامیابی

بورڈنگ ہاؤس میں اوّل روز نو لڑکیاں داخل ہوئیں جن میں تین میری چھوٹی بچیاں تھیں۔ تین عبداللہ بیگم کی منجھلی بہن کی لڑکیاں تھیں اور ایک عبداللہ بیگم کی دوست میمونہ بیگم رئیسہ بلند شہر کی لڑکی تھی اور دو اور لڑکیاں تھیں جن کی سرپرستی اور پرورش کئی سال سے عبداللہ بیگم نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ان لڑکیوں کو داخل کرنے کے بعد عبداللہ بیگم خود مدرسے میں دن رات رہنے لگیں اور اپنے دو بچوں کو اناؤں اور ماماؤں کے اوپر اپنے گھر میں چھوڑ دیا۔ اُس زمانے میں اس بورڈنگ کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی اور رات کو تمام احاطے اور اردگرد کے مقامات میں جانے سے ڈر معلوم ہوتا تھا مگر چوکیدار اور کتے ہر وقت پہرے پر موجود رہتے تھے۔ لیکن چھوٹی بچیوں کو اس بڑے احاطے میں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اس لیے عبداللہ بیگم اور چند استانیاں خود بورڈنگ ہاؤس کے اندر لڑکیوں کی حفاظت کے لیے رہنے لگیں۔

عبداللہ بیگم کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کا بہت ہی اچھا اثر ہوا۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ وہ خود ہی بورڈنگ ہاؤس کی حفاظت کے لیے آکر رہتی ہیں تو رفتہ رفتہ لوگوں کو مدرسے اور بورڈنگ ہاؤس کی طرف سے اطمینان ہونے لگا۔ گذشتہ دس بارہ سال میں رسالہ ''خاتون'' کے ذریعہ جو اطراف ہندوستان میں مقاصد تعلیم کی اشاعت کی گئی تھی اس کی وجہ سے اب لوگ آمادگی ظاہر کرنے لگے تھے کہ اگر کوئی قابل اطمینان انتظام ہو تو ہم ضرور اپنی لڑکیوں کو تعلیم دیں۔ ایسے

لوگوں کو عبداللہ بیگم کا بورڈنگ ہاؤس میں رہنا ایک طرح سے قابلِ اطمینان دکھائی دیا اور وہ رفتہ رفتہ لڑکیوں کو بھیجنے لگے۔ غالباً ناظرین و ناظرات خاں صاحب میر ولایت حسین مرحوم کے نام نامی سے واقف ہوں گے۔ وہ نہایت سچے مسلمان و مخلص دوست تھے اور تعلیم نسواں کی تحریک میں وہ ابتدا سے میرے ہمدرد رہے لیکن جب اوّل ہی اوّل میں نے بورڈنگ تعمیر کرانے کا ذکر ایک جلسے میں کیا تو انھوں نے نہایت ہی حیرت سے میرے طرف دیکھا اور کہا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ تو ایک جداگانہ مسئلہ ہے لیکن وہ کون شریف مسلمان ہوگا جو اپنی لڑکی کو اپنے گھر سے لے جا کر اس بورڈنگ ہاؤس میں رکھے گا۔ میں نے اس وقت میر صاحب کو جواب دیا کہ خدا نے چاہا تو آپ بھی اپنی صاحبزادیوں کو اس بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرائیں گے۔ چنانچہ میر صاحب موصوف نے بعد میں اپنی دو صاحبزادیوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرایا اور اس وقت مجھ کو اس باہمی گفتگو کا واقعہ یاد دلایا اور کہا کہ آپ کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ چنانچہ ان دونوں صاحبزادیوں نے اس اسکول سے میٹرک پاس کیا اور پھر آگرے میں جا کر ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔

لوگوں نے جب مدرسے کے حالات دریافت کرنا شروع کیے تو عبداللہ بیگم کی طرف سے میں نے خطوط لکھوائے کہ اب بورڈنگ ہاؤس کھل گیا ہے۔ میں خود بورڈنگ ہاؤس میں مستقل طور سے سکونت رکھتی ہوں اور خود بچیوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتی ہوں۔ اب جو بیوی اپنی لڑکی کو یہاں داخل کرانا چاہیں وہ خود تکلیف گوارا کر کے لڑکی کو ہمراہ لے کر یہاں آ جائیں اور چند روز تک یہاں رہ کر خود یہاں کے حالات دیکھنے کے بعد اگر وہ مناسب سمجھیں تو لڑکی کو داخل کریں ورنہ اپنے ہمراہ واپس لے جائیں۔ خود میری بیٹیاں اور بھانجیاں بھی بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہیں اور پڑھتی ہیں۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے اصحاب خود اپنی بیوی اور لڑکی کو ہمراہ لے کر علی گڑھ آئے اور بیوی کو بورڈنگ ہاؤس میں قیام کرنے کی اجازت دی اور آپ باہر ادھر ادھر پھر کر لوگوں سے حالات دریافت کرتے رہے۔ چند روز ہی کے قیام کے بعد جب کسی لڑکی کی ماں دیکھتی تھی کہ عبداللہ بیگم تو غیر لڑکیوں کو اپنی بیٹیوں کی طرح رکھتی ہیں تو بڑے اطمینان سے اپنی لڑکی کو بھی عبداللہ بیگم کے سپرد کر دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ لو بی بی لڑکی کو اللہ پر چھوڑا اور تمھارے سپرد کیا۔ اب ہمارے خاندان کی لاج تمھارے ہاتھ ہے۔

اصلیت یہ تھی کہ عبداللہ بیگم نے اس ابتدائی زمانے میں اپنی ہم قوم و ہم وطن بیویوں کے سامنے ایثار اور قومی محبت کا ایک عدیم المثال نمونہ پیش کیا تھا۔ ہمارے سامنے مشنری لیڈیز کی تو مثالیں موجود ہیں کہ وہ امریکہ سے اور دیگر یوروپین ممالک سے آ کر ہندوستان میں مدارس قائم کرتی ہیں اور بڑی جاں فشانی سے دن رات کام کرتی ہیں اور ان کو اس کام میں بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں لڑکیاں ان کے زیر اثر تعلیم پاتی ہیں لیکن ان کا نصب العین کچھ اور ہی ہوتا ہے اور وہ اشاعت مذہب کی غرض سے اپنے گھر سے چلتی ہیں اور تعلیم کا دینا اور مدارس کا کھولنا اسی اشاعت مذہب کا ایک ذریعہ قرار دے لیتی ہیں۔ اس لیے ان کو غیر ملک میں آ کر یہاں کے مصائب و تکلیف کا اٹھانا کچھ گراں نہیں گزرتا لیکن ہمارے ملک میں یہ خیالات کہاں۔

ہمارے مبلغین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہمیں ذرہ برابر بھی تکلیف نہ ہو اور مذہب خود بخود پھیل جائے۔ اگر ایثار کے نمونے ڈھونڈنے نکلو تو ایک بھی نہ ملے گا۔ جب مردوں میں ہی ایثار نہیں تو بے چاری عورتوں میں کہاں سے ایثار آئے گا۔ عورتیں اپنے گھروں میں البتہ بڑے تحمل اور صبر کی زندگی بسر کرتی ہیں لوگ اس کو ایثار کہیں یا ہمدردی، مگر اس میں ذاتی رائے اور رضامندی بہت کم شامل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے عبداللہ بیگم کی یہ محنت و جفاکشی و ایثار کا ایک عدیم المثال نمونہ سمجھنا چاہیے۔ جس بیوی کے اپنے بچے ہوں خدا نے گھر میں سب کچھ دیا ہو، نوکر چاکر مامائیں بھی ہوں وہ دوسروں کی خاطر اپنا ہرا بھرا گھر چھوڑ کر بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرے میں آ کر رہے۔ اس کی زندگی اور قربانی واقعی دوسروں کے لیے ایک بڑا نمونہ ہے۔

عبداللہ بیگم کی لگاتار کوشش نے ملک کے لیے ایک خاص کشش پیدا کر دی اور بورڈنگ ہاؤس ایک کامیاب ادارہ ثابت ہونے لگا۔ کل ہندوستان میں اس وقت مسلم لڑکیوں کا ایک یہی دار الاقامہ تھا۔ تعلیم نسواں کے ہمدردوں کے دلوں میں ایک بے چینی اور تشویش تھی اور بعض دوستوں کو میں نے دعائیں مانگتے دیکھا کہ خدا اس پودے کو کامیاب کرے۔ مخالفین ہر وقت نکتہ چینی پر تلے بیٹھے تھے۔ اگر ان کو ذرہ برابر بھی کوئی بہانہ مل جاتا تو وہ اپنی طرف سے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ یہ عبداللہ بیگم ہی کا دم تھا کہ کسی کو زبان کھولنے کا بھی موقع نہ ملا۔ دور ہی سے حاسد بیٹھے بیٹھے نکتہ چینیاں کرتے رہے لیکن اخبارات میں جھوٹی باتیں لکھنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔

ایک واقعہ جو کسی قدر بعد کے زمانے کا ہے وہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہے جس سے ثابت ہوگا کہ عبداللہ بیگم کو اپنے انتظام اور نگرانی پر اس درجہ اطمینان و بھروسہ تھا کہ اگر کوئی بورڈنگ ہاؤس کے متعلق ذرا بھی بے اطمینانی ظاہر کرتا تھا تو وہ اس کو سخت بے انصافی سے تعبیر کرتی تھیں۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ خاں صاحب میر ولایت حسین نے اپنی دو صاحبزادیوں کو بورڈنگ ہاؤس میں رکھ کر تعلیم دلوائی تھی۔ ایک مرتبہ ایک ڈے اسکالر لڑکی کی نسبت یونیورسٹی کے احاطے میں کچھ برے خیالات پھیلائے گئے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی کے احاطے میں رہتی تھی۔ جب اس کی نسبت لوگوں نے بری شہرت پھیلائی تو میر صاحب موصوف کو لوگوں نے رائے دی کہ وہ اپنی لڑکیوں کو بورڈنگ ہاؤس سے اٹھالیں۔ چنانچہ میری غیر حاضری میں میر صاحب نے عبداللہ بیگم کو لکھا کہ میری لڑکیوں کو واپس بھیج دیجیے۔ عبداللہ بیگم نے اسی وقت میر صاحب کو جواب لکھا کہ یہ آپ کا اچھا انصاف ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کے احاطے میں کسی لڑکی کی بدنامی ہو اور آپ اپنی لڑکیوں کو میرے بورڈنگ ہاؤس سے اٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگر آپ اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو آپ اپنی یونیورسٹی کے احاطے کی اصلاح کیجیے۔ میرا بورڈنگ ہاؤس خدا کے فضل و کرم سے اس قسم کی باتوں سے محفوظ ہے اور یونیورسٹی والوں کو چاہیے کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے احاطے میں رکھیں میرے بورڈنگ ہاؤس میں بھیج دیں۔

میر صاحب موصوف ایک راست باز اور انصاف پسند بزرگ تھے۔ ان کو عبداللہ بیگم کا یہ جواب بہت ہی پسند آیا اور لکھا کہ آپ کے خط سے میرا اطمینان ہوگیا اور اب میں اپنی لڑکیوں کو نہیں اٹھانا چاہتا ہوں۔ مسلمان لڑکیوں سے جو ان کے پاس آ کر بورڈنگ ہاؤس میں رہتی تھیں عبداللہ بیگم کو اس قدر انس پیدا ہو جاتا تھا کہ ان کی بیماری اور تکلیف کے وقت ان کی وہی کیفیت ہو جاتی تھی جو بچے کو بیمار دیکھ کر ماں کی ہوتی ہے۔ عبداللہ بیگم کے پاس رہ کر جن لڑکیوں نے پرورش پائی ہے ان میں سے بہت سی لڑکیاں نہایت قابل اور تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے عبداللہ بیگم کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ عبداللہ بیگم بہت سے پودے لگا گئیں ہیں جو اب بار آور ہو رہے ہیں اور جس تعلیم سے اس مدرسے کے قائم ہونے کے قبل مسلمانوں کو نفرت تھی اب تعلیم یافتہ لڑکیوں کے نمونے دیکھ کر ہر شخص کے دل میں امنگ پیدا ہو

رہی ہے کہ مجھ کو بھی اپنی لڑکی کو تعلیم کے لیے اس مدرسہ میں داخل کرانا چاہیے۔ میں جب ایسے لوگوں سے جن کا تعلق اس کالج سے نہیں ہے اس کالج کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے حالات سنتا ہوں اور اکثر ان کے متعلق ذکر خیر ہی سننے میں آتا ہے تو مجھے انتہا درجے کی مسرّت ہوتی ہے اور عبداللہ بیگم کے احسان کا ایک بڑا احساس پیدا ہوتا ہے کہ ان کے طفیل سے ہماری قوم کو آج تعلیم یافتہ لڑکیوں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کا موقع ملا ہے۔

لڑکیوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ تعلیمی مدارج میں بھی ترقی ہونی شروع ہوئی۔ جب تک مدرسہ شہر میں تھا اس وقت تو پرائمری کے درجے تک تھا کیونکہ لوگ اس سے زیادہ تعلیم کے متمنی نہ تھے لیکن بورڈنگ ہاؤس میں آنے کے بعد تو لڑکیوں کے دلوں میں ترقی کرنے کا شوق پیدا ہوا اور عبداللہ بیگم نے ان کو ترغیب دی کہ تم آگے پڑھو تو اوّل ہی اوّل 16۔1917 میں تین لڑکیاں اینگلو ورنا کیولر مڈل کے امتحان میں شریک ہوئیں۔ جب ان لڑکیوں کے اس امتحان میں شرکت کی درخواست دی گئی تو ڈائرکٹر صاحب تعلیمات مسٹر ڈیلا فاس نے (جو سخت اینگلو انڈین آدمی تھا اور جس نے گورنمنٹ کی گرانٹ دینے میں بھی بہت مزاحمت کی تھی) لکھا کہ تمھارا مدرسہ صرف پرائمری ہے اس لیے تمھاری لڑکیوں کو امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میرا مدرسہ تو بی۔اے تک کا ہے آپ کی ان باتوں سے ہماری ترقی نہیں رُک سکتی۔ اس وقت تک سو میں ایک مسلمان لڑکی بھی مڈل کے امتحان میں شریک نہیں ہوئی ہے اور آپ اپنی رپورٹوں میں اس بات کی ہمیشہ شکایت کرتے ہیں کہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اب جبکہ چند لڑکیاں شرکت کے لیے تیار ہیں تو آپ ان کے امتحان میں مزاحمت کرتے ہیں۔ اگر آپ کو ان کا شریک ہونا ناگوار ہو تو آپ میرا یہ خط گورنمنٹ کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ اس پر وہ ٹھنڈے ہو گئے اور لکھا کہ میری یہ غرض نہیں تھی کہ لڑکیاں شریک نہ ہوں۔ تینوں لڑکیاں شریک امتحان ہوئیں اور کامیاب بھی ہو گئیں۔

اس کے بعد خیالات میں اور وسعت پیدا ہوئی اور لڑکیوں نے چاہا کہ میٹرک بھی پاس کریں لیکن میٹرک کی تعلیم کے لیے زیادہ تعلیم یافتہ استانیوں کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی اور بہت سی لڑکیاں بلا فیس کے بھی بورڈنگ ہاؤس میں رکھی جاتی تھیں جن

کے اخراجات کچھ تو مدرسہ پورے کرتا تھا اور کچھ عبداللہ بیگم میری جیب سے ہر ماہ وصول کر لیا کرتی
تھیں۔لیکن استادوں کو تنخواہوں کے لیے لڑکیوں سے ایک پیسہ بھی وصول نہیں ہوتا تھا۔ مگر اعلیٰ
حضرت ہزا یگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام والئی دکن و ہز ہائی نس نواب صاحب ٹونک و ہز ہائی نس
نواب صاحب بھاول پور و ہز ہائی نس نواب جاورہ کی خداداد ریاستوں کو اللہ تعالیٰ ابدالاباد تک قائم
رکھے کہ ان کی شاہانہ فیاضیوں نے میری مدد کی اور اس فیاضانہ عطیہ پر جو مرحومہ مغفورہ ہر ہائی نس
بیگم صاحبہ بھوپال نے دیا تھا بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ (نوٹ 1953۔ مجھے اس بات کا رنج ہے کہ
میں اللہ تعالیٰ سے جس مقصد کے لیے دعا کرتا تھا وہ پوری ہوتی تھی لیکن اپنی دیسی ریاستوں کے
لیے دوام واستحکام کی جو دعا میں نے مانگی تھی وہ قبول نہیں ہوئی اور موجودہ حکومت نے تمام
ریاستوں کو ختم کر دیا) اور پھر گورنمنٹ میں امداد کے اضافے کے لیے درخواست دی گئی تو
گورنمنٹ بھی بجائے تین ہزار روپے سالانہ کے امداد کے اضافہ کر کے قریب سات آٹھ ہزار
کر دیا۔ اس کے بعد ایم اے اور بی اے پاس شدہ استانیاں ملازم رکھی گئیں اور لڑکیاں مڈل و
میٹرک دونوں امتحانوں میں شریک ہونے لگیں۔

1922 میں میرس روڈ پر میں نے اپنا مکان موسومہ عبداللہ لاج تعمیر کرا لیا اور شہر کے
مکان سے اس مکان میں چلے آئے۔ یہاں آنے کے بعد عبداللہ بیگم کو مدرسے کی نگرانی میں بہت
زیادہ آسانی ہو گئی۔ میرا مکان مدرسے سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ہے۔ دومنٹ کا راستہ ہے
گویا یہ مکان گرلز کالج ہی کا ایک جزو ہے اور اس جگہ مکان بنانے کی میری غرض بھی یہی تھی کہ مجھ
کو اور عبداللہ بیگم کو مدرسے کی نگرانی میں آسانیاں ہوں۔ یہ مکان جو میرس روڈ پر تعمیر ہوا یہ ایک
بہت بڑے احاطے میں واقع ہے جس کے احاطے کا رقبہ 9 بیگہ پختہ ہے یعنی چوبیس ہزار سات
سو پچاس 24750 مربع گز آراضی ہے۔ اس مکان کا نام شروع ہی سے عبداللہ لاج پڑ گیا تھا اس
کی موجودہ مالیت کا تخمینہ قریباً تین لاکھ روپے کیا جاتا ہے کیونکہ اس موقع کی آراضیات کی قیمت
دس روپے گز سے پندرہ روپے گز تک ہے اور عمارات الگ ہیں جن کی لاگت 22-1920 میں
اس وقت ایک لاکھ 20 ہزار تھی۔ اس کوٹھی کے احاطے کے آموں کے باغ میں عبداللہ بیگم مرحومہ کا
مزار بنا ہے یا بہ الفاظ دیگر ان کی ہستی کا زندگی میں بعد ان کے مرنے کے اسی احاطے سے ان کا

تعلق ہو گیااور کالج کی عمارات بنتے بنتے اس کے بہت ہی قریب آ گئی ہیں اب عبداللہ لاج ویمنس کالج کی عمارات کا ایک جز معلوم ہونے لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے مجھ کو توفیق بھی دی ہے اور دل بھی ایسا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ پر کسی چیز کے دینے میں مجھ کو دریغ نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ میں نے 22 رمئی 1951 کو عبداللہ لاج کی کل عمارات اور احاطے اللہ تعالیٰ کی راہ پر وقف کر کے آئندہ کے لیے ویمنس کالج اور گرلس ہائی اسکول کو اس کا مالک بنا دیا اور اپنے بعد ممتاز جہاں بیگم اپنی منجھلی لڑکی کو جو ویمنس کالج کی پرنسپل ہیں متولی قرار دیا اور ان کے بعد اور میرے لڑکے اور لڑکیوں کے بعد مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو متولی قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کی مہربانی سے یہ کام بھی انجام پا گیا۔

عبداللہ بیگم کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح ہی سے مدرسے میں پہنچ جاتی تھیں۔ لڑکیوں کے کھانے وغیرہ کے متعلق حکم دیتیں اور کوئی لڑکی بیمار ہو جاتی تھی تو خود ہی اس کی تیمارداری کرتی تھیں۔ بیماروں کا ان کو خاص خیال رہتا تھا۔ معمولی بیماریوں میں تو لڑکیوں کو زنانہ اسپتال بھیجتیں یا خود ان کے ساتھ جاتی تھیں۔ لیکن اگر کوئی لڑکی کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جاتی تو ڈاکٹر کو وہیں بلوا کر دکھاتی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی بورڈنگ کی اور لڑکیاں بھی بیمار بورڈرس لڑکیوں کی تیمارداری نہ بہت مدد دیتی تھیں۔ اس زمانے کا ایک واقعہ جس کا ذکر کسی رسالے میں پہلے بھی آ چکا ہے اس موقع پر لکھنے کے قابل ہے۔ ایک مرتبہ میری غیر حاضری میں جبکہ میں میرٹھ کسی مقدمے کی پیروی کے لیے گیا ہوا تھا ایک لڑکی بیمار ہوئی اور سب کو یہ شبہ ہوا کہ اس کو پلیگ ہو گیا ہے۔ (اس زمانے میں شہر میں پلیگ کا زور تھا) رات کا وقت تھا۔ پلیگ کا شبہ ہوتے ہی لڑکیاں بیمار کے پاس آنے سے ڈرنے لگیں۔ عبداللہ بیگم نے جب یہ بات دیکھی کہ بیمار علاحدہ خوف زدہ ہے اور لڑکیاں ڈر رہی ہیں تو جا کر اس کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ اور اس لڑکی کو اپنی گود میں لے لیا اور رات بھر اسی طرح سے اس کو لیے بیٹھی رہیں۔ جب صبح کو میں واپس آیا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ کوئی لڑکی بیمار ہے اور اس کو پلیگ ہو گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی کی حالت بہتر ہو رہی تھی اور بیگم صاحبہ اس کے پاس بیٹھی ہیں۔ بخار اتر رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا پلیگ نہیں ہے جب اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ معمولی بخار کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو عبداللہ بیگم اٹھ کر اپنے گھر

آ ئیں ۔ میں نے دریافت کیا کہ پلیگ والی لڑکی کے پاس بیٹھنا تو دوسری بات ہے لیکن اس کو گود میں لے کر تمام رات بیٹھنا کیسا۔ کہا کہ میں نے جب دیکھا کہ اس لڑکی کے اوپر سخت خوف طاری ہو رہا ہے اور اگر سب اس کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں گے تو وہ تو یونہی خوف کے مارے ختم ہو جائے گی تو میں اسے لے کر بیٹھ گئی کہ اگر بیماری مجھے لگ جائے گی تو مرنا تو ایک ہی بار ہے ۔لڑکی کے دل میں تو ایک ڈھارس پیدا ہوگی ۔ میرے دل پر اس انتہائی ایثار کا ایسا زبردست اثر ہوا کہ یونیورسٹی کے کسی کونسل کے جلسے میں میں نے اس کا ذکر کیا کہ دیکھو عورتوں میں اس قسم کا ایثار ہوتا ہے۔اگر ہماری یونیورسٹی کا کوئی لڑکا پلیگ میں مبتلا ہو جاتا تو کوئی افسر یا استاد اس کو اس طریقہ سے گود میں لے کر نہ بیٹھتا۔اس واقعے سے مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلیں اس نتیجے پر پہنچ سکتی ہیں کہ عورت ذات کو خدا نے ایثار کا مادہ دیا ہے جس سے ہندوستانیوں نے صدہا سال سے اپنے آپ کو محروم کر رکھا تھا اور اب جب کہ ان کو اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے ہمدردی اور ایثار حاصل کرنے کے موقع ملے ہیں تو اقوام ہند کو اس پر فخر کرنے کا اور اس سے پورے طور پر مستفید ہونے کا موقع حاصل ہے کہ وہ عورتوں کو تعلیم دیں ۔ اور ان کو زندگی کے اس کشمکش کے میدان میں لائیں تا کہ وہ مردوں کے پہلو بہ پہلو زندگی کی مشکلات حل کرنے میں آسانیاں پیدا کر سکیں۔

عبداللہ بیگم دن رات گرلز کالج کے کاموں میں منہمک رہتی تھیں اور جو وقت بچتا تھا اسے اپنے گھر کی دیکھ بھال میں صرف کرتی تھیں ۔لیکن باوجود کثرت کار کے وہ دوسری بیگمات سے بھی ملنے کے موقع نکال لیا کرتی تھیں اور جب کسی مجلس میں وہ شرکت کرتی تھیں تو میں نے سنا ہے کہ ان کے گرد دوسری خواتین جمع ہو جاتی تھیں ۔ کیونکہ ان کی گفتگو میں شگفتگی ہوتی تھی اور ان کی پُر مذاق باتوں سے حاضرین ہمیشہ لطف اٹھاتے تھے۔ان کا ذاتی اخلاق بہت وسیع تھا۔سب ملنے والی خواتین سے ان کا نہایت رواداری اور محبت کا برتاؤ تھا کیونکہ ان کی تکلیفوں میں اُن سے ہمدردی کرتی تھیں اور جب کسی کی دکھ بیماری کی خبر پاتی تھیں تو بے چین ہو جاتی تھیں۔

بورڈنگ ہاؤس اور گھر کے ملازمین سے نہایت مہربانی اور فیاضی کا برتاؤ کرتی تھیں۔ کسی ملازم لڑکے کی اگر شادی ہوتی تھی تو اس کی دلہن کے لیے جوڑا خود بنا دیتی تھیں اور اپنے گھر کی موٹر کار کو باقاعدہ پھولوں سے سجوا کر دولھا کو اس میں بٹھا کر دلہن کے گھر بھیجتی تھیں اور جب دلہن

رخصت ہوکر آتی تھی تو وہ بھی ان ہی کی موٹر کار میں لائی جاتی تھی۔ چھوٹے ملازمین کی جب برات نکلتی تھی تو وہ اول مع بارات کے عبداللہ بیگم کی سلامی کو آتے تھے اور انعام لے کر جاتے تھے اور اسی طرح دلہن بھی سیدھی بیگم صاحبہ کے پاس لائی جاتی تھی تا کہ وہ ہی سب پہلے اس کا منہ دیکھ کر منہ دکھائی دیں۔ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی نوکر آ کر دستک دیتے تھے کہ ہمارے گھر میں کھانے کو نہیں ہے ہمیں کچھ پیشگی تنخواہ دے دیجیے۔ انہی مہربانیوں اور رواداریوں کی وجہ سے تمام ملازمین عورت اور مرد خواہ وہ گھر کے ہوں یا بورڈنگ ہاؤس کے ان کو بطور اپنی محسنہ ماں سمجھتے تھے اور ہر تکلیف و مصیبت کے وقت میں بیگم صاحبہ کے دروازے پر دکھائی دیتے تھے۔ موجودہ ملازم تو درکنار جو لوگ عرصہ ہوا ملازم رہ چکے تھے وہ بھی بیگم صاحبہ کے پاس ضرورت کے وقت آتے تھے۔ اور بیگم صاحبہ کبھی ان کی امداد سے دریغ نہیں کرتی تھیں۔ کسی نے ایک دفعہ ان سے کہا کہ یہ کیا علت پال رکھی ہے کہ ہر شخص چلا آتا ہے کہ مجھ کو یہ ضرورت ہے وہ ضرورت ہے۔ کیا سب کی ضرورتیں پوری کرنے کو تم ہی رہ گئی ہو۔ جواب دیا کہ جو کچھ کسی سے بن پڑے اس میں کمی نہیں کرنی چاہیے، انسان کو بےفیض نہیں ہونا چاہیے۔ خاندان کی کسی بڑی بوڑھی کا یہ مقولہ دہرایا کرتی تھیں، کہ انسان کے پاس روپیہ پیسہ چلتی پھرتی چیز ہے اور مثل ایک بہتے دریا کے ہے، اس سے جب تک مخلوق کو فیض پہنچ سکے پہنچانا چاہیے نہ معلوم کب اس کا رخ کس طرف کو بدل جائے۔

عبداللہ بیگم کھانے پینے میں بہت احتیاط کرتی تھیں۔ بعض کھانے ان کو بہت مرغوب تھے۔ اچھا گاڑھا دودھ اور بالائی بہت پسند کرتی تھیں۔ کپڑے نہایت سادہ اور صاف پہنتی تھیں۔ شادی میں جو کارچوبی کے بھڑک دار اور چمک دار کپڑے بنے تھے وہ شادی کے چند سال کے بعد سے بہت کم پہننے لگی تھیں اور بعد میں جس قدر کپڑے بناتی تھیں وہ فوق البھڑک نہیں ہوتے تھے۔ زیور پہننے کا شوق بھی شادی کے تھوڑے دنوں بعد تک رہا۔ رفتہ رفتہ اس میں اس قدر کمی ہوگئی کہ عزیزوں کے یہاں شادی میں بھی کوئی ایک آدھ چیز پہن لیتی تھیں۔ پرانے زمانے کی بیویوں کی طرح اپنے کل زیورات ایک وقت میں پہنے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ شادی میں لوگوں کے اصرار سے نتھ بھی بنوائی گئی تھی لیکن شادی کے دن کے بعد سے مجھ کو یاد نہیں کہ کبھی پہنی ہو۔ جڑاؤ زیور سے شوق تھا اور بنوایا بھی گیا تھا لیکن پہنتی بہت کم تھیں۔

عبداللہ بیگم ابتدا میں بہت گہرا پردہ کرتی تھیں۔ میں بھی ابتدا میں عام مسلمانوں کی طرح پردے کا حامی تھا لیکن رفتہ رفتہ میرے خیالات میں پردے کے معاملے میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہوگیا۔ یہ انقلاب خود قرآن پاک کی صحیح تعلیم کی واقفیت اور اسلام کے ابتدائی تاریخی واقعات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ واقفیت ہونے کے بعد ہندوستان کا رسمی پردہ مجھے ایک بدعت معلوم ہونے لگا اور میں نے اپنے خیالات کسی سے پوشیدہ نہیں رکھے۔ اخبارات اور رسالوں میں میں نے اس مسئلہ پر مضامین لکھے اور رسمی پردے کی مخالفت کی، رسالہ 'خاتون' کے اوراق اس کے گواہ ہیں۔ اکثر کانفرنسوں کے اجلاسوں میں اس مسئلہ پر بحثیں ہوتی تھیں اور پرانے خیالات کے لوگ خوب کڑی کڑی اور تلخ تلخ باتیں مجھے سنایا کرتے تھے۔ میں معقول طریقے سے ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن رسم ورواج کے دلدادہ لوگ قائل ہونے والے نہیں تھے۔ بورڈنگ ہاؤس کے جاری کرنے کی تجویز کے بعد لوگوں نے اکثر مجھ سے سوالات کیے کہ آیا مدرسے میں پردہ رہے گا یا نہیں۔ حتیٰ کہ امرتسر کی کانفرنس میں جناب شمس العلما مولانا شبلی مرحوم نے بھی برسر اجلاس مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نہایت صفائی سے بتادیجیے کہ مدرسے میں پردہ رہے گا یا نہیں۔ مولوی صاحب مرحوم تعلیم نسواں کے حامی تھے مگر اس کے ساتھ پردے کے بھی حامی تھے۔ میں نے ان کے سوالوں کے جواب میں اس وقت بیان کیا کہ مدرسے اور بورڈنگ ہاؤس میں ضرور پردہ رہے گا۔ پردہ بطور اسکول ڈسپلن کے لازمی ہوگا۔ ابتدا سے اس بورڈنگ ہاؤس میں پردے کے معاملے میں بہت احتیاط کی جاتی ہے اور عبداللہ بیگم کو اس کا بہت خیال تھا کہ جب تک لڑکیاں مدرسے میں پڑھیں وہ ضرور پردہ کریں۔ لاری اور گھوڑا گاڑیاں جن میں ڈے اسکالر لڑکیاں مدرسہ میں لائی جاتی تھیں ان کے ساتھ یا تو کوئی بڈھا مرد چپراسی ہوتا تھا اور یا کوئی عورت ہوتی تھی۔ اب اس طریقے میں بہت کچھ کمی ہوگئی ہے لیکن بالکل ختم نہیں ہوا ہے۔ پردے کے بارے میں عبداللہ بیگم کی ایک مثال میرے دوست خلیل احمد مراد صاحب نے (جو ایک عرصے سے یونیورسٹی اسٹاف میں ملازم ہیں) اب ان کے انتقال کے بعد مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ لاری خراب ہوگئی۔ لڑکیوں کو یکّہ میں بیٹھا کر مدرسے میں لانے کی نوبت پہنچی۔ عبداللہ بیگم نے ہر ایک یکّہ کے ساتھ چپراسی یا عورت کو بھیجا۔ لیکن ایک یکّہ کے ساتھ جانے کے لیے جب کوئی نہ ملا تو کود کر یکّے

میں بیٹھ گئیں اور مراد صاحب کی صاحب زادی اور ایک لڑکی کو اپنے ہمراہ لائیں۔ مراد صاحب نے فرمایا کہ جب ایک یکہ میرے مکان پر پہنچا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ خود لڑکی کو لینے کے لیے آئی ہیں تو میرے دل پر ایک عجیب اثر ہوا کہ اس قدر احتیاط تو شاید لڑکیوں کی مائیں بھی نہیں کرتی ہوں گی۔ میں نے فوراً لڑکی کو ان کے ہمراہ بٹھا دیا اور بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کیا۔

عبداللہ بیگم کا معمول تھا کہ صبح اور شام دونوں وقت چپراسی کی معرفت ڈاکخانہ سے لڑکیوں کے خطوط اپنے پاس منگوالیتی تھیں اور ہر ایک لفافہ غور سے دیکھ کر لڑکیوں کو دینے کی اجازت دیتی تھیں۔ لڑکیوں کے والدین یا سرپرستوں سے ان کی تحریر کے نمونے منگوا کر اپنے پاس احتیاط سے رکھ لیے تھے۔ اور اگر لڑکیوں کے کسی رشتہ دار سے خط و کتابت کا حال معلوم ہو جاتا تھا تو سرپرستوں سے ان کے خطوں کے نمونے بھی منگوالیتی تھیں۔ جب لفافے کی تحریر نمونے کی تحریر سے مل جاتی تھی تب خط لڑکی کو دیتی تھیں اور اگر اس میں کچھ فرق معلوم پڑتا تھا تو تحقیقات کے بعد لڑکی کو دیتی تھیں۔ اس احتیاط کی وجہ سے لڑکیوں کے والدین اور سرپرستوں کو بہت اطمینان رہتا تھا اور بعض لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ جس قدر احتیاط عبداللہ بیگم برتتی ہیں وہ ہمارے گھروں میں بھی نہیں برتی جاتی۔

بورڈنگ ہاؤس کے لیے جنس مہینہ میں ایک بار یا دو بار آتی تھی۔ بڈھا ممتاز الدین چپراسی گذشتہ پچیس سال سے جنس لاتا تھا۔ بازار سے دوسرے ذرائع سے بھی نرخ دریافت کرتی تھیں۔ جب جنس آتی تھی تو بعض چیزیں جیسے کہ گھی و شکر وغیرہ خود اپنے سامنے وزن کرا کر گودام میں رکھواتی تھیں۔ گودام کی چابیاں کسی مسلمان معتبر نگراں بی بی کے ہاتھ میں رہتی تھیں۔ روزانہ کھانے پکوانے کا حکم خود ہی دیتی تھیں اور باورچی روز آ کر دریافت کر جاتا تھا کہ صبح و شام لڑکیوں کے لیے کیا کھانا پکے گا۔ اگر کھانے کے وقت بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہوتی تھیں تو سب کھانے چکھ کر دیکھتی تھیں ورنہ ہر کھانے میں سے تھوڑا تھوڑا کھانا ایک آدمی لا کر ان کو دکھاتا تھا اور اگر کوئی خرابی دیکھتی تھیں تو باورچی کو بلا کر تنبیہ کرتی تھیں اور اکثر باورچیوں کو ادلتی بدلتی رہتی تھیں۔ لڑکیوں کو شروع سے ہی میز کرسیوں پر کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کھانے کے کمرے کی میز اور کرسیوں اور دسترخوانوں کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ خاتون جہاں بیگم میری منجھلی بیٹی جب انگلستان کی

لیڈز یونیورسٹی سے تین سال کی تعلیم پا کر واپس آئیں اور تعلیم میں ایک اعلیٰ ایم اے کی ڈگری لے کر آئیں تو کچھ دنوں تک اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے کے لیے پرنسپلی کا عہدہ قبول کر لیا۔ اور بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات میں اپنی والدہ کو بہت مدد دی اور لڑکیوں کے کمروں کا اور کھانے کے کمرے کا جدید سامان تیار کرا دیا تھا۔

1938 میں جب منسٹر صاحب تعلیمات مسٹر سمپورنا نند کالج میں تشریف لائے اور انھوں نے بورڈنگ ہاؤس کا معائنہ کیا تو ان پر ایسا اچھا اثر ہوا کہ انھوں نے فرمایا ہم لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ پردے کی دیواروں کے پیچھے نہ معلوم کس طرح انتظام ہو رہا ہوگا۔ لیکن آج یہ معلوم ہوا کہ پردے کے اندر رہ کر بھی لوگ کس صفائی اور خوش اسلوبی سے رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بورڈنگ ہاؤس کی امداد کے لیے دو ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ مقرر کر دی اور بیس ہزار روپیہ نقد عمارات کی تیاری کے لیے دیا۔ یہ کل صفائی اور انتظام عبداللہ بیگم ہی کی ذات کی وجہ سے مسلمانوں کے قومی ادارے کو نصیب ہوا۔

لڑکیوں کو یہ اجازت نہیں تھی کہ الگ الگ دھوبی رکھ کر اپنے کپڑے دھلوائیں۔ کل بورڈنگ ہاؤس کے لیے ایک دھوبی مقرر تھا۔ ہر لڑکی سے ایک ایک روپیہ مہینہ لیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کے کپڑوں کی بڑی احتیاط کی جاتی تھی گو اس احتیاط پر بھی لڑکیاں کپڑے کھو بیٹھتی تھیں لیکن بہ مقابل دیگر بورڈنگ ہاؤسوں کے بہت کم نقصان ہوتا تھا۔ سب لڑکیوں کو سر میں ڈالنے کا تیل ایک جگہ سے ملتا تھا۔ سر اور کپڑے صاف رکھنے کی سخت تاکید تھی۔ بعض چھوٹی لڑکیوں کا سر عبداللہ بیگم شروع میں بیٹھ کر خود ہی صاف کیا کرتی تھیں۔ بعد میں یہ انتظام کیا کہ ہر ایک بڑی لڑکی کے سپرد ایک چھوٹی لڑکی کر دی جاتی تھی کہ اس کی صفائی اور کپڑوں وغیرہ کی نگرانی کرتی رہے۔

مذکورہ بالا حالات عبداللہ بیگم کی کوشش کے بارے میں، مشت نمونہ از خروارے، کے طور پر ہیں۔ عبداللہ بیگم کے کام اور ان کے ایثار اور جدو جہد کی تفصیل بہت زیادہ ہے۔ جملہ حالات قلم بند کرنے کے لیے بہت وقت کی ضرورت ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا حالات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آئندہ موقع پر جہاں کہیں کسی واقعہ کے تعلق سے ان کی شرکت اور کوشش ضروری ہوگی وہاں ان کا ذکر کیا جائے گا۔

بورڈنگ ہاؤس میں لڑکیاں دور دراز مقامات سے آنا شروع ہوئیں لیکن والدین اور مربیوں کو خود لڑکیوں کو اپنے گھر سے نکال کر علی گڑھ کے مدرسے میں پہنچانے میں بعض وقت سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک صاحب جالندھر کے رہنے والے مالاکانڈ صوبہ سرحد میں ملازم تھے۔ انھوں نے کسی طرح اخفا حالات کی آڑ میں اپنی لڑکی کو علی گڑھ پہنچا دیا اور پہنچانے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے مجھے اطلاع کی کہ کل خاندان کا غیض وغضب مجھ پر نازل ہو رہا ہے۔ بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم جا کر لڑکی کو لے آئیں گے۔ مجھے لکھا کہ آپ مہربانی سے احتیاط کیجیے گا کہ کوئی شخص لڑکی کو دھوکا دے کر اپنے قبضہ میں نہ کرلے۔ میں نے ان کو لکھ دیا کہ آپ اطمینان رکھیے، میں سوائے آپ کے کسی دوسرے کے ساتھ لڑکی کو کہیں باہر نہیں جانے دوں گا۔ لڑکی نے تین سال تک یہاں پڑھا۔ لڑکی بہت ہونہار تھی اگر اس کو موقع دیا جاتا تو وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتی تھی لیکن تیسرے سال جب چھٹیوں کے بعد وہ لڑکی کو علی گڑھ لا رہے تھے تو خاندان والوں نے جالندھر کے ریلوے اسٹیشن پر لڑکی کو ان سے چھین لیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ لڑکی زنانہ درجہ میں بیٹھی تھی اور اس کے باپ مردانہ درجہ میں بیٹھے تھے کچھ لوگوں نے باپ کے درجہ میں جا کر ان کو باتوں میں لگا دیا اور کچھ آدمی زنانہ درجہ کے پاس گئے اور کہا کہ چلو تمھارے باپ یہاں اُتر رہے ہیں۔ غریب بھولی بھالی لڑکی درجہ سے اُتر آئی۔ لوگوں نے اس کا سامان بھی اتار لیا اور اسٹیشن سے باہر لے گئے اور باپ سے جا کر کہا کہ لڑکی تو شہر چلی گئی۔ اب تم جا کر کیا کرو گے تم بھی اتر آؤ اور شہر چلو۔ غریب مجبور ہو گیا اور لوگوں کے ساتھ شہر چلا گیا پھر لڑکی کو علی گڑھ آنا نصیب نہ ہوا۔ اسی طور پر بہت سی لڑکیاں یو۔ پی کے شہروں سے یہاں آکر پڑھنا چاہتی تھیں بہت سی لڑکیوں نے عبداللہ بیگم سے خط وکتابت بھی کی اور یہاں آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن بعد میں لکھا کہ ہم تو بہت آنا چاہتے ہیں، خاندان والے کسی طرح رضامند نہیں ہوتے اور مدرسے کے بارے میں بُری بُری باتیں ہمارے والدین کے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ ہم کو مدرسہ میں بھیجنے پر رضامند نہ ہوں۔ اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں کہاں تک ان کو گنوایا جائے۔

ان واقعات کے حالات مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو پڑھنے ضروری ہیں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ علی گڑھ نے جو تعلیم نسواں کے میدان میں جھنڈا کھڑا کیا تھا اس جھنڈے تلے

آنے میں ہماری سوسائٹی نے کس قدر مزاحمت کی تھی۔ اب عورتوں کو شکر کرنا چاہیے کہ بہت سی شدید رکاوٹیں جو ابتدا میں ان کے رستہ میں حائل تھیں بہت کچھ رستے سے ہٹ گئی ہیں اور امید ہے کہ تعلیم کے حاصل کرنے میں اور ان کی آزادی میں ہماری پرانی اور بوسیدہ سوسائٹی مزاحم نہیں ہوگی۔ آنے والے زمانے کی عورتوں کو ان لوگوں کی مصیبتوں و دقتوں کا اعتراف کرنا چاہیے جنھوں نے ان کی خاطر بہت بڑا بارا پنے سر اٹھایا تھا اور جس بار کو وہ اپنی زندگی بھر اپنے کندھوں پر اٹھاتے رہے۔ حال میں کسی دوست نے دریافت کیا کہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی بیداری کب شروع ہوئی اور اس کے کیا نتائج ہوئے۔ میں نے کہا کہ جب علی گڑھ میں تعلیم نسواں کی تحریک شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ملک میں بھی بیداری پیدا ہونے لگی۔ کوئی محدود زمانہ یا تاریخ اس بیداری کا نہیں بتایا جا سکتا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ علی گڑھ کی تحریک کے ساتھ ساتھ بیداری شروع ہوگئی اور اس بیداری میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اور نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں کہ ہماری مستورات اعلیٰ سوسائٹی میں اپنا خاص مقام پیدا کر چکی ہیں۔ جن صاحب سے اس بارے میں گفتگو ہوئی ان کے خیالات کا ماحصل یہ ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک تعلیم کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ عورتیں کسی طرح پردے سے باہر آ جائیں اور تتلیوں کی طرح رنگ برنگ کے پر لگا کر ان کی آنکھوں کے سامنے اڑتی اور چلتی پھرتی دکھائی دیں خواہ الف کے نام ب بھی نہ جانتی ہوں۔ اس قسم کے خیالات کے لوگوں نے بھی تعلیم نسواں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

اب رواجی پردہ خود بخود ختم ہو رہا ہے اور صحیح طریقے سے اس کا خاتمہ جب ہی ہوگا کہ لڑکیاں بکثرت تعلیم یافتہ ہو جائیں تو رواجی پردے کو اپنے لیے اپنی اولاد کے لیے اپنی سوسائٹی کے لیے مضر سمجھ کر اس کو ترک کر دیں اور شرعی پردہ جو جوہر شرافت ہے اس کو اختیار کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسے لوگوں سے ہمیشہ میرا اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے کہ وہ تعلیم کے لیے کبھی کچھ نہیں کرتے لیکن وہ ہر وقت پردے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ یہ کسی طرح اٹھ جائے۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اگر جاہل سے جاہل عورت بھی ان کے سامنے آئے تو وہ اس کو سوسائٹی میں اچھا درجہ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے اگر کوئی تعلیم یافتہ لڑکی برقع پہن کر ان

کے سامنے آئے تو وہ اس کو پست خیال عورت سمجھ کر اس کی کچھ عزت وقدر نہیں کرتے۔ ایسے لوگ بھی فی الواقع تعلیم نسواں کے رستے میں روڑے اٹکانے والے گروہ میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ ان کی ذات سے بھی لڑکیوں کی تعلیم کو اتنی ہی مضرت پہنچنے کا اندیشہ ہے جتنا کہ تعلیم نسواں کے مخالف لوگوں کی ذات سے پہنچ رہا ہے۔ پردے کے موضوع پر آئندہ کسی موقع پر ہم مفصل اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو یوں چھوڑ دیا جائے۔

اس وقت تو مدرسہ کی ترقی کا ذکر اس کے افتتاح اور اس کے بعد کے چند سالوں تک محدود کیا جاتا ہے۔ اس کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ اس کالج کا ایم اے۔ بی اے کی ڈگریوں تک پہنچنا اس کی تاریخ کے سلسلے میں داخل کیا جائے گا۔ اور یہ تاریخ میری زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہے گی۔ کچھ دوسرے حالات جو بعض اس مدرسے سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض تمام ملکی و قومی تعلقات سے میرے مشاہدے میں آئے ان کا ذکر زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ قلم بند کرنے کے قابل ہے مگر کل واقعات میرے حافظہ میں نہیں رہے۔ جو اہم واقعات میرے حافظہ میں رہ گئے ہیں وہ آئندہ نسلوں کے لیے قلم بند کیے جاتے ہیں۔ ان واقعات میں مختصر طور پر کام کرنے والوں کی زندگی کے حالات بھی ہوں گے اور سوشل اور پولیٹکل واقعات کی تاریخ بھی ہوگی۔

گرلس ہائی اسکول کی توسیع

1914 میں جب ہم نے پہلے ہوسٹل کا افتتاح کیا تھا اس وقت صرف نو لڑکیاں ہمارے بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئی تھیں لیکن جس امید پر لڑکیوں کا ایک بورڈنگ ہاؤس مسلمانوں کی قومی تاریخ میں پہلی مرتبہ کھولا گیا اور وہ امید پوری ہوتی دکھائی دی تو ہماری ہمت میں بہت ترقی ہوئی اور ہم نے اپنا منصوبہ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کا اور مضبوط کر لیا۔ 1916 تا 1917 میں اوّل ہی مرتبہ ہم نے اپنی لڑکیوں کو گورنمنٹ کے مڈل کے امتحان میں شریک کرایا جس میں بہت کامیابی ہوئی۔ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ایک لڑکی اول رہی اس کو وظیفہ ملا۔ 1919 میں ہم نے لڑکیوں کو میٹرک کے امتحان میں شریک کرایا۔ لڑکیاں کامیاب ہوئیں اور اکثر کو وظائف ملے۔ 1927 تک میٹرک کے امتحان میں لڑکیاں سال کے سال شریک ہوتی رہیں اور ان کو کامیابی ہوتی رہی۔ 1926 میں ہم نے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں لڑکیوں کو شرکت کے لیے بھیجا۔

اس میں بھی وہ خوب کامیاب رہیں۔ مڈل اور میٹرک کے امتحانات دلوانے کی مخالفت ڈائریکٹر صاحب نے کی لیکن ان کی مخالفت کے باوجود لڑکیوں کو تیار کرا کے امتحانات میں شریک کرایا گیا اور وہ کامیاب بھی ہوئیں۔ اس کے بعد یہ مخالفت بھی ختم ہوگئی۔

اب ادھر تو امتحانات میں ہمارے مدرسے کو کامیابی ہوتی چلی گئی۔ ہم نے آراضیات خریدنے اور مکانات کی تعمیر میں بہت کچھ اضافے کر لیے۔ 1911 میں جس قدر ہمارے پاس آراضی تھی 1922 میں اس سے قریب دو چند کے ہوگئی اور گورنمنٹ نے ہم کو جدید عمارت کے لیے مبلغ بیس ہزار روپیہ دیا اور کچھ روپیہ ہم نے بھی جمع کیا جس سے ہم نے موجودہ اسکول دفتر کے کمرے اور لائبریری کا کمرہ بنالیا۔ یہ اسکول بعد میں بہت ہی کارآمد ثابت ہوا اور اس وقت تک یعنی اپریل 1948 تک اس اسکول سے ہمارے بڑھتی ہوئی ضروریات بہت کچھ پوری ہوتی رہی ہیں۔ یہ بیس ہزار روپیہ مجھ کو لارڈ مسٹن گورنر یو۔ پی نے دیا تھا۔ اس زمانے میں ڈیلافوس نامی ایک انگریز ڈائرکٹر تعلیمات تھا۔ اس کی وجہ سے بعض وقت میرے اور گورنمنٹ کے تعلقات میں رکاوٹیں پڑ جاتی تھیں۔ چنانچہ ایک مثال اس بیس ہزار روپے کی گرانٹ کی بھی ہے۔ میں نے لارڈ مسٹن گورنر کے پاس جا کر استدعا کی کہ میرے پاس اسکول کی تعمیر کے لیے روپیہ نہیں ہے۔ مجھے بیس ہزار روپیہ دے دیجیے کہ میں اسکول بناؤں گا۔ گورنر موصوف نے میری درخواست لے لی اور فرمایا کہ روپیہ مل جائے گا لیکن چند روز کے بعد لارڈ مسٹن کا ایک خط دستخطی میرے پاس آیا اس میں مجھ سے دریافت کیا، کہ کیا تم نے ڈیلافوس سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو روپے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر نہ ملے تو مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ میں نے لارڈ مسٹن کو جواب میں لکھ دیا کہ ڈیلافوس کا یہ بیان بالکل بے بنیاد ہے۔ میں نے کبھی ان سے نہیں کہا کہ مجھے روپے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد میں مجھ کو معلوم ہوا کہ لارڈ مسٹن نے ڈیلافوس کو بلا کر اجلاس میں ڈانٹا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے اور میرا خط اجلاس میں ہی پڑھ کر کونسل کے ممبروں کو سنایا۔ یہ بات مجھ کو بعد میں ڈیلافوس کی زبانی معلوم ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم نے میرے بیان کی اس طرح تکذیب کر دی کہ لارڈ مسٹن مجھ پر ناراض ہو گئے اور مجھ کو اجلاس میں بلا کر ڈانٹا۔ میں نے کہا کہ پھر آپ نے غلط بیانی کاہے کو کر دی تھی آپ کی بات کا کون یقین کر لیتا کہ ادپر تو میں لارڈ مسٹن کے سامنے درخواست پیش کرتا ہوں

اور آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ ڈیلافوس کا ناتھا اور رنگی تھا اور ہندوستانیوں کی تعلیم کے موافقت میں نہیں تھا اور مسلمانوں کی تعلیم پر روپیہ خرچ کرنا گناہ سمجھتا تھا۔

1916 کے قریب علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم سے میں نے ایک سلطانیہ ہال کا سنگ بنیاد رکھوایا تھا۔ علیا حضرت نے روپے کا تو کوئی وعدہ نہیں کیا تھا لیکن مجھے توقع تھی کہ اس کی تعمیر کے لیے علیا حضرت مرحومہ امداد فرمائیں گی۔ جہاں پر علیا حضرت نے سنگ بنیاد رکھا اس کے قریب میں نے بالشت بھر کا ایک نیم کا پودا نصب کر دیا اور لوگ مجھے دیکھ رہے تھے کہ میں ایک نیم کا پودا اپنے ہاتھ سے لگا رہا ہوں۔ ان سے میں نے کہا کہ یہاں اس لیے پودا لگایا ہے کہ آیا ہم ایک ہال بنانے میں پہلے کامیاب ہوتے ہیں یا یہ پودا ہم کو پیچھے چھوڑ کر ایک بڑا درخت بن جاتا ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ قدرت کی قوتوں کا مقابلہ کمزور انسان نہیں کر سکتا۔ ہم اس وقت تک ایک ہال تعمیر کرنے میں یا اس کے لیے روپے مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور وہ سنگ بنیاد انتظار کر رہا ہے کہ مجھے ایک عالی شان ہال کی عزت بخشی جائے لیکن اس کی آرزو اس وقت تک پوری نہیں ہوئی۔ لیکن وہ چھوٹا سا پودہ اب ایک تناور درخت بن گیا ہے اور اتنی بلندی سے مجھے جب دیکھتا ہوگا تو زبان حال سے کہتا ہوگا کہ کمزور انسان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ قدرت کی چیزوں کی نشوونما کا مقابلہ کر سکے۔

میں نے اس کے بعد ایک بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرایا اور سنگ بنیاد کی جگہ قریب ستر فیٹ چوڑی جگہ خالی چھوڑ دی تاکہ اس پر کسی وقت میں سلطانیہ ہال بن سکے۔ اس ہال کے بننے میں تاخیر کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فوری ضرورتوں نے اس قدر زور باندھا کہ ہر ضرورت کے لیے گورنمنٹ سے روپیہ لینا پڑا اور گورنمنٹ کے روپے سے جو کسی خاص مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا ہم کسی شخص واحد کی یادگار قائم نہیں کر سکتے تھے۔ جو بورڈنگ ہاؤس میں نے بعد میں بنایا وہ ایک لاکھ روپے کی لاگت سے زیادہ میں بنا۔

اب اگر خدا کی مہربانی سے کہیں سے روپیہ مل گیا تو ہال بھی بن جائے گا اعلیٰ حضرت جناب نواب صاحب بھوپال کی خدمت عالی میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا ورنہ ان کی توجہ مبارک ضرور اس طرف مبذول کراتا۔ میں نے ایک درخواست ان کی خدمت میں بھیجی تھی لیکن

اس کا کوئی جواب مجھ کونہیں ملا جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس یادگار کے لیے روپیہ دینے کو آمادہ نہیں ہیں۔سخت مایوسی ہے۔اب میں نے کہیں نہ کہیں سے قریب اٹھائیس ہزار روپے کے جمع کر لیا ہے جس سے میں ہال تیار کرادوں گا۔خیر اب نہیں تو آئندہ سہی۔میری زندگی میں نہیں تو میرے بعد سہی یہ ہال ضرور تیار ہوگا لیکن علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم اس مدرسے کی بہت بڑی سرپرست تھیں اور ابتدا میں ان سے بہت مدد ملی تھی اس لیے میں نے ان کی شکر گزاری کا حق ادا کر دیا ہے اور وہ بڑا بورڈنگ ہاؤس جو ایک لاکھ روپے سے زائد لاگت سے بنا ہوا تھا وہ سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔اس لیے الگ بطور یادگار کے کسی ہال کے تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا سلطانیہ ہوسٹل 1928 میں بننا شروع ہوا۔اس بڑی عمارت کے لیے میرے پاس روپیہ نہیں تھا لیکن اسی سال میں یو پی کی پرانی لیجسلیٹیو کونسل کا ممبر تھا۔اسمبلی کے ممبر صاحبان کا یہ طریقہ تھا کہ گورنمنٹ کے افسران سے وہ اپنے لیے مفاد حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔کوئی اپنے بیٹے یا بھتیجے، بھائی وغیرہ کی نوکری کے لیے کوشش کرتا تھا اور کوئی خطابات حاصل کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔لیکن میرا مطمح نظر صرف لڑکیوں کا مدرسہ تھا۔اس لیے میں نے کبھی کسی افسر سے کسی بات کی خواہش نہیں کی۔لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اگر گرانٹ وغیرہ حاصل کرنے کا کوئی معاملہ کسی ہندو یا مسلمان نے میرے سامنے پیش کیا تو میں نے اس معاملے میں کسی سائل کی مدد کرنے میں دریغ نہیں کیا۔میں نے اپنے بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لیے ایک بڑی گرانٹ کی درخواست دی۔مسٹر میکنزی ڈائریکٹر تعلیمات اور مس اسٹوورڈ لڑکیوں کی مدارس کی چیف انسپکٹر یس تھیں۔ان دونوں سے میرے تعلقات خوش گوار تھے ان دونوں سے میں نے کہا کہ مجھے روپیہ دلوادو۔مسٹر میکنزی نے کہا کہ اگر کسی اچھے ایمان دار آدمی کو ٹھیکہ دو تب میں تم کو روپیہ دینے کی کچھ فکر کروں۔میں نے ان سے کہہ دیا کہ فورڈ میکڈانلڈ سے بڑا اور ایمان دار کنٹریکٹر اس وقت عمارت کے لیے اور نہیں ہو سکتا۔میں اس کو ٹھیکہ دوں گا اور میں نے فورڈ میکڈانلڈ کو ٹھیکہ دیا چنانچہ ایک بڑی گرانٹ مل گئی اور قریب ایک لاکھ کی لاگت سے بورڈنگ ہاؤس تعمیر ہو گیا جس کا نام سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس ہے۔یہی وہ بورڈنگ ہاؤس ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔اس بورڈنگ

ہاؤس کے بننے کی وجہ سے ہمیں لڑکیوں کو اپنے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اس لیے لڑکیوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ اب اس وقت اس کے ایک حصے میں ڈگری کلاسز کے لیکچر ہوتے ہیں اور باقی حصوں میں طالبات رہتی ہیں۔ اب آئندہ 1930 کے بعد سے جو ترقی ہوئی اور واقعات پیش آئے ان کا سلسلہ پھر شروع کیا جائے گا۔

متفرق مضامین

۱

خدا کا تصور

خدا زندہ ہے اور قائم ہے اس بیان کی اصلیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جو انسان اس کی اصلیت سے انکار کرے وہ انسانیت سے خارج اور عقل سے بے بہرہ ہے۔ اب تک کسی سائنس داں نے یا فلاسفر نے خدا کی ہستی اور اس کے بڑے اوصاف سے انکار نہیں کیا تھا۔ سب مانتے تھے کہ وہ ہر کام کے انجام دینے میں قادر ہے اور ہر چیز کے جاننے میں ماہر ہے اور ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ یہ بڑے اوصاف جو اللہ تعالیٰ سے منسوب کیے گئے تھے وہ کسی الہامی کلام پر مبنی نہیں تھے بلکہ گذشتہ زمانے کے فلاسفروں اور سائنس دانوں نے اپنی گہری غور و خوض سے ظاہری حالات دیکھتے ہوئے یہ کلیۂ قائم کیا تھا اور اب تک یہ قائم رہا۔ فلاسفر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور اختلاف کرتے رہے لیکن عوام خواہ مسلمان ہوں یا ہندو ہوں، عیسائی ہوں یا سکھ ہوں، پارسی ہوں یا مجوسی سب اس بات کے قائل رہے کہ ہمارا خدا ہر جگہ موجود ہے اور جو کچھ ہم اس سے مانگیں گے وہ ہم کو دے گا۔

میں نے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ الٰہ آباد کے مقام پر جنگلی قوموں کے ایک گروہ میں دیکھا کہ ایک مرد ایک جوان عورت کو خار دار جھاڑی کی شاخ سے مار رہا تھا اور اس جوان

عورت کے جسم سے خون کے فوارے جاری تھے اور اس قوم کے مرد و عورت چاروں طرف کھڑے کہہ رہے تھے کہ اپنے کرتوت کا پھل پا رہی ہے۔ عورت روتی جاتی تھی اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتی جاتی تھی کہ ہے ایشور تو دیکھتا ہے کہ مجھ پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ لوگوں نے مجھ پر تہمتیں لگائی ہیں اور اب مجھ کو مارا جا رہا ہے اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ یہ جنگلی قومیں بھی ایشور کو مانتی ہیں اور اپنی مصیبت کے وقت اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتی ہیں کہ تو مجھ کو بچا۔ یہ لوگ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔ میں نے ان جنگلیوں میں سے ایک آدمی کو اشارہ کر کے اپنی طرف بلایا اور دریافت کیا کہ کیوں اس پر ظلم کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ اس کا چلن اچھا نہیں ہے اس لیے اس کا شوہر اس کو مار رہا ہے۔ مجھے افسوس تو بہت ہوا کہ میں اس کو بچا نہیں سکتا مگر میں زیادہ دیر تک وہاں کھڑا نہ رہ سکا اور ان لوگوں کو ویسے ہی چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ جنگلی قوموں کو خدا کی ہستی اور موجودگی کا احساس ہے اور بہت سے موقعے میری آنکھوں کے سامنے گزرے جن سے یہ ثابت ہوا کہ مظلوم اور مصیبت زدہ سب لوگ خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ ہم کو بچا۔ لیکن اب زمانہ کچھ ایسا آ گیا ہے اور سائنس داں کہنے لگے ہیں کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے اور بعض ملکوں میں عوام بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں اور ایک فرقہ کمیونسٹ کا پیدا ہو گیا ہے جو روس میں، چین میں اور قریب قریب دنیا کے دوسرے ملکوں میں خدا کی ہستی اور موجودگی سے انکار کر رہا ہے۔

کمیونسٹ فرقہ ایک فلاسفر کی کتاب پر استدلال کرتا ہے۔ اس کتاب کا لکھنے والا ایک جرمن تھا جس کا نام کارل مارکس تھا جس نے گذشتہ عالمگیر جنگ سے بہت پہلے یہ کتاب لکھی تھی۔ لینن جو روس کی حکومت کا پریذیڈنٹ بعد کو ہوا اس پر اس کتاب کے دلائل کا بہت اثر ہوا اور اس نے اپنے ملک میں اس کی اشاعت کرنی شروع کی اور اس اشاعت کی وجہ سے روس کی حکمراں جماعت نے جرمن فلاسفر کے استدلال پر عمل کرنا شروع کیا اور روس قریب قریب صرف لامذہب ہی نہیں ہوا بلکہ خدا سے اور خدا کی قدرت سے بھی منحرف ہو گیا۔ اب اس وقت روس میں اس کا بہت کچھ چرچا ہے اور آبادی کا ایک بڑا حصہ اس کا قائل ہے اور خدا کی ہستی سے انحراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نہیں ہے۔ چین میں بھی اس کا چرچا ہو رہا ہے۔ لیکن چین میں اب تک کل آبادی

نے اپنا آبائی مذہب نہیں چھوڑا ہے۔

ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کے اونچے طبقے میں خدا سے انحراف کے آثار نظر آ رہے ہیں اور لوگ کمیونسٹ بن رہے ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد تو زیادہ نہیں ہے لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے خیالات کا اثر طلبا پر بھی بہت کچھ پڑ رہا ہے۔ میں نے جہاں تک حالات سے واقفیت حاصل کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر یونیورسٹی میں بعض پروفیسر اور ریڈر وغیرہ کمیونسٹ ہو گئے ہیں۔ کمیونسٹ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کومت مانو تاکہ سب لوگ ایک سطح پر آ جائیں، اور مناقشے و جھگڑے نہ ہوں۔ میرے خیال میں مناقشے اور جھگڑے ان لوگوں میں بہت زیادہ ہیں جو خدا کو نہیں مانتے لیکن خدا کے ماننے والے لڑائی جھگڑوں میں ایسے پڑے ہیں کہ خدا کے نہ ماننے والوں کو بھی انھوں نے مات کر دیا ہے۔

اس صدی کے ابتدائی اور درمیانی دنوں میں دو عالمگیر جنگ شروع ہوئیں۔ اوّل جنگ کے ختم ہونے سے کوئی دس بارہ سال تک تو امن رہا اور اس کے بعد یورپ میں پھر جنگ شروع ہو گئی اور بہت سخت خونریزی ہوئی۔ اس خونریزی کے مظاہرے زیادہ تر خدا کے ماننے والوں کے درمیان ہوئے۔ دونوں فریق خدا کے ماننے والے تھے اور دونوں نے ایک دوسرے کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ دوسری جنگ کے زمانے میں جرمنی میں ایک شخص پیدا ہوا۔ جس کا نام ہٹلر تھا۔ یہ شخص ایک نیچے درجے کا فوجی افسر تھا پھر اس کو موقع مل گیا تو اس نے جرمن قوم کو غیر قوموں پر حملے کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ اس کے مقابل میں انگریز اور فرانسیسی وغیرہ مغرب کی قومیں لڑتی رہیں اور آخر میں آکر روس بھی اس میں شریک ہو گیا۔ ہٹلر نے اپنی فوج کو اتنا بھڑکایا کہ وہ دیوانہ وار سب پر حملے کرنے لگی اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ روس کی زبردست حکومت پر بھی دھاوا بول دیا اور روس کے ایک بڑے شہر جس کا نام اسٹالین گریڈ تھا حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ کچھ عرصہ کے لیے اس پر قبضہ بھی رکھا پھر روس کی فوج نے اس کو شہر سے نکال دیا اور ہٹلر کی فوج اب بہت کمزور ہو گئی اور لوٹ کر اپنے ملک میں پہنچی۔ اس کے بعد روس نے ایک بڑی فوج تیار کر کے جرمنی پر حملہ کیا۔ جرمنی روس کا مقابلہ نہ کر سکی اور روس نے جرمنی کے دارالخلافہ پر حملہ کر کے اس کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اب ہٹلر کمزور ہوتے ہوتے برلن کے مغربی حصے میں جا کر پناہ گزیں ہوا اور

شہر کے تہہ خانوں میں جا کر اور لوگ بھی پناہ گزیں ہوئے اور ہٹلر نے وہاں اپنی ایک چتا بنا کر خودکشی کر لی اور چتا پر اس کو جلا دیا گیا۔

• ہٹلر نے جو مظالم کیے وہ ان مظالم سے کم نہیں تھے جو ایٹلا ہن نے کیے تھے یا چنگیز خاں اور اس کے بیٹے ہلاکو خاں سے سرزد ہوئے تھے۔ ہٹلر نے اپنی حکومت کے زمانے میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کرایا۔ اس میں عورت مرد بچے بڈھے سب شامل تھے اور جس شخص کو اس نے اس خونریزی کے لیے مقرر کر رکھا تھا اس کا نام آئشمن تھا وہ ہٹلر کے مرنے کے بعد جنوبی امریکہ کے ایک مقام ارجنٹائنا میں جا کر پناہ گزین ہوا تھا۔ پتہ لگانے سے معلوم ہوا کہ ارجنٹائنا میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ یہودیوں نے یروشلم میں ایک چھوٹی سی اپنی حکومت قائم کر لی ہے جس کا نام اسرائیل ہے اس حکومت کے ایجنٹ اس تاک میں رہے کہ اس شخص کو کہیں سے گرفتار کر کے اسرائیل کی حکومت میں پہنچایا جائے۔ چنانچہ آخر کو آئشمن پکڑا گیا اور اسرائیل حکومت نے اس کو پھانسی دے دی۔ اس کا جواب صرف یہ تھا کہ میں نے خود کچھ نہیں کیا بلکہ جو حکم ہٹلر نے دیا میں نے اس کی تعمیل کی۔ یہ ہٹلر کا قصور تھا مجھے کیوں سزا دی جاتی ہے۔ لیکن ججوں نے اس کو نہیں تسلیم کیا اور پھانسی کی سزا دے دی۔

ان لڑائیوں کا ذکر فقط اس لیے کیا گیا ہے کہ اس مضمون کے پڑھنے والوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ خدا سے انحراف یا خدا پرستی انسانوں کے آپس کے لڑائی جھگڑے روکنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔ لڑائی جھگڑے جن وجوہات سے پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ایک ملک کے لوگوں کو جب اپنی معاشرت کی چیزیں حاصل کرنے میں دشواری ہو جاتی ہے تو وہ دوسری پڑوسی قوم پر حملہ کرتے ہیں اور ان کا مال و اسباب چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جھگڑے تو آخر تک رہیں گے۔ جب تک انسان اپنے لیے اشیا مہیا کرنے کی جستجو میں رہے گا۔

خدا دوسری قوموں پر ظلم کرنے سے تو ضرور روکتا ہے لیکن دوسرے ملک پر فوجی حملہ کرنے کا حکم میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر ایک قوم کمیونسٹ ہو جائے اور دوسری خدا پرست رہے تو ان دونوں میں سے ہم کو اختیار ہے کہ اپنے پیغمبر ﷺ کے حکم کے مطابق کس کو اپنا بھائی سمجھیں۔ آنحضرت نے اپنی زبان مبارک سے فتح مکہ کے بعد فرمایا تھا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا

بھائی ہوتا ہے اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ہمارے پیغمبر ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے مدعو کیا تھا کہ آؤ ہم تم جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور قدرت کے قائل ہیں مل کر غیر مسلموں کا مقابلہ کریں۔ اس وقت دنیا میں غیر مسلموں کی کثرت تھی اور مسلمان و یہودی اور عیسائی صرف تین فرقے تھے جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے قائل تھے۔ اب مسلمانوں کو یہ مرحلہ پیش آ گیا ہے کہ بعض مقامات کے کچھ مسلمان اللہ تعالیٰ کے وجود اور قدرت سے انحراف کر رہے ہیں اور کلمۂ ایمان کی تحقیر کر رہے ہیں اور اس کو پس پشت ڈال رہے ہیں اور بر خلاف مسلمانوں کے ہمارے ملک کے بہت سے ہندو اور دنیا کے عیسائی اور یہودی خدا کے وجود اور اس کی قدرت کے قائل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ہم کسی شخص کے نام کی وجہ سے جو اسلامی نام تو رکھتا ہے لیکن اسلام چھوڑ چکا ہے ایسے مسلم نما غیر مسلموں کو اپنا بھائی سمجھیں یا نہیں اور یہ بھی ایک بڑا اہم سوال ہے کہ آیا ان غیر مسلم قوموں اور اشخاص کو جو خدا کے وجود اور اس کی قدرت کے قائل ہیں ان کو بھی اپنا بھائی سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ آنحضرت ﷺ نے تو یہودیوں اور عیسائیوں کو مدعو فرمایا تھا کہ آؤ ہم تم مل جائیں اور مل کر کام کریں کیونکہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے وجود اور قدرت کے قائل ہیں اور باقی دنیا کے انسان قائل نہیں ہیں ان کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جاوے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہو جائیں۔

اب ہمارے سامنے کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ چکے ہیں اور دوسری قومیں جو اللہ تعالیٰ کی قائل ہیں لیکن بت پرستی بھی کرتی ہیں ان کو ہم بھی مدعو کریں یا نہ کریں کہ آؤ ہم تم مل کر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں لانے کی کوشش کریں جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ رہے ہیں یا چھوڑ چکے ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو کیمونسٹ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی قدرت کے قائل نہیں ہیں، ان لوگوں کی ابتدا تو روس سے ہوئی لیکن دنیا کے اور حصوں میں بھی یہ لوگ موجود ہیں۔ ہم کو ان لوگوں سے کوئی عداوت نہیں ہے لیکن خدا تعالیٰ کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ہم میں اور ان میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اب جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اوصاف کے قائل ہیں ان کو باہمی اتفاق کر کے کیمونسٹ فرقہ کو راہ راست پر لانے اور اللہ تعالیٰ کی ہستی کا قائل بنانے کی ضرورت ہے۔ ہم ہندوستان کی معزز ہندو قوم جو کثرت سے ہے اور دیگر فرقے جو اقلیت میں ہیں

ان سب کو مدعو کرتے ہیں کہ وہ باہمی اتفاق کر لیں اور اپنے بچوں یعنی لڑکے اور لڑکیوں کو کیمونسٹ ہونے سے روکنا ہمارا پہلا فرض ہے۔ اس کے بعد ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ جو لوگ کیمونسٹ ہو گئے ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں واپس لائیں۔

اب ہم کیمونسٹ فرقہ کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ہستی کے متعلق اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو گزشتہ زمانے کے سائنس داں اور فلاسفروں نے مانا تھا اور ان کے اثرات سے مہذب دنیا کے سب لوگ خدا کے وجود کے قائل ہو گئے۔ ہم اس بات کے پورے طور پر قائل ہیں کہ بعض باتیں جو اس دنیا میں دکھائی دیتی ہیں وہ ہرگز دکھائی نہ دیتیں اگر خدا نہ ہوتا۔ مفصلہ ذیل امور ہم خدا کی ہستی کے متعلق پیش کرتے ہیں۔

(1) اگر خدا تعالیٰ نہ ہوتا تو انسان بھی دنیا میں کہیں نہ ہوتا۔ انسان کی ابتدا خدا ہی کے حکم سے ہوئی۔ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو انسان پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان کے پیدا ہونے کے متعلق ہمارا یہ تجربہ ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کے باہمی اختلاط سے ایک بچے کی ابتدا ہوتی ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو خدا نے آلات شہوانی دیے ہیں۔ ان دونوں میں سے اختلاط باہمی کے وقت ہر ایک کے آلات شہوانی سے جرم نکلتے ہیں۔ اور جو جرم مرد کے آلہ شہوانی سے نکلتے ہیں انگریزی میں ان کو اسپرم (sperm) کہتے ہیں اور جو مادہ کہ عورت کی اندام نہانی سے برآمد ہوتا ہے اس کے جرم کو ایگ (egg) کہتے ہیں اور ایگ کے معنی انڈے کے ہیں جب عورت کے رحم میں یہ دونوں پہنچ جاتے ہیں تو قدرت کی رہنمائی سے یہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور ملنے کے بعد ایک دوسرے میں مخلوط ہو جاتے ہیں اور مخلوط ہونے کے بعد جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے (Fertilized Egg) فرٹلائزڈ ایگ کہتے ہیں یعنی ایسا انڈہ جس کو کھاد لگ گئی ہے اور اس کی جسمانیت ایک نکتہ کے برابر ہوتی ہے اس وقت یہ دونوں جرم اپنے اپنے تعلقات جسمانی سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں اور کہیں سے ان کو خوراک نہیں ملتی لیکن خدا نے اس کی خوراک کا انتظام یہ کر رکھا ہے کہ رحم کی دیوار سے ایک نلکی کے ذریعہ سے مخلوط انڈہ جڑا رہتا ہے اور خوراک اس کے ذریعہ حاصل کرتا ہے اور اسی طور پر یہ خوراک لگاتار اس ننھی سی جان کو پرورش کرتی رہتی ہے اور یہ ترقی کرتے کرتے ایسے درجہ کو پہنچ جاتا ہے کہ اس میں اعضا اور ہڈیاں اور ہڈیوں کے جوڑ خود بخود پیدا

ہونے شروع ہوجاتے ہیں اور نو مہینے کے عرصے میں ایک ایسی شکل بن جاتی ہے کہ گویا سانچے میں
کوئی چیز ڈھال دی گئی ہے۔ اگر ٹخنے کی جوڑ کی ہڈیاں الگ الگ کر کے ان پر غور کیا جائے تو سوائے
قدرت کی کاری گری کے اور کوئی طریقہ ہڈیوں کے جوڑ میں آنے کا اور ایک کا دوسرے سے مل جانے
کا معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں پر ہم بچے کی وہ شکل ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے اگر ہمارے پاس
آلات کافی ہوتے۔ ایک بچہ جب ماں کے رحم سے باہر آنا شروع ہوتا ہے تو اس کی شکل بالکل ویسی
ہی ہوگی جیسی کہ پیدا شدہ بچے کی ہوتی ہے۔ اور جو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنے لیے خوراک کی
کوئی چیز ڈھونڈتا ہے اور اگر ماں کے پستان پر اس کی انگلیاں پہنچ جاتی ہیں تو اپنے ننھے ننھے ہونٹوں کو
اس کے قریب لے جاتا ہے۔ وہ پستان کے نہایت چھوٹے سے منہ کو اپنے ہونٹوں میں لے کر چوسنا
شروع کرتا ہے اور اس میں سے جو دودھ نکلتا ہے اس کو چُسر چُسر پینا شروع کرتا ہے۔ اسے جب
بھوک لگتی ہے تو وہ رونا شروع کرتا ہے اور پستان کے منہ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کو چوسنا بھی
شروع کرتا ہے۔ اگر یہ سب کام وہ قدرت کی مدد سے نہ کرتا تو اسے اُس ابتدائی زمانے میں خوراک
نہ ملتی۔ یہ سب باتیں جو اس نے کیں اس کو قدرت نے سکھائیں۔ قدرت خدا کے بنائے ہوئے
قانون کا نام ہے جس کو اس وقت تک دنیا نیچر کہا کرتی تھی۔ اب جب کہ خدا کی ہستی سے انکار کیا
جا رہا ہے لیکن نیچر سے ہر کام نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نیچر کوئی چیز نہیں ہے اور نہ سائنس دانوں
نے اس کی نسبت ہمیں بتایا کہ آیا وہ کوئی قانون ہے یا خود ایک ذات ہے جیسے کہ خدا۔

سائنس دانوں کا بات بات میں نیچر کا حوالہ دینا ان کی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ
خدا کے علاوہ کوئی دوسری ذات مستقل اور کارفرما نہیں ہے۔ سائنس دان اگر نیچر کو کوئی چیز سمجھتے ہیں
تو ان کو چاہیے کہ وہ اس کی اصلی حقیقت سے دنیا کو واقف کرنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نکالیں
جس سے ثابت ہو کہ نیچر نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ جہاں تک سابق فلاسفروں اور سائنس
دانوں کا خیال نیچر کے متعلق تھا وہ یہ کہ نیچر خدا یا گوڈ کا قانون ہے۔ اس کی نسبت کوئی اختلاف
کرنے کی وجہ نہیں تھی کیونکہ خدا اور خدا کا قانون دونوں تسلیم کیے جاتے تھے۔ لیکن اب جب کی خدا
کی ذات سے انکار کیا جا رہا ہے کہ خدا کوئی ہستی ہے ہی نہیں تو پھر نیچر کو خدا کا قانون نہیں کہا
جا سکتا۔ نیچر خود کوئی ایسی ذات ہوگی کہ جس کے صفات اسی طور پر ہونے لازم ہوں گے جیسے خدا کا

قوانین کا خیال ہمارے دلوں میں قائم تھا۔ ہم اب تک نہایت مضبوطی کے ساتھ اس خیال پر قائم ہیں کہ نیچر خدا کا ایک قانون ہے اور خدا سے الگ نیچر کوئی چیز نہیں ہے، موجودہ زمانے کے بعض سائنسداں خدا کی ذات سے انکار کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں وہ ہم کو یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کون سی چیز یا کون سی ہستی ہے جو بعینہ وہی اوصاف رکھتی ہے جو کہ خدا کے اوصاف تھے۔ جن کو ہم نے قبول کیا تھا اور قبول کر رہے تھے۔

آج کل کمیونسٹ فرقہ کا بڑا زور ہے لیکن اب تک کمیونسٹ فرقے نے دنیا کو یہ نہیں بتایا کہ کمیونسٹ فرقہ کسی اخلاقی قوت پر مبنی ہے اور عقل سے ہم اس کو قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم کمیونسٹ فرقہ کو عقل اور اخلاق دونوں سے بیگانہ سمجھتے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں جب کہ اقوام دنیا ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے والے تھے اور انسان کشی کا بازار گرم تھا اس وقت جرمنی کے فلاسفر کارل مارکس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا میں جو ایک فرضی عقیدہ اقوام نے قائم کر رکھا ہے اور جس کے اثر سے ہر فریق دوسرے کی جان کا لیوا ہو گیا ہے، کہیں اس عقیدے ہی کا تو یہ اثر نہیں ہے کہ دنیا میں تباہیاں آ رہی ہیں۔ اس فلاسفر کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ دنیا میں روزی کمانے کے ذرائع محدود ہیں۔ زمین بلا کسی حد و حساب کے ہم کو رزق نہیں دے سکتی اس لیے ہمیں کل توجہ زمین ہی کی طرف مبذول کرنی چاہیے اور اسی کو اپنی زندگی کا سہارا تسلیم کرنا چاہیے۔ کارل مارکس سے قبل ایک فلاسفر جس کا نام ہکسلے تھا اس نے دنیا کے سامنے اپنا خیال پیش کیا تھا کہ ہم کو کوئی ایسی چیز معلوم نہیں ہے اور نہ کسی ایسی چیز کے آئندہ معلوم ہونے کا امکان ہے جس کو خدا کہتے ہیں یا جو مادّی دنیا کی تماشہ گاہ سے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے۔ کارل مارکس کی کتاب جب روس میں پہنچی اُس وقت عالمگیر جنگ ختم ہو چکی تھی اور روس میں لینن نامی ایک بڑا لیڈر حکومت کرتا تھا۔ لینن نے جب کارل مارکس کی کتاب کو پڑھا تو اس پر بہت اثر ہوا اور اس کے دل میں بھی خیال گزرا کہ خدا کی ہستی پر عقیدہ رکھنے والے لوگوں کے درمیان خونریز لڑائیاں ہوتی ہیں اور دونوں کا عقیدہ خدا کی ہستی پر ہوتا ہے۔ کہیں یہی عقیدہ اس تباہی اور خونریزی کا باعث تو نہیں۔ اس نے کارل مارکس کی کتاب کو خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی ترغیب دی کہ وہ بھی پڑھیں اور اس کے اپنے خیالات پر جو کچھ اثر پڑا تھا اس اثر سے بھی دوسروں کو آگاہ کیا۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ روس نے خدا کی ہستی اور

حقیقت سے انکار کرنا شروع کیا اور لوگوں سے کہا کہ تم کس بھول میں پڑے ہو خدا نہ دکھائی دیتا ہے اور نہ اس کی کوئی بات سنائی دیتی ہے۔ ہمارے حواس خمسہ کی پہنچ سے وہ بالکل باہر ہے اگر کوئی خدا ہوتا تو اپنی پہچان کا بھی ہمارے حواس میں سے کسی کو اس قابل بنا دیتا کہ وہ خدا کو دیکھ سکیں یا سمجھ سکیں اس لیے ان تمام فرضی خیالات کو ترک کر دو جس کی دنیا گرویدہ ہو رہی ہے اور اپنی زمین کی طرف توجہ کر و اور اس میں سے اپنی کوشش سے اپنی روزی پیدا کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت روس کی گورنمنٹ کے سربر آوردہ لوگ کارل مارکس کی باتوں کے قائل ہو گئے اور ان سے نیچے درجے کے جو لوگ تھے ان پر بھی ان خیالات کا اثر ہوا لیکن زیادہ تر لوگ خدا کے اور اس کی قدرت کی کاری گری کے قائل ہیں۔ ہندوستان میں تعلیم یافتہ فرقہ کے اوپر ہکسلے کے اس بیان کا اثر بہت تھا اور اب بھی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے اور جس میں اس نے کہا ہے کہ ہمیں قدرت کی ذات اور اوصاف اور دوسری کسی چیز کا بجز مادی دنیا کے تماشے کے کوئی علم نہیں ہے۔ اس خیال کی گرویدگی یہاں تک پہنچی کہ ہمارے اسکول کے بچے بھی اگر ان سے کہو کہ تم خدا کو مانتے ہو یا نہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں آپ دکھا دیجیے کہ خدا کیا ہے اور کہاں ہے تو پھر مانیں گے۔ اس خیال کو انگریزی میں اگناسٹی سزم (A gnosticism) کہتے ہیں اور آج کل بہت سے لوگ (Agnostic) ہو گئے ہیں لیکن اس پر طرہ یہ ہے کہ خدا کی ہستی کے منکروں کی لہر بہت زور سے چاروں طرف چل رہی ہے اور کیمونسٹ پارٹی نہ خدا کو مانے اور نہ خدا کے اوصاف کو مانے اور یہ ہم کو نہیں بتایا گیا کہ زندگانی جو انسان کو خدا نے دی ہے اور اس کے ساتھ عقل بھی دی ہے یہ انسان کو اس مادی دنیا کی مہربانی سے عطا ہوئی ہے یا کسی اور ذریعہ سے ملی ہے لیکن جب مادی دنیا میں خود نہ زندگی ہے اور نہ عقل ہے تو وہ انسان کو دونوں چیزیں کیسے دے سکتی تھی۔ کیمونسٹ فرقے سے ہم یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ آپ اس کا جواب صفائی سے ہمیں دیجیے کہ ہم کو زندگی اور عقل کہاں سے ملی۔ وہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ مادی دنیا سے ملیں تو ان کا یہ کہنا قابل قبول نہ ہوگا۔ علاوہ اس کے بہت سی چیزیں اور بہت سے کام ایسے ہیں جو مادی دنیا سے ہم کو نہیں مل سکتے اور جن کے لیے ہمیں کسی ایسی ہستی کی ضرورت پیش آتی ہے جس میں وہ کام یا وہ چیز بنانے کا مادہ موجود ہو اور ہم نے تسلیم کر لیا ہو کہ اس میں یہ کام کرنے یا وہ چیز بنانے کا مادہ موجود ہے۔ سب

سے اوّل ہم اپنی زندگی کی ضرورتوں میں سے پانی پیش کرتے ہیں۔

پانی

یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ جس وقت مادّے کے عنصر ہوا اور دوسرے عنصر جن کی تعداد ترانوے بتائی جاتی ہے پیدا ہوئے تھے تو ان کے ساتھ پانی پیدا نہیں ہوا تھا۔ پانی بعد میں دو گیسوں سے مل کر بنا ان میں ایک گیس کا نام ہائیڈروجن اور دوسری کا نام آکسیجن ہے۔ اگر ہائیڈروجن کے دو جز آکسیجن کے ایک جز سے نہ ملیں اور دونوں ایک دوسرے میں مخلوط ہو جائیں اس وقت تک پانی نہیں بنتا ہے۔ اگر ہائیڈروجن اور آکسیجن کی مقدار برابر برابر آپس میں ملیں یا کسی اور نسبت سے ملے تو پانی نہیں بنے گا۔ فرض کرو کہ پانچ جز ہائیڈروجن کے اور تین جز آکسیجن کے آپس میں ملیں تو پانی پیدا نہیں ہوگا بلکہ دونوں گیس الگ الگ اپنی شکل میں رہیں گی۔ اب ہم ان لوگوں سے دریافت کرتے ہیں جو خدا کی ہستی کے قائل نہیں ہیں کہ پانی بنانے کے لیے یہ آمیزش دو جز اور ایک جز کی کس نے کی۔ یہ کہنا کہ آپ ہی آپ ہائیڈروجن کے دو جز اور آکسیجن کا ایک جز پانی بنانے کے لیے آپس میں جا کر مل گئے بالکل نامسموع اور ناقابل یقین ہوگا۔

ہوا

دوسری مثال جو اللہ تعالیٰ کا وجود ثابت کرتی ہے وہ ہوا ہے جو زمین کے گرد چاروں طرف گھیرا دیے ہوئے ہے۔ یہ ہوا ایک گیس نہیں بلکہ دو گیسوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ایک تو نائٹروجن ہے اور دوسری آکسیجن ہے۔ یہ ہوا جس سے ہم زندہ ہیں۔ اس میں سولہ جز نائٹروجن کے اور چار جز آکسیجن کے ہیں اس نسبت سے دونوں گیسوں کو کس نے جمع کیا۔ سائنس داں اور کیمونسٹ بتائیں یہ دونوں گیسیں اس نسبت سے کیسے مل گئیں اور کس نے دونوں کو اس نسبت سے زمین کے چاروں طرف پھیلا دیا اگر اس نسبت سے ملی ہوئی نہ ہوتیں تو انسان زندہ نہ رہتا۔ یہ ہوا زمین کی سطح سے کوئی بیس پچیس ہزار فٹ اونچائی میں پہنچتی ہے۔ وہ لوگ جو جہازوں میں اوپر کی طرف اڑتے ہیں ان کا تجربہ یہ ہے کہ پندرہ ہزار فٹ اونچائی پر آکسیجن بہت کم ہو جاتی ہے اور نائٹروجن قائم رہتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ نائٹروجن بھی کم ہو جاتی ہے۔ اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں گیسوں کو سولہ اور چار کی مقدار سے کسی دوسرے نے ملایا ہے خود بخود نہیں ملی ہیں۔

اس نسبت سے دونوں کے ملانے کی غرض یہ تھی کہ آکسیجن اتنی مقدار میں رہے جو انسان کے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو اور نائٹروجن کے کم وبیش ہونے سے انسان کی زندگی اور صحت پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ ان دونوں گیسوں کو کوئی قوت ملانے کے لیے اس وقت کارآمد ہوسکتی ہے جب اس میں عقل ہو اور سمجھ ہو اور سولہ و چار کے ملانے کی ترکیب سے واقف ہو۔ سائنس دانوں کا بلاسوچے سمجھے کہہ دینا کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے یہ ان کی غلط خیالی پر مبنی ہے ان کی بات قطعاً ماننے کے قابل نہیں ہے۔ پرانے زمانے کے فلاسفروں اور سائنس دانوں نے جن باتوں کو سمجھا ان کے ہم بالکل قائل ہیں۔ پرانے زمانے کے فلاسفروں میں سقراط، ارسطو، افلاطون سب سے زیادہ زیرک اور سمجھ دار ہوئے ہیں۔ انھوں نے جن باتوں کو مانا ہے ان باتوں کو دنیا مان رہی ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے فلاسفروں اور سائنس دانوں نے جو باتیں تسلیم کی ہیں ہم ان کے قائل ہیں اور موجودہ زمانے کے فلاسفروں کے کہنے کے قائل نہیں ہیں کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ موجودہ زمانے کے سائنس داں ہرگز نہیں بتا سکتے کہ پانی کی ساخت اور اس ہوا کی ساخت جو ہم سونگھتے ہیں اور کس طرح پر ہوسکتی ہے۔

علاوہ بریں ہمارے بعض موجودہ سائنس داں یہ نہیں جانتے اور نہ بتا سکتے ہیں کہ نسل انسانی کا اوّل آدمی اور اول عورت کیسے پیدا ہوئے اور کہاں سے آئے۔ اگر ہم اول انسان کی نسبت عقل دوڑائیں تو ہم کو اس کا کہیں پتہ ونشان بھی نہیں ملے گا کہ سب سے اول انسان مرد اور عورت اس طریقہ سے پیدا ہوئے جو طریقہ آدمی کی پیدائش کا ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہمارا موجودہ تجربہ انسان کی پیدائش کے بارے میں وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن یہ تجربہ تو ایک مرد اور ایک عورت کی موجودگی کے بغیر عمل میں نہیں آسکتا۔ یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ وہ انسان کسی ماں باپ سے پیدا نہیں ہوا تھا، وہ خدا کے حکم سے بلا ماں باپ کے ظہور میں آیا۔ اگر خدا نہ ہوتا تو انسان بھی نہ ہوتا۔ ہمارے موجودہ سائنس داں اور کوئی ترکیب نہیں بتا سکتے کہ اول انسان کیسے پیدا ہوا اور بلا خدا کے ہم کو زندگی (Life) کس نے دی۔ مادّی دنیا کی پیدائش سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ اس میں عقل آسکتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں خدا ہی کے ہاتھ میں ہیں اور سائنس داں نہیں بتا سکتے کہ یہ دونوں چیزیں اور کس کے ہاتھ میں ہوسکتی ہیں۔ ہم

اس مختصر تحریر کو ختم کرتے ہیں اور ناظرین کو مطلع کرتے ہیں کہ وہ موجودہ زمانے کے بعض سائنس دانوں اور کمیونسٹ فرقہ کے لوگوں کو اپنی رہنمائی کے قابل نہ سمجھیں۔

ہمارا تصور

ہمارا تصور بہت چیزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ادھر خدا کی ہستی کو اپنے میں جذب کر کے اس کو بے حد مان کر اور اپنی بادشاہت میں ہر جگہ موجود ہونا ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے فلاسفروں کے ذہن میں شروع میں یہ بات آئی تھی کہ ہر چیز خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور ہر چیز اپنی وسعت میں بلا حد و حساب کے ہے۔ ان چیزوں میں سب سے وسیع ہم کو جو معلوم ہوتی ہے وہ خلا کی وسعت ہے۔ وہ کسی طرف سے محدود نہیں کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم میں سے کسی شخص کی عمر کروڑوں اور پدموں سال کی بھی ہو اور وہ علی گڑھ سے مشرق یا مغرب، شمال یا جنوب کی طرف روانہ ہو جائے کہ میں اس خلا کے کسی کنارے پر پہنچ جاؤں جس میں میں رہتا ہوں تو وہ اپنی ساری عمر (جس کی کوئی حد نہیں ہے) صرف کرنے کے بعد بھی خلا کے کسی کنارے پر پہنچ نہیں سکے گا۔ جس طرف کو وہ جا رہا ہو اس کی وسعت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ فرض کرو کہ وہ مغرب کی طرف چلا اور ہزاروں کروڑ سال تک چلتا رہا اور اتنی دوری پر پہنچنے کے بعد وہ ذرا سی دیر کے لیے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے لیے کھڑا ہو گیا تو اس کو وہی منظر دکھائی دے گا جو علی گڑھ میں دکھائی دیتا تھا۔ یعنی اتنی دوری پر پہنچنے کے بعد بھی اس کو کسی کنارے پر پہنچنے کا خیال ہنوز روز اوّل ہی متصور ہو گا۔

خلا کی وسعت بلا کسی حد و حساب کے ہے۔ اس کے کنارے پر پہنچنے کا خیال ہزاروں کروڑوں میل چلنے کے بعد بھی ہنوز روز اوّل ہے۔ یعنی اس کا تصور اس کو بتائے گا کہ تو بے کار کس محنت میں پڑا ہے۔ خلا کے کنارے پہنچنا محال ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی طرف یعنی وجود باری کی حدود کی طرف توجہ کرے گا کہ کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں وہ نہ ہو۔ اس کا تصور اپنے گھر یا دفتر میں بیٹھے بیٹھے یہ بتائے گا کہ یہ کوشش قطعی بے سود ثابت ہو گی اور اس پر یہ قول صادق آئے گا کہ "این خیال است و محال است و جنوں" یعنی یہ خیال تو محال ہے اور مانند ایک جنون کے ہے۔

اب اپنے تصور کو دوسری چیزوں کی طرف متوجہ کرو۔ ان سب میں زیادہ واضح اور روشن

خیال بحرِ ہستی کا ہے، بحرِ ہستی اس کو سمجھنا چاہیے جس میں ہم پیدا ہوئے اور جس میں ہم کچھ عرصے کے لیے رہ کر یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ یہ غور کرنے سے ناپیدا کنار ثابت ہوگا۔ شاعر نے اس بحرِ ناپیدا کنار کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے

جسے کہتے ہیں بحرِ ہستی اس کے دو کنارے ہیں ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

یہ ازل اور ابد خود بلا کسی حد و حساب کے دو الفاظ ہیں جن میں غیر محدود ہیں۔ ہستی کی چیزوں میں ایک چیز جو قابل ذکر ہے وہ وقت ہے، وقت کا بھی کوئی کنارہ ادھر یا اُدھر نہیں ہے۔ ہزاروں کروڑوں سالوں تک اوّل اپنا تصور دوڑانے کے بعد اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ یہ چیز بھی حد و حساب میں محدود نہیں کی جا سکتی۔ اب ہستی کی ایک ایک چیز کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کوئی چیز بھی محدود نہیں ہے۔ ہم رات کے وقت جب مطلع بالکل صاف ہو اور گھپ رات ہو تو اپنے اوپر کی طرف دیکھیں تو ہمیں کروڑوں تارے دکھائی دیں گے جن کو ہم آسمان کے تارے کہتے ہیں۔ یہ تارے اپنے قد و قامت میں ہر ایک ہمارے سورج کے برابر ہیں۔ یعنی کروڑوں اربوں میل پر ہماری نگاہ سے دور خلا میں اسی طور پر روشنی اور حرارت اپنے آس پاس کی خلا میں پہنچاتے رہتے ہیں جیسے کہ ہمارا سورج اپنی روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی روشنی ہم تک پہنچتی ہے اور اس پر بھی ہمارا شاعر کہتا ہے ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یعنی جو ستارے ہم کو اتنی دوری پر دکھائی دیتے ہیں ان سے آگے اور بھی ستاروں کے جھنڈ پھیلے ہوئے ہیں۔ انگریزی میں لفظ جہان کو لفظ یونیورس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انگیریزی لفظ یونیورس کے معنی ہیں وہ مجموعۂ اشیا جن میں ہمارے سورج کے برابر کوئی تارا بھی ہوتا ہے جو روشنی دیتا ہے اور اس کے گرد بہت سے سیارے بھی ہوتے ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ ہمارے سورج کے گرد نو سیارے گشت لگاتے ہیں جن میں زمین بھی ایک سیارہ ہے۔ سیارے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ان سیاروں میں ایک سیارہ جسے ہمارے شاعر اردو زبان میں مشتری کہتے ہیں اور انگریزی میں اس کو جوپیٹر کہتے ہیں۔ جوپیٹر بہت کافی روشنی دیتا ہے۔ یہ روشنی اس کی اپنی روشنی نہیں ہوتی بلکہ سورج کی روشنی کا پرتو ہوتا ہے۔ ایک دوسرا سیارہ جو ہمارے قریب میں واقع ہے وہ

زہرہ ہے۔ زہرہ کی روشنی مشتری سے بہت زیادہ صاف ہوتی ہے اور بعض وقت ایسی صاف ہوتی ہے کہ تیز نگاہ کے بچے اس روشنی میں اپنی کتاب پڑھ لیتے ہیں۔ میں نے اپنی بہت ابتدائی عمر میں ایک دفعہ تجربہ کیا تھا اور میرے پاس فارسی کتاب تھی تو اپنی نگاہ پر زور دینے سے میں نے اس کتاب کو پڑھ لیا تھا۔ زہرہ اور مشتری دونوں کو اپنی روشنی کی وجہ سے لوگ اپنے معشوق سے بھی مثال دیتے ہیں۔ ایک شاعر نے اپنے محبوب کو مخاطب کر کے لکھا ہے ع

تیری مانند زہرہ و مشتری ہو لے تو میں جانوں

مشتری چونکہ زمین سے بہت دور ہے اس لیے شاعر اپنے خیال میں سمجھتے ہیں کہ وہ تاروں کی مجلس میں ناچا کرتی ہے اور وہ یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ ناچنے والی ایک عورت ہے جو ناچا کرتی ہے۔ ناچنے والی عورت کو فارسی زبان میں رقاصہ کہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں جب انگریزوں کا قبضہ تھا تو ایک وائسرائے یہاں آیا تھا جس کا نام لارڈ کرزن تھا۔ اس زمانے میں ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کے بیٹے ایڈورڈ کی تاج پوشی کا ایک بڑا ہنگامہ خیز جشن منایا گیا اور انگریزوں کے یہاں ناچنا ایک مہذب سوسائٹی کا ایک آرٹ ہے۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے اس جشن کے متعلق ایک نظم لکھی تھی جس میں لیڈی کرزن کے ناچنے کی بھی تعریف کی تھی اور رقاصہ مشتری کا بھی اس میں حوالہ دیا تھا اور مشتری کا لیڈی کرزن کے مقابلے میں ایک کم درجہ کی ناچنے والی ثابت کیا تھا اور لکھا تھا۔

وہ رقاصہ اوج فلک تھی اس میں کہاں یہ نوک و پلک تھی

ہمارا تصور جب خدا کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس بات کے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ سورج کہاں سے آیا اور کب آیا اور اس میں روشنی و حرارت شروع ہی سے پیدا تھی یا پیچ میں پیدا ہوئی اور اس کا کوئی اندازہ لگانا ممکن ہے یا نہیں کہ وہ کب تک اس مقام پر رہے گا جس پر اس وقت تک روشنی دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ روشنی اور حرارت لگا تار بلا وقفہ کے اس میں سے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔ آیا اس میں خود کوئی چیز ایسی ہے جو ہزاروں سال تک بلا وقفہ کے چلتی رہتی ہے اور روشنی و حرارت دیتی رہتی ہے اور اگر باہر سے اس میں کوئی آتش خیز مادّہ کہیں سے آتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی روشنی و حرارت میں

کبھی وقفہ پیدا نہیں ہوتا تو وہ آتش خیز مادہ کہاں سے آتا ہے۔ خلا میں ہمیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دیتی جس میں سے لگاتار وہ مادّہ جو لاکھوں اور کروڑوں ٹن روزانہ آکر سطح پر منتقل ہوتا ہے۔ باہر سے آنے والی کروڑوں اور پدموں ٹن چیز چھپ نہیں سکتی۔ وہ ضرور کبھی نہ کبھی تو آتی ہوئی معلوم ہوگی۔ پس باہر سے کسی چیز کے آنے کا خیال بالکل ترک کر دینا چاہیے اور اس کے اندر ایک لا انتہا طول وعرض شے کا موجود ہونا اور اس کا برابر جلتے رہنا اور روشنی وحرارت دیتے رہنا کسی طرح سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ گو ہم اس زمانے کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس زمانے سے ہمارا سورج روشنی اور حرارت دے رہا ہے۔ اور نہ تاریخی کوئی واقعہ ہمارے پاس موجود ہے کہ کب سے اس نے روشنی اور حرارت دینی شروع کی۔ لیکن ایک تاریخی واقعہ ہمارے پاس ایسا موجود ہے جس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج سے قریب پانچ ہزار برس پہلے جس طور پر کہ سورج ہم کو روشنی اور حرارت دیتا تھا اُسی طور پر برابر دیتا چلا آیا ہے۔۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مصر کے کسی فلاسفر یا ایسٹرونومر (Astronomer) نے شمسی سال کے دن گن کر یہ طے کیا تھا کہ شمسی سال میں 365 دن ہوتے ہیں اس کے بعد سے اس اندازے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ برابر اور لگاتار وہی تعداد دنوں کی ہر سال میں چلی آتی ہے جس سے یہ بات معلوم ہوگی کہ سورج کی روشنی اور حرارت میں کبھی کوئی فرق نہیں آتا۔ برابر اور لگاتار وہی روشنی اور وہی حرارت چلی آتی ہے۔ موسم ضرور بدلتے ہیں لیکن وہ سورج کی وجہ سے نہیں بدلتے بلکہ وہ زمین کی گردش کی وجہ سے بدلتے ہیں۔ زمین کبھی خط استوا کی لائن کے مقابلے میں گشت لگاتی ہے اور جہاں جہاں وہ سورج کے سامنے آتی ہے۔ وہ مقام گرم ہو جاتا ہے اور جب خط استوا سے اوپر یا نیچے گشت لگاتی ہے تو اس کے گشت کا جو مقام سورج کے سامنے آتا ہے وہ گرم ہو جاتا ہے۔

ان مشاہدات سے یہ معلوم ہوا کہ سورج سے جو گرمی یا روشنی نکلتی ہے اس میں کوئی کمی وبیشی نہیں ہوتی ہے۔ گرمی کی کمی بیشی صرف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ سورج کے سامنے جو مقامات گشت کی وجہ سے آجاتے ہیں وہ گرم ہو جاتے ہیں اور جن مقامات پر سورج کی روشنی سیدھی زمین پر آکر نہیں پڑتی وہ مقامات ٹھنڈے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے گرد جو مقامات ہیں وہ ہمیشہ نہایت ٹھنڈے رہتے ہیں اور ان میں پانی جم جاتا ہے۔

ہمارے سائنس داں ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ جب کوئی آتش گیر چیز نہ تو سورج میں موجود ہے اور نہ باہر سے آ کر اس میں روشنی اور حرارت پیدا کرتی ہے تو پھر یہ روشنی اور حرارت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے پیدا ہونے کے کیا وجوہات ہیں۔ دنیا کے اندر جس طرح فلاسفر مختلف چیزوں کے بارے میں تحقیقات کر کے اپنی اپنی تھیوریاں پیش کرتے رہتے ہیں وہ میرے لیے اور عام مخلوق کے لیے اطمینان بخش نہیں ہیں۔ ادھر تو یہ فلاسفر معذور ہیں اور ہم کو نہیں بتا سکتے کہ سورج میں روشنی اور حرارت کیسے پیدا ہوئی ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ دنیا کا پیدا کرنے والا اور دنیا پر حکومت کرنے والا ایک ہے جس کو لوگ خدا کہتے ہیں اور یہ روشنی و حرارت جو سورج میں ہے اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، اس کو کوئی چیز پیدا کرنے کے لیے کسی سبب یا امداد کی ضرورت نہیں ہوتی وہ جس چیز کو چاہتا ہے وہ ہو جاتی ہے یعنی وجود میں آ جاتی ہے جیسے کہ عہد عتیق میں آیا ہے کہ خدا نے کہا کہ روشنی ہو جائے تو روشنی ہو گئی۔ اس سے قبل اندھیرا ہی اندھیرا تھا روشنی نہیں تھی۔ تو ہم بھی فلاسفروں سے کہتے ہیں کہ وہ ہستی جس کو ہم خدا کہتے ہیں وہ بلا کسی سبب یا بنیاد کے چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے اس نے اپنے حکم سے روشنی اور حرارت پیدا کی اور اسی کے حکم سے بہت سی دوسری چیزیں پیدا ہوئیں جن کو ہم دیکھتے ہیں لیکن وجوہات سمجھ میں نہیں آتے کہ کن وجوہات سے یہ پیدا ہوئیں۔ موجودہ زمانے کے بعض فلسفی لوگ بجائے اس کے کہ ہمارے عقیدے کو قبول کریں کہے جا رہے ہیں کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ خدا کی موجودگی کوئی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے وہم کا نام خدا ہے۔ ہم کو ان کے کہنے کی کوئی اصلیت یا حقیقت معلوم نہیں ہوتی بلکہ خدا کی ہستی سے انکار ہی ہم کو ان کا وہم معلوم ہوتا ہے۔ اگر ان میں کوئی صلاحیت یا قابلیت ہو تو ہم کو بتائیں کہ سورج میں روشنی اور حرارت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ بطور حجت کے فلاسفروں کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ اگر خدا کی ہستی کے انکار میں ان کو کوئی وجہ یا اصلیت معلوم ہوتی ہو تو وہ بھی مہذب دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مہذب دنیا نے خدا کی ہستی کو تسلیم کر لیا ہے۔ اگلے زمانے کے بعض فلاسفروں نے بھی خدا کی ہستی کو تسلیم کیا تھا۔ اب اس زمانے میں بعض فلاسفروں نے خدا کی ہستی سے انکار کرنا شروع کیا ہے۔ میں ان کے انکار کی مطلق کوئی وجہ نہیں دیکھتا ہوں اور نہ ان کے اس بیان میں کوئی معقولیت معلوم ہوتی ہے۔

مہذب دنیا کی تاریخ میں اصلیت تو ضرور ہے لیکن ابھی تک اس میں ایک پختگی پیدا نہیں ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ابھی بہت سی باتیں سیکھنی ہیں اور وہ باتیں جو اس وقت ہم کو معلوم نہیں وہ ہم سے بعد کو آنے والوں کو ضرور معلوم ہو جاویں گی۔ ان کے معلوم ہونے کا انحصار ہماری معلومات کی وسعت پر منحصر ہے۔ جدید فلاسفروں کا جو بھی دل چاہے وہ بیان کیا کریں لیکن مخلوق کو موجودہ حالت کی طرف توجہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک بے گناہ مظلوم اور کمزور عورت کو ایک شخص اذیت پہنچا رہا ہے۔ اس میں اتنی قوت نہیں کہ خود اپنا بچاؤ کر سکے لیکن اس کو اس بات کا یقین ہے کہ جس نے مجھ کو اور اذیت پہنچانے والے ظالم کو پیدا کیا ہے وہ خود موجودہ ظلم کو دیکھ رہا ہے اور وہ دعا کرتی ہے کہ اے خدایا، اے پرمیشور تو دیکھ رہا ہے کہ مجھ پر کیا ظلم ہو رہا ہے تو ہی اس ظالم کو اس کی سزا دے گا اور میں دعا کرتی ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس کو اس ظلم اور تشدد کی سزا دے۔

روشنی اور حرارت یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ وہ سائنس کی نگاہ میں مادّی سمجھی جاتی ہیں یعنی جیسے اور مادّی اشیا ہیں ویسے ہی وہ بھی ہیں اور ان کی بنیاد میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے وہ پیدا ہوتی ہوں۔ نہ بنیاد میں کوئی گرم چیز ہے اور نہ روشن چیز ہے جس سے وہ پیدا ہوں۔ موجودہ زمانے کے بعض سائنس داں کہتے ہیں کہ کوئی چیز بلا اس کی جڑ و بنیاد کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر چیز کی جڑ اور بنیاد ہوتی ہے۔ اب ان سے اگر پوچھا جائے کہ روشنی کی جڑ یا بنیاد کوئی ہے جس سے وہ پیدا ہوتی ہے اور اسی طور پر حرارت کی کوئی اصلیت یا جڑ بنیاد ہے جس سے وہ پیدا ہوتی ہے تو سائنس دانوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کا جواب ہے۔ ہم اس میں یقین رکھتے ہیں کہ خدا جو چیزیں پیدا کرتا ہے ان کی کوئی جڑ یا بنیاد نہیں ہوتی بلکہ بلا جڑ و بنیاد کے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی تو پھر ہم کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ روشنی و حرارت کی کوئی جڑ و بنیاد ہے یا نہیں۔ سائنس دانوں کو روشنی اور حرارت کی جڑ و بنیاد ثابت کرنی چاہیے۔ آج تک سائنس دانوں نے ان چیزوں کی جڑ و بنیاد ثابت نہیں کی ہے۔ ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ سورج سے جو روشنی اور حرارت نکلتی ہے اس کا کوئی ذخیرہ کسی جگہ ہے۔ یہ دونوں چیزیں کس طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ اگر سائنس داں یہ بتا سکیں کہ فلاں چیز سے یہ پیدا ہوتی ہیں تو ہم ان کی بات مان لیں گے اور اپنا سر ان کے آگے جھکا دیں گے۔ ہم کو ان دونوں چیزوں کی اصلیت یا جڑ و بنیاد ثابت کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا یقین اور اعتقاد ہی ان چیزوں کے پیدا کرنے کے لیے کافی ہے کہ خدا جس چیز کا حکم دیتا ہے وہ ہو جاتی ہے۔

ہمارے سورج کی روشنی و حرارت جس کی تعداد کا کوئی حد و حساب ریاضی کے اعداد سے ظاہر نہیں ہو سکتا اس کو ہم اپنے یقین اور اعتقاد سے مانتے ہیں کہ وہ محض خدا کے حکم ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ سائنس دانوں کے علاوہ بعض غیر سائنس داں بھی کبھی کبھی سائنس دانوں کی تقلید میں کہا کرتے ہیں کہ خدا کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہم ان کے سامنے نہایت صفائی سے یہ پیش کرتے ہیں کہ جب خدا کوئی چیز نہیں ہے تو یہ روشنی اور حرارت کس نے پیدا کی ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال بہت ہی غلط ہے اور ہم اس کی تردید کرتے اور ان سے کہتے ہیں کہ تم سب باتیں جو ہمارے سامنے آتی ہیں اور ہمارے خیال میں آتی ہیں ان کو اپنے تجربات سے ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ ہیں۔ ہم ان کو بتاتے ہیں کہ زمانہ حال کے بعض سائنس دانوں کے غلط خیالات کی تقلید مت کرو۔ خدا دنیا میں موجود ہے۔ اس کی ہستی ہر چیز سے ثابت ہوتی ہے۔ ان کو لازم ہے کہ خدا کی ہستی میں اپنا اعتقاد رکھیں اور پرانے زمانے کے فلاسفروں مثل سقراط، ارسطو، اور افلاطون کے خیالات کی تقلید کریں۔ وہ باوجود اس کے کہ اعلیٰ درجے کے سائنس داں تھے لیکن خدا کی ہستی کے بھی قائل تھے۔

عورتوں سے ہمدردانہ سلوک

عورتیں نسل انسانی میں ایک نہایت ضعیف القوا مخلوق ہیں۔ ان سے مردوں کو بہت اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ان کے لیے بڑے صدمے کی یہ بات ہے کہ جو مرد ان سے شادی کر لے وہ بعد میں دوسری عورتوں سے بھی شادیاں کرے۔ اس کی نہایت دل خراش مثالیں موجود ہیں کہ جن عورتوں پر دوسری سوکنیں لا کر گھر میں بٹھائی گئیں اور خاوند و نئی دلہن نے مل کر پہلی عورت پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ میں نے اس مضمون کو کئی طریقوں سے رسالۂ خاتون میں لکھا تھا اور ایک مضمون تو ایسا تھا کہ لوگ کہتے تھے کہ اس کے پڑھنے کے بعد اب دوسری شادی کرنے کی رغبت کوئی شخص نہیں کرے گا۔ وہ مضمون ایک شیعہ سید کے بارے میں لکھا تھا جس کی پہلی غریب عورت نے سخت محنت کر کے اپنے غریب میاں کے لیے بھینس خریدی تھی۔ بھینس کو خود چارہ و پانی فراہم کرتی تھی

اور اپنے میاں کو اس کا دودھ پلاتی تھی۔ میاں کے پاس ایک چھوٹی سی ملازمت تھی اور وہ ایک اسکول میں ماسٹر تھا لیکن اس اسکول کا کوئی ہیڈ ماسٹر ایسا آیا کہ اس چھوٹے ماسٹر کو بہت تنخواہ دے دی۔ جب سے اس کی تنخواہ میں ترقی ہوئی اس نے ایک دوسری شادی کرنے کا منصوبہ اپنے سامنے رکھ لیا اور تلاش میں رہا کہ کوئی خوبصورت عورت ملے تو اس سے شادی کروں۔ آخر کو اس کو ایک نوجوان عورت مل گئی اور اس سے نکاح کر لیا اور اس کو اپنے گھر میں لایا اور اپنی مظلومہ پہلی بیوی سے کہا کہ یہ میری بیوی ہے اور اب اس گھر کی مالک ہے تم اس کی خدمت کرو۔

ایک موقع پر دونوں سوکنوں میں لڑائی ہو رہی تھی کہ میاں باہر سے آ گئے اور دیکھا کہ وہ دونوں آپس میں لڑ رہی ہیں۔ اس نے پہلی بیوی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور نئی بیوی سے کہا کہ اب اس کو مارو جس قدر تمھارا دل چاہے۔ آخر کو ہوتے ہوتے وہ وقت بھی آ گیا کہ میاں کو بھی موت آ گئی۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کو بلا کر کہا کہ اب ہم مرتے ہیں ہمارا کہا سنا یا بدسلوکیاں جو تم سے کیں ان سے مجھے معافی دے دو۔ بیوی نے کہا کہ میاں سب چیزیں معاف کیں۔ لیکن وہ بات معاف نہیں کی جب تم نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر مجھے میری سوکن سے پٹوایا تھا۔ اس نے بہتیرا کہا کہ اب تو ہم مرتے ہیں معاف کر دو۔ لیکن اس نے معاف نہ کیا اور کہا کہ اس کا بدلہ تم سے خدا لے گا چنانچہ وہ مر گیا۔

میں پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کا ہمیشہ مخالف رہا ہوں۔ میں اب دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں اور اپنے ملکی بھائیوں سے عرض پرداز ہوں کہ وہ شادی کریں تو ایک ہی کریں دوسری شادی نہ کریں۔ قرآن پاک نے شرط کے ساتھ دوسری شادی کرنے کی اجازت دی ہے اور کہا ہے کہ "اگر تم اپنی بیویوں میں انصاف کر سکو تو دوسری شادی کرو ورنہ ایک ہی شادی کرو۔" اب پندرہ سو سال کے تجربے سے یہ پورے طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی مرد جس کے گھر میں دو عورتیں ہوں پہلی عورت سے انصاف نہیں کر سکتا اور ہر شخص جو دوسری شادی کرتا ہے وہ خدا کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے اس لیے بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی جائے دوسری شادی نہیں کرنی چاہیے۔

یہ پیغام مسلمانوں کے لیے صاف ہے کہ "اگر انصاف کر سکو تو دوسری شادی کرو ورنہ ایک ہی شادی کرو" لیکن ہندو بھی ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں اور مجھے اپنے سات آٹھ

ہندو دوستوں کا تجربہ ہے کہ انھوں نے دو دو تین تین شادیاں کیں اور مجھ کو معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے بعض نے پہلی بیویوں سے بہت برا سلوک کیا۔ ان کے مذہب میں کوئی شرط انصاف کی کسی رُو سے نہیں دیکھی گئی۔ اس لیے ایک بے انصافی کا گناہ اپنے سر نہ لیں۔ اپنے ہندو اہل ملک سے نہایت مخلصانہ درخواست ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں نہ کریں۔

بچّوں کی تعلیم

ممالک یورپ اور امریکہ میں بچوں کی تعلیم دوسری سب باتوں سے مقدم سمجھی جاتی ہے۔ بچّوں کو تعلیم دینا مہذب انسان کے لیے جس قدر ضروری سمجھا گیا ہے اُس قدر اور کوئی دوسری بات ضروری نہیں ہے۔ میں اپنے تجربے کی وجہ سے ضروری سمجھتا ہوں کہ بچوں کے والدین بجائے اس کے کہ کوشش کر کے روپیہ پیدا کریں اور اپنے مرنے کے بعد اپنے بچّوں کے لیے روپیہ چھوڑ مریں ان کو واجب اور لازمی ہے بجائے روپیہ کما کر چھوڑنے کی کوشش کے وہ شروع ہی سے اپنے بچّوں کو تعلیم دلانے کی کوشش کریں۔

ایم۔ اے او کالج اور گرلس کالج کا تجربہ میرے لیے بہت کافی ہے کہ بچّوں کے لیے اگر کسی کو کچھ کرنا ہو تو وہ تعلیم دلائے۔ اکثر لوگوں کو یہ دیکھا ہے کہ بچّوں کو تعلیم دلانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ایک صاحب ذرا خوش حال تھے اور ان کے کئی لڑکیاں اور لڑکے تھے لیکن وہ بچّوں کو تعلیم نہیں دلاتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ بچّوں کو جاہل رکھا جائے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کون سی تعلیم حاصل کی تھی اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جتنے تعلیم یافتہ ہیں میں ان میں سے، کسی سے کم نہیں ہوں۔ یہ بڑا گھر میں نے اپنی کمائی کے روپے سے بنایا ہے۔ میں اور میری بیوی اور سب بچے بڑی خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے بھی اچھی حالت میں رہیں لیکن تعلیم کا پَن چھلّا اپنے بچّوں کے ساتھ لگانا نہیں چاہتا۔ کچھ عرصہ بعد وہ دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن نہ معلوم ان کے بیوی اور بچّوں پر کیا آفت آئی کہ ان کا گھر نیلام ہو گیا اور خوش حالی کی کوئی بات ان کے لیے باقی نہ رہی۔ اور نہ روپیہ رہا نہ گھوڑے رہے نہ بھینس اور گائیں رہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان کی بیوی کے پاس کچھ روپیہ باقی نہیں رہا۔ بڑی عسرت سے ان کی اور ان کے بچّوں کی گزر اوقات ہوتی ہے۔ ان کے بچے کارخانوں میں

مزدوری کرتے ہیں اور بیوی خود چکی پیس کر اور چرخہ کات کر گزر اوقات کرتی ہے۔ مجھے اس وقت ان کے مرحوم شوہر کا قصہ یاد آ گیا۔ اس واقعہ سے ہر شخص کو عبرت ہونی چاہیے کہ بچوں کو جاہل رکھنا کس قدر غلطی کا باعث ہوتا ہے۔

بچوں کو تعلیم دینے کا یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ چار پانچ برس کی عمر سے ان کو نرسری اسکولوں میں بھیج دیا جائے اور سات برس کی عمر تک وہ نرسری اسکولوں میں رہیں اور آٹھ سے گیارہ سال کی عمر تک مڈل کے درجہ کی تعلیم دلائی جائے اور اس کے بعد ہائی اسکول کی تعلیم دلائی جائے تاکہ پندرہ سولہ سال کی عمر تک وہ ہائی اسکول پاس کر لیں۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ان کو اعلیٰ تعلیم دلائیں جس کے لیے اب ہر جگہ کالج کھلے ہوئے ہیں جن میں میڈیکل، انجینئرنگ، زراعتی اور آرٹس کی تعلیم ہوتی ہے۔ بچوں کو تعلیم نہ دلانا ایک قومی جرم ہے اور نیز خاندان کے لیے بھی ایک ایسی غلطی ہے جس کو بمنزلۂ جرم ہی کے سمجھنا چاہیے اور قوم کے لیے ایک غیر تعلیم یافتہ آدمی وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک ڈاکو یا چور کی حیثیت ہوتی ہے۔ اس لیے میں اس کتاب کے پڑھنے والوں کے لیے یہ نصیحت اور وصیت چھوڑتا ہوں کہ وہ سب کاموں سے زیادہ بچوں کی تعلیم کو ضروری اور لازمی سمجھیں۔

میں لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیتا ہوں۔ لڑکے تعلیم پا کر ضرور روپیہ کمانے کے قابل ہو جاتے ہیں اور خاندان میں خوش حالی کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن بچوں کی تعلیم کے لحاظ سے میں لڑکیوں کی تعلیم بہت زیادہ قابل توجہ کے سمجھتا ہوں۔ کیونکہ بچوں کی تعلیم ابتدا سے ماں ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اگر وہ بچوں کی تعلیم سے لاپرواہی کریں تو بچے تعلیم کے رستے پر لگنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ بچوں کی ابتدا ہی سے تعلیم کے رستے پر لگانا لازمی ہے اور یہ کام جیسا کہ ایک تعلیم یافتہ ماں کر سکتی ہے ویسا باپ نہیں کر سکتا ہے۔

دنیا کی آبادی میں انسانوں کی کثرت

دنیا میں انسان روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ زمین جو ہمارے لیے کھانے کی چیزیں پیدا کرنے کا کام دیتی ہے اس کی پیداوار کی ایک حد ہے۔ اس سے زیادہ اس میں کچھ پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ زمین ادھر ادھر سے کھینچ کر وسیع کی جا سکتی ہے۔ اس قدر زمین خدا نے پیدا کر دی ہے وہ آخر تو ویسی ہی رہے گی اس میں خود بخود کمی بیشی نہیں ہو گی اور کھانے والوں کی افراط جب اس حد

سے بڑھ جائے گی جو زمین سے پیدا ہوسکتی ہے تو پھر قحط پڑ جائے گا اور انسان بھوک سے مرنا شروع ہو جائیں گے۔لیکن انسانوں کی کثرت آبادی قابل اصلاح کے ہے تا کہ اس میں بے روک ٹوک کے اضافہ نہ ہوتا چلا جائے۔اس کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر اور کسی فلاسفر نے اب تک کوئی علاج نہیں نکالا کہ انسانوں کی آبادی کو محدود کیا جائے تا کہ جو اشیا زمین سے پیدا ہوں وہ آبادی کی ضرورتوں کے لیے کفالت کر سکیں اور کافی ہو سکیں۔ میں مفصلہ ذیل تجویز مہذب انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ وہ اس پر توجہ کریں۔

آبادی کی افزائش کو محدود کرنے کے لیے سب سے اوّل بات یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ آبادی کیوں بڑھی چلی جاتی ہے اور کھانے کی اشیا کے متوازی کیوں نہیں رکھی جاتی کہ اگر کسی گاؤں میں ہزار آدمی رہتے ہیں اور ان ہزار آدمیوں سے زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے ورنہ ایک ہزار سے زائد جب انسان ہو جائیں گے تو موجودہ آبادی کی زندگی قائم رکھنے کے لیے جو ضرورت تھی اس میں کمی ہو جائے گی۔آبادی کو محدود کرنے کے لیے تین فریق کا اتفاق باہمی ضروری ہے۔ سب سے اوّل ماں باپ کو اس طرف خیال دلایا جاتا ہے کہ وہ ایک مقررہ تعداد سے زیادہ بچے پیدا نہ کریں اور دوسرا فریق جو اس میں مدد دے وہ ڈاکٹر اور حکیم ہیں اور تیسرا فریق کسی ملک کی حکومت ہے کہ وہ قانون ایسے پاس کرے کہ افزائش آبادی میں کوئی حد مقرر ہو جائے۔بچے کا پیدا کرنا باپ اور ماں دونوں کے ہاتھ میں ہے۔پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ سے کسی صحابی نے آ کر کہا کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے اور مجھے نہایت سخت ضرورت ہے کہ میں شادی کروں۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تمھارے پاس اگر بچوں کو پالنے کا سامان ہو تو شادی کرو ورنہ روزے رکھا کرو تا کہ جذبات شہوانی تم پر قبضہ نہ کر لیں بلکہ تمھارے قبضہ میں رہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ کچھ تدابیر ایسی ہیں جن سے جذبات شہوانی قابو میں آ سکتے ہیں۔اس لیے بچوں کے والدین کو لازم ہے کہ وہ ایسی تدابیر اختیار کریں کہ بچے ضرورت سے زیادہ آبادی میں افزائش نہ کر سکیں۔ یہ بات مرد اور عورت دونوں کے اختیار کی ہے کہ ان سے جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے سے الگ رہیں اور ڈاکٹروں و حکیموں کا یہ فرض ہے کہ وہ والدین کے لیے ایسی ادویات پیدا کریں کہ جس سے بچے پیدا نہ ہو سکیں اور حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ قانون بنا دے کہ موجودہ آبادی میں ایک مرد اور ایک عورت دو بچوں

سے زیادہ پیدا نہ کر سکیں اور جب دو بچے ہو جائیں تو ان کو موجودہ آبادی کی ضروریات میں حصہ ملے لیکن اگر دو سے زیادہ بچے پیدا ہوں تو ان کا پیدا کرنا ماں باپ کی ذمہ داری پر ہو اور آبادی کی ضروریات میں ان کو مخل ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔

اس کی تدبیر یہ ہے کہ جب دو بچوں سے زیادہ کوئی بچہ پیدا ہو تو اس کے ماں باپ اس کی زندگی کا بیمہ کرا دیں اور ہر ماہ میں بیمہ کی رقم ایک فنڈ میں جمع کی جائے جو لائف انشورنس کمپنی کی شاخ ہو اور اس بچے کی پندرہ سال کی عمر تک باپ سے یا ماں سے اقساط لی جاویں اور جب بچہ اٹھارہ سال کا ہو جائے یعنی قانونی بالغ ہو جائے تو یہ کل جمع شدہ سرمایہ اس کے سپرد کر دیا جائے جس سے وہ اپنا کاروبار کرے۔ یہ بیمہ کی تدبیر اس لیے ضروری ہے کہ بچے کے ماں باپ اس بار کو اپنے اوپر لینا پسند نہ کریں گے اور کوشش کریں گے کہ دو سے زیادہ بچے پیدا نہ ہوں۔ اس میں ایک تو یہ فائدہ ہے کہ ماں باپ پر ایک زور پڑے گا اور دوسری بات یہ ہوگی کہ زائد بچے کے لیے ماں باپ ہی ذمہ داری لیں گے اور بچہ بڑا ہو کر کسی پر بار نہ ہوگا۔ پہلی بات لازمی ہے کہ ماں باپ سوچ سمجھ کر دو بچوں سے زیادہ دنیا میں لانے کی کوشش نہ کریں۔

اس میں ڈاکٹروں اور حکیموں کی مدد کی بھی بہت ضرورت ہے کہ وہ باپ کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اولاد پیدا نہ کر سکے۔ حکومت کو اس معاملے میں بہت زیادہ توجہ کرنی پڑے گی۔ ہر بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کی پیدائش کی رپورٹ ایک افسر سے کی جاوے گی جو حکومت کی طرف سے اسی کام کے لیے مقرر ہوگا اور باپ کو یا ماں کو ان بچوں کی زندگی کی رپورٹ ہر ماہ میں افسر مذکورہ بالا کے دفتر میں کرنی پڑے گی تا کہ یہ معلوم رہے کہ دونوں بچے حیات ہیں۔ ان دو بچوں کی پرورش کے لیے ماں باپ کا فرض ہے کہ نسل کی بقا کے لیے کافی انتظام کریں۔ اور اگر کسی ملک میں یہ شرط دو بچے پیدا کرنے کی اور موجودہ آبادی کی روزی میں ان کو شریک کرنے کی قانون کی رو سے مقرر ہو جائے تو پھر کثرت آبادی کی وجہ سے قحط سالی کے مصائب کسی ملک یا شہر کو اٹھانے نہ پڑیں گے۔

تدابیر کا سوچنا اور دوسروں کے سامنے پیش کرنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ ان پر عمل پیرا ہونا دشوار ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آبادی میں روز بروز اضافہ ہوا چلا جاتا ہے اور خورد و نوش میں اس کی وجہ سے لوگوں کو قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس قلت کو دور کرنے کی اور کوئی تدبیر دکھائی نہیں

دیتی بجز اس کے کہ ان بچوں کی تعداد قانونی طور پر مقرر کی جاوے جو نسل کی بقا کے لیے ضروری ہوں اور اس سے زیادہ بچے نہ پیدا کیے جاویں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ معمولی درجے کی عورتیں جب باہر نکلتی ہیں تو ایک بچہ تو ان کے بغل میں ہوتا ہے ایک بچہ ایک طرف سے اور دوسرا بچہ دوسری طرف سے ان کی ساڑی پکڑے ہوئے ہوتا ہے اور تین چار بچے اس کے پیچھے پیچھے ایک جلوس بنائے ہوئے چلتے ہیں۔ ایسی حالت میں آبادی میں کثرت ہوگی کمی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے روک تھام ہر مہذب گروہ کے لیے لازمی ہے۔ بچے پیدا کر کے قوم کی آبادی میں شامل کرنا اور ان پر کوئی حد بندی کی قید نہ لگانا ایک قومی جرم سمجھنا چاہیے۔ قوم بچوں سے جو چاہتی ہے وہ یہ ہے کہ بچوں کی وجہ سے ان کی نسل قائم رہے۔ نسل کے قائم ہونے کی صورت یہی ہے کہ ان کی زندگی قائم رکھنے کے لیے ان کو کھانے پینے کی اشیا ضرورت کے موافق ملتی رہیں اور اگر ان میں کمی واقع ہوگی تو آدمی بھوک کے صدمے سے بیمار ہونا اور مرنا شروع کر دیں گے۔ بھوک ایک حد تک ضبط ہوسکتی ہے یعنی ایک دن کو کھانا ملے اور دوسرے دن نہ ملے اور اس کے بعد کے دن پھر کھانا مل جائے تو آدمی نہیں مرے گا لیکن اگر متواتر دو روز تک کھانا نہ ملے تو پھر آدمی کمزور اور بیمار ہو جائے گا اور دو چار روز نہ ملنے سے اس کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ ہمارے ملک میں قحط سالیاں بہت پڑتی رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ 1770 میں بنگال میں قحط پڑا تھا تو کم وبیش نصف آبادی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ 1900 میں بھی بنگال ہی میں قحط پڑا اور بہت آدمی مر گئے۔ بنگال کی آبادی چاولوں پر زندگی بسر کرتی ہے اور چاولوں کا کافی تعداد میں پیدا ہونا موسم بارش پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر ساون بھادوں میں مینہ نہ برسے تو چاولوں کی فصل ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہوگی۔ اور بعد کے مہینوں میں بھوک کی شدت سے لوگ مرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ جو مرتے ہیں وہ مزدور پیشہ ہوتے ہیں اور مزدور پیشہ لوگوں کو کاشت کے کاموں میں کام ملنا ضروری ہے تا کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے کافی غلہ حاصل کر سکیں۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں فقط بارش ہی پر دار و مدار نہیں ہے بلکہ نہریں اور کنویں بھی ہیں جن سے گیہوں جو وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے اور گو ان فصلوں میں بھی بارش کی کمی کی وجہ سے کمی آجاتی ہے لیکن بنگال کی طرح ان علاقوں میں اس قدر سخت قحط بارش نہ ہونے کی وجہ سے

نہیں پڑتا۔1900 کے شروع میں جو قحط پڑا تھا اس کی بابت لکھا تھا کہ گورنمنٹ نے غلّہ مختلف مقامات سے منگوایا تھا اور قحط زدہ دیہات میں وہ تقسیم کیا جاتا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ تقسیم کرنے والوں نے بڑی بے رحمی اور ظلم سے کام لیا کہ اپنے مذہب اور قوم کے لوگوں کو غلّہ دیا لیکن غیر قوم اور غیر مذہب والوں کو غلّہ دینے میں اس قدر کمی کی کہ ہر جگہ بہت سے آدمی بھوک سے ہلاک ہو گئے۔اگر بنگال میں بھی آبادی کی کثرت نہ ہوتی تو اتنے زیادہ آدمی نہ مرتے۔جتنا غلّہ باہر سے آیا وہ سب کے لیے کافی نہیں ہوا۔اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہاں آبادی میں بہت کثرت ہو گئی تھی۔

دنیا کے اور ملکوں میں بھی تاریخی زمانے میں قحط پڑتا رہا ہے اور اس کی داستانیں کتابوں میں ملیں گی۔ایک قحط کی نسبت شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے

چنان قحط افتاد اندر دمشق   کہ یاران فراموش کردم عشق

خشک ملکوں میں جہاں موسمی بارش ہوتی ہے ہمیشہ لوگ قحط سالی کی مصیبت برداشت کرتے رہے ہیں۔آج تک جو کچھ دنیا میں ہوا اس کا تجربہ ہمارے سامنے موجود ہے۔اس سے فائدہ اٹھا کر ہمیں آئندہ قحط سالیوں کی روک تھام کا انتظام کرنا چاہیے۔اور اس روک تھام کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آدمی کم پیدا ہوں تا کہ فصل کی کمی کی وجہ سے ملک کی آبادی کا ایک حصہ بھوک کی نذر نہ ہو جایا کرے۔اسی وجہ سے میں نے مہذب دنیا کے سامنے اپنا خیال پیش کیا ہے اور بھوک سے بچنے کا علاج بھی بتا دیا ہے کہ کسی ملک کی آبادی میں اتنے انسان نہ پیدا کیے جائیں کہ اس ملک کی پیداوار وہاں کی آبادی کے لیے ناکافی ہو۔میرے معروضات کو پڑھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ سب مہذب انسان اس خیال کو پسند کریں گے کہ آبادی میں انسانوں کی کثرت نہیں ہونی چاہیے۔

میری اولاد

میری چھ لڑکیاں اور دو لڑکے عبداللہ بیگم مرحومہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔سب سے پہلا بچہ ایک لڑکی تھی جو شادی کے دو سال بعد پیدا ہوئی تھی جس کا نام شوکت جہاں تھا۔لیکن وہ ڈیڑھ دو سال کے بعد راہیٔ ملک عدم ہوئی۔اس کے بعد رشید جہاں بیگم پیدا ہوئی اور پھر خاتون جہاں بیگم پیدا ہوئی۔اور اس کے بعد ممتاز جہاں بیگم پیدا ہوئی۔رشید جہاں بڑی ذہین لڑکی تھی اور اس کا بچپن بھی بڑا دلچسپ تھا۔وہ مدرسے میں پڑھنے لگی اس نے میٹرک پاس

کرلیا۔ پھر اپنی خواہش سے وہ لڑکیوں کے میڈیکل کالج میں یعنی لیڈی ہارڈنگ کالج واقعہ دہلی میں جا کر ڈاکٹری کی کلاس میں داخل ہوگئی اور مدت مقررہ کے بعد اس نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کرلیا اور ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور یو۔ پی کے مشرقی اضلاع لکھنؤ و کانپور وغیرہ میں ملازمت اور ہر جگہ زنانے اسپتالوں میں انچارج ہوتی تھی اور عورتوں میں اپنے خُلق سے اور قابلیت سے ایسا تعلق پیدا کیا کہ بعض مقامات کی عورتیں اصرار کرتی تھیں کہ ہمارا علاج اس مسلمان ڈاکٹرنی سے کراؤ جو فلاں اسپتال کی انچارج ہیں۔ اسی زمانے میں محمود الظفر خاں پسر ڈاکٹر سعید الظفر خاں سے ان کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد بھی وہ ایک عرصے تک ملازمت کر تی رہیں اور آخر کو موذی مرض کینسر میں مبتلا ہوگئی۔ ممبئی میں علاج ہوا لیکن ڈاکٹروں نے اشارتاً اور کنایۃً ان لوگوں سے کہنا شروع کیا جو اس کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس تھے کہ اس مرض سے جانبر ہونا مشکل ہے اور اس وقت اخبارات میں بھی شہرت ہوگئی اور پرائیویٹ طور پر بھی معلوم ہوا کہ روس کے شہر ماسکو میں کسی ڈاکٹر نے کینسر کے علاج میں کامیابی حاصل کی ہے ۔ اس خبر کے سننے کے بعد محمود الظفر خاں اور دوسرے عزیز و اقارب میں یہ مشورہ ہوا کہ آیا اس کو ماسکو بھیجا جاوے یا نہ بھیجا جاوے۔ آخر محمود الظفر خاں نے کہا کہ کسی کی رائے ہو یا نہ ہو میں تو ان کو ماسکو لے جاؤں گا۔ وہ اس کو لے کر ماسکو پہنچے۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے کہا کہ ہمارے یہاں جو بیمار شروع میں آجاتے ہیں ان کا علاج ہو جاتا ہے لیکن جب دیر ہو جاتی ہے تو پھر ہمارے علاج سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔

رشید جہاں کئی مہینوں تک ہندوستان میں علاج کراتی رہیں اور اس کو یقین ہو گیا کہ میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں لیکن محمود الظفر خاں کے حکم سے مجھے کوئی انکار بھی نہیں کہ میں نہ جاؤں اس لیے میں جانے کو تیار ہوں اور سب سے مل کر الوداع کہی جیسے انسان مرنے کو جاتا ہے اور عزیزوں سے الوداع کہتا ہے۔ محمود الظفر خاں نے وہاں کے کچھ حالات لکھے جو امید افزا نہیں تھے۔ وہ دو تین ماہ تک وہاں علاج کراتی رہیں۔ ایک رشین لڑکی سے دوستی کی محبت ہوگئی جو ان کے اسپتال میں اکثر ملنے آتی تھی آخر کو وہی ہوا جس کا ان کو اور ہم سب کو ڈر تھا یعنی ان کا انتقال ہو گیا اور ماسکو ہی میں دفن ہوئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ وہ بہت اچھی لکھنے والی لڑکی تھی۔ اس نے

بہت سے مضامین لکھے تھے ان میں سے چند مجھے دستیاب ہوئے جو کتابی شکل میں ہیں۔ان کو میں نے دوبارہ چھپوادیا ہے۔اس کی بہنیں اور عزیز و اقارب اور کالج کی لڑکیاں اور اس کے دوست غالباً پسند کریں گے وہ آج کل پریس میں ہے غالباً مہینہ دو مہینہ میں تیار ہو جاوے گی۔

دوسری لڑکی خاتون جہاں ہے جس نے لندن میں لیڈس یونیورسٹی میں جا کر تعلیم پائی اور وہاں سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد واپس آئی تو مسلم گرلس کالج علی گڑھ میں کچھ عرصے تک پرنسپل کے فرائض انجام دیے اور بعد کو کلکتا کے ایک زنانہ کالج میں پرنسپل ہو گئیں اور اسی دوران میں میاں ابو محمد ذوالقمرین ساکن آسنسول سے شادی ہو گئی۔میاں قمرین کو ریزرو بینک میں ایک جگہ ملی اور ان کی قابلیت نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک قابل منیجر کا درجہ عطا کیا۔وہ صرف اپنی ذہانت اور قابلیت سے درجہ بدرجہ اوپر چڑھتے گئے یہاں تک کہ وہ ریزرو بینک کولکتا، مدراس، بمبئی، کراچی اور دلی میں منیجری کے عہدے پر ممتاز رہے۔آخر ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ کر دل کی بیماری سے دنیا سے رخصت ہوئے۔یہ ان کے دونوں بچے نہایت ہونہار ہیں۔لڑکی ہنوز اعلیٰ تعلیم کی جماعتوں میں زیر تعلیم ہے اور اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور لڑکا شیرووڈ کالج نینی تال میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو کر دلی یونیورسٹی کے ایک کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کر چکا ہے اور اب اس کو چارٹرڈ بینک میں نوکری مل گئی ہے۔اور وہ خود اس بات کا خواہش مند ہے کہ کسی طرح ایم اے ہو جاؤں لیکن میرا مشورہ اس کو یہ ہے کہ چارٹرڈ بینک کی نوکری گورنمنٹ کی نوکریوں سے کم منفعت بخش نہیں ہے اور جب انھوں نے چارٹرڈ بینک میں نوکری شروع کی ہے تو اسی میں ترقی کرنے کی کوشش کریں اور "یک در گیر و محکم گیر" کا قول اپنے سامنے رکھیں اور دل لگا کر چارٹرڈ بینک میں کام کریں۔خاتون جہاں اپنے بچوں کی تعلیم میں بھی مشغول رہیں اور خود بھی سوشل ویلفیر بورڈ میں ملازمت کرتی رہیں اور بے کار نہیں بیٹھیں۔

تیسری میری بیٹی ممتاز جہاں بیگم ہیں جس نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے پاس کیا ہے اور مسلم گرلس کالج علی گڑھ میں لیکچرر ہو گئیں اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی ویمنس گرلس کالج میں پرنسپل کے عہدے پر ان کا تقرر ہو گیا۔اور اب تک اس عہدے کا کام بہت قابلیت سے انجام دے رہی ہیں اور درمیان میں انگلینڈ کی برسٹل یونیورسٹی سے بھی ایک ڈگری اعلیٰ تعلیم کی حاصل کر

چکی ہیں ۔ان کی شادی پروفیسر کرنل ایم حیدر خاں صاحب مرحوم سے ہوئی تھی جو مسلم یونیورسٹی اسٹاف اور طلبا میں نہایت ہر دلعزیز تھے ۔اور 1950 میں قائم مقام وائس چانسلر بھی رہے اور اسی عہدے پر ان کا بمقام بنارس انتقال ہوا جہاں وہ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی میٹنگ میں بحیثیت وائس چانسلر کے گئے تھے ۔انھوں نے ایک لڑکی اور ایک لڑکا اپنی اولاد چھوڑے ۔لڑکی نے دلّی یونیورسٹی سے ایم اے کی تعلیم حاصل کی اور لڑکا جب شیر وڈ کالج نینی تال سے کامیاب ہوکر آیا تو دہلی سینٹ اسٹیفنس کالج سے بی اے آنرز پاس کر کے فوراً ہی انگلینڈ چلا گیا اور وہاں جاکر آنرز کی ڈگری حاصل کی ۔وہاں سے واپس آیا تو فوراً آئی ۔اے ۔ایس کے امتحان کی تیاری میں لگ گیا اور امتحان ہوا تو اُس میں بڑے اونچے نمبر پر پاس ہوا یعنی پاس شدہ امیدواروں میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔گورنمنٹ نے اس کو ٹریننگ کے لیے بھیجا اور ٹریننگ کے بعد مصر کے سفارت خانے میں تقرر کر دیا اور آج کل مصر کے مقام قاہرہ میں مقیم ہے اور اب ان کو ترقی کے مواقع حاصل ہیں اور امید ہے کہ بہت جلد وہ سفیر ہو جائیں گے ۔ابھی تک دونوں بچوں میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے ۔

ممتاز جہاں کے بعد لڑکا پیدا ہوا جس کو محسن عبداللہ کہتے ہیں ۔اس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایس سی کرنے کے بعد ایل ایل بی پاس کیا اور علی گڑھ میں وکالت شروع کی لیکن ان کی قسمت میں وکیل ہونا نہیں لکھا تھا اس لیے وکالت چھوڑ کر فلم کی کمپنیوں میں ملازمت کر لی ۔یہ عمل میری طبیعت کے قطعاً خلاف تھا ۔جن لڑکوں نے علی گڑھ یا دوسرے مقامات پر اس سال وکالت شروع کی تھی جب محسن نے وکالت شروع کی تھی ان میں سے بعض ہائی کورٹ کی ججی تک پہنچ گئے ۔ اگر وہ بھی وکالت کے کام میں دلچسپی لیتا اور کرتا تو آج وہ بھی کسی بڑے عہدے پر پہنچ جاتا ۔وکالت چھوڑ جانے کی وجہ سے میرا اور ان کا اختلاف رہا اور اب تک ہے کیونکہ فلم کا کام بہت غیر مستقل ہے ، روپیہ بھی کچھ زیادہ نہیں ملتا اور سوشل پوزیشن بھی کوئی شخص حاصل نہیں کر سکتا ۔محسن کے دو لڑکے تھے ایک کا نام کمال عبداللہ تھا ، دوسرے کا نام طارق عبداللہ ۔کمال کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا ۔اس کے بعد دوسرا بچہ ہوا جس کا نام میں نے طارق رکھا ۔جب وہ سترہ اٹھارہ سال کا ہو گیا تو ٹورونٹو یونیورسٹی واقع کینیڈا میں انجینیر نگ کا امتحان پاس کرنے کے لیے گیا اور اب تک وہیں ہے ۔سُنا ہے کہ وہاں کے پاس شدہ لوگ تین تین چار چار ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں کیونکہ اس کو یہاں سے گئے

ہوئے قریب سات سال ہو گئے کچھ معلوم نہیں کہ وہ ملک ان کو پسند آ گیا کہ وہ واپس نہیں آتے یا کوئی اور وجہ ہے لیکن وہ باوجود اس کے کہ انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں لیکن واپس آنے کا نام نہیں لیتے ہیں۔ سُنا ہے کہ وہاں انجینئروں کی بہت کمی ہے اگر کوئی ان کے ۔۔ میں رہنا چاہے تو وہ بڑی خوشی سے رکھ لیتے ہیں۔ اگر ان کو تین ہزار یا چار ہزار روپے کی نوکری ۔ ئی تو وہ یہاں کیوں آئیں گے اور ہم ان کے لیے دعا کریں گے کہ جہاں رہو خوش رہو۔

محسن کے بعد سعید میاں پیدا ہوئے لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور تیس سال کی عمر میں 1935 میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے یونیورسٹی کے قبرستان میں ان کی پختہ قبر بنوائی جو چاروں طرف سے پتھر کی سلوں سے تیار ہوئی ہے۔

سعید میاں کے بعد میرے یہاں پھر ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام خورشید جہاں ہے وہ بہت خوبصورت بھی تھی اور دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ وہ شریر بہت تھی تو لوگ اس کو بڈھے سے ڈراتے تھے تو میں نے اس کی حالت کو دیکھ کر خلاف عادت ایک شعر موزوں کر دیا۔

بڈھے سے ڈراتے ہیں یہ مہربان سارے بلا سے ان کی ڈر جائے یا چھپے خوف کے مارے

میٹرک تک پڑھنے کے بعد ان کی شادی اکبر مرزا سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ہو گئی جو خان بہادر مرزا عاشق حسین ممبر اسمبلی یو پی کے صاحب زادے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد دونوں میاں بیوی پاکستان چلے گئے۔ خورشید جہاں کے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، سب سے بڑی لڑکی کا نام شبنم ہے جس نے لبنان یونیورسٹی سے تعلیمی ڈگری حاصل کی اور اب اس کی شادی ایک نوجوان وکیل سے ہو گئی ہے جو کراچی میں رہتے ہیں۔ دوسری لڑکی کا نام لبنیٰ ہے جو عبداللہ بیگم مرحومہ اور میرے پاس بچپن میں پانچ چھ سال تک رہی جس کے یہاں سے جانے کا رنج اب تک مجھے یاد ہے اور عبداللہ بیگم مرحومہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بھی یاد ہے۔ اس کی شادی ایک نوجوان کاظم حسین نامی سے ہو گئی، چونکہ وہ اوائل عمری میں عبداللہ لاج علی گڑھ میں رہی تھی اس لیے اس نے اصرار کیا کہ میری شادی عبداللہ لاج علی گڑھ میں ہی ہو گی۔ چنانچہ اس کی شادی عبداللہ لاج میں ہی ہوئی۔ دولھا کے باپ بھائی دوست سب برات لے کر عبداللہ لاج میں ٹھہرے اور یہیں پر نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ اس کا شوہر ریلوے میں ملازم ہے اور لاہور میں رہتا ہے وہ حکومت پاکستان کا ملازم ہے اور وہیں

سے کام سیکھنے کے لیے لندن بھیجے گئے تھے۔اب واپس آ کر لاہور ہی میں ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں
۔لندن جب وہ گئے تو لیلی بھی ان کے پاس چلی گئیں اور قریب ڈیڑھ سال تک لندن میں مقیم رہیں۔
خورشید جہاں کی تیسری بچی کا نام سنبل تھا۔ بہت ہی خوبصورت اور دلچسپ بچی تھی لیکن
اوائل عمری ہی میں انتقال کر گئی۔خورشید جہاں بھی فارغ نہیں بیٹھتی ہے اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ
بھی بند نہیں کیا۔ پرائیویٹ امتحان دے کر اس نے بی اے پاس کر لیا اور ایم اے کی تیاری کر رہی
ہے امید ہے اس میں بھی کامیاب ہو جائے گی۔اس نے کوئٹہ میں چند بیگہ زمین لے کر اس میں
بڑے قیمتی پودوں کا باغ لگایا ہے۔یعنی اس میں بادام، پستے، آڑو وغیرہ کے پودے لگائے ہیں۔
امید ہے وہ پودے اپنے وقت پر بارآور ہوں گے اور اگر اس وقت تک ملک الموت نے مجھے
اجازت دی تو میں بھی پھل کھا سکوں گا۔

خورشید جہاں کے بعد برجیس جہاں عبداللہ بیگم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ نہایت
خوبصورت اور دلچسپ بچی تھی اس کے لیے بھی میں نے شعر کہنے کی کوشش کی اور ایک شعر جو مجھے
یاد ہے وہ حسب ذیل ہے۔

مزا ہے تیری باتوں میں مزا ہے مسکرانے میں ۔۔۔ اگر غم بھی تجھے دیکھے پھرے شاداں زمانے میں

برجیس جہاں کی شادی احمد نظیر قدوائی سے ہوئی جو آئی سی ایس ہیں اور شیخ مشیر حسین
قدوائی کے بھائی شیخ مقبول حسین کے نواسے ہیں۔شیخ مقبول حسین قدوائی کی صاحب زادی کے
بطن سے پیدا ہوئے چونکہ انگریزوں کے زمانے کے سول سروس کے امتحان میں پاس ہو چکے تھے
اس لیے ان کو بلا کسی کوشش کے ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصے کے لیے یہ دہلی کی مرکزی حکومت میں
وزارت خارجہ میں کام کرتے رہے اور اسی زمانے میں میری بیٹی برجیس جہاں بیگم سے ان کی
شادی ہو گئی۔اس کے بعد وہ صوبہ آسام کی حکومت میں سکریٹریٹ میں لے لیے گئے۔اب وہ
صوبہ آسام کے چیف سکریٹری ہیں۔ برجیس جہاں کے بطن سے دو بچے پیدا ہوئے۔ایک لڑکی
جس کا نام شہناز قدوائی ہے۔دوسرا لڑکا جس کا نام خالد رشید قدوائی ہے۔دونوں شکل صورت کے
لحاظ سے دیکھنے کے قابل ہیں اور بہت تندرست زندہ دل بچے ہیں۔لڑکی دارجلنگ کے کالج
میں زیر تعلیم ہے اور اب تھوڑے دنوں میں وہ بی اے کا امتحان دے گی۔لڑکا ابھی چھوٹا ہے ساتویں

جماعت میں شیلانگ میں پڑھ رہا ہے۔

عبداللہ بیگم مرحوم ابھی جوان العمر ہی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اور میں نے ان کی سوانح عمری ان کے اولاد کے لیے اور مدرسے کی لڑکیوں کے لیے لکھ دی ہے۔ مدرسے کی لڑکیاں اس کو بہت پسند کرتی ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ اس کالج کی سب لڑکیاں اس کو پڑھیں گی۔ نیز دوسرے کالجوں کی لڑکیاں بھی اس کو پڑھیں گی جس کو پڑھ کر وہ اپنی زندگی کو جو موقع ملے تو اسی عدیم المثال طرز زندگی کی اختیار کریں گی جو عبداللہ بیگم مرحومہ نے اپنی یادگار کے طور پر چھوڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے بچے اس کی قدر کریں گے کہ ان کے باپ نے ان کی زندگی کی خوش اسلوبی کے لیے ایک یادداشت چھوڑی ہے۔

میرے ملازمین

جب میں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا تو میرے پاس نجی کوئی ملازم نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ میرے دوستوں میں سے بعض کے پاس پرائیویٹ ملازم بھی ہوتے تھے اور بورڈنگ ہاؤس کے ملازم بھی کام کرتے تھے۔ جب انٹرمیڈیٹ پاس کر کے میں بی۔اے میں آیا تو مجھے کچھ وظیفہ ملا تو میں نے ایک لڑکے کو اپنا نوکر رکھ لیا۔ نام یاد نہیں رہا لیکن میں نے کوئی سختی کا برتاؤ اس سے نہیں کیا۔ حالانکہ میرے دوسرے دوست نوکروں کو مارتے بھی تھے اور بعض لوگ کسی قصور پر ان پر جرمانہ بھی کرتے تھے اور تنخواہ بھی کاٹ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ البتہ اس نے کوئی قصور کیا تھا تو میں نے اس کو ایک دھکا دے دیا تھا اور وہ چبوترے سے گر گیا تھا۔ میں نے اس کے بعد ہی اس کی تلافی کر دی تھی اور اس کو مجھ سے کوئی رنج نہیں رہا تھا۔ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ لیکن جب تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے وکالت شروع کی تب مجھ کو نوکر رکھنے کی ضرورت ہوئی۔ باورچی تو لازمی طور پر رکھنا پڑتا تھا اور وکالت کے صیغہ کے منشی جہاں تک مجھ کو یاد ہے دو تھے مجھے ان کی تنخواہ نہیں دینی پڑتی تھی۔ وہ خود کافی کما لیتے تھے۔ اس کے بعد جب مرے پاس روپیہ ہو گیا تو میں نے موٹر خریدی۔ اس سے پہلے میرے پاس ایک گھوڑے کی گاڑی تھی اور اس کے لیے ایک ملازم رکھنا ضروری تھا۔ جب موٹر خریدی تو میں نے موٹر ڈرائیور ملازم رکھ لیا۔ اس کے بعد آمدنی زیادہ ہونے لگی تو میں نے پرانی موٹر کو بیچ دیا اور ایک نئی موٹر خریدی۔ جس کا ڈرائیور زیادہ تنخواہ لیتا تھا لیکن کام

بھی اچھا کرتا تھا۔ اس کا نام بشیر الدین تھا۔ جس نے تیس سال تک میری نوکری کی اور ایک وقت میں میرے پاس دو موٹریں ہوگئی تھیں لیکن ڈرائیور ایک ہی تھا۔ اس زمانے میں وکالت خوب چلی اور میں نے عبداللہ لاج کے نام سے ایک بڑی کوٹھی بنالی۔ میں نے کسی انجنیر کو نقشہ بنانے یا نگرانی کرنے کی تکلیف نہیں دی تھی۔ مکان کا نقشہ خود بنا کر ایک مستری رکھ لیا تھا اس نے کوٹھی بنادی۔ اس کا نام مستری عزیز خاں تھا جو قوم کا میواتی مسلمان تھا اور مانک چوک کے محلّہ میں رہتا تھا۔ اس کوٹھی کی لاگت کے بارے میں میں نے کوئی حساب نہیں رکھا تھا۔ جب مستری نے روپیہ مانگا تو دے دیا۔ وکالت ان دنوں خوب چلتی تھی۔ جب کوٹھی کی تعمیر ختم ہوگئی تو صاحب زادہ آفتاب احمد خاں میرے دوست نے معلوم کیا کہ کتنا خرچ ہوا، عزیز خاں مستری بھی موجود تھا۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے کوئی حساب نہیں رکھا۔ عزیز خاں مستری سے پوچھیے وہ موجود ہے کہ کیا خرچ کیا۔ عزیز خاں نے جواب دیا کہ اس عمارت میں بجائے ایک کوٹھی کے دو کوٹھیاں ہوگئیں اور دونوں پر کم وبیش اسی ہزار روپیہ صرف ہوا۔ آفتاب احمد خاں صاحب عمارات کے معاملے میں بڑے ماہر تھے انھوں نے چاروں طرف سے دونوں حصوں کو دیکھا اور کہا کہ اگر اسّی ہزار روپیہ صرف ہوا ہے تو کوئی زیادہ نہیں ہوا مناسب خرچ ہوا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس عمارت کی تعریف کی اور اب بھی کرتے ہیں ان دنوں روپیہ چونکہ زیادہ آ گیا تھا اس لیے مجھے ذرہ برابر تکلیف نہیں ہوئی۔ اتنی بڑی دو منزلہ کوٹھی اور احاطے کے مکانات اور باغ اور کنواں سب کو دیکھنے کے بعد اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ اسّی ہزار سے کم خرچ نہیں ہوا ہوگا۔ اب ان دو حصوں میں سے ایک حصہ کرایہ پر اٹھا دیا ہے۔ قریب چار سو روپے مہینے کے کرایہ آتا ہے۔ اس میں سے مہینہ کے آخر میں ایک پیسہ بھی نہیں بچتا وہ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ یہ کوٹھی میں نے گرلس کالج و گرلس اسکول کے نام وقف کردی ہے اور ایک شرط یہ لگادی ہے کہ میرے بعد فوری قبضہ میری اولاد کا ہوگا اور میری اولاد میں سے ہر ایک اپنی اپنی زندگی میں اس پر قابض رہ سکے گا اور میری اولاد میں نسل اوّل کے بعد قبضہ کالج کا ہو جائے گا۔ جس کا انتظام یونیورسٹی کرتی ہے۔

میں اپنے ملازمین کے بارے میں لکھ رہا تھا کہ بیچ میں کوٹھی کا قصہ آ گیا۔ اس کو ختم کر دیا ہے۔ اپنے ملازمین کے نام لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں جو حسب ذیل ہیں:

1-عبدالرحمان، ڈرائیور، 2-عیدو، خدمت گار، 3-سید کریم بخش، چوکیدار 4-ضامن علی، 5-سید فرخند علی چوکیدار، 6-محمد یار خاں خانسامہ، 7-عبدالحمید خاں خانسامہ، 8-حامد خان، ضلع دار، 9-بشیرا لدین ڈرائیور، 10- حمایت خاں خدمت گار، 11-نجم الدین خاں خدمت گار، 12-ممتاز خاں خانسامہ، 13-علاء الدین، خانسامہ، 14-لطیف، خانسامہ، 15-کبیر خانسامہ، 16-والدہ سید اشفاق علی تمیزن بوا ملازمہ، 17-مسماۃ سدّو ملازمہ، 18-اللہ دی کی اماں ملازمہ، 19-رام چرن مالی، 20-عیدو کی بہو یعنی خاتون جہاں کی انا، 21-ممتاز جہاں کی انا (نام یاد نہیں)، 22-محسن کی انا (نام یاد نہیں)، 23-سعید میاں مرحوم کی انا (نام یاد نہیں)، 24-خورشید کی آنا (نام یاد نہیں)، 25-برجیس جہاں کی انا، 26-مریم کی نانی ملازمہ، 27-لیلا کوچوان، 28-حنا گھاس والا، 29-ظالم گاڑی والا، 30-تلسی رام، 31-معشوق علی خانسامہ، 32-شبیر احمد خانسامہ، 33-محمد یونس خانسامہ، 34-ننا خدمت گار، 35-نورا خدمت گار، 36-منے خاں خدمت گار، 37-عباس علی خدمت گار، 38-شاہد حسین منشی، 39-عبدالوحید خاں خدمت گار و خانسامہ، 40-کرشنا مالی، 41-بھوپ سنگھ کیرا، 42-رام سہائے کیرا، 43-مواشی رام کیرا، 44-خوبی رام کیرا، 45-چیت رام کیرا، 46-کیول کیرا، 47-گوپی مالی، 48-پنا رام چوکیدار، 49-پنا کی بہو مہترانی، 50-پیتا چوکیدار، 51-پیتا کی بہو مہترانی-52-چرنجی چوکیدار، 53-چرنجی کی بہو مہترانی، 54-امراؤ کی بہو مہترانی، 55-قمر الدین کیرا، 56-نواب علی کیرا، 57-بابو رام دھوبی، 58-مبارک حسین دھوبی، 59-شکور دھوبی، 60-اعجاز خاں، عرف ملّو خدمت گار، 61-نذر محمد مالی، 62-شمس الدین خانسامہ، 63-گنیشی لال کیرا، 64-سکھی کوچوان، 65-رستم بہشتی، 66-غوث محمد بہشتی، 67-ہوشیار خاں بہشتی، 68-احمد بہشتی۔

مذکورہ بالا ملازمان کی فہرست یکجا کر دی گئی ہے لیکن ان میں اکثر یکے بعد دیگرے ملازم ہوئے تھے اور ایک وقت میں تو ملازم سے زیادہ مستقل نوکر کبھی نہیں رہے۔ البتہ بچوں کو کھلائی عورتیں نو سے زیادہ ہو جاتی تھیں۔ میں ہر سال گرمیوں کی تعطیل میں پہاڑ پر جاتا تھا۔ اگر ادھر ادھر چلنے پھرنے میں وقت کٹتا تھا تو ہمراہ ایک ہی ملازم ہوتا تھا جو میرے ساتھ رہتا تھا اور کھانا بھی تیار کرتا تھا۔ اس زمانے کی آمدنی کے لحاظ سے اتنے ملازم رکھنا ضرورت سے زیادہ نہیں تھا، اس زمانے میں ملازم بھی سستے ہوتے تھے۔ بعض ملازمین کو کھانا بھی میرے ساتھ ملتا تھا اور

باغ کی ضرورت کی وجہ سے ایک مالی اور دو کیپر ے ضرور ہوتے تھے۔ موٹر کا ڈرائیور ایک ہی ہوتا تھا۔ کلینر کا کام بھی وہ خود ہی کرتا تھا۔ کلینر الگ نہیں ہوتا تھا۔ نوکروں کو ان کے مناسب حالات کے لحاظ سے تنخواہ میں کبھی کمی نہیں کی جاتی تھی۔ ان میں سے بعض نوکر اپنی تنخواہ میں سے کچھ بچا بھی لیتے تھے اور مکانات بنوا لیتے تھے جو کرایہ پر اٹھتے تھے۔ حامد خاں ضلع دار نے نئی بستی میں دو مکانات بنوائے اور بشیر الدین ڈرائیور نے ایک بڑا مکان اسلام آباد محلہ میں بنایا۔ چونکہ میں وقت پر نوکروں کی مدد کرتا تھا اس لیے میرے یہاں کبھی کسی نوکر نے چوری نہیں کی اور نہ ان کو چوری کرنے کی ضرورت تھی۔

جھوٹ بولنا خدا کی ایک لعنت ہے

میری یہ کتاب جو میرے چشم دید واقعات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے کل اغراض کی طرف توجہ کرنے کا کوئی سلسلہ میری سمجھ میں اس وقت تک نہیں آیا لیکن انسانی اغراض وضروریات کی طرف توجہ کرنا ہر سمجھدار انسان کا فرض ہے اور اس لیے ہمیں خاص طور پر اس کی طرف توجہ کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ لیکن ہر انسان سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جو تعلیم پا کر اپنی سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوں۔ اس لیے میں بچوں کی کتابوں میں اپنے خیالات درج کرانے کا ان لوگوں سے متمنی ہوں جو بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم کی کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ لوگ کہانیوں کے طور پر اپنے خیالات بچوں کی کتابوں میں درج کرتے ہیں لیکن ابتدائی کتابوں میں اخلاقی زندگی پر روشنی ڈالنے کے لیے کوئی مصالحہ اپنی کتابوں میں درج نہیں کرتے مثلاً سچ بولنے غریبوں سے ہمدردی کرنے کی طرف ان کتابوں میں بہت کم واقعات اور حالات دیکھتا ہوں۔ اور جو تین چار برس کی عمر سے لے کر پندرہ سال کی عمر تک بچوں کے سامنے کہانیوں کی شکل میں دکھائی دیتے ہوں۔

کچھوے اور خرگوش کی کہانی سے بچے صرف یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ لگاتار محنت کرنے سے وہ اپنے امتحانوں میں کامیاب ہوتے رہیں گے اور اگر اپنی کتاب کو جلدی جلدی سے پڑھ کر کچھ دور پہنچ کر غفلت کریں گے تو کامیاب نہیں ہوں گے اور جو شخص لگاتار محنت کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔ لیکن بہت سی اور باتیں ہیں جو بچوں کو سکھانی چاہییں ان سب میں مقدم بات سچ بولنے کی

ہے۔ بچّوں کو سکھانا چاہیے کہ سچ بولنا خدا کی مہربانی کو اپنی طرف کھینچتا ہوتا ہے اور جھوٹ بولنے والوں کے اوپر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ خدا کی کتابیں جو آسمان سے اتری ہیں ان میں سچ بولنے کی تاکید ہے اور جھوٹ بولنے سے منع کیا ہے۔ جھوٹوں پر خدا نے لعنت بھیجی ہے اور سچ بولنے والوں کو امید دلائی ہے کہ اگر تم سچ بولو گے تو میں اپنی مہربانی سے تم کو خوش کرتا رہوں گا۔ جھوٹ شیطان نے بولا تو خدا نے لعنت کا طوق ہمیشہ کے لیے اس کے گلے میں ڈال دیا۔ لعنت کے معنی پھٹکار کے ہیں اس لیے ہر شخص جو کوئی کام شروع کرے اس کے لیے حکم ہے کہ بسم اللہ سے پہلے آعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھو یعنی پناہ چاہتا ہوں اللہ کی شیطان مردود سے'' اور یہ بھی نیک بزرگوں نے لکھا ہے کہ سچائی خدا کی رضا مندی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور جو سچ بولتے ہیں وہ گمراہ اور پریشان نہیں ہوتے اور قرآن پاک میں آیا ہے کہ لعنت اللہ علی الکاذبین یعنی اللہ تعالی کی لعنت ہے ان لوگوں پر جو جھوٹ بولتے ہیں۔

جو لوگ بچّوں کے لیے ابتدائی کتابیں لکھتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اپنی کتابوں میں سچ بولنے کی اچھائی یا خوبی بچّوں کے سامنے پیش کریں اور جھوٹ بولنے سے ان کو ڈرائیں کہ اگر جھوٹ بولو گے تو تم پر خدا کی پھٹکار پڑے گی۔

میری وکالت

میں مئی 1891 کے مہینے میں لاہور سے میٹرک کر کے علی گڑھ ایم۔اے۔او کالج میں داخل ہونے کے لیے آیا اور اس تاریخ سے لے کر آج تک اکہتر سال ہوتے ہیں علی گڑھ کا بستا ہو کر رہ گیا۔ علی گڑھ ایم۔اے۔او کالج سے میں نے بی اے اور ایل ایل بی کا امتحان دیا اور سرسید نے مسٹر بیک پرنسپل کالج سے مجھ سے کہلوایا کہ علی گڑھ میں بھی تو وکالت ہو سکتی ہے علی گڑھ میں رہو اور وکالت کرو۔ یہ اس وجہ سے کہلوایا تھا کہ ایل ایل بی کے امتحان کے بعد میں وکالت شروع کرنا چاہتا تھا اور لوگوں سے مشورے کر رہا تھا کہ کہاں پر شروع کروں اور ایک پرندے کی طرح اڑان کے لیے پر تول رہا تھا۔ یہاں سے بلند شہر بھی جانے کا ارادہ تھا اور الہ آباد بھی جانے کا خیال تھا اور دوسری جگہوں کا بھی ارادہ کر رہا تھا۔ کیونکہ لوگوں نے کہا تھا علی گڑھ میں وکلا زیادہ ہیں ایسی جگہ وکالت کرنی چاہیے جہاں وکلا کم ہوں۔ اب اگر میں اس رائے پر غور کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ یہ

رائے غلط تھی کہ جہاں وکلا زیادہ ہوں وہاں وکالت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن مجھے سرسید کی مہربانیوں اور بزرگی کا اتنا زیادہ خیال تھا کہ میں نے ان کے خیال کے مطابق طے کرلیا کہ میں علی گڑھ ہی میں وکالت کروں گا۔ چنانچہ جنوری 1900 میں ہائی کورٹ سے علی گڑھ میں وکالت کرنے کی اجازت لے لی۔ مجھ کو یہ نہیں معلوم کہ آیا ہائی کورٹ کی اجازت ضروری تھی یا نہیں لیکن کسی نے کہا کہ ہائی کورٹ سے اجازت لینی چاہیے اس وجہ سے میں نے درخواست بھیج دی تھی۔

جب میں بار ایسوسی ایشن میں پہنچا تو دو تین ہندو وکیلوں نے میرا خیر مقدم کیا کیوں کہ اس وقت یہ مشہور تھا کہ میں کشمیری ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے کشمیری بھائی کہا اور مسلمان تو جتنے تھے سب خوش ہوئے لیکن ایک صاحب نے جن کو مرے ہوئے بھی ایک زمانہ ہوگیا میں ان کا نام لینا نہیں چاہتا انھوں نے مجھے علی گڑھ میں وکالت شروع کرنے سے منع کیا اور کہا کہ یہاں کیا رکھا ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بہت دنوں سے علی گڑھ میں وکالت کر رہے ہیں لیکن ان کی وکالت چلی نہیں۔ میں ہمیشہ بار ایسوسی ایشن ہی کے مکان میں بیٹھتا تھا جہاں پر زیادہ تر ہندو ہی دکھائی دیتے تھے اور دو تین مسلمان بھی تھے اور باقی مسلمان ایک علاحدہ کمرے میں بیٹھتے تھے جو بار روم سے ملا ہوا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ وکالت میرے انتظار میں تھی کہ میرے جیسا کوئی نوجوان آئے اور میں ان کی مدد کروں۔ سب سے پہلا مقدمہ ایک گوسائیں کا تھا جو اگلاس کے رہنے والے تھے اور جن کی زمین پر دوسروں نے قبضہ کر رکھا تھا وہ آکر میرے منشی کے پاس بیٹھا اور اس نے پوچھا کہ یہ لڑکا کہاں کا ہے۔ منشی نے بتایا کہ کشمیر سے یہاں آئے تھے اور یہیں پڑھے ہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ اچھے معلوم ہوتے ہیں میں ان ہی کو وکیل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کا مقدمہ لے لیا اور خوب دل لگا کر اس میں کام کیا۔ اس نے مجھ کو محنتانہ بھی دیا اور وہ مقدمہ جیت گیا اور ایک گنی مجھ کو شکرانے میں دی۔ وہ مقدمہ منصفی میں تھا لیکن اسی دوران میں مجھ کو سب ججی کے مقدمات ملنے لگے۔

ایک بہت بڑے مقدمہ میں جو ریاست لاکھنو کا مقدمہ تھا مجھے وکیل کیا گیا میرے ساتھ اور بھی وکیل تھے لیکن دل لگا کر کام کرنے والا میں ہی تھا۔ فریق ثانی کی طرف سے جو شہادت ہوئی اس میں جرح میں نے ہی کی جو میرے پیروکاروں کو بہت پسند آئی اور راجہ مان سنگھ

سے سفارش کی کہ اگر جیت جائیں تو ان کو معقول شکرانہ دینا چاہیے۔ چنانچہ وہ مقدمہ میں جیت گیا اور مجھے محنتانے وشکرانے میں بہت معقول رقم ملی اور اس وقت سے سب بجی کی وکالت میں میرا نام ہو گیا اور اب لال خانی رؤسا اور شروانی رؤسا کے مقدمے میرے پاس آنے لگے اور علی گڑھ، بلند شہر، کانپور، فرخ آباد، اور سہارنپور وغیرہ میں مجھے روزانہ فیس پر مقدمات ملنے لگے۔ روزانہ فیس کے میں دوسو روپے لیتا تھا لیکن غریب اور مجبور لوگوں سے سو روپیہ بھی منظور کر لیتا تھا۔ اور ایک بیوہ نے مجھے جو سو روپے دیے تھے میں وہ مقدمہ ہار گیا تو میں نے اس کو سو روپے واپس کر دیے۔

ایک مقدمہ مجھے گوالیار کا ملا اس میں تنہا میں ہی وکیل تھا لیکن بعد میں مسٹر قادری بھی میرے شریک ہو گئے۔ وہ بڑے ساہوکاروں کا مقدمہ تھا۔ اس میں ہم دونوں کو کئی ہزار روپیہ ملا۔ ایک بڑا مقدمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے خاندان کا تھا۔ ان کے ایک رشتہ دار نے جو مظفر نگر میں رہتا تھا اپنی جائداد کا بڑا حصہ وقف کر دیا تھا جس میں مسلم یونیورسٹی کا بھی ایک حصہ تھا۔ وہ مقدمہ نواب وقار الملک مرحوم مغفور کے زمانے میں لڑا یا تھا اور لیاقت علی خاں کے والد اور چچا نے لڑا یا تھا۔ میں وقف کی طرف سے وکیل تھا۔ یہ قریب تیس چالیس لاکھ کی مالیت کا مقدمہ میں نے تن تنہا وقف کی طرف سے لڑا اور دوسری طرف سے ہائی کورٹ کے وکلا بھی آئے تھے اور ایک روز سر شاہ محمد سلیمان مرحوم بھی آئے تھے۔ یہ مقدمہ کوئی ڈیڑھ سال تک میرٹھ کی عدالت میں لڑتا رہا اور آخر کو میں اس مقدمے کو جیت گیا اور پھر واصلات کا مقدمہ لڑا اور واصلات کی تعداد قریب چار لاکھ کے تھی وہ بھی میں جیت گیا اور جن اداروں کے نام وقف تھا ان کو بہت فائدہ ہوا۔ اس میں سب شرکا نے مل کر مجھے پانچ ہزار روپیہ شکرانے کا دیا۔ یوں تو میں نے پانچ پانچ ہزار روپے شکرانے کے دو تین اور مقدموں میں بھی لیا تھا، لیکن یہ بہت بڑا مقدمہ تھا جب یہ ہائی کورٹ میں گیا تو میں بھی ہائی کورٹ میں گیا اور سر تیج بہادر سپرو آنجہانی نے اس میں ہماری طرف سے بحث کی تھی اور دوسری طرف کلکتہ کے نامی وکیل راس بہاری گھوش آنجہانی بھی آئے تھے۔ اس جائداد سے مجھے معلوم نہیں کہ اس وقت کوئی منافع اداروں کو ملتا ہے کہ نہیں مگر زمین داری کے خاتمہ تک بہت بڑی رقمیں حصہ داروں کو تقسیم ہوا کرتی تھی۔

میں نے اپنی وکالت 1946 تک جاری رکھی اور پھر آمدنی کم ہوگئی تو وکالت چھوڑ دی۔ علاوہ عدالتی شغل کے میں میونسپلٹی ممبر ہونے کی حیثیت سے اور بھی کام کیا کرتا تھا اور علی گڑھ و ہاتھرس و کانپور اور فرخ آباد کے لوگوں سے دوستی کے بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ بالخصوص سیٹھ پھول چند ہاتھرس والوں کے خاندان سے بہت ہی گہرے تعلقات تھے۔ ان کے پوتے سیٹھ چرنجی لال میرے بہت دوست تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

شہر علی گڑھ

علی گڑھ کے شہر میں ہندو اور مسلمان دونوں سرسید کے بڑے دوست تھے۔ کوئی بھی معاملہ جب پیش ہوتا تھا اور صدارت کے لیے کسی بڑے آدمی کی ضرورت ہوتی تھی تو سب سرسید ہی کو پکڑتے تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کے اندر کوئی بینک نہیں تھا۔ آگرہ میں بینک آف بنگال کی ایک شاخ تھی اس میں سرسید چندوں کی آمدنی کا روپیہ جمع کرتے تھے اور روز مرّہ کے اخراجات کے لیے علی گڑھ میں ایک جینی ساہوکار تھے ان کے ساتھ سرسید کے دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ خرچ کے لیے جو روپیہ سرسید بینک آف بنگال شاخ آگرہ سے منگاتے تھے وہ ان جینی ساہوکار ہی کے یہاں جمع رہتا تھا۔

علی گڑھ میں ایک پختہ سڑک ریلوے اسٹیشن سے یونیورسٹی تک نکلی جس کا اب نام مولانا خالق روڈ ہے لیکن میرس روڈ جو ریلوے اسٹیشن سے دودھ پور تک ہے اس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ صرف ایک کچا دگڑا تھا جو ریلوے اسٹیشن سے لے کر اس روڈ تک پہنچتا تھا جو کلکٹری کچہری اور ایگریکلچر فارم کے درمیان واقع ہے۔ اس دگڑے کے ایک طرف ایک کچی قبر تھی جس کو لوگ کہتے تھے کہ کسی بزرگ فقیر کی قبر ہے۔ عبداللہ لاج جس زمین پر تیار ہوا ہے یہ گورنمنٹ سے لی گئی تھی۔ اس کے ملحق ایک میری زمین تھی جس پر نور جہاں بیگم مرحومہ کا قبضہ میں نے کرادیا تھا۔ اور بعد میں اس کا بیع نامہ بھی ان کے نام لکھ دیا تھا جب میں نے عبداللہ لاج بنوایا اس وقت ان کی کوٹھی نسیم منزل بھی اپنے اہتمام سے بنوادی۔ انور جہاں بیگم کے صاحب زادے میاں نسیم نے وہ کوٹھی میرے دوست سریندر کمار کے ہاتھ بیچ دی اور جب اس کی فروخت کا معاملہ ہوا تو میں نے یہ شرط لگائی کہ یہ زمین اور کوٹھی فروخت ہونے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن اس کے ایک کونے پر جو قبر میرس روڈ کے سہارے

بنی ہے اس کو بیع نامہ سے نکال دیا جائے اب وہ قبر مسٹر سریندر کمار کے احاطہ سے باہر میرس روڈ پر واقع ہے اور سنا ہے کہ لوگ اس پر آ کر فاتحہ پڑھتے ہیں اور جمعرات کو روشنی بھی کرتے ہیں اور پھول چڑھاتے ہیں۔ میرس روڈ کی تیاری کے بارے میں عبداللہ بیگم کی سوانح عمری میں جو میں نے لکھا ہے مندرجہ ذیل اس کی نقل کی جاتی ہے۔

میرس روڈ علی گڑھ: گرلز کالج کی ایک اور برکت

اس وقت میرس روڈ کے دونوں جانب بڑی بڑی عالی شان عمارتیں دیکھ کر کوئی قیاس بھی نہیں کر سکتا کہ ریلوے اسٹیشن علی گڑھ سے لے کر دودھ پور کی سڑک تک پختہ سڑک بننے سے قبل مضافات علی گڑھ میں اس قطعہ کی کیا حالت تھی۔ 1909 میں مسٹر جانسن مالک کارخانہ جانسن اینڈ کو اور میں علی گڑھ ریلوے اسٹیشن سے باہر آئے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ہم دونوں میں میونسپل بورڈ علی گڑھ کے انتظامات کے متعلق سلسلۂ گفتگو شروع ہوا۔ کیونکہ ہم دونوں میونسپل بورڈ علی گڑھ کے ممبر تھے، ہماری توجہ علی گڑھ کے شہر کی توسیع کی طرف مبذول ہوگئی۔ ہم دونوں نے یہ رائے قائم کی کہ ریلوے لائن درمیان میں حائل ہونے کی وجہ سے یہ شہر یونیورسٹی (یونیورسٹی سے مراد اس وقت کے ایم۔اے۔او کالج سے ہے) وجج کچہری اور دیگر تعلیمی اداروں کی طرف کسی طرح پھیل نہیں سکتا ہے ہونا چاہیے لیکن ریلوے لائن نے اس جانب اس کی توسیع روک دی ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی دوسرا طریقہ دکھائی نہیں دیتا۔ بجز اس کے کہ اسٹیشن علی گڑھ سے دودھ پور کی سڑک تک ایک پختہ سڑک بنائی جائے اور اس سڑک کے دونوں جانب بہت سی زمینیں حاصل کر کے اس کے قطعات بنائے جائیں اور یہاں کے زمین داروں اور باضرورت آدمیوں کو سہ قطعات اپنے مکانات کی تعمیر کے لیے دے دیے جائیں تا کہ اس طرح سے اس نواح میں ایک اچھی وستھری بستی بن جائے گی۔ چنانچہ وہاں سے آنے کے بعد میں نے اس معاملے کے متعلق ایک درخواست کلکٹر صاحب پریذیڈنٹ میونسپل بورڈ کے پاس بھیج دی (ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ حصول آراضیات کی مثل کا معائنہ کرتے وقت میں نے اپنی درخواست کو مثل میں دیکھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ درخواست ابھی تک مثل میں موجود ہے) لیکن اس وقت کلکٹر صاحب نے اس ضرورت کی طرف کچھ التفات نہ کی۔ ان کے بعد جب دوسرے

صاحب آئے ان سے میں نے زبانی کہا۔ انھوں نے جواب دیا کہ سرکاری طور پر زمینوں کا حاصل کرنا کچھ آسان نہیں ہے۔ زمین داروں سے کہیے کہ وہ اپنی زمینیں میونسپل بورڈ کو دے دیں پھر ہم ان زمینوں کے قطعات بنا کر فروخت کر دیں گے اور اپنی سڑک بھی بنالیں گے۔ اس جواب سے ثابت ہوتا ہے کہ گو انگریزی قوم بڑی ہوشیار اور مستعد قوم ہے لیکن اس کے بعض افراد بھی کم ہمت اور لاپرواہ ہوتے ہیں جب تک ان پر کوئی سخت مجبوری نہ آجائے وہ آسانی سے کسی کام کے کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے ہاں اپنے مطلب کی باتوں کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

اوپر دو انگریز کلکٹر کا ذکر آیا ہے ان کے جانے کے بعد سر ولیم میرس کلکٹر ہو کر یہاں آئے جو ایک بڑے منتظم اور ہوشیار انگریز تھے۔ اگر ان کی سمجھ میں کوئی بات آجائے کہ وہ اچھی ہے تو وہ اس کو کر گزرتے تھے۔ جب وہ تشریف لائے تو میں نے ایک سڑک کی تعمیر کا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ اوّل تو انھوں نے بھی زیادہ آمادگی ظاہر نہیں کی لیکن دوسری ملاقات ان سے جب ہوئی تو میں نے دوسرے شہروں کی مثالیں ان کے سامنے پیش کیں جہاں پر کہ جدید سڑکیں بنا کر جدید بستیاں آباد کی گئی تھیں۔ تو یہ معاملہ ان کی سمجھ میں آگیا اور کہا کہ اچھا میں اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔

رائے بہادر انت رام بھارگو اس زمانے میں علی گڑھ میونسپل بورڈ کے ایگزیکٹیو آفیسر تھے۔ ان سے اس معاملے میں پہلے ہی میری بات چیت ہو چکی تھی اور انھوں نے اس خیال کو بہت پسند کیا تھا۔ جب سر ولیم میرس نے ان سے ذکر کیا تو انھوں نے بڑی زور سے اس تجویز کی تائید کی۔ دوسرے روز سر ولیم میرس نے لکھا کہ ہم وہ موقع دیکھنا چاہتے ہیں جہاں سے ہو کر وہ سڑک نکلے گی آپ بھی میرے اور رائے بہادر انت رام جی کے ساتھ چلیے۔ چنانچہ دوسرے روز صبح کے وقت سر ولیم میرس اور رائے بہادر انت رام اور پٹواری اور میں ریلوے اسٹیشن سے دودھ پور والی سڑک کی طرف چلے۔ رستے میں ایک ڈگرا یعنی دیہاتی کچا رستہ ضرور تھا جو بیگ پور سے شہر کی طرف جاتا تھا اور فصل کے زمانے میں بیل گاڑیوں میں غلہ جایا کرتا تھا۔ یہ ڈگرا کھیتوں میں ادھر ادھر سے گھوم کر اور چکر لگا کر نکلا تھا اور علاوہ اس کے اور کوئی رستہ آدمیوں کے جانے کا نہیں تھا۔ ببول کے درخت جا بجا بہت تھے اور جو زمین میں نے گرلز کالج کے لیے خریدی تھی اس کے جنوب

مشرق کی طرف سے ہم لوگ نکلے اور دودھ پور کی اس پختہ سڑک پر پہنچے جو کلکٹری کچہری سے دودھ پور ہوتی ہوئی زراعت فارم کے پاس جا کر ہر دوا گنج کی پختہ سڑک سے مل جاتی ہے۔ اس معائنہ کے بعد آراضیات کے حاصل کرنے کی کاروائی شروع ہو گئی۔ آراضیات حاصل ہونے کے بعد قریب آٹھ آٹھ بیگہ پختہ کے قطعات بنائے گئے جو ایک تاریخ پر نیلام ہوئے اور سب کے سب اچھی قیمت پر فروخت ہو گئے۔ وہ قطعہ جس پر عبداللہ لاج بنا ہے میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا لیکن سر ولیم میرس کی مہربانی سے پھر مجھ کو مل گیا۔ جب پختہ سڑک بنی تو اس سڑک کا نام میونسپل بورڈ نے میرس روڈ تجویز کیا اور اس کے رستے کے بننے کے بعد گرلس کالج کی حیثیت کچھ دوسری ہو گئی۔ میں نے میرس روڈ کا ذکر اس وجہ سے کیا ہے کہ ایک طرح میرس روڈ گرلس کالج کا جزو ہے۔ جب تک میرس روڈ نہیں بنا تھا گرلس کالج کے لیے کوئی بڑی سڑک نہیں تھی۔ گرلس کالج کی وجہ سے میرس روڈ بنا اور میرس روڈ کی وجہ سے گرلس کالج کو ایک بڑی رونق بھی حاصل ہوئی اور ایک بڑا فائدہ بھی حاصل ہوا۔ اس میرس روڈ کا ذکر آئندہ نسلوں کے سامنے ایک نمونہ ہوگا۔ مختلف شہروں میں لوگ شہر سے باہر کوٹھیاں بنا کر رہتے ہیں لیکن کسی ترتیب یا قاعدہ یا راستہ کا انتظام یا خیال نہیں رکھتے اس لیے ان کوٹھیوں میں رہنے والوں کو زیادہ آرام نہیں ملتا۔ میرس روڈ کی وجہ سے فقط ایک اچھا اور کشادہ رستہ ہی نہیں ملا بلکہ بجلی کا بھی الحاق ہو گیا اور پانی کے نل بھی اس کے ساتھ ساتھ شہر کے واٹر ورکس سے جاری کر دیے گئے۔

علی گڑھ شہر کی آبادی

اس شہر میں کم وبیش میرے خیال میں دو لاکھ آدمی عورت مرد بڈھے جوان اور بچے بستے ہوں گے۔ ان سب کے سامنے میری یہ درخواست ہے کہ وہ اپنے شہریوں اور اپنے پڑوسیوں کی خوشی اور بہتری کے لیے کوشش کریں گے۔ میرے مذہب میں تو یہ ہدایت ہے کہ تم اپنے پڑوسیوں کی بہبودی کا ایسا ہی خیال رکھو جیسا اپنی ذات کی بہبودی کا رکھتے ہو لیکن اس ہدایت کے اوپر نہ مسلمان چلتے ہیں اور نہ ہندو چلتے ہیں۔ آپس میں قومی اور مذہبی منافرت سب سے زیادہ غالب ہے اور بس چلے تو دوسرے مذہبی فرقہ کے عورت مرد اور بچوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔ یہاں جب بھی بلوہ ہوتا ہے تو اقلیت کے لوگوں کو سخت نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ علی گڑھ کے شہریوں سے میری التجا ہے کہ وہ علاوہ اور

کمیٹیوں کے ایک شہری کمیٹی بھی قائم کریں اور اس کمیٹی کا مقصد یہ ہو کہ وقتاً فوقتاً لوگوں کو جمع کر کے اپنے پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنے کی ترغیب دی جاوے۔ میں علی گڑھ کے ایک بلوے کے متعلق ذکر کرنا چاہتا تھا لیکن وہ معاملہ عدالت کے سامنے ہے اس کی نسبت کچھ لکھنا مناسب نہیں ہے۔

میری عمر اب نوے سال سے اونچی ہوگئی ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب میں اور کتنے دن جیؤں گا۔ اپنے شہر کے باشندوں کے بارے میں جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔ علی گڑھ میں بہت سے اور اسکول بھی قائم ہو گئے ہیں۔ تعلیم کا سامان پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لیے اپنے شہریوں سے دلی خواہش پر اس کو ختم کرتا ہوں کہ تم اپنی اولاد کو تعلیم دلواؤ۔

بچّوں سے خطاب

گرلز ہائی اسکول اور گرلز کالج کے احاطہ میں نرسریاں ان سب کو اپنے سامنے رکھ کر ان سے اپنی موجودہ جسمانی حالت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں بوجہ پیری کے بہت ضعیف ہو گیا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم سب سے جدائی کی گھڑی بہت جلد آنے والی ہے۔ تم کو میرے مرنے پر ضرور رنج پہنچے گا لیکن میں بھی تم سے جدائی کا صدمہ اپنے دل میں لے کر دنیا سے رخصت ہوں گا۔ میری عمر 90 سال سے زیادہ ہوگئی ہے اب صحت اور خوشی کا احساس برائے چند بھی واپس آنے کی امید نہیں ہے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تم سے جدائی کا مرتے وقت مجھے بہت صدمہ ہوگا۔ میرے بعد تم اگر کبھی میرے مزار پر آؤ تو فاتحہ پڑھ کر میری روح کو ثواب پہنچانا۔ مرنا اور جینا دونوں قدرت کے ہاتھ میں ہیں، اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ خوبصورت سے خوبصورت آدمی، بہادر سے بہادر آدمی نہایت پاکیزہ خیال کا آدمی اور اس کے ساتھ ہی ظالم اور بے باک آدمی، سب موت کا مزا اپنے اپنے وقت پر چکھیں گے۔ ہٹلر جیسا آدمی جس نے ساٹھ لاکھ یہودی مع دودھ پیتے بچّوں کے قتل کیے تھے اور اس کے ایجنٹوں نے ماؤں کی گودوں سے بچے گھسیٹ گھسیٹ کر نکالے اور ان کو ماؤں کے سامنے ذبح کر دیا اور پھر ان کے سب بچوں کو جمع کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ایسا غضب اور ایسا ظلم تاریخ میں کبھی نہیں ہوا۔ ہٹلر بھی مارا گیا یا اس نے خودکشی کر لی اور برلن کے کسی مکان کے تہہ خانے میں اس کی اور اس کی عورت کی

لاشیں آگ کے حوالے کی گئیں۔ دل کو ہلا دینے والے عمل اور صدمے کا وہ دروازہ جو اس وقت کھلا ہوا تھا جس سے ایسے لوگ اندر آسکتے تھے ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے قابل ہے۔ یہ بات تب ہی ہوسکتی ہے کہ کل دنیا کے لوگ ایکا کرلیں کہ اب ہٹلر جیسا آدمی ہم میں پیدا نہ ہوگا اور نہ کسی ظالم کو یہ موقع دیں گے کہ وہ بچوں کو عورتوں کو مردوں کو سب کو لاکھوں کی تعداد میں ہر ہفتہ اور ہر دن قتل کرائے اور تماشہ دیکھے۔ اس کی شرط یہ تھی کہ میں یہودی قوم میں کسی کو زندہ نہیں رہنے دوں گا اور اس نے ایک حد تک پورا کرکے دکھایا۔ جرمنی میں یہودی بھی کم و بیش ساٹھ ستر لاکھ ہوں گے ان سب کو جہاں تک اس سے ہوسکا فنا کرادیا۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ علاوہ یہودیوں کے قتل کرنے کے عیسائی جرمن قوم نے کوئی تدبیر ان مظلوموں کو بچانے کی کی یا نہیں کی۔

اس سے تم اندازہ کرسکتی ہو کہ اس قدر ظلم اور ستم کبھی دنیا میں نہیں ہوا۔ تم اس مثال کو اپنے سامنے رکھ کر ہندوستان میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنا کہ ایسا آدمی کسی ملک میں یا کسی سوسائٹی میں کبھی پیدا ہی نہ ہو اور اگر اتفاق سے کوئی ہو جائے تو سب مل کر اس کو اپنے دباؤ میں رکھیں اور اس کے ہاتھ سے اس قسم کے مظالم جو ہٹلر سے سرزد ہوئے نہ ہونے دیں۔

دوسروں کے متعلق خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن اپنے خیالات میں کوئی بری جگہ دینے کے لیے تیار نہیں رہنا چاہیے۔ سب کی نسبت اچھے خیالات رکھنے چاہییں اور اگر دوسرے کی طرف سے کوئی مخالفانہ بات ہو تو اس کے دفعیہ کے لیے تیار بھی رہنا چاہیے۔ ہماری قومی تعلیم میں سب سے بڑا کام بچوں کی تعلیم ہے۔ بچوں کو برائی کے رستے میں چلنے سے روکنا چاہیے۔ اگر وہ بلا سوچے سمجھے کوئی ایسا کام کریں جس کو تم پسند نہ کرو تو ایسے کام کی پاداش سے بچوں کو معاف بھی کردو اور غالب کے اس شعر پر عمل کرو۔ ''روک دو گر غلط چلے کوئی؛ بخش دو گر خطا کرے کوئی'' یہ عمل اگر سب والدین اختیار کریں تو بچے کبھی بدراہ نہیں ہوسکتے۔ بدی تو غلط تعلیم سے پیدا ہوتی ہے بچوں کو غلط تعلیم نہیں دینی چاہیے۔ یہ تمھارے لیے کوئی مفید چیز ہے نہ بچوں کے لیے اور نہ قوم کے لیے مفید ہوگی۔ مولانا حالی کی 'مسدس' اور 'چپ کی داد' دونوں کو پڑھا کرو اور آنحضرت ﷺ کی اس ہدایت پر پورا عمل کرو کہ پڑوسی کا تم پر بہت بڑا حق ہے۔ اس کو تکلیف مت دو بلکہ فائدہ پہنچاؤ۔ اس بارے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے احکام بھی انجیلوں میں پڑھو، انھوں نے بھی صلح و آشتی اور تعلقات کی صفائی کے بڑے

بڑے احکام دیے ہیں۔ ہمارے قرآن پاک میں کسی ایک جگہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے احکام کی مخالفت نہیں کی گئی ہے۔ ہمارا مذہب یہ ہے الصدق ینجی و الکذب یھلک پڑھنے اور یاد کرنے کے بعد پھر جتنے کام کرو ان میں نیک خیال کو جگہ دو اور برے خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ یہی اسلام ہے اور یہی نجات کا ذریعہ ہے خود بھی سچ بولو اور بچوں کو بھی سچ بولنا سکھاؤ۔

عبداللہ بیگم مرحومہ وقت سے بہت پہلے دنیا سے چل بسیں ورنہ ان کی تعلیم و تربیت اور راست بازی کے اثرات تم پر اچھی طرح سے محکم ہو جاتے۔ وہ کسی کی برائی کرنا جانتی ہی نہیں تھیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے والد بزرگوار سے یا مجھ سے سن لیا تھا کہ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا بری بات ہے اور اپنی زندگی بھر ان کا اس پر عمل رہا۔ ان کے سوانح کی مختصری جو کتاب میں نے لکھی ہے اس کو ضرور پڑھا کرو۔ علاوہ اس کے ایک کتاب خاتم الانبیا تم ہی کو سامنے رکھ کر میں نے لکھی ہے وہ بھی پڑھ لیا کرو کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کیسی پاکیزہ اور پاک صاف تھی۔

جب میں کسی مسلمان کی زبان سے سنتا ہوں کہ مسلمانوں کی مالی حالت دوسرے مذاہب کے لوگوں کی نسبت، بہت ابتر ہے تو میں اپنے دل میں سوچتا ہوں کہ کیا وہ شخص جس نے یہ الفاظ کہے اس نے اس بات کی طرف بھی توجہ کی ہے یا نہیں کہ وہ بھی مسلمان ہے۔ اس کو سب سے پہلے اس کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ مسلمانوں کی زبان سے جس وقت تمھارا دل چاہے تم مسلمانوں کی مالی ابتری کے الفاظ سن سکتے ہو لیکن مجالس میں آپ کسی مسلمان کی زبان سے سنیں گے کہ مسلمانوں کی حالت کے بدلنے میں ہم سب شریک ہیں اور ہم یہ کام کر رہے ہیں اور بعض مسلمان اپنی کوشش سے خوش حال ہو گئے ہیں۔ ہماری مجالس میں زیادہ تر دوسروں کی برائی سننے میں آتی ہے اور مولانا حالی نے اس کا خاکہ یوں کھینچا ہے۔

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگزر ہے نہ ملا کو، صوفی کو، اس سے حذر ہے

اگر نشۂ مے ہو غیبت میں پنہاں
تو ہشیار پایئے نہ کوئی مسلماں

مجھے اس قسم کی مجالس میں اپنی عمر میں بیٹھنے کا زیادہ موقع نہیں ملا گو ایک جگہ مجھے کئی روز تک ایسی
مجالس میں شریک ہونا پڑا کہ بجز اس کے کہ ہر شخص دوسروں کی برائی کرے لیکن اس کی صلاح و
فلاح کی کہیں نام ونشان بھی نہ ہو، میں اس مجلس میں بیٹھ کر ایک مرتبہ جو باہر تو میرے ساتھ ایک
بزرگ بھی نکل آئے اور انھوں نے کہا کہ میں آپ کو مبارکباد دینے کو آیا ہوا پ کسی کی برائی نہیں
کرتے اور آپ نے دیکھ لیا سوائے دوسروں کی برائی کے ان کی بھلائی و بدی کے لیے ان کی
زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا تھا۔ ہمارے بچوں کو گو بڑی بڑی مجالس میں جانے کا موقع نہیں ملتا لیکن
اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے تو انھوں نے ہر روز یہی سنا ہوگا کہ زید برا ہے اور بکر بھی اس کے
ساتھیوں میں ہے۔ میں اس کے اوپر بہت زور دیتا ہوں کہ عورتوں کی مجالس میں تم اول تو بیٹھا نہ کرو
اور بیٹھنے کی اگر مجبوری ہو جائے تو مجلس میں جو عورت دوسروں کی برائی زیادہ کرتی ہو اس کے پاس نہ
بیٹھیں اور اٹھ کر چلی جائیں۔ یہ پیٹھ پیچھے برائی کرنے کی عادت ہندوستانیوں کی مقدس کتاب گیتا
میں بھی پیٹھ پیچھے برائی کرنے کی مذمت کی گئی ہے اور منع کیا گیا ہے کہ کسی کی برائی مت کرو۔
امید ہے کہ میرے کالج اور ہائی اسکول کی لڑکیاں اپنی سوسائٹیاں بنائیں گی اور ان
میں جو ذکر واذکار ہوں اس میں اگر کسی کی برائی بیان ہوتی ہو تو وہ شرکت نہ کریں گی اور رفتہ رفتہ وہ
عورتیں جن کا مشغلہ ہی دوسروں کی برائی کرنا ہے وہ ان کی عزت کرنے لگیں گی۔ میرا دل چاہتا
ہے کہ میرے کالج اور ہائی اسکول کی لڑکیاں اپنے کو عام مسلمان عورتوں کی طرح بے کار باتیں
کرنے میں اپنا وقت صرف نہ کریں اور نہ کسی کی برائی کیا کریں۔ میں اپنی وصیت کے طور پر اپنی
لڑکیوں کے سامنے اپنا خیال پیش کر رہا ہوں کہ تم اپنے کو ایسے سانچے میں ڈھالو، جو خوبصورت ہو
کشادہ ہو اور چمکیلا ہو اور مولانا حالی نے جو اچھے لوگوں کی تعریف کی ہے اس کو ہمیشہ یاد رکھیں۔
انھوں نے فرمایا ہے کہ اس ملک میں بعض قومیں ایسی ہیں جن کی طرف دل کھنچتا ہے کہ ان سے
ملیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری قوموں کے چھوٹے بڑے اچھے اچھے کاموں میں اپنا وقت صرف
کریں۔ اس ہندوستان میں روز بروز آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اسی طور پر اگر بڑھتی چلی گئی تو
کسی وقت میں اپنی بہتات کے دباؤ سے ان میں اکثر آدمی یا تو خود بخود ہلاک ہو جاویں گے جیسے
کہ شہد کی مکھیاں ہر سال نر مکھیوں کو مار کر فنا کر دیتی ہیں تا کہ جو مکھیاں بے کار شہد کھاتی ہیں ان سے

ان کے چھتے خالی ہو جائیں۔ یہ مسئلہ کثرت آبادی کا ایسا نہیں ہے کہ میرے کالج اور ہائی اسکول کی لڑکیاں اس سے محسوس نہ کرتی ہوں۔ ابھی تو اس آبادی کو محدود کرنے کے لیے کوئی تدبیر نہ کسی کو سوجھی ہے اور نہ عمل میں لائی گئی ہے لیکن ہر شخص اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ یہ آبادی کسی وقت میں رنگ لائے گی اور ہماری نسل کو فنا کر دے گی۔

میری معصوم بیٹیاں یہ نہ سمجھیں کہ میں نے دنیا سے چلتے وقت یہ کیا ان کے لیے چھوڑا ہے۔ یہ معاملہ میرا بہت سوچا سمجھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بچوں کے والدین کو اس کا خاص طور پر اہتمام اور انتظام کرنا چاہیے۔ یہ بات تو ایک بطور جملہ معترضہ کے آ گئی لیکن مجھے تو ان کی ذات سے زیادہ امیدیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی وقت آ جائے اور ہر شخص کہے کہ وہاں کی لڑکیاں نہ فضول خرچ ہیں اور نہ اپنے عادات و اطوار سے کسی دوسرے کو نقصان پہنچاتی ہیں اور ہمیشہ سچ بولتی ہیں تو ملک میں سب جگہ واہ واہ ہو جائے گی اور میری روح اس کو دیکھ کر خوش ہو گی۔

الوداع

عورتیں اپنے بچوں کے گلے میں تعویذ لٹکاتی ہیں، جس سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نظر بد سے بچیں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ میرا یہ الوداعی نوٹ مردوں وعورتوں اور بچوں کے گلے میں اگر وسعت ہو تو سونے کے پتروں میں یا چاندی کے پتروں میں یا تانبے کے پتروں میں بند کر کے تعویذ کے طور پر پہنا جائے۔ آپس کے تنازعات اور مناقشے جات سے بچو، یہ آپس کی مخالفت دونوں فریق کی زندگی تلخ کر دیتی ہے، فارسی کا ایک شعر ہے۔

خیر کن اے فلاں غنیمت شمار عمر　　　　زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

ترجمہ: نیکی یا بھلائی کرائے شخص اور یہ عمر جو تم کو خدا نے دی ہے اس کو اپنے لیے سودمند سمجھ اس وقت سے قبل جب آواز آئے کہ فلاں شخص دنیا سے اٹھ گیا۔

اس کے خلاف اردو میں ایک مصرعہ ہے۔

تجھے پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

یعنی کسی کی تکلیف اور خوشی سے تجھے کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہیے تو صرف اپنی زندگی اچھی طرح سے گزار۔ یہ تعلیم بہت بڑی ہے۔ یہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ دوسروں کی برائی یا بھلائی سے کوئی

سر وکار نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ دوسروں کے جھگڑے میں پڑ کر اپنی حالت آدمی درست نہیں رکھ سکتا لیکن انسان ایک ایسی ہستی ہے کہ وہ دوسروں کے رنج وخوشی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر دوسروں کے رنج کے وقت ان کا خیال بدلنے کے لیے ان سے آشتی اور محبت اور ہمدردی سے پیش آئے تا کہ ان کی زندگی میں جو ایک تکلیف دہ واقعہ پیش آیا ہے اس میں اپنی ہمدردی سے ان کی حالت کی تبدیلی میں مدد ملے اور اگر خوشی ہو تو ان کی خوشی میں شریک ہو جائے تا کہ دونوں مل کر خوش ہو جائیں۔

کل جانوروں میں انسان ہی ایک ہستی ہے کہ اس کو اپنی موجودہ حالت کے علاوہ اپنی آئندہ زندگی کا خیال بھی ہوتا ہے۔ آئندہ زندگی کا اگر خیال نہ کیا جائے تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ حیوان صرف اپنی موجودہ زندگی کا خیال رکھتا ہے لیکن انسان آنے والے دن کا بھی خیال رکھتا ہے۔ یہ آئندہ کا خیال اس کو قیامت تک کی گھڑی تک پہنچا دیتا ہے۔ آئندہ کا خیال کرتے ہوئے یہ امر سب سے پہلے سامنے آجاتا ہے کہ وہ کیا کیا باتیں ہیں جن پر ہم عمل کریں کہ آئندہ کی زندگی طول ہونے کے علاوہ خوش گوار بھی ہو۔ زندگی کے خوش گوار ہونے میں سب سے زیادہ خیال کھانے کی اشیا کی فراہمی ہے۔ اس میں یہ خیال غالب آتا ہے کہ کھانا کس حد تک ہم کو مہیا کرنا چاہیے۔ یہ بات بدیہہ ہے کہ ہر شخص کو بقدر اپنی اولاد کی ضرورت کے کھانے مہیا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک گھر میں چار آدمی ہیں۔ چاروں کو یہ خیال کرنا لازمی ہے کہ ہم اس قدر کوشش کریں کہ اپنی زندگی میں فاقہ کشی کی نوبت نہ آئے۔ کھانے کے لیے کافی اناج اور پھل وغیرہ پیدا کریں لیکن ان چار میں اگر پانچواں گھس آئے تو چاروں کی روزانہ خوراک میں کمی ہو جائے گی جو اشیا خوردنی چاروں کے لیے کافی ہوتے تھے ان اشیا کا کھانے والا ایک آدمی اور موجود ہو گیا اور اگر ان چاروں کو ہر روز پاؤ پاؤ بھر کھانے کی چیزیں ملتی تھیں تو اب وہی چیزیں پانچ آدمیوں پر تقسیم ہوں گی لہٰذا اشیا خوردنی کی مقدار ایسی رکھنی چاہیے کہ جس قدر ضرورت ہو وہ سب پوری ہو جائے۔ اگر پہلے پاؤ پاؤ بھر روز کھاتے تھے تو اب بھی پاؤ بھر روز فراہم کرنے کی کوشش کریں اور یہی تعلیم اسلام کی ہے کہ چار پاؤ کے بجائے پانچ پاؤ کے فراہم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ مسئلہ بجائے پانچ پاؤ کے اگر دس پاؤ کی ضرورت ہے تو دس پاؤ کے فراہم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسلام کی یہ

تعلیم ہے کہ دس پاؤ چیز مل سکتی ہے لیکن اس وقت تک نہیں ملے گی جب تک اس کے لیے کوشش نہ کرے۔ کسی دوسرے مذہب نے اس قدر اعلیٰ تعلیم اپنے اصولوں کے ماننے والوں کو نہیں دی ہے جیسے کہ اسلام نے دی ہے۔ اسلام تو کوشش کا حامی ہے۔ اگر کسی شخص کو چار پاؤ کی جگہ پانچ پاؤ کی ضرورت ہے اور وہ اس کے لیے کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی اس کو نہیں ملتا تو ان پانچ آدمیوں کو جو اوپر بیان ہوئے ہیں توکل سے کام لینا چاہیے اور چار پاؤ کے اوپر ہی اکتفا کرنا چاہیے نہ کہ چوری کر کے یا ڈاکہ ڈال کر وہ اپنی ضرورت کو پورا کرے۔

اب اپنے خیال کو وسعت دو کہ انسان کی آبادی بڑھتے بڑھتے اتنی زیادہ ہو گئی کہ جس گھر میں چار پاؤ اشیا خوردنی کی ضرورت تھی اس میں آٹھ یا نو پاؤ کی ضرورت پیش آ گئی یعنی آدمی اتنے بڑھ گئے کہ اگر پاؤ پاؤ بھر سب گھر والوں کے لیے مہیا کیے جاویں تو اس کی ضرورت ہے کہ جتنے آدمی ہوں اتنے ہی پاؤ چیز فراہم کی جائے۔ خیال یہ ہے کہ اگر آبادی میں افزائش کی رفتار یہی رہی جو آج ہے تو ایک وقت آئے گا کہ جو اشیا اس وقت ضرورت کو پورا کرتی ہیں ان سے دو چند اشیاء کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لیے انسان کو دور اندیشی سے کام لینا چاہیے اور آبادی کی افزائش کی رفتار کو محدود کرنا چاہیے۔

ہمارے ملک میں جس قدر آبادی ہے اس کے لیے زمین سے ہم حسب ضرورت اشیا پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن جب آبادی کی تعداد موجودہ تعداد سے دوگنی اور سہ گنی ہو جائے گی اس وقت زمین سے اتنی پیداوار نہیں حاصل ہو سکے گی کہ کل آبادی کے لیے کافی ہو۔ اس لیے دور اندیش آدمی کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے ملک میں آبادی زیادہ نہ بڑھے۔ بچوں کی مائیں اتنے بچے پیدا کریں کہ ان کی تعداد زمین کی پیدائش کے مساوی رہے یعنی اگر زمین ہزار من اناج دے سکتی ہے تو آدمی بھی اتنے ہوں کہ ان کے لیے ہزار من اناج کفالت کرے۔

یورپ اور امریکہ میں آبادی کی تعداد اپنی حد سے نہیں بڑھنے پاتی ہے کیونکہ وہاں تعلیم مردوں اور عورتوں دونوں میں مکمل طور پر بچوں کو دی جاتی ہے لیکن ہمارے ملک میں چونکہ عورتیں تعلیم سے عاری ہیں اس لیے وہ کسی سوشل اصلاح میں حصہ نہیں لے سکتی ہیں۔ مجھ کو ایک خاندان کی حالت سے واقفیت ہے کہ اس خاندان میں چار لڑکیاں تعلیم یافتہ ہو گئی تھیں اور ان کی شادیاں

بڑے اونچے درجے کے تعلیم یافتہ لڑکوں سے ہوئیں۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چاروں لڑکیوں کے دو دو بچے ہوئے اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ خاوند اور بیوی دونوں اعلیٰ تعلیم حاصل کیے ہوئے تھے اس لیے ان کے بچوں کی تعداد اس طور پر بڑھنے نہیں پائی جیسے کہ جاہل ماں کے بچوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک عورت اپنے بچے لیے ہوئے گرلس کالج علی گڑھ میں آئی۔ اس نے ایک بچے کو اپنی بغل میں دبا رکھا تھا دوسرا اس کا پاجامہ پکڑے ہوئے پیچھے پیچھے جا رہا تھا اور دو بچے اور پیچھے آ رہے تھے۔ ایک دوسرے موقع پر دیکھا کہ ایک عورت آئی اور کم و بیش آٹھ بچے اس کے ساتھ تھے لیکن یہ مجھے معلوم ہوا کہ یہ دونوں عورتیں اعلیٰ تعلیم سے عاری تھیں اس لیے وہ اپنے بچوں کی تعداد محدود نہ کر سکیں۔ اب تعلیم کی ترقی کے ساتھ ممکن ہے کہ آبادی کا مسئلہ بھی ایک حد تک حل ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ سب عورتیں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو جائیں اس لیے ملک کی گورنمنٹ کو کچھ ایسی تدبیریں کرنی چاہئیں کہ آبادی میں اضافہ کرنے کے لیے بلا کسی حد و حساب کے ہر عورت بچے دینے پر مجبور نہ ہو جائے۔

میری رائے یہ ہے کہ سب سے اوّل آنے والی نسل کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ طے کیا جاوے کہ ہر عورت جس کی شادی ہو وہ دو بچوں سے زیادہ اولاد نہ پیدا کر سکے۔ اس معاملے میں تین پارٹیوں کا باہم ہم خیال ہونا ضروری ہے۔ وہ تین پارٹیاں یہ ہیں: اول تو ماں باپ دوسرے طبّی امداد اور تیسرے ملک کی گورنمنٹ ہے۔ ماں باپ تو سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں کہ اولاد میں تعداد بڑھنے نہ پائے۔ ہر ماں جس کی شادی ہو جائے وہ آبادی میں اور سوسائٹی میں دو بچوں سے زیادہ اضافہ نہ کر سکے۔ دوسرا فرقہ ملک کا طبّی فرقہ ہے کہ ایلوپیتھک کیا اور ہومیوپیتھک کیا اور یونانی ویدک طریقے کے ڈاکٹر و حکیم نہایت فکر و کوشش سے کوئی طریقہ معلوم کریں کہ جس سے ہر ماں کے رحم میں بچے اتنے ہی پرورش پا سکیں جتنی کہ سوسائٹی کو ضرورت ہے۔ کوئی دوا اور طریقہ ایسا معلوم کریں کہ اس کے استعمال سے جب ماں باپ چاہیں بچہ ماں کے رحم میں زندہ ٹھہر جائے اور اگر ضرورت نہ ہو تو نہ ٹھہر سکے۔ یہ بہت بڑی کامیاب طبّی معلومات ہوگی اور ہم کو امید رکھنی چاہیے کہ کسی نہ کسی وقت میں طبّی پیشہ اس معاملے میں سوسائٹی کی مدد کرے گا۔ ان دو فریقوں کے علاوہ تیسرا فریق گورنمنٹ ہے جس کے لیے آئے دن شورش برپا ہوتی ہے کہ رعایا بھوکی مر رہی

ہے کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ ان دنوں میں ہمارے ملک کی پارلیمنٹ میں مرکزی گورنمنٹ کے خلاف ریزولیوشن پیش ہوا ہے جس پر بحث ہوگی۔ وہ ریزولیوشن یہ ہے کہ رعایا بھوکی مر رہی ہے ملک میں اناج کی قلت ہے ایسی حالت میں گورنمنٹ یا تو گدی چھوڑ دے یا ملک کے لیے اناج فراہم کرے۔ ہماری گورنمنٹ نے ان دنوں امریکہ سے اور پاکستان سے بہت اناج خریدا ہے لیکن اب تک مہنگائی میں کمی نہیں ہوئی۔ ایسی مہنگائی تو کبھی نہیں ہوئی اور اگر یہی مہنگائی رہی تو بہت لوگ بھوکے مر جائیں گے۔ لیکن ریزولیوشن مذکورہ بالا پیش کرنے والے کو بھی یہ بتانا پڑے گا کہ گورنمنٹ علاوہ اناج کی خریداری کے اور کیا طریقہ اختیار کر سکتی ہے کہ آبادی کی ضرورت کے لیے اناج مہیا ہو جائے۔ اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہر شادی شدہ مرد اور عورت کو لازمی ہے کہ وہ دو اولادوں سے زیادہ کا اضافہ سوسائٹی میں نہ کریں اور دو بچوں کا پیدا ہونا اور زندہ رہنا نسل کی بقا کے لیے کافی معلوم ہوتا ہے اور اس سے زیادہ بچے کسی وقت میں سوسائٹی کو برباد اور تباہ کر دیں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ دو بچے بقائے نسل کے لیے ضروری ہیں۔ ان کو سوسائٹی میں بنا کسی روک ٹوک کے لانا ہر شادی شدہ ماں کا فرض ہے لیکن جب دو بچے کسی ماں کے ہو جائیں تو وہ تیسرا بچہ بلا روک ٹوک سوسائٹی میں لانے کی اہل نہ ہو اس لیے دو بچوں کے بعد جب تیسرا بچہ ہو تو اس پر گورنمنٹ کا ٹیکس قائم کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ ٹیکس کی تعداد کیا ہو؟ میری رائے یہ ہے کہ کاشتکاروں سے ہر زائد بچے پر ایک روپیہ مہینہ جمع کرایا جائے اور اگر دو زائد بچے ہوں تو دو روپے مہینہ جمع کرایا جائے اور شہر کے لوگوں پر ان کی حیثیت کے لحاظ سے ٹیکس مقرر کیا جاوے۔ اگر یہ طریقہ گورنمنٹ اختیار کرے تو آبادی کی تعداد غیر محدود نہیں رہے گی بلکہ محدود ہو جاوے گی اور چونکہ اس کے محدود کرنے کی نہایت سخت ضرورت ہے اس لیے ہر دوراندیش گورنمنٹ کو زائد بچوں پر ٹیکس قائم کرنا چاہیے اور ہماری پارلیمنٹ کی اس ٹیکس کے قائم کرنے میں دلچسپی لینی چاہیے تاکہ رفتہ رفتہ کثرت آبادی محدود ہو جائے اور زمین کی پیداوار کے مساوی اناج کے کھانے والے مقرر اور معین ہو جائیں۔

اس رائے کو میں نے تعویز کے نام سے موسوم کیا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی اچھی طرح سے گزارنے کے لیے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کو ہمیشہ اپنی نظر کے سامنے رکھا جاوے۔ اس کو میں

تعویذ زندگی کہتا ہوں اس میں ان سب غلطیوں کا دفعیہ موجود ہے جن سے قومیں رفتہ رفتہ بربادی کی طرف جارہی ہیں۔ اگر تعویذ کے طور پر ہر بچے کے گلے میں یہ عبارت باندھ دی جائے اور جوانی و بڑھاپے تک قائم رہے اور اس کی حقیقت پر انسان غور کرتا رہے تو اس کی زندگی کے لیے یہ ایک تعویذ ہو جائے گا۔ وہ تعویذ کے طور پر ہر بچے کے گلے میں باندھ دیا جائے اور جوانی اور بڑھاپے میں بھی قائم رہے تو قومی بہبودی کے لیے یہ رائے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ میں اس کو اپنی کتاب میں درج کرادوں گا کہ پڑھنے کی ضرورت ہو تو انسان پڑھ سکے۔ میں نے وہ اندیشہ اپنے سامنے رکھا ہے جو آج کل کے دور اندیش حکمرانوں کے سامنے ہے اور اس کی ذمہ داری میں نے ماں باپ وطنی سوسائٹی اور گورنمنٹ کے سر ڈالی ہے۔

اب سب سے آخر میں دو امور پر اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور تمام دنیا کی مہذب قوموں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس زمانے کے بعد کبھی ان دو باتوں کو اپنی نسل میں نہ آنے دیں جن سے میں منع کر رہا ہوں۔ ان دو میں سب سے اہم اور ضروری یہ ہے کہ آئندہ کسی انسان کو خدا ہونے کا خطاب نہ دیا جائے۔ اس میرے زمانے میں دو انسانوں کو خدا مانا گیا۔ ان میں ایک تو شاہ جاپان ہے جو کئی نسلوں سے صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ خدا بھی ہوتا ہے۔ اور دوسرے تبت کا دلائی لامہ ہے۔ اس وقت دونوں حیات ہیں اور میں بصد منت مہذب انسانوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں کے بعد انسانوں کو خدا نہ کہا جائے۔ میرے نزدیک انسان کبھی اور کسی حالت میں خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا ایک اعلیٰ روح ہے اور موت سے اور کمزوری سے قطعی محفوظ ہے۔ نہ وہ کبھی کمزور ہو کر بڈھا ہوتا ہے اور نہ کبھی مر سکتا ہے اور غالباً وہ لوگ جو انسان کو خدا مان لیتے ہیں وہ اس خدا میں جو واقعی خدا ہے اور اس انسان خدا میں ضرور کوئی نہ کوئی تفریق کرتے ہوں گے۔ یہ اصول نہایت تاریک زمانے میں انسانوں پر غالب آ گیا تھا اور انھوں نے ایک انسان کو اپنا خدا مان لیا۔ سنا ہے کہ جاپان کے بادشاہ نے دنیا کی قوموں کو یقین دلایا ہے کہ اب وہ خدائی کے دعویٰ سے دست بردار ہو جائیں گے اور سب کے سامنے دست بردار ہو بھی گئے ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ جاپانیوں کی مہذب قوم اب کسی انسان کو خدا ہونے کا خطاب نہ دے گی۔

دوسرا امر جس سے میں منع کرنا چاہتا ہوں وہ خود مختار مطلق العنان بادشاہ ہونے کا

ہے۔ان مطلق العنان بادشاہوں کی وجہ سے دنیا میں جو جو مظالم ہوئے وہ تاریخ کے اوراق میں عبرت کے لیے دیکھنے کے قابل ہیں۔ ہندوستان میں راجہ ہمیشہ مطلق العنان رہا ہے اور راجہ ایک ہی ذات کے انسانوں میں سے ہوتا تھا یعنی راجپوتوں میں سے راجہ ہوتا تھا۔ان کی حالت دیکھ کر اور کتابوں میں پڑھ کر کسی نے کہا کہ خدا کی عبادت کرنے سے راج ملتا ہے۔ اور راجہ جب مرتا ہے تو اس کو دوزخ ملتی ہے یعنی یہاں کی تہذیب میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی کہ راجہ مرنے کے بعد ضرور دوزخ میں جائے گا۔ جاپان میں بھی کبھی مطلق العنان بادشاہ تھا اور وہی خدا ہو گیا تھا۔ بادشاہوں کے قصوں کی نسبت کچھ لکھنا وقت ضائع کرنا ہے چونکہ ان کے حالات تواریخ میں ملیں گے۔ ہندوستان کے علاوہ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بھی بادشاہ زیادہ تر ظالم ہی ہو گزرے ہیں۔ فقط ایک ایران کا بادشاہ تھا جس کا نام نوشیرواں تھا اور جو بڑا عادل بادشاہ تھا۔ ہمارے پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر فخر یہ فرمایا تھا کہ میں نوشیرواں عادل کے زمانے میں پیدا ہوا ہوتا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے باقی کسی ملک کے بادشاہ کا حال میں نہیں بیان کر سکتا لیکن انگریزوں کی تاریخ میں کئی ظالم بادشاہوں کا ذکر ہے۔سب سے پہلے وہ جس شخص نے انگلستان فتح کیا۔اس کا نام ولیم تھا اور ولیم فاتح اس کو کہتے ہیں۔وہ بہت بڑا ظالم تھا اس نے بڑے بڑے مظالم کیے اپنے جنگلوں کی حفاظت کے لیے یہ قانون بنایا کہ کوئی شخص اگر کسی درخت کی ایک ٹہنی کاٹے تو اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے۔اس کے بعد ایک بادشاہ ہوا جس کا نام ہنری ہشتم تھا اس نے کئی عورتوں سے شادیاں کیں جب کسی دوسری عورت سے اس کو عشق ہو جاتا تھا تو پہلی عورت پر بغاوت کا جرم لگا کر قتل کروا دیتا تھا۔اور شیکسپیر کی شہادت سے یہ ثابت ہے کہ ایک بادشاہ ایڈورڈ (نام یاد نہیں) نے بڑے بڑے مظالم کیے، بچوں کو مروایا عورتوں کو قتل کر دیا اور کیا کیا۔

ہندوستان میں اسلامی زمانے میں رعایا کے اوپر کچھ مظالم نہیں ہوئے جیسا کہ مشہور مورخ جادو ناتھ سرکار کی کتاب سے یہ بات ثابت ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر گو بہت بدنام ہیں لیکن اس نے مذہب کے بہانے سے ایک ہندو کو بھی قتل نہیں کیا تھا لیکن اس نے اپنے کل خاندان کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو سب کو قتل کرا دیا اور آخر کو جب وہ مرا تو سوائے ان کے بیٹوں کے اکبر اور جہانگیر کی اولاد میں کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا۔ مولانا شبلی نے حسب ذیل شعر اورنگ زیب کے

بارے میں لکھا ہے وہ ہندوؤں سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تمھیں لے دے کہ ساری داستاں میں یاد ہے اتنا　　کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا

ہندو کش ہونے کا مجھے معلوم نہیں کہ مولانا شبلی نے کہاں سے لیا ہے۔ ہندوؤں میں اس بات کا کوئی چرچا نہیں تھا لیکن اس کے ظالم اور ستم گر ہونے میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ اس نے اکبر کی اولاد میں سوائے اپنے بیٹوں کے زندہ نہ چھوڑا اور جب مرنے لگا تو اس نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ "ہر چہ بادا باد" یعنی جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ ما کشتی در آب انداختیم" یعنی اپنی حیات کی کشتی پانی کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کی اولاد میں محمد شاہ رنگیلا بھی ہوا ہے جو اورنگ زیب کے مرنے کے بعد کوئی 36 رسال بعد حکومت کرتا تھا جب نادر شاہ گذر یہ ایک فوج لے کر ملک میں گھس آیا تو محمد شاہ نے وہ رپورٹ جو پنجاب سے آئی تھی کہ نادر شاہ آ گیا ہے شراب کے پیالے میں ڈال دی اور زبان سے یہ الفاظ کہے "این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولے" یعنی یہ رپورٹ جو بے معنی ہے اس کا شراب کے اندر غرق کرنا ہی بہتر ہے۔ نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کرایا تب محمد شاہ کو ہوش آیا اور کہا کہ "شامت اعمال ما صورت نادر گرفت" اب میرا یہی کہنا ہے کہ آئندہ مطلق العنان بادشاہ نہ ہوں کیونکہ ان کی وجہ سے مخلوق خدا کو سخت مصیبتیں پڑی ہیں اس لیے آئندہ کے لیے سب کو احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

•••
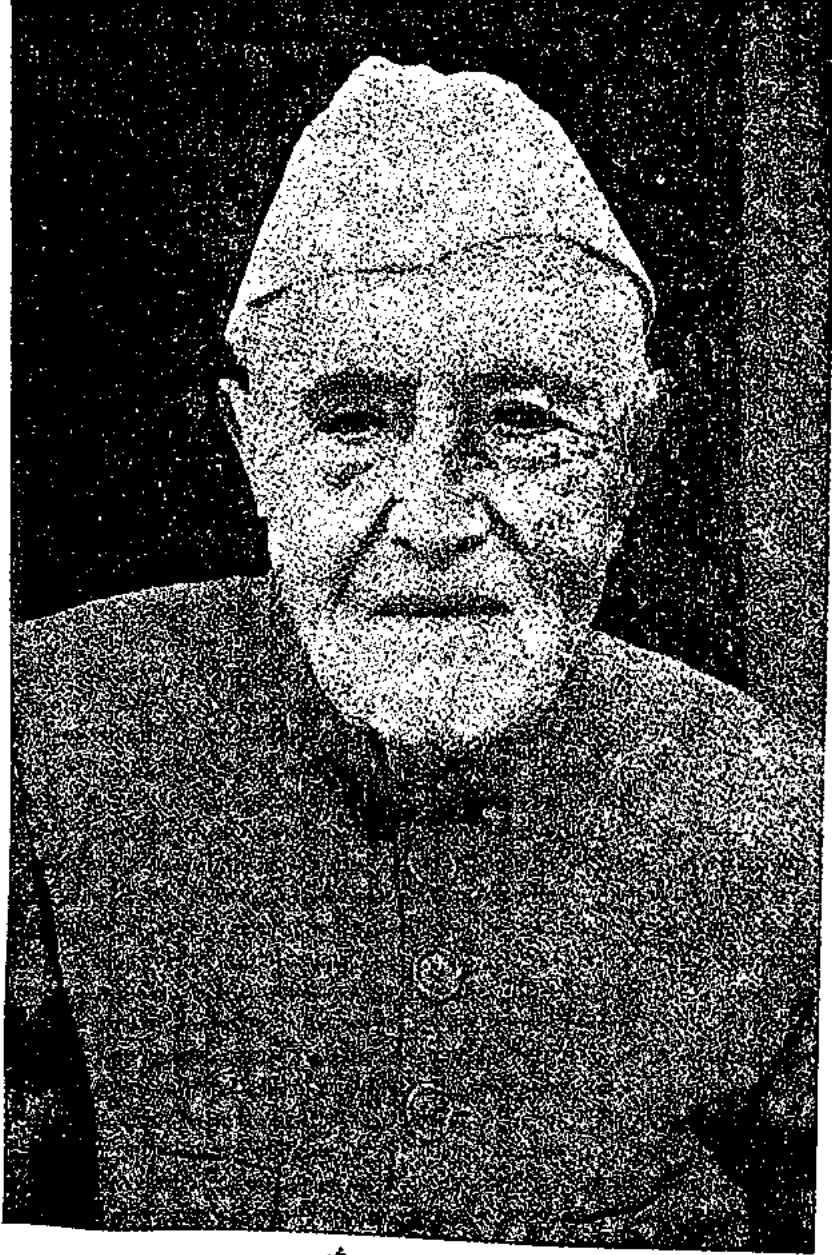
پاپا میاں۔۔۔۔ڈاکٹر شیخ عبداللہ
(بانی ویمنس کالج اے۔ایم۔یو۔علی گڑھ)

بیگم ممتاز جہاں حیدر پرنسپل ویمنس کالج۔اے۔ایم۔یو۔علی گڑھ
سکریٹری فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن۔علی گڑھ
(موصوفہ ڈگری کالج کی تاسیس کے وقت سے مسلسل واحد پرنسپل ہیں)

राष्ट्रपति भवन, नई दिल्ली-4
RASHTRAPATI BHAVAN,
NEW DELHI-4

مورخہ ۲ دسمبر سنہ ۶۸

محترمہ مسز حیدر — آداب

آپ کا عنایت نامہ ملا - بہت بہت شکریہ -

میں شیخ صاحب مرحوم کی کتاب پر پیش لفظ ضرور لکھ دوں گا - مگر
کتاب تو مجھے دیکھنے کو ملنی چاہیے - کبھی نظامی صاحب ادھر آئیں
تو کتاب ساتھ لیتے آئیں - یا مناسب سمجھیں تو بھیج دیں - مگر اس
بہانہ سے ان سے ملاقات بھی ہوجائے تو بہت اچھا ہے -

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں - والسلام

مخلص

محترمہ مسز حیدر صاحبہ
"عبداللہ لاج"
میرس روڈ — علی گڑھ (یوپی)
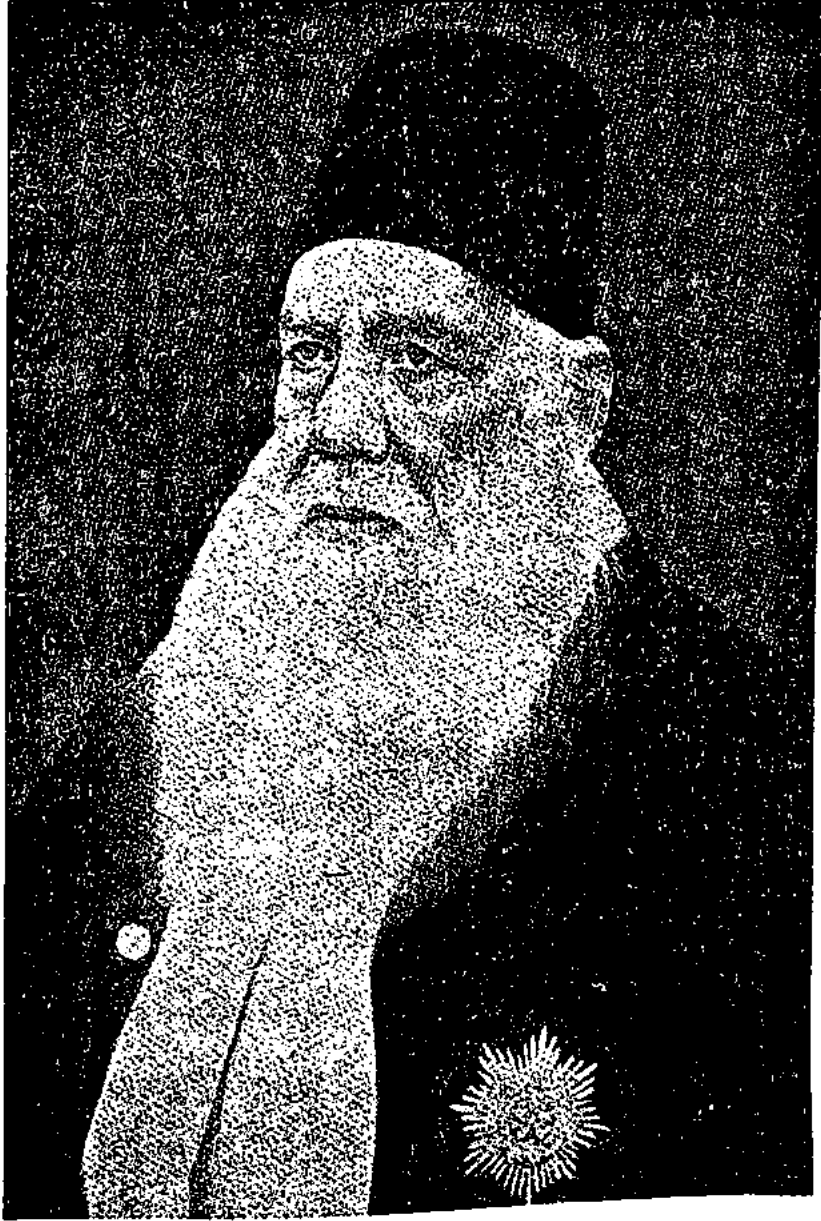
(سر سیّد رحمۃ اللہ علیہ)

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ (ایڈووکیٹ) اور بیگم عبداللہ

ڈاکٹر شیخ عبداللہ
(بانی ویمنس کالج علی گڑھ) عالمِ جوانی میں

اعلٰی بی۔۔۔۔۔۔۔بیگم ڈاکٹر شیخ عبداللہ

بدرالدین طیب جی شیخ صاحب کو پدم بھوشن کے خطاب کی خوشی پر
ہار پہناتے ہوئے

بدرالدین طیب جی، شیخ محمد عبداللہ، مسز سعیدہ واحد قدوائی
مائک پر شیخ صاحب کی صاحبزادی ''خاتون جہاں''

شیخ صاحب کرنل ''جمال عبدالناصر'' (صدر جمہوریہ عربیہ) کو
ہار پہناتے ہوئے
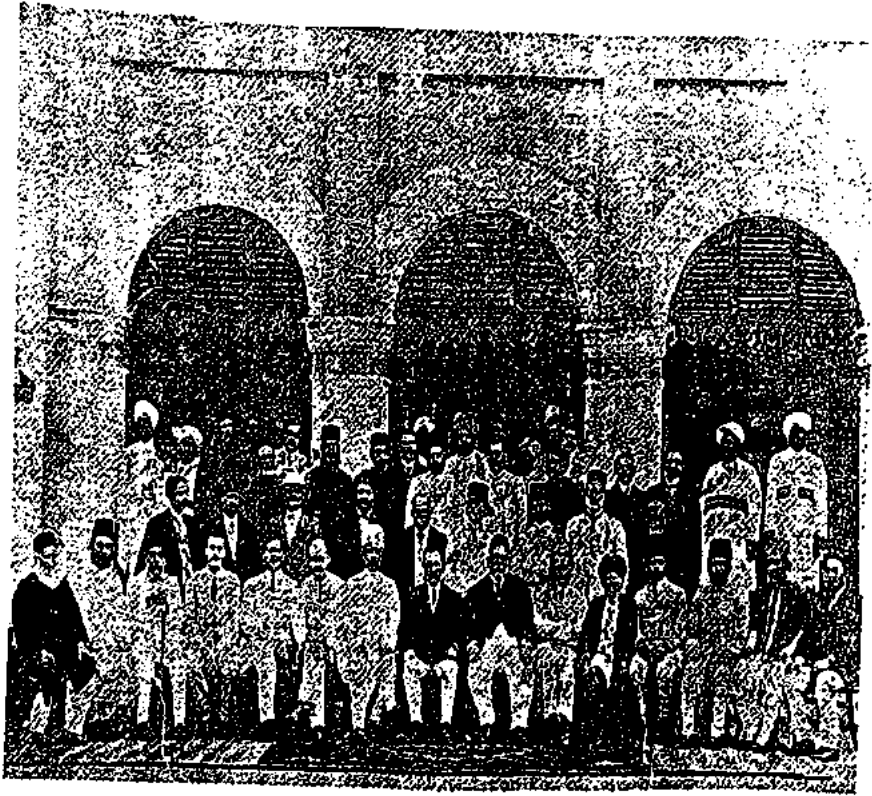
ایم۔ای۔اوکالج کا ایک یادگار۔گروپ

شیخ صاحب کا ایک یادگار خاندانی گروپ
شیخ صاحب اپنی صاحبزادیوں، دامادوں، نواسوں اور نواسیوں کے ساتھ
اور بائیں جانب بیگم عبداللہ کی بہن سکندر جہاں

یہ کتاب شیخ محمد عبداللہ معروف بہ پاپا میاں کی یادداشتوں پر مبنی ان کے مشاہدات اور تاثرات کا مجموعہ ہے، جو شرح وبسط سے علی گڑھ میں شیخ عبداللہ کی تحریک تعلیم نسواں اور ان کے جملہ مساعی پر روشنی ڈالتی ہے۔ شیخ صاحب اور ان کے اہل خانہ نے مسلم لڑکیوں کی تعلیم کو اس وقت اپنا مشن بنایا جب تعلیم نسواں کا مطلع بالکل بھی صاف نہیں تھا۔ شیخ عبداللہ نے براہ راست سر سید سے استفادہ کیا اور ان سے حاصل قوت کار کے جذبے کو مسلم بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ اس طرح یہ کتاب شیخ صاحب کے ساتھ تعلیم نسواں کے تعلق سے سر سید کے موقف کو بھی سامنے لاتی ہے۔ سر سید سے متعلق شیخ صاحب کے متعدد چشم دید حالات و واقعات کی تاریخی کڑیاں بھی کتاب کے مباحث کا حصہ ہیں۔

کتاب کے مرتب پروفیسر اطہر حسین صدیقی ہندستان کی مایہ ناز علمی دانش گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے علم الحیوانیات میں اعلی سند یافتہ ہیں۔ اردو زبان، تدریس، تحقیق، ترجمہ اور سائنس ان کی دلچسپی کے شعبے ہیں۔ دو جلدوں پر مشتمل خودنوشت سوانح 'میں کیا میری حیات کیا' کے علاوہ 'نشاطِ آبلہ پائی' (سفر نامہ)، 'حیرت سرائے کی کہانیاں' (ترجمہ)، نواب سلطان جہاں بیگم (حیات و خدمات (ترتیب) ان کی مطبوعہ کتب ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی-110025

قیمت -/185 روپئے